[illegible] LOANED

[illegible] book may be kept for

Fourteen days

A fine of **.06 nP.** will be charged for each day the book is kept over-time.

سی۔ ایف۔ اینڈریوز

مرتبہ

بنارسی داس (چترویدی)

و

مارجوری سائکس

تعلیمی مرکز

مترجمہ

ضیاء الدین احمد برنی، بی اے

دیباچہ

از ایم۔ کے۔ گاندھی

انگریزی کتاب کا دیباچہ مہاتما گاندھی کا تحریر کردہ ہے

جو حسب ذیل ہے:

چارلی اینڈریوز بچہ کی طرح سیدھے سادے، دیانتدار اور انتہائی شرمیلے تھے۔ سوانح نگاروں نے ان کی زندگی کے حالات نہایت محبت سے تحریر کئے ہیں۔ اینڈریوز کی سی زندگی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ آپ اپنا تعارف ہے۔

نیو دہلی ۸ دسمبر ۱۹۴۷　　　ایم کے۔ گاندھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

۱۹۰۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول (دہلی) سے انٹرنس کا امتحان پاس کرتے ہی میں داخلہ کے لئے سینٹ اسٹیفنز کالج پہنچا۔ اُس زمانہ میں اِس کالج میں مسلم طلبا کی تعداد بہت کم تھی، اتنی کم کہ اُسے انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ مگر کالج کے پرنسپل ایس۔ کے۔ رُدرا اور وایس پرنسپل سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے شروع ہی سے میرے ساتھ ایسی مہربانی کا برتاؤ کیا اور میرے لئے اسقدر تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائیں کہ میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔ میں اس کالج میں ۵ سال رہا اور اس مدت میں ان دونوں بزرگوں کے ساتھ میرے روابط بہت گہرے ہوگئے۔ انہی روابط کا نتیجہ تھا کہ میں نے کوشش کرکے بہت سے مسلم طلبا کو کالج میں داخل کرایا تاکہ وہ کالج کی اعلیٰ تعلیم اور تربیت سے مستفید ہوں۔ رُدرا صاحب نے ان میں سے بہت سوں کے لیے تعلیمی آسانیاں بہم پہنچائیں۔

اینڈریوز صاحب شروع ہی سے ہماری جماعت کے ٹیوٹر تھے اور اس وجہ سے مجھے ان کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ میں کالج ہی کے زمانہ سے ان کی خداداد قابلیتوں سے متاثر تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ کالج میں اور بھی کئی ایک انگریز اور ہندوستانی پروفیسر تھے اور خوش قسمتی سے ان میں سے بعض سے میرے مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ ان پروفیسروں میں سی۔ بی ینگ، پیڈی ڈسے، سین، مکرجی، حکیم خواجہ عبدالمجید، جے۔ ویسٹرن اور شمس العلما مولوی عبدالرحمٰن قابلِ ذکر ہیں۔ سی۔ بی۔ ینگ کیمبرج میں مولانا محمد علی کے ہم سبق رہ چکے تھے اور جب ۱۹۱۸ میں میں نے انگریزی میں مولانا کی سب سے پہلی "لائف" لکھی تو یہی ینگ تھے جنہوں نے مجھے مولانا کی ولایت کی زندگی کے بارے میں نوٹ لکھکر عطا فرمائے تھے۔

زمانۂ طالب علمی کا واقعہ ہے کہ میرے دوست اور ہم جماعت محمد انو احدی تصوف کے مشہور رسالہ "نظام المشائخ" نکالا کرتے تھے جو میرے محترم دوست خواجہ حسن نظامی کی

شایع ہوا کرتا تھا۔ ایک دن خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اینڈریوز صاحب سے ہمارے رسالہ کے لیئے کوئی مضمون لکھوا کر دو۔ چنانچہ میری درخواست پر انہوں نے "سیکریٹ آف پریئر" لکھکر دیا جس کا ترجمہ میں نے "سرّ الدعا" کے عنوان سے کیا۔ پھر خواجہ صاحب کے ارشاد پر میں نے اینڈریوز صاحب سے "نظام المشائخ" کے "رسول نمبر" کے لیے مضمون لکھوایا۔ انہوں نے واقعۂ ہجرت پر نہایت خوبصورت انداز میں مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "رسول کا تیسرا ساتھی" یعنی (خدا)۔ یہ مضمون بیحد پسند کیا گیا اور اس سے ظاہر ہو گیا کہ انہیں اسلام اور بانی اسلام سے کتنی گہری عقیدت ہے۔

۱۹۱۱ء میں مولوی ذکاءاللہ کا انتقال ہوا جن سے اینڈریوز کے گہرے مراسم تھے۔ چونکہ میں مولوی صاحب کا ہم محلہ تھا اس لئے اینڈریوز صاحب نے میرے ذمہ یہ خدمت سپرد کر رکھی تھی کہ میں روزانہ ان کی علالت کا حال ان کے گوش گزار کر دیا کروں۔ ان کی وفات کی اطلاع بھی میں نے ہی اینڈریوز صاحب کو دی۔ وہ ان کی موت سے اس طرح سے متاثر تھے گویا خود اُن کے والد کا انتقال ہو گیا ہو۔ مولوی صاحب اینڈریوز صاحب کو بیٹا کہکر پکارتے تھے جس سے اینڈریوز صاحب بیحد خوش ہوتے تھے۔

اینڈریوز صاحب نے ۱۹۱۲ء میں خیال کیا کہ وہ اپنے دوست مولوی ذکاءاللہ کے سوانح حیات لکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کی ابتدا بھی کر دی۔ مگر ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کی وجہ سے وہ چھپ نہ سکی۔ اس کتاب کی تیاری میں میں نے بھی مولوی صاحب پر ایک طویل مضمون لکھکر اینڈریوز صاحب کو دیا تھا جس سے خوش ہو کر انہوں نے مجھے "سوآن پین" عنایت فرمایا تھا

اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب کو "ماڈرن ریویو" میں بالاقساط شایع کرانا شروع کر دیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کا ترجمہ ماہ بماہ کسی اچھے رسالہ میں شایع کراؤں۔ چنانچہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں میں نے کانپور کے مشہور رسالہ "زمانہ" میں کتاب کو ماہ بماہ شایع کرایا۔ یہ سلسلہ بہت پسند کیا گیا اور اکثر احباب نے خواہش ظاہر کی کہ اسے کتابی صورت میں بھی شایع کیا جائے۔ اینڈریوز صاحب کی کتاب ۱۹۲۹ء میں شایع ہو گئی تھی لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں اس وقت اپنے ترجمہ کو کتابی صورت میں نہ لا سکا۔ بہرحال مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا

کہ میرا اُردو ترجمہ کتابی صورت میں میرے محترم استاد کی زندگی میں شایع نہ ہو سکا۔ مقامِ مسرت ہے کہ یہ کتاب اب اگست ۱۹۵۲ میں اتنے عرصہ کے بعد کتابی صورت میں پہلی مرتبہ شایع ہو رہی ہے۔

کالج کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ میرے ایک سرحدی ہم جماعت نے اینڈریوز صاحب کے خلاف بہت کچھ اول فول بکا اور دھمکی دی کہ "میں انہیں قتل کردونگا" پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جس پرچہ کو اینڈریوز صاحب نے جانچا تھا اس میں یہ حضرت فیل ہوگئے تھے اور ان کے غصہ کی اصل وجہ امتحان میں ناکامی تھی۔ جب اینڈریوز صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے میرے ذریعہ اسے بلوایا۔ چنانچہ میں اسے لیکر ان کے مکان میٹ لینڈ ہاؤس میں پہنچا۔ یہ لڑکا اپنی حرکت پر بیحد پشیمان تھا اور اسقدر گھبرایا ہوا تھا کہ مجھے اس کا ترجمان بننا پڑا تھا تاکہ اینڈریوز صاحب کی باتوں کو اُردو میں ترجمہ کرکے اس تک پہنچاؤں۔ بالآخر اس نے اظہارِ افسوس کیا اور اینڈریوز صاحب نے اسے کلیتہً معاف کردیا۔

اینڈریوز صاحب نے ایک دن ہماری جماعت کے سیاہ بورڈ پر لکھوا دیا کہ ——

Mr. Andrews will not take his classes to-day.

ایک لڑکے کو جو شرارت سوجھی تو اس نے "کلاسیز" کا ابتدائی حرف "سی" مٹادیا۔ دوسرے دن جب اینڈریوز جماعت میں آئے تو انہوں نے بورڈ پر یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی:

Mr. Andrews will not take his lasses to-day.

اینڈریوز صاحب نے لڑکوں سے کچھ نہیں کہا بلکہ مسکراتے ہوئے لفظ "لیسیز" میں سے ابتدائی حرف "ایل" کو مٹادیا، اور اب عبارت یہ رہ گئی:

Mr Andrews will not take his asses to-day.

جماعت کے سب لڑکوں نے اس لطیفہ سے بیحد لطف اٹھایا اور جس لڑکے نے اس "مذاق" کی ابتدا کی تھی، اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

اینڈریوز صاحب ایک دن شیکسپیئر پڑھا رہے تھے۔ اتفاق سے ایک جملہ ایسا آگیا جس کے مفہوم کے بارے میں انہیں شبہ تھا۔ انہوں نے جماعت سے کہا کہ میں اس کا مطلب کل بتاؤنگا اس لیئے کہ مجھے اس جملہ کے صحیح مفہوم کے بارے میں کچھ شک ہے۔ اور کوئی ہوتا تو

وہ اس قدر صفائی ہرگز نہ برتتا بلکہ اسے اپنی توہین خیال کرتا، مگر اینڈریوز صاحب نے نہایت انکساری سے وہ بات کہدی جسے صرف وہی کر سکتے تھے۔

ایک دن انہوں نے کالج میں تقریر کی کہ شادی شدہ زندگی مسیحی نقطۂ نظر سے پاکیزہ زندگی کہلانے کی مستحق نہیں ہے اور وہ مجرد زندگی سے بہت ادنیٰ ہے۔ چند دن بعد انہیں معلوم ہوا کہ ان کی اس تقریر کا یہ مطلب لیا گیا ہے کہ شادی شدہ زندگی سرے سے گناہ کی زندگی ہے۔ چنانچہ انہوں نے دوسری تقریر میں اس کی تردید کردی اور فرمایا: "پہلے میرا خیال ایسا ہی تھا مگر مزید غور کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شادی شدہ زندگی بھی تجرد کی زندگی کی طرح پاک ہے۔" اس ذرا سے واقعہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ اپنا بہت سا وقت غور و فکر میں صرف کرنے کے عادی تھے اور اگر کبھی غلط خیال کا اظہار کردیا کرتے تھے تو بہ عجلت ممکنہ ان کی تلافی بھی کردیا کرتے تھے۔

۱۹۰۸ء میں "بندے ماترم" کا بڑا زور تھا۔ ان دنوں کا قصہ ہے کہ دہلی کی بنگالی کلب نے اینڈریوز صاحب کو اپنے یہاں مدعو کیا۔ اینڈریوز صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ٹی پارٹی کے بعد کلب کے نوجوان بنگالیوں نے "بندے ماترم" اس والہانہ جوش سے گا کر سنایا کہ سب کے دل دہل گئے۔ دوسرے انگریزوں کی طرح اینڈریوز صاحب اس گیت سے چڑتے نہیں تھے بلکہ طلبا کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اس گیت کو قومی گیت کا درجہ حاصل تھا۔

اینڈریوز صاحب مجھ پر بہت مہربانی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے مجھے (The Sayings of Muhammad.) مرتبہ عبداللہ المامون سہروردی تحفۃً دی۔ اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں اور ۳۰ نومبر ۱۹۱۱ کی تاریخ درج ہے۔ اسی طرح انہوں نے ۱۹۳۲ میں "واٹ آئی اونو کرائسٹ" کا آخری مسودہ جس میں کچھ حصہ ٹائپ شدہ ہے اور باقی سارے کا سارا اُن کے دستِ خاص کا لکھا ہوا ہے، مجھے بمبئی میں عنایت فرمایا۔ میرے پاس محفوظ ہے اور میں اسے گنجِ گرانمایہ سمجھتا ہوں۔

ان کی آخری علالت سے چند سال قبل میرے دل میں خیال آیا کہ میں اردو میں ان کے سوانحِ حیات لکھوں لیکن بعض موانعات حائل ہوئے اور میرا یہ ارادہ تشنہ رہ گیا۔ دو سال قبل

جب میرے ہم کالج اور دوست مسٹر بنارسی داس چترویدی نے اپنی کتاب "سی۔ ایف۔ اینڈ ریوز" شایع کرائی تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے اُردو کا جامہ پہنا دوں۔ چنانچہ اس کے پبلشرز میسرز جارج ایلن نے بعد مسرت مجھے اس کی اجازت دی۔ جو ترجمہ اب شایع کیا جارہا ہے وہ اسی انگریزی کتاب کا ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ کتاب کے مصنفین (مسٹر بنارسی داس چترویدی اور مس مارجوری سائیکس) نے اس زندگی کے ساتھ بہت انصاف اور دیانتداری سے کام لیا ہے۔ یہ زندگی اس قابل ہے کہ اس کی تقلید کی جائے۔ سوشل سروس، انکساری اور بے غرضانہ قومی خدمت کا جو ریکارڈ (کارنامہ) انہوں نے پیش کیا ہے وہ نہایت قابلِ فخر ہے۔ ہمارے یہاں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے۔ جو معاشرتی اور تعلیمی میدانوں میں مشنریوں کے طریقوں پر کام کرے حالانکہ ہمارے رسولؐ مقبول کا ارشادگرامی یہ ہے: "افضل الاشغال خدمت النّاس" ــــ مگر اس کے باوجود ہم میں ایسے قومی اداروں کی افسوسناک کمی ہے جن کا مطمحِ نظر سوشل خدمت ہو۔ اگر میری اس کتاب کے مطالعہ سے قدرے قلیل مسلمانوں میں سوشل خدمت کا جذبہ اُبھر آئے تو میں سمجھونگا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اس شاندار زندگی میں جو قیام پاکستان سے بہت پہلے ختم ہوگئی، بہت سی دلچسپ اور سبق آموز باتیں پڑھنے والوں کو ملینگی۔ اسلئے میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام غور سے ان کے حالاتِ زندگی پڑھیں اس لئے کہ صرف اسی صورت میں وہ ان کی پاکیزہ زندگی سے متمتع ہو سکینگے۔

مسلم لیڈروں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ مثلاً مولانا محمد علی کے ساتھ اینڈریوز کے مراسم بہت صمیمانہ اور مخلصانہ تھے۔ جب بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد مولانا کی کتابیں اور خط میرے پاس آخری بار سنسر ہونے کے لئے آئے (اس زمانہ میں میں مدخولہ حکومتِ بمبئی تھا) تو اس وقت مجھے ان کے مجموعہ میں ایک خط ملا جو اینڈریوز صاحب کا تحریر کردہ تھا میں نے اسی وقت اس کی نقل لے لی تھی۔ وہ خط ایک لحاظ سے بیحد اہم ہے۔ اس لیئے کہ اس میں اینڈریوز صاحب نے بحث کی ہے کہ انہوں نے اپنے نیسنین عقیدہ[1] کی پیروی کیوں ترک

---

[1] اس عقیدہ کی رُو سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ نجات صرف مسیح کے ماننے والوں کے لئے ہے اور باقی دنیا کے لئے جہنم۔

کردی۔ چونکہ یہ خط بہت اہم ہے اور اب تک شایع نہیں ہوا اس لئے میں اس کے اقتباسات یہاں پیش کرتا ہوں تاکہ اس ذہنی کشمکش کا اندازہ ہو سکے جس کا ذکر جا بجا اس کتاب میں آپ کو ملے گا۔ وہو ہذا:—

بولپور۔ ۱۶ اپریل

مائی ڈیر محمد علی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس امر کا اندازہ لگائیں کہ زمانۂ حال میں کتنا اور بجیبل ریسرچ کا کام کیا گیا ہے اور عہد عتیق اب ہمارے لئے ایک بالکل مختلف کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ عہد جدید اس حد تک بالکل متاثر نہیں ہوئی، لیکن بہت سے اختلافات اور تضاد ایسے پائے گئے ہیں جنہوں نے ایک غور و فکر کرنے والے انسان کے لئے "لفظی الہام" کے پرانے نظریہ کو بالکل ناممکن بنا دیا ہے۔ بلاشبہ یونیورسٹیوں کے بہت ہی کم اشخاص ایسے ہیں جو آج اس قسم کے خیالات رکھتے ہوں۔

برخلاف اس کے یہ تحریک اب زوروں پر چل رہی ہے کہ "اتھارٹی" (سند) کے جملہ تخیل کو مسترد کر دیا جائے اور ہر مسئلہ کو انسانی دماغ کی تحقیق و تفتیش کے لئے کھلا رکھا جائے اور بے خوف ہو کر اس راستہ پر گامزن رہا جائے خواہ وہ کہیں لیجائے۔ میں نے خود بھی راستہ اختیار کیا ہے اور چونکہ میں ایمانداری کے ساتھ بعض عقائد (مثلاً اتھے نیسین عقیدہ) کو اپنی زبان سے دُہرا نہیں سکتا اس لئے میں نے کلیسائے انگلستان کے پادری کے فرائض منصبی کو عملی جامہ پہنانے سے انکار کر دیا ہے جس کی رُو سے ایسے عقیدہ کو دُہرانا لازمی ہے۔ بہت سے لوگ جو میری طرح خیالات رکھتے ہیں، ابھی تک اس عقیدہ کو رسماً دہرائے چلے جا رہے ہیں، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اینڈریوز صاحب جنگِ طرابلس میں اٹلی کے مظالم سے بیحد متاثر تھے۔ اسی طرح جنگِ بلقان میں وہ بلغاریوں اور ان کے حلیفوں کی زیادتیوں سے بیحد مغموم رہتے تھے اور اس کی وجہ یہی کردار ایسے عیسائیت پر بدنما داغ سے تعبیر کرتے تھے۔ ایک دن جب ایڈریانوپل بلقانیوں نے فتح کر لیا تو اینڈریوز صاحب از راہ نوازش میرے پاس تشریف لائے اور ترکوں کی شکست پر مجھ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے امید ہے کہ اب اس کے بعد یہ تباہ کن جنگ

ختم ہوجائیگی۔" اینڈریوز ترکوں کے شریفانہ طرزِ عمل کے بہت معترف تھے۔

اینڈریوز صاحب نے مسز اینی بیسنٹ اور بی۔ جی۔ ہارنیمین کی طرح ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا اور وہ ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ "مجھے اس خدمت نے وہ بنادیا جو میں ہوں۔"

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنم
منت شناس ازو کہ بہ خدمت گزاشتت

ان کا مطمحِ زندگی مظلوموں کی حمایت اور بے کسوں کی دستگیری تھا اور جہاں کہیں وہ دیکھتے کہ بنی نوعِ انسان پر ظلم ڈھایا جارہا ہے تو وہ مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر ہوجاتے ایسے مواقع پر ان کی عیسائیت بہت کام آتی اور انہی کی کوششوں کی بدولت وہ جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ میں یورپین باشندوں کی رائے عامہ کے دھارے کو مظلوم ہندوستانیوں کی حمایت میں موڑ سکے۔

میں ۱۹۰۸ اور ۱۹۴۷ کے مابین اینڈریوز صاحب کے متعدد مضامین کا ترجمہ اردو جرائد میں شایع کراچکا ہوں۔ ۱۹۳۴ میں میں نے بمبئی سے ان کی کتاب "خیالاتِ مہاتما گاندھی" کا اُردو ترجمہ دو جلدوں میں شایع کیا تھا، اور اب ان کی کتاب "مولوی ذکاء اللہ دہلوی" شایع کررہا ہوں۔ اسی طرح ان کے ایک طویل مضمون کا جو رابندرانا تھ ٹیگور اور بنگال کی نشاۃِ ثانیہ سے متعلق ہے، میں نے انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ "اُردو" کے لئے ترجمہ کیا۔ جو اسکی اپریل ۱۹۴۷ کی اشاعت میں امتیازی جگہ پر شایع ہوا۔

یہ سب مضامین وہ ہیں جو وقتی اہمیت کے حامل نہ تھے بلکہ مستقل افادیت کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔

میں نے اپنے ہم محلہ اور ہم کالج اور بچپن کے دوست ہز ایکسیلنسی سید آصف علی کا مکتوبِ گرامی بھی اس کتاب میں درج کردیا ہے اس لئے کہ اس میں بعض ایسی باتیں لکھی گئی ہیں جو کتاب کے متن میں نہیں ملتیں ہیں۔ اس مکتوب کے لئے ہز ایکسیلنسی کا بیحد شکرگزار ہوں۔ اس مکتوب نے یقیناً کتاب کی افادیت میں اضافہ کردیا ہے۔

آخر میں میں میسرز جارج ایلن اینڈ ان ون کا بھی شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میری تاخیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اسی طرح میں ڈاکٹر سید سجاد ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (سابق چیئرمین، شعبۂ اردو، جامعۂ عثمانیہ) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کتاب کے ترجمہ میں بعض نازک مقامات کے حل کرنے میں میری امداد فرمائی۔

مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ جہاں کہیں اچھائی دیکھیں اسے اپنالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کتاب کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھیں گے۔

۳۰ جون ۱۹۵۲　　　ضیاء الدین احمد برنی

ہز ایکسیلنسی سید ایم آصف علی، گورنر اڑیسہ[1] کا مکتوب مترجم کے نام

گورنمنٹ ہاؤس، کیمپ پوری   ۹، اپریل ۱۹۵۲

مائی ڈیر ضیاء الدین۔ ..... ہاں میں نے اینڈریوز کی حیات مرتبہ چترویدی کو جستہ جستہ دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ میں ان کی سینٹ اسٹیفنز کالج کی زندگی کے متعلق چند سطور لکھ دوں۔ وہ ۱۹۰۶ سے ۱۹۰۹ تک جبکہ وہ کالج چھوڑ کر چلے گئے، سینٹ اسٹیفنز کالج کے سربرآوردہ شخص تھے۔ ہبرٹ ویسٹ کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہونے والے تھے لیکن وہ پیچھے ہٹ گئے تاکہ رُدرا کے لئے جگہ خالی کردیں۔ وہ کالج کے طلبا کے لئے جواب مضمون لکھنے کی غرض سے عنوانات مقرر کرتے اور پھر خود ہی ان کی اصلاح کرتے۔ وہ انگریزی میں اعلیٰ درجہ کی جماعتوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ وہ جان سن کی فضول عبارت آرائی کو یا ایسے طرز کو پسند نہیں کرتے تھے جس میں تصنع ہو یا الفاظ پرستی سے کام لیا گیا ہو بلکہ وہ سلیس اور سادہ طرزِ تحریر پر زور دیا کرتے تھے۔ وہ نام و نمود کے سخت خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ جذبات اور اظہارِ جذبات میں خلوص ہو۔ وہ کیرکٹر (سیرت) پر زور دیا کرتے تھے اور صحت مندانہ فہم و فراست کو پسند کرتے تھے۔ وہ خالی خولی معلومات کے مجموعہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے لیکچر یوں تو پُر مغز ہوتے تھے مگر جب وہ "دیانتداری بہترین پالیسی ہے" جیسی کہاوت پر تقریر کرتے اور اس کا تجزیہ کرکے دکھاتے تو اس میں مزید زور پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ اسے مبتذل نصیحت سے تعبیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "نیکی اپنا انعام آپ ہے" جیسی کہاوت کو اس کی جگہ لے لینی چاہئے۔ ان کا ایک ہفتہ وار لیکچر جس کی یاد میرے دماغ میں محفوظ رہ گئی ہے اور جس کا میں بار بار حوالہ دیا کرتا ہوں، "تاریخ کی روانی اور تناسب" سے تعلق رکھتا تھا۔ ان کی نظر میں تہذیب جوار بھاٹے

---

[1] آج کل یہ بھارت کی طرف سے سوئٹزرلینڈ میں سفیر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

کی رقصاں حرکت کی پیروی کرتی ہے۔ جوار بھاٹے کا مد ایک نقطہ پر پہنچکر پھر سمندر کے عمق میں جا پڑتا ہے تاکہ وہ اس نقطہ سے آگے بڑھنے کے لئے مزید طاقت حاصل کرے اور پھر پیچھے کو ہٹ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ مد بعید ترین نقطہ پر نہ پہنچ جائے اور پھر بڑھنے والا مد اسی بپنی ہوئی رفتار سے پیچھے ہٹ جاتا ہے تاکہ پھر آگے والے نقطہ تک پہنچنے کی سعی کرے۔ تاریخ بھی اسی روانی کی شاہد ہے۔

وہ اعلیٰ درجہ کے کھلاڑی تھے اور اچھے اسٹائل کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنے کے عادی تھے مگر کھیل کے میدان میں وہ صرف بائیں ہاتھ سے کھیلتے تھے۔ لیکن وہ سیدھے اور اُلٹے ہاتھ سے صاف اور اعلیٰ درجہ کی تحریر لکھ سکتے تھے۔

میرے دل و دماغ میں ان کی قابلِ تقلید سیرت کی اور ان کی دلوں کو موہ لینے والی ذاتی محبت کی امٹ یاد محفوظ ہے۔ ہمیں (جو اُن کے شاگرد ہیں) ٹیچر کی حیثیت سے ان کی انتہائی قابلیت اور رسوخ کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک پروفیسر بھی جو اُن کی جگہ پر فائز ہوا (اگرچہ وہ سب اپنی جگہ پر امتیازی شان کے مالک تھے) ہمیں مطمئن نہ کرسکا۔ ایک لحاظ سے گاندھی جی کو چھوڑ کر وہ بلاشبہ سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ سے مشابہت رکھتے تھے۔

یہ ہے جو میں مختصراً چارلی اینڈریوز کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ بہترین دعاؤں کے ساتھ۔

مخلص

ایم۔ آصف علی

(الف) سی۔ایف۔ اینڈریوز کی تصانیف

١۔ سرمایہ اور محنت کی نزاع سے عیسائیت کا تعلق (١٨٩٦)
٢۔ شمالی ہندوستان (١٩٠٨)
٣۔ ہندوستان کی نشاۃِ ثانیہ (١٩١٢)
٤۔ مادرِ وطن (نظمیں) (١٩١٦)
٥۔ حضرت عیسیٰ اور محنت (١٩٢٣)
٦۔ ہندوستان میں افیون کی لعنت (١٩٢٦)
٧۔ ذکاء اللہ دہلوی (١٩٢٩)
٨۔ ہندوستان اور سائیمن رپورٹ (١٩٣٠)
٩۔ مجھ پر حضرت عیسیٰ کا کیا احسان ہے (١٩٣٢)
١٠۔ حضرت عیسیٰ عالم خاموشی میں (١٩٣٣)
١١۔ سادھو سندر سنگھ (١٩٣٤)
١٢۔ ہندوستانی زلزلہ (١٩٣٤)
١٣۔ ہندوستان اور برطانیہ ــــ ایک اخلاقی چیلنج (١٩٣٥)
١٤۔ جان وہائٹ آف میشونا لینڈ (١٩٣٥)
١٥۔ شمال مغربی سرحد کا چیلنج (١٩٣٧)
١٦۔ ہندوستان اور بحرالکاہل (١٩٣٧)
١٧۔ حضرت عیسیٰ اور دعا (١٩٣٧)
١٨۔ حضرت عیسیٰ اور انسانی ضرورت (١٩٣٧)
١٩۔ حقیقی ہندوستان (١٩٣٩)
٢٠۔ اندرونی زندگی (١٩٣٩)
٢١۔ سندھیا کی دعائیں (١٩٤٠)

۲۲۔ اچھا گنڈریا (۱۹۴۰)
۲۳۔ پہاڑی کا وعظ (۱۹۴۲)
۲۴۔ کانگریس کی ابتدا اور ترقی (۱۹۳۸)
۲۵۔ مذہب دورِ انقلاب میں (۱۹۳۷)

(ب) سی۔ایف۔اینڈریوز کی ایڈٹ کردہ کتابیں:

۱۔ خدا کی موجودگی (۱۹۰۴)
۲۔ خطوط ایک دوست کے نام (۱۹۲۸)
۳۔ خیالاتِ ٹیگور (۱۹۲۸)
۴۔ خیالاتِ مہاتما گاندھی (۱۹۲۹)
۵۔ مہاتما گاندھی — ان کی اپنی کہانی (۱۹۳۰)
۶۔ مہاتما گاندھی کام میں (۱۹۳۱)

(ج) پمفلٹ اور تقریروں اور مضمونوں کے مجموعے:

۱۔ ہندوستانی مشرقی افریقہ میں
۲۔ عدم تعاون
۳۔ عدم تعاون کا مفہوم
۴۔ طلبا کے نام
۵۔ مکمل آزادی — فوری ضرورت
۶۔ ہندوستان کی مکمل آزادی کی تائید
۷۔ غربا پر ظلم
۸۔ ہندوستانی مسئلہ
۹۔ وشوا بھارتی
۱۰۔ زنجبار کی نازک حالت
۱۱۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور بنگال کی نشاۃِ ثانیہ وغیرہ، وغیرہ

فہرست مضامین

فہرست تصاویر

پہلا ایڈیشن	...	ایک ہزار
کاتب	...	عبدالحمید دہلوی
پریس	...	مشہور آفسیٹ پریس کراچی
پرنٹر	...	ضیاءالدین احمد برنی، تعلیمی مرکز:
پبلشر	...	۵۰۱۔ گیدومل لیکھراج روڈ، کراچی ۱

قیمت چار روپے گیارہ آنے

سی - ایف - اینڈریوز

باب ۱

ابتدائی سال

(۱۸۷۱ سے ۱۸۸۵ تک)

(۱)

ابتدائے موسم بہار کی ایک سرد صبح کو ایک ۳۵ سالہ قوی الجثہ نوجوان جس کے بال کالے تھے اور داڑھی بھی سیاہ تھی، "نیوکیسل آن ٹائین" کی سنسان گلیوں میں سے ہوتا ہوا ویسٹ گیٹ کے ایک تنگ و تاریک دفتر میں پہنچا اور اپنے دوسرے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی:

بارہ فروری ۱۸۷۱
۱۴ برونیل ٹیریس
چارلس فریئر
باپ: جان ایڈون اینڈریوز
ماں: میری چارلوٹ اینڈریوز

باپ یہ اطلاع دینے کے بعد ہی اسکاٹس ووڈ روڈ کی ایک بالائی ڈھلواں گلی کے نکڑ کے چھوٹے سے گھر میں واپس آگیا۔ آتے ہی اس نے اپنی بیوی کی خیریت دریافت کی اور پھر محبت بھری نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھا۔ چارلی کو ماں سے بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں ورثہ میں ملی تھیں۔ دوسرا نام فریئر بھی انہیں اپنی ماں سے ورثہ میں

ملا تھا۔ یہ نام ماں کے نانا ولیم لی کرافٹ فریئر سے ملا تھا جو اسٹوربرج کے مغربی علاقہ میں ایک زمیندار تھا اور جسے اس کی اولاد نے فخریہ طور پر اپنے ناموں کا جزو بنا لیا تھا۔ پیدائش سے کئی سال بعد ماں کو یاد آیا کہ جب اس کا دوسرا بیٹا یعنی چارلس پیدا ہوا تھا تو اس کا سر جھلی میں لپٹا ہوا تھا اور قدیم عقیدہ کے مطابق یہ غیر معمولی واقعہ کسی خاص امتیاز کا حامل ہوتا ہے[۵]۔

کچھ عرصہ بعد تک بھی اس عقیدہ سے متعلق سنہری خواب دیکھنے کی کسی کو فرصت نہ تھی حتیٰ کہ کنبہ کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا گیا اور میری اینڈریوز اپنے بچوں کی غور و پرداخت میں مصروف ہو گئی۔ میری کی دو سوتیلی بیٹیاں بھی تھیں جن میں سے ایک کی عمر چھ سال کی تھی اور دوسری کی چار سال کی۔ ان کے علاوہ بڑی بیٹی تھی جو دوسرے بیٹے چارلس کی پیدائش کے وقت تیرہ مہینے کی تھی۔ ۱۸۷۷ میں برمنگھم منتقل ہونے سے پہلے ماں پر تین بچوں کی نگہداشت کا بار اور آ پڑا تھا۔ وہ دن بھر مصروف رہتی، لیکن کبھی چیں بہ جبیں نہ ہوتی۔ ہر شام کو جب بچے ماں کے پاس عبادت کے لئے دو زانو ہوتے تو انہیں اس کے مسکراتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے حد مسرت محسوس ہوتی۔ وہی ان کی ساری کائنات کا مرکز تھی۔ مئی کے مہینہ میں ماں کے جنم دن کے موقع پر بچے صبح سویرے دروازے کے باہر گیت گاتے اور اس خوشگوار دن کو تہوار کی طرح مناتے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام تک جب کبھی چارلی اپنے بچپن کے کرسمس کا تصور کرتے تو انہیں وہ تمام کہانیاں یاد آجاتیں جو ایسے مواقع پر ان کی ماں انہیں سنایا کرتی تھی۔ جب کبھی وہ اسکاٹستانی گیت گاتی (کیونکہ کلین میک کلم سے خاندانی تعلق تھا) تو چارلی رومان کی وادیوں میں گم ہو جاتے۔ چارلی چار سال کے تھے کہ ان کی والدہ بیمار پڑ گئی۔ چارلی کو اپنی ماں کے کمرے میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب ڈاکٹر آیا تو اس نے دیکھا کہ چارلی اپنی

---

۵ روایتی عقائد کے مطابق اسے مبارک خیال کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ "ایسا شخص کبھی ڈوب کر نہیں مرے گا۔"

ماں کے کمرے کے باہر سیڑھیوں پہ بیٹھے چپکے چپکے رو رہے ہیں۔ خوف و ہراس اور رنج کا یہ پہلا تجربہ تھا جس کی یاد چارلی کے دل میں ہمیشہ باقی رہی۔

۷۷۔۱۸۷۶ کے موسم سرما میں چارلی پر یکایک گٹھیا کے بخار کا شدید حملہ ہوا۔ یہ صرف ان کی ماں کی مشفقانہ تیمارداری تھی جو کئی ہفتوں کی محنت شاقہ کے بعد بچہ کی جان بچانے میں کامیاب ہو سکی۔ اس طویل بیماری نے نحیف و نزار چارلی کی طبیعت میں ضرورت سے زیادہ سنجیدگی پیدا کردی اور ان کے اور ان کی ماں کے باہمی رشتہ کو اور زیادہ استوار کر دیا۔ اُن کی اس گہری قربت کا اثر چارلی کی سیرت اور نظریۂ حیات پر پڑا۔ برسوں بعد جب انہیں اپنی ماں کے انتقال کی اطلاع ملی اس وقت اُنہوں نے الفاظ کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ اُن کی کا اثر ان کے لئے کیا مفہوم رکھتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اسی اثر کی بنا پر ان میں نسائی اور ایک حد تک مظاہراتی حساسی پیدا ہو گئی ہے جس کے پیش نظر سالہائے مابعد میں ان کے دوست طنزاً یا تعریفاً کہا کرتے تھے کہ "چارلی نصف عورت ہیں۔" انہوں نے لکھا ہے کہ "اُس تبدیل نہ ہونے والے مادرانہ اثر ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مجھ میں ماں کا جو جز ہو ہے وہ اس قدر قوی ہو گیا ہے۔ میری زندگی پھول کی طرح اُس وقت شگفتہ ہوتی ہے جب میں دوسروں پر اپنی محبت نچھاور کرتا ہوں بعینہٖ جس طرح میری ماں مجھ پر اپنی محبت نچھاور کرتی تھی۔"[۱]

(۲)

اس بیماری کے بعد جلد ہی یہ کنبہ نیوکیسل سے برنگھم منتقل ہو گیا جو گنجان اور کثیف آبادی کا ایک خوشحال اور ممتاز شہر تھا، وہی برنگھم جو آزاد تجارت کے سنہری دور میں جوزیف چیمبرلین کا شہر تھا، جہاں تمام دنیا کے لئے "تجارتی اشیا" بنتی تھیں اور جو مخصوص نوعیت کی ذہنی سرگرمیوں کا مشہور مرکز بھی تھا۔

اینڈریوز کا خاندان ابتدا میں "کی ہل ڈرائیو" پر رہا کرتا تھا جو "کی ہل" کی ڈھلوان سڑک سے ذرا آگے ایک سنسان سی بند گلی تھی۔ یہ چھوٹی سی سڑک پہاڑی کے برابر برابر

---

[۱] مکتوب بنام رابندرناتھ ٹیگور، ۲۷ جنوری ۱۹۱۴

چلی گئی ہے جہاں سے مکانوں سے نیچے کے علاقہ کے درخت اور "پرانے قبرستان" کی ہری گھاس صاف دکھائی دیتی ہے۔ پہاڑی کے دامن کے برابر اور "ڈرائیو" کے متوازی اِکنیلڈ اسٹریٹ کی قدیم رومی شاہراہ ہے جو پرانے قبرستان کے زیریں حصہ کا کام دیتی ہے۔ آج بھی ستر سال گزر جانے کے بعد اُن قدیم ایام کا کچھ دھندلا سا عکس نظر آتا ہے جب "ڈرائیو" صحیح معنوں میں "ڈرائیو" تھی اور صنعتی شہر بننے سے پہلے سبزہ زاروں میں سے ہوتی ہوئی کسی نہ کسی دیہاتی مکان تک جا پہنچتی تھی۔ چارلی کے بچپن میں "ڈرائیو" کے انتہائی سرے پر جو "لاج گیٹس" تھے وہ اب بھی بدستور موجود تھے اور انہیں بند کیا جا سکتا تھا تاکہ ان بھاری ٹھیلوں کو جنہیں گھوڑے کھینچتے تھے اور جو دن رات پہاڑی پر آتے جاتے رہتے تھے، آگے بڑھنے سے روکا جا سکے۔

یہاں برمنگھم میں بیرونی دنیا نے اینڈریوز کے بچوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ برٹی اور چارلی روزانہ "کی ہل" کے نیچے سے اِکنیلڈ اسٹریٹ میں داخل ہوتے اور کونے کی مٹھائی کی دکان کی پاس والی اونچی عمودی سیڑھیوں سے گزر کر مس ہیپ کینٹر کے ابتدائی اسکول میں چلے جاتے۔ ایڈتھ ۵ سال کی تھی اور وہ بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ اسکول جایا کرتی تھی۔ ایک دن چارلی اپنی ایک ہم عمر لڑکی سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے کیونکہ اس نے کہا تھا ــــ اور غالباً صحیح کہا تھا ــ کہ "ان کی چھوٹی بہن سینا پرونا نہیں جانتی!"

اسکول کے نئے تجربوں میں دو ایسے تجربوں کا اضافہ ہوا جن کا مرکز "کیتھولک اپاسٹولک چرچ" تھا جس سے یہ خاندان وابستہ تھا اور جو نپولین جنگ آزمائیوں کے بعد کی بے اعتمادی کے پُر آشوب دور میں معرضِ ظہور میں آیا تھا۔ سنجیدہ اشخاص نے "اقوام کی اس تباہی" کے ایام میں قربِ قیامت کے قرائن کو پورا ہوتے دیکھا تھا جن کے متعلق بائیبل میں پیشین گوئیاں درج ہیں۔ دقیانوسی خیالات رکھنے والے ان نئے خیالات کے حامیوں سے گریز کرتے تھے، تاہم وہ عبادت اور روزہ کے وقت آپس میں ملتے اور بڑی بے چینی اور شوق کے ساتھ آسمان سے مسیح کی معجزانہ آمد کا انتظار کرتے جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ اب دور نہیں ہے۔ چارلی کے دادا جان اینڈریوز بھی انہی میں سے ایک

تھے۔ جرأت رندانہ اور اکھڑ قسم کی آزادی رائے کے ساتھ ساتھ جو اُن کے آباد اجداد کا طرۂ امتیاز تھی، انہوں نے معلّمی کے عہدہ کو اس بنا پر ترک کر دیا تھا کہ ان کا ضمیر اس کے خلاف تھا اور اس کے بعد انہوں نے اپنی نوجوان بیوی کے ساتھ نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ان کے صاحبزادے جان ایڈورن اسی روحانی کشمکش کے دور میں ۵۳۸۱ میں پیدا ہوئے۔ باپ کی سی پرجوش ذاتی عقیدت مندی اور وفاداری کی جھلک بیٹے میں بھی نمایاں تھی جس نے اپنے آپ کو انجیل کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیا تھا اور "اپنی تمام طویل عمر ایک مسلسل روحانی جد و جہد میں گزار دی تھی۔"

اس طرح چارلی کا سارا بچپن گہری مذہبی رفاقت اور روحانی امنگ کے ماحول میں بسر ہوا۔ مسیحیوں کی اندرونی تنظیم اور برمنگھم کے خوبصورت گرجا میں اُن کی مقررہ عبادتوں کے اوقات عہدِ عتیق کی ہیکل (عبادت گاہ) کی تفصیلی اور اشاراتی تعبیر پر مبنی تھے جن کا چار، سات اور بارہ جیسے ہندسوں کے معانی سے تعلق ہے اور جن کا ذکر بائیبل میں بھی جا بجا آیا ہے۔ لڑکے کا جمالیاتی ذوق عبادت کی عظمت سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔ قربان گاہ کی دونوں بتیاں اور ساتوں لیمپ جو اس کے سامنے آویزاں رہتے تھے، اور عظیم الشان ناف کلیسا اور اُونچی تاریک چھت اس کے جذبۂ خوف و تحیر کی نشوونما کرتی رہتی تھی۔ اس زمانہ میں بھی جب وہ بہت چھوٹے تھے اور اپنی ماں کے پاس بیٹھے رہتے تھے، یوحنا کی انجیل کے "الوداعی" ابواب جو ہر سال خیراتی جمعرات کے دن پڑھے جاتے تھے، ان کے دل پر ایک گہرا اور انمٹ اثر ڈالتے تھے۔ لیکن اُن ابواب کی زبان کی خوبصورتی سمجھنے کی بجائے زیادہ تر محسوس کرنے کی چیز تھی اور وہ غیر معمولی طور پر ایک "اچھے" یا قبل از وقت نشوونما یافتہ بچے کی طرح "متقی" نہیں تھے۔ ایک مرتبہ بظاہر تھکا دینے والی طویل نماز کے بعد انہوں نے کہا: "خدایا، جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو پھر کبھی گرجا نہ جاؤں گا۔"

اتوار کے اتوار جب نمازی باری باری سے اصطباغ کی رسم ادا کرنے کے لئے قربان گاہ کی طرف جاتے اس وقت گرجا کے بڑے مجمع پر پُرہیبت سکوت طاری ہو جاتا، جو اس وقت ٹوٹتا جب کوئی شخص تنبیہ کے طور پر کوئی الہامی کلمہ منہ سے نکالتا یا کوئی عورت مذہبی

جوش کی حالت میں چلا اٹھتی۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ شور و غل پھر اسی سکوت میں تبدیل ہو جاتا۔ واعظین بعض اوقات اس وقت کا ذکر کرتے جب صور کی آواز سنتے ہی مردے اپنی اپنی قبروں سے آن کی آن میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور جب وہ لوگ جن کی "نجات" مسلّمہ ہے، آسمان پر پروردگار سے ملاقی ہوں گے۔ اس وقت واعظین اور عامۃ الناس کے چہرے فرطِ مسرت سے تمتما اٹھتے۔ چارلی کے جسم میں تھرتھری پیدا ہو جاتی۔ اُن میں وہ قوت موجود تھی جو بالعموم بچوں میں ہوا کرتی ہے، یعنی وہ ذہنی تصورات کو ظاہری اشکال میں دیکھتے، یہاں تک کہ وہ واقعۃً انہیں حقیقی معلوم ہونے لگتیں —— یہ قوت ان میں مابعد کی زندگی میں بھی رہی۔ یہ تخیلی خطبے بڑا زبردست اثر رکھتے تھے۔ ان کی ماں کا ہاتھ اور تبسّم وقتی طور پر ان میں یقین اور اعتماد پیدا کر دیتا تھا، مگر جاڑے کی تاریک راتوں میں جب وہ گرجا سے موسیقی کی مشق کے بعد جلدی جلدی گھر پہنچنے کے لئے ایکنلڈ اسٹریٹ میں مڑتے اور قبرستان کے برابر ہو کر گزرتے تو اس وقت واعظ کی شبیہیں ان میں خوف و دہشت کا جذبہ پیدا کر دیتیں۔ ان کی دائیں جانب قبروں کی لوحیں خفیف سی جھلملاہٹ پیدا کرتیں، اور وہ سوچنے لگتے کہ اگر ان قبروں میں سے اسی وقت مردے نکل آئیں تو پھر کیا ہوگا! وہ "کی ہل" تک ہانپتے کانپتے جاتے —— بھوتوں کی لوحیں ان کی سیدھی جانب ہوتیں —— اور پھر لانج گیٹوں میں سے ہو کر گھر کی تسکین دینے والی آگ کی روشنی اور رفاقت کے ماحول میں داخل ہو جاتے۔ لیکن وہ اپنا یہ راز کسی سے نہ کہتے —— حتیٰ کہ اپنی ماں سے بھی نہیں۔ وہ اپنے خوف اور اس کے متعلقہ خیالات کے تقدس کی وجہ سے بہت سے دوسرے بچوں کی طرح راز کی باتوں کا بالکل چرچا نہ کرتے۔

(۳)

رفتہ رفتہ خاندان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ "کی ہل ڈرائیو" کا خاموش مکان ان کی رہائش کے لئے کافی نہ ہو سکا اور نہ ہی مس ہپ کینز کا چھوٹا سا اسکول ان کی تعلیم کے لئے۔ لہذا ۱۸۷۹ میں گھر کے لوگ ہینڈز ورتھ کے قریب ساؤتھ روڈ کے مکان نمبرا

میں اُٹھ کر چلے گئے جو اُن دنوں کھیتوں اور کھلے دیہی علاقہ سے بالکل قریب تھا۔ لڑکے مسٹر ڈیکن کے پریپریٹری اسکول میں پڑھنے کے لئے جاتے، لیکن باپ ہی اپنے بیٹوں کا سب سے بڑا استاد تھا، ان کا دل و دماغ چاق و چوبند تھا، گہرے مذہبی معتقدات کے ساتھ ساتھ ان میں روح کی اضطراری لچک بھی موجود تھی، ان میں دنیا کی چیزوں کو حیرت و مسرت سے دیکھنے کی قوت بھی تھی اور انہی باتوں کی وجہ سے وہ اپنے تئیں نوجوان سمجھتے تھے اور اسی لئے وہ اپنے بچوں کے بہترین رفیق بن گئے تھے نیو کیسل میں جب وہ چھوٹے تھے وہ انہیں لے جاتے تاکہ وہ اپنا دن سمندر کے قریب گزاریں اور اب جب کہ بچے بڑے ہو گئے تھے وہ انہیں برمنگھم کی دھوئیں سے اٹی ہوئی فضا سے نکال کر سٹن پارک میں لے جاتے اور وہاں سارا سارا دن گزار دیتے، وہ انہیں چلنا، تیرنا اور کرکٹ کھیلنا سکھاتے، ورچارلی میں حسن کے پُرشوق جذبہ کو اُبھارتے۔ ان میں شاعر کی حساس روح پوشیدہ تھی اور وہ اِس نوع کے اشعار لکھنے پر قادر تھے:

"زمین کی نہ ختم ہونے والی موسیقی موجود ہے،
نرم اور عمیق، اُن لوگوں کے لئے جو سننے کے لئے کان رکھتے ہیں،
خاموش پہاڑوں، جنگلوں اور سَن سَن کرنے والے درختوں میں، اور
آسمان میں آدھی رات کے وقت جبکہ تارے آواز پیدا کئے بغیر جملہ اجرامِ سماوی کا نغمہ گاتے ہیں"

اپنی بیماری کے بعد کئی سال تک چارلی سخت قسم کی جسمانی ورزش نہیں کر سکتے تھے اور اسی لئے ان کا قوی تخیل کتابوں سے اپنی خوشگوار غذا حاصل کرتا رہا۔ اپنے باپ کی الماری کے بالائی خانے میں انہیں سر والٹر اسکاٹ کے ناولوں کا مکمل سیٹ مل گیا، جو اگرچہ خراب کاغذ پر بھدے طریقہ سے چھپا ہوا تھا، تاہم ان کی نظروں میں "وہ دولت کا سنہری ذخیرہ تھا جو نہ گھٹ سکتا تھا اور نہ ختم ہی ہو سکتا تھا"۔ سٹن کے

جنگلات میں جو دن بسر ہوئے وہ شاندار تخیل سے بھرپور تھے، جو یا تو شیروڈ کے جنگلوں میں "آئیون ہو" کے ساتھ بسر ہوتے تھے یا پھر "راب رائے" اور "تمار مینٹن" کی معیت میں طلسماتی اسکاٹ لینڈ میں جس کے بارے میں ان کی والدہ گیت سنایا کرتی تھی۔ ان کے علاوہ اور بھی یادگار دن تھے، مثلاً وہ دن جو لینڈوڈ نو "(llandudno) میں بسر ہوتے تھے جب کہ سمندر کی موسیقی انہیں مسحور کر دیتی تھی، اور نارتھمبرلینڈ کے ساحل کی لہروں کی دھندلی یادان کے دماغ میں تازہ ہو جاتی تھی۔ اُن یادگار دنوں میں وہ چھٹیاں بھی شامل تھیں جو وہ اپنی خالہ مسز لیوکس کے ساتھ اپنے "سیکس فارم" میں اپنے چچازاد بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ لیکن سٹن اور اس کے بے ترتیب سنسان جنگلوں کا تخیل سب سے پہلے ان کے دل میں آتا تھا۔

جب چارلی میں طاقت آگئی وہ اپنے والد کے ساتھ باہر جاتے، کبھی کھیتوں میں اور کبھی شہر میں، اور ان کے والد دنیا کے ہر موضوع پر ان سے اس طرح بات چیت کرتے گویا وہ کسی برابر والے سے باتیں کر رہے ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ تاریخ، سیاسیات اور مذہب کے متعلق۔ وہ اُن کے سامنے صدیوں پیشتر کی انگریزی زندگی کی منظر کشی کرتے اور بتاتے کہ ایک زمانہ میں رومیوں کی فوجیں اِکنیلڈ اسٹریٹ میں سے ہو کر گزرا کرتی تھیں — وہی اسٹریٹ جس پر وہ اتنی مرتبہ چل چکے ہیں۔ پھر وہ قریب کے زمانۂ ماضی کی طرف لوٹتے اور انہیں انگریزوں کی بہادری کے واقعات سناتے اور اس طرح اینڈریوز دل ہی دل میں یہ سمجھنے لگے تھے کہ روئے زمین پر برطانوی سلطنت ہی شریف ترین چیز ہے۔ انہوں نے چارلی کو کہانیوں کی مشہور کتاب "ڈیڈز دیٹ وَن دی ایمپائر" پڑھنے کے لئے دی جس میں چین اور برطانیہ کی اَفیون لڑائیوں کا حال پُرعظمت الفاظ میں دیا گیا ہے جو افیون کے سلسلہ میں لڑی گئی تھیں۔ انہوں نے ہندوستانی "غدر" کی کپکپی پیدا کرنے والی داستانیں بھی سنائیں، اور ہیولاک، آؤٹرم اور لارنس کے کارناموں سے بھی آگاہ کیا۔ ان باتوں نے لڑکے کی قوتِ متخیلہ کو تیز تر کر دیا۔

ایک مرتبہ انہوں نے گھر واپس آکر نہایت شوق کے لہجہ میں ماں سے کہا: "اماں!

میں ہر روز رات کے کھانے کے ساتھ تھوڑے سے چاول کھانا چاہتا ہوں۔ مہربانی کرکے تیار کر دیا کیجئے۔ بات یہ ہے کہ بڑا ہو کر میں ہندوستان جاؤں گا اور ابا کہتے ہیں کہ وہاں ہر شخص چاول کھاتا ہے۔ لہذا جانے سے پہلے میں اس کی عادت ڈالنا چاہتا ہوں۔"

ان کی ماں ہنستی اور کہتی: "تم تو جھل لڑکے ہو۔" لیکن ماں کی آواز میں بڑا درد ہوتا اور چارلی یہ درد بھری آواز سنتے تھے۔

"کیتھولک اپاسٹولک چرچ" "سیاسی خیالات کے اعتبار سے کٹر قسم کا قدامت پسند کلیسا تھا۔ "تمام طاقت اوپر سے، خدا کی طرف سے آتی ہے۔" مسٹر اینڈریوز بجد کی سے اس کی تشریح یوں کرتے: "یہ کہنا کہ طاقت عوام سے آتی ہے، محض کلمۂ کفر ہے۔" وہ شہر کی سیاسیات میں جانے پہچانے شخص تھے، اور برمنگھم کی "پارلیمنٹری ڈی بیٹنگ سوسائٹی" کے بانیوں میں سے تھے جس نے انہیں اپنے پہلے اسپیکر کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔

"مسٹر اسپیکر" کی حیثیت سے وہ ایک "بے قابو بچہ" کی طرح تھے اور کرسی صدارت سے بھی قدامت پسند تقریروں کی تالیاں بجا کر تعریف کرنے پر اصرار کرتے تھے۔ لیکن "سالسبری کے ممبر" کی حیثیت سے وہ بڑی چابک دستی اور مہارت سے اپنے دلائل ثبوت کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے جس سے ان کی قابلیت اور مکمل واقفیت کی شہادت ملتی تھی، اور وہ ان دلائل کو کسی پیدائشی لڑنے والے کے جوش کے ساتھ پیش کیا کرتے تھے۔ سوسائٹی کی طرف سے شائع شدہ ایک دلچسپ پمفلٹ میں ان کے ہمعصر نے یوں تبصرہ کیا تھا: "یہ شخص اپنے عقائد پر کامل یقین رکھتا ہے اور یہ ایسا انسان ہے جو خندہ پیشانی سے دوسروں پر چوٹیں کرتا ہے اور دوسروں کی چوٹوں کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت بھی کرتا ہے اور ہر حالت میں مسکراتا ہوا باہر نکلتا ہے۔" چارلی بارہ برس کے ہوں گے کہ جان برائٹ اور جوزیف چیمبرلین نے ان کے گھر کے قریبی میدان میں لبرل پارٹی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریریں کیں جس میں ان کے

والد بھی شریک تھے اور اپنی اختلافی رائے کو جو صرف ایک کی جارحانہ اقلیت میں تھی تحریر کرایا تھا!

(۴)

۱۸۸۰ کے آخر میں چارلی کی عمر کے دسویں سال میں دونوں بھائی قدیم اور مشہور "کنگ ایڈورڈ ششم ہائی اسکول" میں داخلہ کے امتحان میں بیٹھے۔ چونکہ انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ نمبر حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کریں اس لئے دونوں لڑکوں نے بڑی تن دہی سے یونانی پرچہ حل کیا۔ اگرچہ ان کے والد نے کلاسکس (ادبیات عالیہ) کا مذاق اپنے بچوں میں پیدا کر دیا تھا تاہم اس کے باوجود ان کے الفاظ کا ذخیرہ محدود تھا خواہ ان پانچ نمبروں کی وجہ سے جو چارلی کو یونانی زبان میں ملے، خواہ اس رعایت کی وجہ سے جو ان کی کم سنی کے اعتبار سے ان کے ساتھ روا رکھی گئی وہ وظیفہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انھوں نے اور ان کی بہن برٹی نے اپنی ہائی اسکول کی زندگی شروع کر دی۔ ابتدا میں یہ تبدیلی چارلی کے لئے کچھ دلچسپ نہ تھی کیونکہ ان کی طاقت بحال نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی جماعت میں سب سے کم سن اور سب سے چھوٹے لڑکے تھے، اور اسی لئے اسکول کے طاقتور لڑکے انہیں ستایا کرتے تھے اور ان کی صحیح زندگی ابھی تک گھر ہی میں بسر ہوتی تھی۔

سال دو سال بعد اینڈریوز کی مالی حالت میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہو گیا۔ میری اینڈریوز کو اپنے والدین کی طرف سے اچھی خاصی دولت ورثہ میں ملی تھی اور روپیہ چونکہ کاروبار میں لگا دیا گیا تھا اس لئے اس سے خاندانی آمدنی میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا اس زائد آمدنی کی وجہ سے ان کے لئے ممکن ہو گیا تھا کہ وہ دو نوکر رکھ سکیں اور جو وہ بچوں کی موجودگی جو اب سے تیرہ شیرخوارگی کی حدود سے نکل چکے تھے اور بڑے ہو گئے تھے انکی امداد کی سخت ضرورت تھی ایک دن جب چارلی بارہ تیرہ برس کے تھے یہ خبر آئی کہ جس قابل اعتماد دوست کے پاس ان کے والد نے اپنی بیوی کا روپیہ رکھوا دیا تھا۔ وہ جوئے میں ساری رقم ہار گیا ہے۔ بلا روپوش ہو گیا

ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے اس منحوس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ گھر کے افراد اپنی عادت کے مطابق جب شام کی نماز کے لئے جمع ہوئے اور چارلی کے والد نے مناجات پڑھنی شروع کی جو اس دن کے لئے پہلے سے متعین کر لی گئی تھی تو چارلی نیم سہمی ہوئی حالت میں تھے:۔

"کیونکہ یہ کھلا ہوا دشمن نہیں ہے جس نے میرے ساتھ یہ ظلم کیا ہے؛ اس لئے کہ اگر یہ صورت ہوتی تو میں اسے برداشت کر سکتا تھا، لیکن یہ تو تو تھا میرا رفیق، میرا رہنما اور میرا جگری دوست......"۔

اس کے بعد وقفہ ہوا۔ لعنت کے وہ الفاظ جو صاحبِ زبور نے کسی دغاباز دوست کے لئے استعمال کئے تھے انہیں پڑھے گئے۔ جان اینڈریوز نے کتاب بند کر دی اور اس شخص کے لئے جس نے ان کے ساتھ اس قدر ظلم کیا تھا، دعا مانگنی شروع کر دی۔ ان کی دعا نے ناقابلِ فراموش اثر پیدا کیا۔ اس طرح ایک دن چارلی کے باپ نے مسیح کے وہ الفاظ انہیں پڑھ کر سنائے جو یوحنا کی انجیل میں درج ہیں: "اس سے بڑھ کر کوئی شخص کسی سے محبت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی جان اپنے دوستوں کے لئے دے دے۔ تم سب میرے دوست ہو، بشرطیکہ تم وہ کام کرو جس کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔" انہوں نے کہا: "چارلی یہ ہے عیسائی مذہب کے مطابق شریف آدمی کی مکمل صحیح تعریف"۔

مادی آرام و آسایش کے بعد کشمکش کا زمانہ آیا۔ اب صرف ایک ملازمہ کی خدمات کو برقرار رکھا گیا کیونکہ ایک ایک پیسہ کے بچانے کی ضرورت تھی اور کنگ ایڈورڈ اسکول تک جانے کے لئے ٹریم کے اخراجات اتنے ضروری تھے جن سے مفر نہ تھا۔ بڑی کو اسکول سے اٹھا لیا گیا اور وہ اپنی روزی کمانے کے کام پر لگ گئی، صرف چارلی وظیفہ کے بل بوتہ پر اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکے۔ میری اینڈریوز جو بہت ہنرمند اور کفایت شعار خاتون تھی، ہزار جتن کرتی تھی، تاکہ ایک پادری کی محدود آمدنی گھر کی ضروریات کے لئے کافی ہو سکے پُرحسرت مسکراہٹ کے ساتھ وہ اپنے خاوند کے "جیب خرچ" میں کتر بیونت کرتی رہتی اس لئے کہ وہ جانتی تھی کہ جو شخص بھی ان کے پاس امداد کے لئے آئے گا، نظر تا وہ اس سے فیاضی برتیں گے۔ ان کے بڑے بچے یہ حالات دیکھتے تھے۔ اور سب کچھ سمجھتے

تھے اور ان باتوں کی وجہ سے وہ ان سے اور زیادہ محبت کرنے لگے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُن سے بے لوثی کا سبق سیکھتے تھے۔

باب ۲

اسکول اور کالج

(۱۸۸۵ سے ۱۸۹۵ تک)

(۱)

کرسمس ۱۸۸۵ میں چارلی جو ابھی ۱۵ برس کے بھی نہ تھے، "کلاسیکل ۳" کے امتحان میں اول نمبر پر پاس ہوئے اور اس طرح وہ "کلاسیکل ۲" میں کنگ ایڈورڈ ششم اسکول کے ہیڈ ماسٹر ریورنیڈ اے - آر - ورڈی کی براہ راست نگرانی میں آگئے۔ جو نہایت قابل استاد تھے۔ اب والدین کی توقعات بہت بڑھ گئیں۔ وہ سوچنے لگے: "ممکن ہے کہ چارلی وظیفہ حاصل کر کے کیمبرج پہنچ جائیں اور اس کے بعد اگر خدا نے چاہا تو اپنے باپ کی طرح مقدس گرجا کی خدمت میں لگ جائیں گے۔"

وہ اِن خوابوں کا تذکرہ شاذونادر ہی کرتے تھے لیکن چارلی کو انکی توقعات کا علم نہ تھا دونوں توقعات میں سے پہلی توقع میں تو وہ پورے طور پر والدین کے شریک تھے کنگ ایڈورڈ ششم اسکول اب ان کی طبیعت کے موافق ہوتا جا رہا تھا۔ بچپن کی جسمانی کمزوری بھی دور ہو چکی تھی اور وہ اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے سنجیدہ واقع ہوئے تھے اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے اعتماد کو حق بجانب ٹھہرائیں گے اور جو مواقع انہیں مل رہے ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ وہ ایک شرمیلے، بدسلیقہ، غور و فکر کے عادی اور محنتی لڑکے تھے اور پڑھی

تیزی کے ساتھ جماعت میں امتیاز حاصل کر رہے تھے۔ اسکول کے علاوہ جہاں انھوں نے نام پیدا کیا، وہ ڈبیٹنگ سوسائٹی تھی۔ اکتوبر ۱۸۸۶ میں انھوں نے زندگی میں سب سے پہلی تقریر کی اور اس کے بعد سے تو انھوں نے باقاعدگی کے ساتھ مباحثوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ وہاں وہ اُن سیاسی آرا کا بھی اظہار کر دیا کرتے تھے جنھیں وہ گھر میں سُنا کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۸۸۷ میں انھوں نے اس تحریک کی مخالفت کی کہ "یہ ایوان آیرلینڈ میں جبر و استبداد کی سرکاری پالیسی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔" دوسرے سال انھوں نے اپنی ایک بصیرت افروز تقریر میں اس تحریک کے متعلق بحث کی کہ "سلطنت کی سالمیت کے لئے ہوم رول موزوں نہیں ہے۔" ان کی تقریروں سے اُسی گہری تیاری کا اظہار ہوتا تھا جو برمنگھم کے پارلیمنٹری مباحث میں "سالسبری کے ممبر" کا طرۂ امتیاز تھی۔ ان کی وسیع معلومات اکثر اوقات ان کے اسکول والوں کو اچنبھے میں ڈال دیتی تھی، لیکن جس بات سے وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ یہ تھی کہ اینڈریوز نے اس تحریک پر تقریر کرتے ہوئے کہ "شیکسپیئر نے مردانہ کرداروں کے مقابلہ میں نسوانی کرداروں کی زیادہ صحت کے ساتھ عکاسی کی ہے" اپنے قابلِ احترام مخالف یعنی ہیڈ ماسٹر کے دلائل کے قلعوں کو موزوں اقتباسات پیش کر کے نہایت جرأت سے منہدم کر دیا۔

ایک ڈبیٹ (مباحثہ) میں اینڈریوز نے ٹینس کے مقابلہ میں کرکٹ کی تائید کی۔ کرکٹ ایسا کھیل تھا جس میں ہر طالب علم بڑے جوش کے ساتھ حصہ لیتا تھا۔ چارلی اور ہربرٹ نے ہینڈزورتھ کے چند اور لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک کلب قائم کیا، جہاں گرمی میں کرکٹ اور سردی میں "ہیر اینڈ ہاؤنڈز"[۱] کھیلا جاتا تھا۔ کنگ ایڈورڈ اسکول کے اپنے آخری دو سالوں میں چارلی کو اسکول کی کرکٹ

---

[۱] ایک کھیل جس میں کچھ لڑکے میدان میں چلتے چلتے کاغذ کے پرزے بکھیر دیتے ہیں تاکہ پیچھے آنے والے اُن پرزوں کی مدد سے ان کا سراغ لگا سکیں۔ مترجم

ٹیم کے لئے منتخب کیا گیا۔ یہ فطری ذوق کے مقابلہ میں استقلال کی فتح تھی اور ان کے ساتھیوں کو عرصۂ دراز تک یہ منظر یاد رہا کہ جب وہ اپنی ٹیم کی طرف سے میچ شروع کرنے کے لئے جاتے تو ان کے چہرہ پر کس قدر سنجیدگی نمایاں رہتی تھی۔ فطرت نے انہیں کھلاڑی نہیں بنایا تھا۔ لیکن محنت اور عزم و استقلال کی بدولت انہوں نے اسٹریٹ فورڈ کالج کے مقابلہ میں اپنے پہلے میچ میں تیس رن بنائے اور کنگ ایڈورڈ اسکول کو کامیاب کرادیا۔

برخلاف اس کے ان میں فنونِ لطیفہ کی کافی صلاحیت موجود تھی اور ایک وقت ایسا بھی تھا جبکہ انکے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ مصور بنیں۔ وہ تعطیلات کے ایام میں جب سٹن کے جنگلات میں جاتے تو اپنے پانی کے رنگ لے کر جاتے تاکہ روشنی اور رنگ کے اثرات کو کاغذ پر دکھلانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ ان کی مصوری کے کچھ نمونے ابھی تک محفوظ رہ گئے ہیں۔ وہ قدیم یونانی مصنفوں کے اور کرکٹ کے کارٹون بناکر اپنی اور اپنے ہم سبقوں کی تفریح کا باعث بنتے تھے۔ میونسپل اسکول آف آرٹ میں وہ شام کی جماعتوں میں شامل ہوا کرتے۔ ان کی صلاحیت دیکھ کر ان کا استاد اس قدر متاثر ہوا کہ اس آرٹ کی مکمل پیشہ ورانہ تربیت کے لئے انہیں وظیفہ کی پیش کش کی۔ اس تجویز نے کئی دن تک انہیں تذبذب میں رکھا لیکن مسٹر ورڈی نے پُرزور طریقہ سے انہیں مشورہ دیا کہ وہ پہلے اپنا کلاسیکل کورس ختم کرلیں اور چارلی نے اس مشورہ کو قبول کرلیا۔

ان کے قابل ہمعصروں[۱] میں بھی ان کی ذہنی قابلیت نمایاں تھی۔ اسکول کے انعامات آسانی سے انہی کے حصہ میں آتے تھے۔ ۱۸۸۹ کے جلسۂ تقسیم انعامات کے موقع پر چارلی کا ایک چھوٹا بھائی فخر و انبساط کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ چارلی نے یونانی نظم

---

[۱] ان میں چند ہیڈ ماسٹر بنے، دو زبردست ریاضی دان نکلے اور ایک نے ممتاز سرجن کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

میں اسکول کے گورنروں کا استقبال کیا اور پھر مسرت اور تالیوں کی گونج میں مسلسل چھ مرتبہ انعامات لینے کے لیے ڈائس پر گئے ، تین انعامات یونانی و لاطینی میں اور تین انگریزی میں ۔ ان کی ہمہ تن توجہ کے ساتھ کام کرنے کی حیرت انگیز قابلیت ، اہم امور پر فوری اور یقینی نظر اور حافظہ جس کی وجہ سے وہ طویل انگریزی ، یونانی اور لاطینی نظمیں آسانی کے ساتھ یاد رکھتے تھے اور سنا سکتے تھے ۔ ان سے یہ اوصاف آج بھی ان لوگوں کو یاد ہیں جو اس وقت انہیں جانتے تھے ۔ درحقیقت ان کی قابلیتیں مابعد کے زمانہ میں اور پختہ ہو گئیں حالانکہ بہت سے تیز طبع لڑکوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا ۔ یونانی اور لاطینی تصنیفات کے عظیم الشان انسانی موضوعات پر اُن کی گرفت دوسروں کے مقابلہ میں بہت گہری تھی ، اس لئے کہ ان میں شاعر کی روح جلوہ گر تھی اور انہیں اپنی عمر کے لڑکوں سے کہیں زیادہ دکھ کا احساس تھا ۔

اس عمیق دماغی خصوصیت کا اظہار آخری مرتبہ اسکول میگزین میں کیا گیا ۔ تقسیم انعامات کے موقعوں پر کسی نہ کسی یونانی ڈرامہ کا سین سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز ہوا کرتا تھا ۔ چنانچہ ۱۸۹۰ میں اسکول کی آخری ٹرم میں اینڈریوز نے سوفوکلیز[1] کے فلاک ٹیٹس کا پارٹ ادا کیا ۔

> " انہوں نے ہوبہو اس کی نقل کر دکھائی ۔۔۔۔۔ انہوں نے ہمیں سوفوکلیز کی اس عظیم الشان تخلیق کی پُرشکوہ اداسی اور غیر محدود سوز و گداز سے واقف کرایا ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہیرو کی اسپرٹ میں پوری طرح داخل ہو گئے تھے اور اپنے اشاروں ، کنایوں اور لہجہ سے اس کے احساسات کی عکا

---

[1] یہ یونانی کا المیہ شاعر تھا ۔ ڈرامہ نگار کی حیثیت سے وہ ۴۶۸ قبل مسیح میں سب سے پہلے نمایاں ہوا ۔ اس نے کم و بیش ۱۰۰ ڈرامے لکھے ہیں لیکن آج صرف ۷ موجود ہیں ۔ ان سب میں گہری انسانیت ، شاندار جذباتی ہیجان اور بلند اخلاق کی عکاسی کی گئی ہے ۔ مشہور و معروف ڈرامہ " اینٹی گنی " کا بھی یہی مصنف ہے جس کی شہرت آج تک قائم ہے ۔ مترجم

جے ۔ ای ۔ اینڈریوز اور ان کے صاحبزادگان (۱۹۰۰)

کرنے میں نمایاں طور پر کامیاب رہے۔"

اپنی اسکول کی زندگی کے آخری دو سالوں میں اینڈریوز نے اسکول کے رسالہ "کرانیکل" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ جو مضامین وہ اس میں لکھا کرتے تھے ان پر کسی کا نام نہیں ہوتا تھا، لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اسکول کے متعلق انہوں نے ایک گیت بھی لکھا تھا۔ مارچ ۱۸۹۰ میں اسکول کے ایک نہایت ممتاز استاد بشپ لائٹ فٹ نے وفات پائی۔ ان کی جگہ پر ڈاکٹر بروک فاس ویسٹ کوٹ فائز ہوئے اور "کرانیکل" میں ان دونوں کے لئے تعریفی مضامین لکھے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا اینڈریوز سے زیادہ کہنہ مشق ہوگا، لیکن یہ یقینی امر ہے کہ انہوں نے پُر جوش طریقہ سے ان کا مطالعہ کیا، اگرچہ اس وقت خود انہیں اس امر کا اندازہ نہ ہو سکتا تھا کہ ویسٹ کوٹ کا کس قدر اثر ان کی آیندہ زندگی پر پڑنے والا ہے۔ ان کی اپنی اسکول کی زندگی کے آخر میں انہیں پمبروک کالج، کیمبرج، میں "اوپن کلاسیکل اسکالرشپ" ملا اور اس طرح ان کے والد کی آدھی امنگ تو قریب قریب پوری ہو گئی۔

(۲)

چارلی اینڈریوز اب ۱۹ برس کے تھے موسم گرما کی تعطیلات میں ایک دن ان کے والد نے صاف صاف کہہ دیا کہ "تمہیں اپنے گرجا کی خدمت ہی میں لگ جانا چاہئے۔" جب انہوں نے یہ کہا اس وقت وہ دونوں باہر چہل قدمی کر رہے تھے ان الفاظ سے جن کی انہیں کچھ کچھ توقع تھی اور جن کے تصور سے وہ خائف بھی تھے چارلی کے دل میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔ ان کے خیالات گزشتہ ایّام کی طرف لوٹے ـــــ اور انہیں بچپن کے چھوٹے چھوٹے واقعات سب یاد آ گئے جن میں انہوں نے جان بوجھ کر تصوروں کی ذمہ داری قبول نہ کی تھی اور جن کی وجہ سے بچپن کی معصومانہ صفائی قلب پر غیر محسوس طریقہ سے بدلی سی چھا گئی تھی ....

انھیں اس کا بھی خیال آیا کہ گرجا کی جس نماز سے ان کے دل میں پہلے خوف پیدا ہو جاتا تھا وہ اب ان کے لئے بے توجہی کی چیز بن گئی ہے۔ وہ نیکی کے ظاہری شعائر پر عامل تھے لیکن یہ شعائر محض رسمی تھے، زندگی کا دھارا ان کے قریب سے گزرتا رہا۔

باپ نے جواب کے لئے توقف کیا، لیکن چارلی بالکل خاموش رہے۔

جوں جوں دن گزرتے گئے گفتگو کے الفاظ ان کے دماغ میں گشت کرتے رہے۔ وہ خاموشی کے جرم کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ انہوں نے متعدد بار بولنے کی کوشش کی، مگر الفاظ منہ سے نہ نکل سکے۔ اس کے بعد جو کچھ گزرا اسے انھی کے الفاظ میں بیان ہونا چاہئے:

"ایک شام کو جب میں سونے سے پہلے نماز کے لئے دوزانو ہوا تو یکایک میرے دل میں گناہ کا احساس ایسی شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ روایتی رسم و رواج کا ہر تار و پود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور میں نے اپنی حقیقت کو پہچان لیا جیسا کہ میں تھا۔ اس کے بعد جو درد و کرب کی کیفیت رُونما ہوئی ...... وہ بجلی کی طرح مجھ پر کوندی اور شروع شروع میں مجھے محسوس ہوا کہ میرے گرد و پیش سوائے تاریکی کے اور کچھ نہیں ہے۔ میں نے اپنے سر کو ہاتھوں سے تھام لیا اور وہیں خدا کے حضور میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اسی روحانی اذیت میں جس نے ہر ایک چیز کو میرے دل سے محو کر دیا تھا اور میں روشنی کے لئے ٹاپک ٹوئیے مارتا رہ گیا...... آخر کار سکون اور معافی کا ایک نیا حیرت انگیز احساس آہستہ آہستہ میرے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوا اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے جس کے بعد مجھے انتہائی سکون ملا۔"

اس کے بعد وہ سو گئے، ½ ۵ بجے تر و تازہ حالت میں اُٹھے اور ۶ بجے کی نماز میں شریک ہونے اور خدا کا شکر بجا لانے کے لئے سیدھے گرجا گئے۔ اس سے

پہلے ان کے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ صبح کی نماز میں شریک ہوں۔

"جب دوسری صبح کو برکت کی دعا مانگی گئی تو اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خدا کی بھرپور محبت کا سیلاب لہریں لیتے ہوئے ایک بڑے سمندر کی طرح بھرے ہوئے گزر رہا ہے اسی حالت میں کہ میں اسے حاصل کرنے کے لئے سرنیچے کئے ہوئے ہوں۔"

روح کے اس سیلاب میں تمام اشیا اور تمام اشخاص نئے بن گئے۔ گرجا کے پیچھے قریب ہی کیمڈن اسٹریٹ کے گندے اور تاریک مکانات تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے اس طرف دھیان بھی نہ کیا تھا اگرچہ گرجا کے دوسرے اشخاص وہاں کبھی کبھار چلے جاتے تھے۔ لیکن اب محتاجوں اور ضرورت مندوں کے چہروں میں انہیں مسیح کی صورت نظر آئی اور ان کی طفلانہ فطرت کی معصوم مہربانی محبت اور رحم کے جذبہ میں منتقل ہو گئی۔ چنانچہ بہت جلد وہ وہاں کے ہر بچہ کے نام سے واقف ہو گئے اور ہر گھر کے رنج و غم کو جان گئے۔ انہوں نے نئی آنکھوں سے اُس بستی کا مشاہدہ کیا جس میں ایک خوش حال شہر کے غربا اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے چچازاد بھائی آر۔ سی۔ لیوکس بھی جو یہاں مقیم تھے، ان کی معیت میں ان گندے اور تاریک محلوں کا معائنہ کرنے کے لئے جایا کرتے تھے، اس گھناؤنے علاقہ کو دیکھنے کے بعد چارلی نے کہا: "ہمیں ان باتوں کا خاتمہ کرنا ہے۔" یہ الفاظ کہتے وقت ان کے چہرہ پر سنجیدگی اور عزم نمایاں تھا۔

ان کی اس تبدیلی نے ان کی فطرت کے دوسرے پہلوؤں کو بھی اجاگر کر دیا، ایک مرتبہ اور وہ فطری حسن سے اسی شدید مسرت کے ساتھ متاثر ہوئے جس کا اظہار لڑکپن میں ہوا تھا۔ جب فصل کاٹنے کے زمانہ میں چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ چمکا تو ان کا دل اس قدر مسرور ہوا کہ ان کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ وہ باہر نکلے اور صبح ہوتے تک چلتے رہے۔ چلتے چلتے وہ مسرت کے ساتھ آہستہ آہستہ کچھ گنگنا بھی جاتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ہی وہ دیہات میں ریچ فیلڈ کے قریب چھٹی کے دن

بسر کر رہے تھے کہ ستمبر کی ایک سنہری سہ پہر کو وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے تاکہ وہاں سے اس چھوٹے سے شہر کا نظارہ اچھی طرح سے کریں۔ اور وہاں انہوں نے اس کے گرجا کے تین عظیم الشان میناروں کو درختوں کے بیچ میں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ نیچے گئے اور ناف کلیسا کے خاموش میدان میں داخل ہو گئے جہاں موسم گرما کے سورج کی روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں ضوفگن تھیں اور وہ خاموش روحانی وجدان کی حالت میں وہاں بیٹھ گئے یہاں تک کہ شام کی نماز شروع ہو گئی اور گانے والوں کی صاف آوازیں گنبد سے بلند ہو کر گونج پیدا کرنے لگیں.......

جب چارلی اپنے ماحول سے واقف ہو کر چونکے اس وقت وہ باطنی وجدان سے آگاہ ہو چکے تھے اور اس روشنی کا مشاہدہ کر چکے تھے جس کا انہیں تصور بھی نہ ہوا تھا۔ وہ شام کے وقت آہستہ آہستہ باہر نکلے۔ ایک آوارہ گرد نے بھیک مانگی اور چارلی نے اس شخص کے ہاتھوں میں اپنی جیبیں اُلٹ کر رکھ دیں جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ کئی گھنٹے بعد وہ تھکی ہوئی حالت میں بھوک سے نڈھال اس گھر میں پیدل واپس آئے جہاں وہ مقیم تھے۔ ان کی ماں یہ سُن کر کہ ان کے پاس ریل کا کرایہ بھی نہ تھا، محبت بھرے انداز میں مسکرائیں۔ انہوں نے کہا: "تم بالکل اپنے باپ کی طرح ہو!"

(۳)

دوسرے دن چارلی کیمبرج چلے گئے جہاں موسمِ خزاں کی نیلگوں خاموشی میں دریا کے برابر برابر درخت محوِ خواب تھے، سرخ رنگ کی بیلیں پیمبروک کے احاطوں کی بھوری دیواروں پر شعلہ فگن تھیں، کنگز کالج کے گرجا کا کلس اپنی نازک رعنائی کے ساتھ ماہِ اکتوبر کے زرد سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا اور گرجا کے اندر موسیقی بلند ہو رہی تھی اور اس کی شیریں آواز گونج پیدا کرنے والی بلند محرابوں میں سے رُک رُک کر گزر رہی تھی حسن و رعنائی کی اس لطیف رفاقت میں پرانی دوستیاں از سر نو تازہ اور دستوار

ہوئیں۔ جے۔ اچ۔ اسٹروے جن کی معیت میں اینڈریوز ایک زمانہ میں ہر روز برنگھم سے گزر کر اسکول جایا کرتے تھے، ان سے دو سال سنیر تھے۔ اب وہ ہر اتوار کو اسٹروے کے کمرہ میں ملتے تھے۔ تاکہ وہاں شعرا کا کلام پڑھیں اور مذہب پر بحث کریں۔ اینڈریوز کہا کرتے تھے کہ انگیٹھی کی روشنی کے پاس بیٹھ کر اسٹروے جس انداز میں براؤننگ کی نظم سَول پڑھتے تھے، اس کی یاد انہیں زندگی بھر رہی۔ وہاں انہوں نے نئے دوست بھی بنائے۔ چارلس ہرمین پرائر نے جو پمبروک کے سنیر معلم تھے اور خود بھی خداداد قابلیتوں کے مالک تھے۔ نوعمر نووارد کے مذہبی تجربہ کی گہرائی اور سچائی کو جلدی بھانپ لیا اور بہت جلد ان کا اعتماد حاصل کر لیا۔ کئی سال بعد اینڈریوز نے اپنے دوست کے مذہبی خطبات کو ایک چھوٹی سی جلد[۵۸] کی صورت میں یادگار کے طور پر مرتب کیا اور اس میں اس خطبہ کو بھی شامل کر لیا جسے انہوں نے اس یادگار ٹرم کی پہلی اتوار کو نووارد کی حیثیت سے سُنا تھا اور جس کا عنوان بائیبل کی یہ آیت تھی: ”تو ہمارے ساتھ آ اور ہم تیرے ساتھ بھلائی کریں گے۔“

اینڈریوز کے لئے اب مذہب زندگی کا محور بن گیا تھا۔ ہر صبح کو ۷½ بجے وہ کالج کے کلیسا کی نماز میں شامل ہوتے اور ہر اتوار کو عشائے ربانی میں شرکت کرتے لیکن اُن کی دلچسپیوں کا گھیرا فیاضانہ طور پر وسیع تھا اور اس میں بہت سی چیزیں شامل تھیں وہ ہر چیز میں پورے انہماک اور گہرے شغف کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ وہ کشتی چلاتے تھے اگرچہ انہیں اس سے کوئی فطری مناسبت نہ تھی، پھر بھی وہ پوری طاقت کے ساتھ کشتی کھیتے تھے۔ دوسرے سال انہوں نے پمبروک کی کشتی رانی کی دوڑ میں ٹیم کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔ کشتی ران کے پاس اپنا چپو ہوتا تھا اور اس کے بعد سے وہ چپو اس کے کمروں کی دیواروں پر آرائش کے لئے آویزاں کیا جاتا تھا۔ وہ کالج کے کھلاڑیوں میں بہت ہر دلعزیز تھے اور جب شام کے وقت انگیٹھی کے اردگرد انڈر گریجوایٹ ایک دوسرے کے کمروں میں

---

۵۸ اس کا عنوان ہے ”خدا کی موجودگی“ ۱۹۰۴ء

جمع ہوتے اور دنیا بھر کے موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے اس وقت ان کا خصوصی امتیاز یہ ہوتا کہ وہ مختلف مضامین پر اس طرح سے گفتگو کرتے گویا کہ انہیں ان مسائل سے گہری واقفیت ہے۔ لوگ اس کے کمرے میں پائپ پینے کے لئے جمع ہوتے اور اس وقت وہ ہر شخص کی توجہ کا مرکز بن جاتے خواہ وہ عالم ہو یا معمولی آدمی۔ آدمی رات کو جب مہمان چلے جاتے تو وہ ذرا سی دیر کے لئے لیٹ جاتے اور تھوڑی دیر سونے کے بعد تازہ دم ہو کر پھر اٹھ بیٹھے اور مطالعہ میں مصروف ہو جاتے

کیمبرج کے "انٹر کالیجیٹ کرسچین یونین" کے ممبروں نے جو مسیح کے پرجوش عقیدت مندوں میں سے تھے اور اپنے معتقدات کے اظہار میں نڈر بھی تھے اس کی توجہات کو بڑی حد تک اپنی طرف منعطف کر لیا تھا وہ ان کے جلسوں میں جو دعا اور تبلیغ کے لئے منعقد کئے جاتے تھے شریک ہوا کرتے تھے۔ اس وقت معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح کے نہ ماننے والے ہمیشہ دردناک عذاب میں رہیں گے۔ اس سے انہیں سخت کوفت ہوئی اس لئے کہ مسیح کی فطرت اس عقیدہ کے بالکل منافی تھی۔ مسیح سے محبت کرنا انہوں نے اپنی ماں سے سیکھا تھا اور اُن کی معافی نے خود اس کی زندگی میں نیا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ اس تعلیم کے خلاف ان کی اخلاقی بغاوت یہاں تک بڑھی کہ انہیں شک ہو گیا کہ بائیبل کا ہر حصہ اور ہر فقرہ الہامی ہے اور ہر عیسائی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسے مستند سمجھے اور اسکی پابندی کرے

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس چیز کو خود اینڈریوز نے ذہنی تحقیقات و تجسس کے دور میں کیمبرج کی گہری اور چبھتی ہوئی فضا" سے تعبیر کیا ہے اس میں بھی انہوں نے اس "بنیادی حقیقت" سے کبھی دست برداری نہیں کی کہ خدا کی فطرت میں محبت کا عنصر غالب ہے۔ خدا، مسیح اور ابدیت ان کی نظروں میں ایسی حقیقتیں تھیں جن میں تزلزل پیدا نہیں ہو سکتا تھا وہ اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ ایسے سوالات پوچھے جاتے ہیں جو اس نوع کے تمام عقائد کی جڑوں کو کاٹنے والے ہوتے ہیں لیکن یہ مسائل اس وقت یا زمانہ مابعد میں اس تکلیف دہ شدت کے ساتھ کبھی بھی ان کے دماغ میں نہیں آئے جس شدت کے ساتھ وہ بہت سے ایماندار اور سچے اشخاص کے دماغوں میں آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ

"سائنٹیفک شبہات" سے جارج گیبرئیل اسٹوکس کی صورت دیکھتے ہی جلتے رہے تھے، کیونکہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے ممتاز سائنس دان تھے جو کالج کے کلیسا میں آکر ہر اتوار کو نماز میں شامل ہوتے تھے ـــ وہ ایسے شخص تھے جن کا ذاتی عقیدہ ان کے پُرنور چہرے سے نمایاں تھا۔ اور جن کو دوسرے انڈر گریجویٹ تمسخر سے نہیں بلکہ سچ مچ "جبرئیل فرشتہ" کہا کرتے تھے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ مخصوص قسم کی مذہبی مشکلات جن سے اینڈریوز کیمبرج میں نبرد آزما رہتے تھے، مقابلۃً سطحی تھیں، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خود ان کے لئے نہایت اہم نہ تھیں۔ کیتھولک اپاسٹولک کلیسا کے بہت سے خصوصی عقائد اور شعائر اس خیال پر مبنی ہیں کہ بائبل کا ایک ایک لفظ الہامی ہے حالانکہ اسی چیز کی صحت کے متعلق انہیں اعتراض تھا۔ ان عقائد کو عملی طور پر ترک کر دینے سے جو ذاتی اثرات مترتب ہوتے وہ انتہائی طور پر تکلیف دہ ہوتے۔ گھر کی محبت کی ہر ایک بندش انہیں والدین کے کلیسا سے وابستہ کئے ہوئے تھی، اور کلیسائی زندگی میں داخل ہونے کے یہ معنی تھے کہ وہ "مہر بہ لب" ہو کر اس کی خدمت کریں۔ اس کے باوجود کیمبرج میں داخل ہونے کے ایک سال کے اندر اندر انہیں اپنے والد سے کہہ دینا پڑا کہ وہ گرجا کی خدمت نہیں کر سکیں گے۔ کشیدگی کا یہ احساس ان دونوں کے لئے سخت سوہانِ روح بن گیا۔

اینڈریوز کو ڈرہم کے بشپ ویسٹ کوٹ اور آکسفورڈ کے نوجوان مفکر چارلس گور کی تعلیمات میں ذہن کو اطمینان دلانے والی مذہبی بنیاد مل گئی۔ موخر الذکر ہیرو (Harrow) میں ویسٹ کوٹ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ۱۸۸۹ء کے آخر میں آکسفورڈ کے طلبا کے حلقہ نے جو گور کے زیر اثر تھا، لکس منڈی کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں "جدید علمی اور معاشی مسائل کے متعلق کیتھولک مذہب کے نقطۂ نظر کی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔"[۵]

---

۵ لکس منڈی۔ "دنیا کی روشنی"

یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اینڈریوز کے پمبروک جانے تک جس میں ایک سال سے کم عرصہ لگا، کتاب کے دس ایڈیشن نکل چکے تھے۔ کتاب میں ایک معرکۃ الآرا مضمون خود گور کا تحریر کردہ تھا اور اس کا عنوان تھا "روح القدس اور انجیل مقدس کا الہام" جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ "مافوق الفطرت ہستی فطری چیز کو پھل دار بنا دیتی ہے مگر اسے فنا نہیں کرتی۔ خدائی روح انسانی قویٰ کو طاقتور بناتی ہے لیکن ان کو ضائع نہیں کرتی لکھنے والے کا الہام اس احساس میں اضافہ کر دیتا۔ ہے کہ خدا تعالیٰ تاریخ میں کس طرح عمل کرتا ہے۔ لیکن وہ جو کچھ لکھتا ہے اس کی صحیح تاریخی صداقت کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔"

ان خیالات میں اور گور کے کیمبرج والے لکچروں میں جن میں انہوں نے بیباکی سے اس خیال پر "خوش آمدید" کیا ہے کہ بائبل کے ہر حصہ کو سائنٹفک تحقیق کے معیاروں سے جانچنا چاہیے، اینڈریوز کو ذہنی پناہ گاہ مل گئی۔

(۲)

"لکس منڈی" کے ساتھ ساتھ کرسچین سوشل یونین کی تحریک کی بنیاد پڑی جس کے پریسیڈنٹ ابتدا ہی سے ویسٹ کوٹ تھے۔ یہ پادریوں کا اجتماع تھا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ عیسائیت کی اخلاقی سچائیوں کو موجودہ زمانہ کی معاشرتی اور اقتصادی مشکلات پر کس طرح سے منطبق کیا جائے۔" اس کے ممبر واقعات کا مطالعہ کرتے تھے اور خطرناک قسم کی غیر محفوظ مشینری اور صنعت و حرفت میں فاسفورس اور سیسہ سے پیدا ہونے والے زہر جیسے امور پر گرجا کے ضمیر کو اجاگر کرتے تھے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ اگر معاشرتی اور صنعتی لوگوں کی انفرادی زندگی کو پاک وصاف اور مقدس نہ بنایا جائے گا تو الوہیت مسیح کے مسئلہ کی تمام خوبصورتی جاتی رہے گی۔

اینڈریوز نے "کرسچین سوشل یونین" کی کیمبرج والی شاخ کے کام میں

اپنا تن من دھن لگا دیا۔ بعد میں وہ اس کے سکریٹری بھی بن گئے۔ یہاں کوئی
ایسی ذہنی کش مکش نہ تھی جو ان کے سکون میں خلل انداز ہوتی۔ ویسٹ کوٹ کو مظلوم
اور دل شکستہ مزدوروں سے جو ہمدردی تھی وہ اسی ہیجان کے ہم رنگ تھی جس نے
اینڈریوز کو کیمڈن اسٹریٹ کے گندے اور تاریک علاقوں میں جانے پر آمادہ
کیا تھا اور اب جو غربا کے ساتھ ان کا براہِ راست تعلق ہو گیا تو اس چیز نے خدائی
اعتقاد کو قائم اور باقی رکھنے میں ان کی اعانت کی۔ "ٹرم" کے دوران میں وہ کیمبرج
کے غریب طلبا کی ایک جماعت کو سنڈے اسکول میں پڑھایا کرتے تھے، ان کے
گھروں میں جایا کرتے تھے اور ان کی مشکلات کو حل کرنے میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ
تعطیلات کے زمانہ میں پمبروک کالج مشن واقع والورتھ میں ہفتہ کے آخری دن بسر کیا
کرتے تھے اور کالج کی جو کمیٹی اس کی امداد و اعانت کے لئے مقرر تھی اس کے وہ
پُرجوش رکن تھے۔ جس مقالہ پر انہیں کیمبرج میں ۱۸۹۵ء "برنی پرائز" ملا اس
کا موضوع (سرمایہ اور مزدور کی باہمی کش مکش میں عیسائیت کا طریقہ کار) تھا۔ یہ
ویسٹ کوٹ اور کرسچین سوشل یونین" کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ تھا۔ یہ رسالہ ۱۸۹۶
میں شایع ہوا۔

چارلس اینڈریوز پر بشپ ویسٹ کوٹ کا جو سیرت بنانے والا اثر پڑا، اس کی عظمت
کا حقیقی طور پر اندازہ لگانا مشکل ہے۔ مسز پرائرجن کے گھر میں، انھوں نے بہت جلد خوش
آیند مہمان کی حیثیت اختیار کر لی تھی بشپ ہی کی صاحبزادی تھیں اور بشپ کے سب
سے چھوٹے لڑکے بیسل جو ٹرینیٹی کالج میں انڈر گریجویٹ تھے، اینڈریوز کے بہت گہرے
دوست تھے۔ گرمی کی تعطیلات میں وہ ویسٹ کوٹ کے گھر بشپ آک لینڈ میں
گئے اور یارک شایر کے ساحل پر رابن ہڈ بے میں ان کے گھر والوں کے ساتھ تعطیلات
کا زمانہ بسر کیا۔ وہاں ڈاکٹر ویسٹ کوٹ صبح کا وقت اپنے ادبی مشاغل میں گزارتے
تھے، دو پہر کا وقت گھاس دار زمین پر باتیں کرتے ہوئے پیدل چلنے میں نوجوان کے
ساتھ صرف کیا کرتے تھے۔ وہاں وہ باتیں کرتے کرتے اپنے نقطۂ نظر پر زور دینے کی غرض سے

رُک جاتے اور کہتے "اینڈریوز، یاد رکھو کہ کوئی چیز بھی جو صحیح معنوں میں انسانی ہے، عیسائی عقیدہ سے باہر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ ایسا کروگے تو سرے سے اس کے وجود کی علت ہی کو تباہ کر دوگے۔" کبھی کبھی وہ نئی وضع کی عیسائی زندگی کا خواب دیکھتے تاکہ اس کے ذریعہ قوم کے معاشرتی خیالات کی تجدید کی جا سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ زندگی قدیم راہبوں کی زندگی کی طرح سادہ ہو ــ غربت، مطالعہ اور عبادت کی منضبط زندگی، لیکن اس طرح سے کہ وہ عیسائی جماعتی جذبہ پر مشتمل ہو نہ کہ تجرد کی زندگی بسر کرنے والے افراد پر۔ وہ کبھی بھی اپنا خواب پورا ہوتے نہیں دیکھ سکے۔ لیکن انہوں نے اینڈریوز کے دماغ میں جو بیج بو دیا اس کے پھول پھل بعد کو نکلنے والے تھے۔

ایک اور مسئلہ جس کے متعلق اینڈریوز نہایت شوق سے ویسٹ کوٹ سے سوال پوچھا کرتے تھے، یہ تھا کہ صنعتی تنازعات میں عیسائی طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ وہ زمانہ ڈرہم میں کوئلہ کھودنے والوں کی ہڑتال کا تھا جس میں ۸۰ ہزار مزدوروں نے حصہ لیا تھا اور جو تین مہینہ تک جاری رہی تھی۔ ویسٹ کوٹ نے مداخلت کی۔ وہ کوئلہ کھودنے والوں سے واقف تھے اور ان سے محبت کرتے تھے، مزدور اور مالکان دونوں اُن پر اعتماد رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی جائے قیام واقع بشپ آکلینڈ میں ان سب کو ایک کانفرنس کی صورت میں جمع کر دیا اور اپنی صدارت میں ایک معاہدہ تیار کیا جس کے بعد ہڑتال کا خاتمہ ہو گیا۔ ثالثی کے نئے انتظام کر دیا گیا۔ تاکہ اگر بعد میں کوئی تنازعات پیدا ہوں تو ان کا تصفیہ ہو جایا کرے۔

دینوی زندگی کے ساتھ یہ تعلق نتیجہ تھا اس فیض کا جو ویسٹ کوٹ نے یونانی بابایانِ کلیسا کی تصانیف سے پایا تھا۔ ویسٹ کوٹ ہی تھے جنہوں نے اسکندریہ کے کلیمنٹ[۱] اور اوریجن[۲] کی محبت اینڈریوز کے دل میں پیدا کر دی تھی، اور انہیں ان بابایانِ کلیسا کے

---

[۱] یہ شخص بابایانِ کلیسا میں سے ہے اور پاپائے اعظم رہ چکا ہے۔

[۲] یہ بابایانِ کلیسا میں سے ہے۔ اسکندریہ میں پیدا ہوا تھا اور کلیمنٹ کا شاگرد تھا۔ اس نے

قصے، چٹکلے اور لطیفے بتائے تھے۔ جنھیں اینڈریوز بار بار اپنی کتابوں میں کام میں لاتے ہیں۔ ویسٹ کوٹ ہی تھے جنھوں نے ہندوستان میں باہمی عظیم الشان مماثلت قائم کی تھی اور جس کی بنا پر کیمبرج مشن دہلی بھیجا گیا تھا۔

انھوں نے ہندوستان کو یونان کے برابر کا درجہ دیا اور بتایا کہ یہی دو بڑی مفکر قومیں ہیں جنھوں نے دنیا کی تاریخ بنائی ہے۔ جس طرح یونان تمام یورپ کا رہنما ہے اسی طرح ہندوستان بھی ہمیشہ تمام ایشیا کا لیڈر رہے گا۔ انھیں اس کی بڑی توقع تھی کہ ہندوستانی مفکرین یوحنا کی انجیل کی مکمل طور پر تشریح اور ترجمانی کریں گے۔"

ایسی گفتگوؤں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ کالج میں اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ انھیں دہلی کے کیمبرج مشن سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج کے پرنسپل کو خط لکھا کہ ایسی اطلاعین بھیجے جو دوسرے انڈر گریجوایٹوں کو اس کے مقاصد سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ ۱۸۹۳ کے موسم بہار میں انھوں نے ایک میٹنگ منعقد کی اور مشن کے اصولوں اور کام کے متعلق لیفلیٹ تقسیم کئے۔ حاضرین میں سے ایک شخص پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا، اس نے وہ لیفلیٹ رکھ لئے اور چند سال بعد وہ کالج کے عملہ میں شامل ہو گیا۔ اس کا نام ہربرٹ وبیٹر تھا۔

۱۸۹۳ کے موسم گرما میں اینڈریوز نے قدیم ادبیات کا امتیازی امتحان (ٹرائی پوس) اچھے نمبروں سے پاس کیا لیکن حسب توقع وہ اول درجہ میں نہ آسکے، کیونکہ دوسرے بیسیوں کاموں سے انھیں جو انہماک تھا وہ امتیازی درجہ حاصل کرنے میں مانع ہوا حالانکہ بلحاظ قابلیت وہ اس کے حقدار تھے۔ انھوں نے سنجیدگی سے طے کر لیا کہ وہ علوم دینیہ میں اعلیٰ امتیازی درجہ حاصل کر کے رہیں گے کیونکہ اسی صورت میں انھیں فیلوشپ ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ تاہم وہ پہلے کی طرح گوناگوں قسم کی

یونانی فلسفہ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ بہت سی مذہبی کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ مترجم

مشغولیتوں میں پوری طرح منہمک رہے، اگرچہ یہ کہنا غلط ہوگا کہ وہ خالصتہً علوم دینیہ کے مطالعہ میں مصروف رہے۔ وہ بہت مستعد اور ملنسار نوجوان تھے اور مختلف انسانی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مثلاً وہ اُن شوقین انڈر گریجوایٹوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے تھے جو پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن کے مکان واقع آئی وی کورٹ پیمبروک میں جا کر رات گئے تک ان کی ایران کی سیاحت کے حالات سننے اور اسلام کے متعلق ان کے تاثرات معلوم کرنے کے لئے جایا کرتے تھے، تعطیلات کے ایام میں وہ بچوں کی پارٹیوں میں سینٹا کلاز[1] بنا کرتے تھے اور انہیں جوش اور روانی کے ساتھ "ہنٹنگ آف دی اسنارک" والی نظم سنایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے برمنگھم کے دوستوں کو دھاچوکڑی مچانے کے لئے ناچ اور موسیقی کی مجالس میں اپنے گھر پر مدعو کیا کرتے تھے۔

۱۸۹۴ کا ایک ذاتی روزنامچہ محفوظ رہ گیا ہے جس سے ان کے زیادہ عمیق خیالات کی جھلک بآسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ بےحد محبت کرنے والے انسان تھے۔ اُس روزنامچہ میں گھریلو معاملات کے ساتھ ساتھ سنڈے اسکول کے لڑکوں اور کیمبرج کے درجنوں دوستوں کے نام بھی درج ہیں۔ لیکن عیسائی زندگی کے بارے میں ان کا تجربہ یہ ہے کہ وہ جانفشانی اور مسلسل کش مکش کی زندگی ہے اور وہ ابھی تک ان کی ذات کے لئے اندرونی سکون کا مخفی سرچشمہ نہیں بنی۔ وہ "ناقابل معافی منٹ" کی کھینچ تان کر تشریح کرتے ہیں اور بے شعوری اور سرگرمی کی کمی پر اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہیں وہ اپنی کوتاہیوں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ مفروضہ گناہ خصوصیت کے ساتھ "بحث و تمحیص کے دوران میں" ان سے سرزد ہوئے ہیں، اپنے جذبۂ ریاکاری جس کے ماتحت وہ صرف دکھاوے کے لئے اور واہ واہ حاصل کرنے کے لئے کام کرتے رہے ہیں، خدا کے نام پر ہر حال

---

[1] ایک فرضی بوڑھا شخص جو کرسمس کی شام کو بچوں کے لئے تحفے اور کھلونے لا کر دیتا ہے۔ مترجم

شدہ فتح کو اپنی ذاتی کامیابی سے تعبیر کرنے کا جذبہ، مغرورانہ انداز میں دوسروں پر نکتہ چینی اور حقارت آمیز اور نامہربان الفاظ کا استعمال۔ یہ ایک طوفانی فطرت ہے جس کی عظمت کبھی آسمانوں تک پہنچ جاتی ہے اور کبھی انتہائی خاکساری پر اتر آتی ہے۔ گھر میں کسی کشیدگی یا غلط فہمی کا علم ان کے لئے سوہان روح بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ خدا سے دعا مانگتے ہیں: "میرے گھر واپس آجانے کو مسرت اور سکون کا سرچشمہ بنا! اے خدا، اگر ایسا موقع آجائے کہ میں کسی کو ناراض بھی کر دوں تو میرے دل میں تلخی پیدا نہ کیجیو، مجھ میں کوئی جھجک نہ آنے پائے بلکہ محبت آمیز مہربانی اور سچائی کے جذبات سے میرا دل ہمیشہ معمور رہے!" لیکن تعطیلات کے اختتام پر انہیں اس کا اقرار ہے کہ "میں بہت غافل رہا ہوں۔ میں نے اپنے والد سے یہ سب باتیں چھپائی ہیں اور ان کا اعتماد حاصل نہیں کیا ہے۔"

۱۸۹۵ء میں مذہبی مسئلہ واضح طور پر سامنے آگیا۔ کیمبرج کی بھرپور پنج سالہ زندگی میں کلیسائے انگلستان نے ان میں نئی مذہبی بصیرت اور مذہبی تکمیل، عملی خدمت الناس اور نیکی کا عیسائی تصور پیدا کر دیا تھا۔ ذہنی کش مکش دور ہو چکی تھی، نئے تصورات کے دروازے کھل گئے تھے، روح کے لئے غذا کا انتظام ہو گیا تھا۔ اب سچائی متقاضی تھی کہ وہ کھلم کھلا اور باضابطہ طور پر کلیسا کا رکن بن جائیں اور خاندانی محبت کا تقاضا تھا کہ وہ ایسا کوئی فیصلہ نہ کریں جس کی وجہ سے جدائی ممکن ہو جائے، کیونکہ گھر کی محبتیں بہت تکلیف دہ تھیں اور ان کے باپ جنہیں اپنے مذہبی عقائد کی سچائی کا پورا پورا یقین تھا، یہ سوچ کر خوف زدہ تھے کہ ان کے بیٹے کی مشکلات کہیں ذہنی غرور کی علامت تو نہیں ہیں۔ ماں نے مطلق بحث نہیں کی ــــ وہ بہت سیدھے سادے عقیدہ کی خاتون تھی ــــ لیکن اس کی آنکھوں میں شدت غم سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اینڈریوز صلاح و مشورہ کے لئے سر الی، سی۔ایچ۔پرائر اور پیل ویسٹ کوٹ سے رجوع ہوئے۔ کیمبرج کے امتیازی امتحان "ٹرائی

پوس" کے دن قریب آرہے تھے۔کیا یہ ممکن نہ تھا کہ امتحان کے اختتام تک اس تمام تکلیف دہ فیصلہ کو ملتوی رکھا جائے؟ بیسل کی رائے تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا: تمھیں پہلے آسمانی بادشاہت کی تلاش کرنی چاہیئے کیونکہ میں اس بارے میں بہت زیادہ حساس واقع ہوا ہوں۔ اگر تم اب فیصلہ کرنے سے کتراؤ گے تو پھر ہماری دوستی کا خاتمہ سمجھو۔" چنانچہ اینڈریوز نے کیمبرج چھوڑ دیا اور پرائر نے صورتِ حال کو سمجھ کر انہیں رخصت دے دی ـــ وہ چھ ہفتے تک مضافات میں رہے اور اپنے عقائد پر غور وخوض کرتے رہے۔جب واپس آئے تو امتحان میں صرف تین ہفتے باقی رہ گئے تھے، وہ اہم لکچروں میں بھی شریک نہ ہو سکے لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا اور اب انہیں سکون حاصل تھا۔ امتحان میں وہ خاص امتیازی نمبروں سے پہلے درجہ میں پاس ہوئے۔ انہیں بتایا گیا کہ گزشتہ ۰ اسال میں صرف ایک اور طالب علم نے ان جیسے نمبر حاصل کئے ہیں۔ایسی صورت میں عطائے فیلوشپ اب صرف وقت کا سوال رہ گیا تھا۔

سرالی نے ان کے لئے عیسوی دین کی تعلیم وتلقین کی رسم کی ادائگی کا انتظام کر دیا۔ ایک مرتبہ وہ پیچ فیلڈ کے گرجا میں دوزانو ہوئے، لیکن اس مرتبہ وہ وجد آفریں مسرت مفقود تھی جس کا تجربہ اس سے قبل کر چکے تھے۔بجائے طویل کش مکش کے بعد کا ردِعمل جو لازمی طور پر ہوا کرتا ہے، موجود تھا اور ساتھ ہی ان کو خاندان سے چھٹنے کا ملال بھی تھا۔

اینڈریوز نے موسم گرما کا زیادہ حصہ کیمبرج میں چارلس پرائر کی معیت میں گزارا۔ نوعمری میں وہ جس کلیسا سے وابستہ تھے، اس سے خود ہی قطع تعلق کرنے کے بعد وہ اپنی پسند کے کلیسا سے وابستہ ہوگئے، اور اب جو دن گزر رہے تھے ان سے اس عزم کو اور قوی بنا دیتا کہ پادری کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو جائے اور وہ غربا میں رہ کر اپنے فرائض کی انجام دہی کریں۔چارلس پرائر نے ان کے اس عزم وارادہ پر خوش آمدید کہا اور تجویز پیش کی کہ وہ کسی صنعتی علاقہ میں غیر پادریانہ کام

کی حیثیت سے کارآمدزی کا کچھ زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ جو علاقہ انہوں نے منتخب کیا وہ بشپ ویسٹ کوٹ کے کلیسائی علاقہ واقعہ ڈرہم میں سینٹ پیٹرز کے گرجا کا ملحقہ علاقہ تھا۔ اور یہ جگہ اینڈریوز کے مقام پیدائش نیوکیسل آن ٹائن سے صرف چند میل کے فاصلہ پر تھی۔

باب ۳

کار آموزی کا زمانہ

(۱۸۹۵ سے ۱۹۰۴ تک)

(۱)

زمانۂ قدیم سے جبکہ تاریخ ابھی نہیں لکھی گئی تھی، شمالی سمندر کے طوفانوں سے بچنے کے لئے لوگ دریائے ویئر کے دہانہ میں پناہ لیا کرتے تھے۔ ۶۷۴ میں جب انگلستان میں عیسائیت اپنی ابتدائی منازل میں تھی، راہبوں نے دریا کے شمالی کنارے پر اس کے بلند حصہ پر ایک خانقاہ تعمیر کی تھی جہاں سے ناردے تک کا سارا سیاہی مائل سمندر نظر آتا تھا اور سال بہ سال وہ اس رہنما مینار کی بتی کا گل کترتے تھے جو ان کے چھوٹے جہازوں کو نیچے بہ حفاظت لنگر انداز ہونے میں مدد دیتی تھی۔ ۶۸۰ میں سینٹ پیٹر کی اسی خانقاہ میں ایک نوجوان لڑکا امیدوار راہب کی حیثیت سے کام کرتا دکھائی دیتا ہے جس نے بعد کو تمام یورپ سے انگلستان کے سب سے پہلے مقدس شخص کی حیثیت سے خراج احترام حاصل کیا۔ اس شخص کا نام مقدس بیڈ تھا۔ صدیاں بیت گئیں، ڈنمارک کے لوٹ مار کرنے والے بحری ڈاکو کبھی کبھی اس چھوٹے سے گرجا میں آ کر آگ لگا دیا کرتے تھے، لڑائیاں ہوتی تھیں۔ لیکن مذہب پر کوئی آنچ نہیں آئی ملک

بھر میں اب دُور رس تبدیلیاں ہو گئی ہیں، صنعتی انقلاب نے سنڈرلینڈ کے جہاز بنانے والے کارخانوں کی کایا پلٹ دی ہے لیکن وہ سیاہی مائل بھورے رنگ کا چھوٹا کلیسا مع اپنے ہرے بھرے درختوں والے صحن کے ابھی تک اُن پر نگراں تھا۔

قدیم شکستہ چھوٹی عمارت جس کے رہنے والوں نے اس قدر صبر سے مصائب کو برداشت کیا تھا اور بے خوف ہو کر اپنے ایمان کو قائم رکھا تھا، اینڈریوز کی نظر میں تاریخ کی حقیقت اور عظمت کو اور مقدس راہبوں کی دولتِ ایمانی کو بالکل نئے اور پُر اثر طریقہ سے پیش کرتی تھی۔ ان کے بچپن میں مذہبی تحریک کا تعلق مستقبل سے تھا، کیمبرج میں حال کا تعلق جانفشانی اور محنت کی زندگی سے رہا، اور اب جبکہ وہ اُن پتھروں پر جہاں بیڈ محو عبادت رہا کرتا تھا، دوزانو ہوئے تو اس وقت انہوں نے ایک عظیم الشان مذہبی ماضی کی طاقت کو محسوس کیا۔ دریائے ویئر کی تمام وادی عیسائیت کی داستان سے پٹی پڑی تھی، ڈرہم کا گرجا اس کے وسطی پھیلاؤ پر اثر انداز تھا اور وادی سے چند میل آگے اونچائی پر بشپ آک لینڈ واقع تھا جو بیسل ویسٹ کوٹ کا گھر تھا۔ دونوں دوست ڈرہم اور جیرو اور جزیرہ لنڈس فارن کے مقدس مقامات کی زیارت ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔

مانک ویئر ماؤتھ کے پادری، سی۔جی۔ہاپ کنسن اور سی۔ایچ۔پرائر کے کالج کے ایک دوست نے نوجوان غیر پادری کارکن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا اور انہیں ایسے کاموں میں لگا دیا جن کی وجہ سے وہ زمانۂ حال کے بعض سخت مسائل سے دوچار ہوگئے۔ گرجا کے ہرے بھرے صحن کے نیچے سیاہی مائل دریا کے برابر برابر دن بھر سرخ انگارا جیسی بھٹیاں، فولادی چادروں کے عظیم الشان جہازوں میں ٹھوکی جاتی تھیں جہاز سازی کے ایک ہی کارخانہ میں بارہ ہزار آدمی ملازم تھے اور بعض اوقات اوور ٹائم کی وجہ سے راتوں کو بہت دیر تک کام رہتا تھا۔ عجلت اور مزید عجلت کی پکار ہر جگہ تھی، ماہر کاریگروں کو بڑی معقول مزدوری ملتی تھی اور انہیں ہر قسم کی مالی ترغیب و تحریص بھی دی جاتی تھی تاکہ اپنے کام کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے پر آمادہ ہوں۔

"تجارت پر قبضہ کرنے" کے جذبہ میں وقت سے مراد روپیہ لی جاتی تھی، اور صنعتی پیداوار میں "کارکردگی" کی وجہ سے منافع دن بدن زیادہ ہوتا گیا۔ اینڈریوز یہ سب کچھ دیکھتے تھے۔ مزدوروں پر جو ظالمانہ دباؤ ڈالا جاتا تھا، وہ اسے بھی دیکھتے تھے، وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ مزدور پیاس اور تکان سے نڈھال ہو کر کارخانوں سے باہر نکلتے ہیں۔ مختلف رنگوں سے آراستہ شراب کی دکانیں جو دروازوں کے باہر بڑی تعداد میں پاس پاس واقع تھیں، شرمناک طریقوں سے انہیں لوٹا کرتی تھیں روح کو تباہ و برباد کرنے والی مزدوری سے اگر ان کے لئے کوئی تسکین کا سامان تھا تو یہ تھا کہ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اور جوئے بازی میں مصروف رہیں اور وہ مایوس کن ناعاقبت اندیشی کے ساتھ اس میں مصروف رہتے تھے۔

اینڈریوز نے ساتھ ہی غیر ماہر مزدور کی مقابلۃً کم نظر فریب مصیبت کو بھی دیکھا کہ وہ سخت مقابلہ کی وجہ سے فاقہ کی زندگی گزار رہا ہے اور اس میں اتنی قوت یا قابلیت نہیں ہے کہ وہ اس ظلم کا جس نے اُسے دبا رکھا ہے، کوئی منظم مقابلہ کرسکے۔ انہوں نے ایسے گھر بھی دیکھے جن کی آمدنی ۱۸ شلنگ فی ہفتہ تھی اور وہ بدقت اپنی گزر بسر کرتے تھے۔ انہوں نے دیدہ و دانستہ اپنے ذاتی مصارف کو کم کر کے ۱۸ شلنگ کر دیئے تھے تاکہ وہ حتی الامکان اُن لوگوں کے تجربہ میں حصہ دار بنیں جن میں رہ کر وہ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اپنے محدود خرچ کی وجہ سے وہ بعض اوقات رات کا کھانا کھائے بغیر سو جاتے تھے لیکن غور و فکر کرنے پر انہیں معلوم ہوا کہ جو چیز انہیں سہارا دے رہی ہے وہ اعلیٰ مقصد ہے اور یہ کہ انہیں خوراک کی قدروں کا جو علم ہوا ہے وہ تعلیم یافتہ شخص کے نظریہ پر مشتمل ہے لیکن ایسے مزدور کے متعلق کیا کہا جائے جس کے چار پانچ بچے ہوں اور جسے ہمیشہ کام نہ ملتا ہو اور جسے کام کی یکسانیت شراب پینے پر مجبور کرتی ہو؟ اینڈریوز نے مانک ویئر ماؤتھ میں رہ کر اس حیوان بنانے والے ماحول کی تلخ حقیقت کا اندازہ کر لیا۔ انہیں شبہ تھا کہ آیا ایسے حالات میں رہ کر خود ان کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ شراب پینے سے مجتنب رہیں؟ ایک مضمون میں انہوں نے لکھا ہے کہ سنڈرلینڈ میں بہت جلد سرمایہ دارانہ نظام کا

کامل دشمن بن گیا"

گرجا میں آنے والے مردوں اور عورتوں میں انہوں نے بہت جلد کئی دوست پیدا کر لئے۔ ہٹا کٹا کسرتی بدن والا جیک جابلنگ (چوکیدار) کچھ دن بیشتر انعامی شرابی قرار دیا جا چکا تھا۔ اس شخص میں جو اچانک اور مستقل تغیر پیدا ہوا اس کی کہانی اپنے اندر ڈراماتی دلربائی رکھتی ہے۔ ایک دن وہ شراب میں دھت سنڈے اسکول کے اجتماع میں آ گیا اور ایک خاتون سے نہایت بدتہذیبی سے پیش آیا جس پر نوجوان پادری نے اسے گھونسا مار کر گرا دیا۔ اور جب وہ کھڑا ہوا تو اس کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ وہ باہر چلا گیا لیکن دوسرے دن پھر آیا اور خواہش کی کہ وہ اپنی زندگی مسیح کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ شخص جہازی کارخانوں کے ملازمین کے لئے ایک کلب قائم کرنے میں اینڈریوز کا معتمد مددگار بن گیا جہاں لوگ دن کا کام کرنے کے بعد آ جاتے، مختلف قسم کے دل بہلانے والے کھیل کھیلتے اور اس کے بعد تھک جانے کے باوجود نہایت مسرت کے ساتھ اینڈریوز کی کہانیاں سنا کرتے جو خود انہوں نے اپنے باپ سے سُنی تھیں اور جن میں بہادرانہ کارناموں کا ذکر تھا ــــ ان کے کلب کے کمرے کی دیوار پر جنرل گارڈن کی ایک شوخ رنگ تصویر آویزاں تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ موصوف سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی پہنے اپنے اونٹ پر سوار چلے جا رہے ہیں"۔ "جنرل گارڈن کلب" میں زندگی تھی اور جب کئی سال بعد اس کے بانی ہندوستان سے لوٹ کر اس شہر کا دورہ کرنے گئے۔ تو اس وقت بھی وہ کلب اچھی حالت میں چل رہا تھا۔

گڈ فرائیڈے سے قبل کی شب اینڈریوز نے عبادت میں گزاری۔ وہ پورے چاند کو جس کی روشنی گیٹس ہیڈ باغ پر پڑ رہی تھی، دیکھتے جاتے تھے اور پڑوس کے محوِ خواب باشندوں کے لئے دعائیں مانگتے جاتے تھے۔ دوسرے دن جب تین گھنٹے کی نماز ختم ہو گئی تو ایک عورت نے اُن سے ملنے کی خواہش کی ــــ وہ اچھی خاصی مذہبی عورت تھی اور باقاعدگی سے گرجا آیا کرتی تھی ــــ ملاقات کے دوران میں اُس نے اپنے دلی خدشات اور شبہات پیش

کیے۔ اینڈریوز نے پوری توجہ سے اس کی باتیں سنیں اور پھر نہایت سادگی سے جواب دیا "جب مسیح نے صلیب پر یہ الفاظ کہے تھے کہ یہ ختم ہو چکا ہے، تو کیا انہوں نے تمہارے اور میرے گناہوں کو ختم نہیں کر دیا تھا؟" انہوں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی ہے اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ آقا کے دیدار سے مشرف ہو چکی ہے، خدا نے چارلی اینڈریوز سے اپنے آلۂ کار کے طور پر کام لیا تھا۔ چند دن کے بعد اس وقت جبکہ اس واقعہ کی یاد ابھی ان کے دماغ میں تازہ تھی وہ مانک ویئرماؤتھ سے چلے گئے اس لئے کہ سی۔ ایچ۔ پرائر کو دوسری جگہ کے لئے ان کی ضرورت تھی اور وہ اس دعوت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

(۳)

یہ دعوت جنوبی لندن کے پیمبروک کالج مشن سے آئی تھی۔ ریورینڈ آر۔ ایچ۔ بی سیمپسن نے اپنے چھوٹے سے مکان واقع ۲۰۷ اے، ایسٹ اسٹریٹ، والورتھ کے باہر والے ڈاک خانے سے اپنا خط بہت کچھ تامل کے بعد بھیجا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ وہ پرائر اور پیمبروک کمیٹی سے ایسے اقدام کی درخواست کر رہے ہیں جو اس سے پیشتر نہ کیا گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مشن میں اینڈریوز ان کے جانشین بنیں مگر اینڈریوز کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اب تک کوئی پادریانہ عہدہ قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن اب کیا کیا جائے؟ وہ خود بیمار رہا کرتے تھے اور ان کا واحد مددگار ایک مبلغ کی حیثیت سے پوگنڈا جا رہا تھا۔ کمیٹی کو اتفاق تھا کہ اب کوئی چارۂ کار نہیں ہے، لہٰذا ۲ اپریل ۱۸۹۶ کو اینڈریوز اپنے نئے فرائضِ منصبی سنبھالنے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ چھ ہفتے بعد ٹری نٹی سنڈے کو روچیسٹر کے بشپ ڈاکٹر ایڈورڈ ٹالبوٹ نے کلیپ ہم پیرش کے گرجا میں انہیں ڈیکن بنا دیا۔

وہ اپنے گرد و پیش سے بخوبی واقف تھے اور اس سے محبت کرتے تھے ——
—— ان کا پادریانہ علاقہ پرانی کینٹ روڈ سے پرے "آیلی فنٹ

اینڈ کیسل "سے قریب واقع تھا اور اگرچہ اُس میں لندن کی طرح کے بدترین جرائم کے
رنج فیے شامل نہ تھے تاہم اس کی پانچ ہزار کی آبادی انتہائی غربت کی زندگی بسر کر رہی تھی اور
زمیندار اور دلال اس پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ اُن کی اخلاقی پستی اسی حد کو پہنچ
چکی تھی جو مانک ویئر ماؤتھ میں دیکھنے میں آتی تھی، لیکن لوگ خود بالکل مختلف تھے
شمالی جہاز ساز کھردرے، محنتی اور آزاد طبع تھے۔ میوہ فروش اور گودی کے
مزدور جو اینڈریوز کے نئے کلیسائی حلقہ کی آبادی کا جزو اعظم تھے، بے پروا، فضول
خرچ اور آرام طلب تھے مگر تھے محبت کرنے کے قابل۔ ان میں آیرلینڈ والوں
کا زبردست عنصر موجود تھا۔

وہ پورے جوش اور مستعدی سے اپنے کام میں مشغول ہو گئے ان کے دل
میں طرح طرح کے پروگرام تھے۔ انھوں نے ایک کریکٹ کلب قائم کیا اور کھلاڑیوں
کو کھیل کی تعلیم بھی دی۔ اس کلب نے ۱۸۹۷ کے موسم گرما میں گیارہ میچوں میں سے
چھ میچ جیتے۔ انھوں نے سنڈے اسکول میں ایک جماعت کھولی جس میں علاقہ کے
تمام نوعمر گرہ کٹ شریک ہوتے تھے انہیں ان کے صحیح نام بھی معلوم نہ تھے مگر وہ انہیں
"بجر"، "نپر"، "ڈاجر"، "سمائلر" جیسے مذاحیہ ناموں سے پکارا کرتے تھے۔ ان کی حیثیت جبرل
گارڈن کلب کی سی تھی، اور انھوں نے مرکزی افریقہ کی بہادری کی کہانیاں یا جنوبی سمندروں
میں آدم خوروں کے قصے سُنا سُنا کر ان کے طفلانہ خیالات میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔
انہیں بہت جلد "جنٹلمین" کا خطاب مل گیا اور وہ مکمل طور پر ان کا اعتماد حاصل
کرنے میں کامیاب ہو گئے اس لئے کہ وہ انہیں "سرزنش" نہیں کرتے تھے، نہ ان کے
سامنے "وعظ" ہی کہتے تھے اور نہ ان کے کسی راز کو دوسروں پر ظاہر کرتے تھے۔ اور
یہی وجہ ہے کہ ان کی معیت میں رہ کر وہ بالکل قابل اعتماد بن گئے تھے۔ لیکن جب
سنڈے اسکول کی پارٹیاں مضافات میں جاتیں تو ایسے مواقع پر چوری بالکل ممنوع

---

[۱] ان ناموں کے معنی علی الترتیب یہ ہیں:- ادرک، چٹکی لینے والا، داؤں پیچ کرنے والا، مسکرانے والا۔ مترجم

قرار دے دی جاتی تھی) وہ کبھی کبھی سیب فروشوں کی دکانوں کے سامنے للچائی ہوئی نظروں سے کھڑے ہو جاتے اور تحریص و ترغیب سے مجبور ہو کر لب کشائی کرتے اور ان سے بہ منت کہتے کہ "ایک مرتبہ موقع دے کر دیکھئے کہ کیسی آسانی سے یہ کام کیا جا سکتا ہے!" مگر اینڈریوز سختی سے اپنے اصول پر قائم رہتے ــــ اگرچہ یہ تفریحی پارٹیاں دوسرے طریقوں سے بہت پریشان کن ثابت ہوتی تھیں۔ ہیمپٹن کورٹ یا ایپنگ فاریسٹ (جنگل) کے سبزہ زار بہشت میں تین سو بچوں کا آزادانہ چھوڑ دیا جانا اپنے اندر بہت سے ناخوشگوار امکانات رکھتا تھا اور ان پریشان کن خدشات میں جو فطرتاً اینڈریوز کے دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے، ان بچوں کے رومان پسند خیالات کی وجہ سے کوئی کمی نہیں ہوتی تھی، "او مسٹر اینڈریوز، ہمارے بلی کو خانہ بدوش اقوام کے افراد اٹھا کر لے گئے ہیں"۔ ــــ "او مسٹر اینڈریوز، ہماری میری این دریا میں گر پڑی ہے"۔ لیکن ان خدشات کا انہیں کافی معاوضہ مل جاتا تھا جب بچے اعتماد کے ساتھ آکر اُن سے چمٹ جاتے اور جوش مسرت میں کہتے: "کیا ہم لطف نہیں اٹھا رہے ہیں؟"

پہلے موسم گرما میں بہت سی مشکلات پیش آئیں جن میں سے کچھ خود اُن کی ناتجربہ کاری اور قوتِ فیصلہ کی غلطیوں کا نتیجہ تھیں۔ ابتدا میں انہیں عام پسند یا سنسنی خیز طریقوں کے خطرہ کا پورا پورا احساس نہ ہو سکا جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ سطحی "ترغیبات" کے ذریعے لوگوں کو مذہب کی طرف لایا جاتا تھا جو بجائے خود ایک قسم کی رشوت تھی۔ لیکن جس جوش سے وہ نئے خیالات کو عملی شکل دیتے اور ارتقائی نشوونما کے لئے جدید انتظامات کرتے، انہیں دیکھ کر لوگ حیرت زدہ ہو جاتے کیونکہ وہ تو صرف پرانے طریقوں کے خوگر تھے اور انہی کو عزیز رکھتے تھے۔ اگرچہ اپنی ضرورت سے زیادہ عجلت پسندی کی وجہ سے وہ وقتی طور پر اُن کی ہمدردیاں حاصل نہ کر سکے تاہم جس ایماندارانہ انکساری سے وہ اپنا قصور تسلیم کر لیتے تھے اس کی وجہ سے ان کی مخالفت کلیتہً ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد جتنی محبت ان سے کی جاتی تھی بہ مشکل کسی اور مصلح سے کی گئی ہوگی۔

جن دوسری ناکامیوں سے وہ ابتدا میں دوچار ہوئے وہ اس بات کا نتیجہ

تھیں کہ وہ دوسرے اشخاص کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتے تھے اور خصوصیت سے اس گہرے شبہ کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے جو جملہ سرکاری عمال کے متعلق لوگوں کے دلوں میں جاگزین رہتا تھا۔

"دالورتھ کے زمانۂ قیام کی ابتدا ہی میں مجھے ایک سخت تکلیف دہ واقعہ کا علم ہوا اور وہ یہ تھا کہ ایک بن باپ کے نوعمر لڑکے سے نہایت ظالمانہ برتاؤ کیا گیا۔ پڑوس کے سب لوگ میری اس رائے کی تائید میں تھے کہ لڑکے کو کسی نہ کسی "گارڈن ہوم" میں بھجوا دیا جائے۔ لیکن جب تک میں نے ایس۔ پی۔ سی۔ سی[1] کے ایک باوردی افسر کو نہ بلا لیا اس وقت تک حالات بالکل ٹھیک رہے، لیکن اس باوردی افسر کو دیکھنا تھا کہ تمام فضا خراب ہو گئی۔ لڑکا معاً غائب ہو گیا......... ہم نے سب جگہ اسے تلاش کیا مگر سوائے خشمگیں نظروں کے ہم نے کچھ اور نہیں دیکھا۔ میں نے افسر سے کہا کہ وہ دوبارہ نہ آئے اور چند دن بعد میں نے خود لڑکے کی تلاش شروع کر دی۔ آناً فاناً سارے پڑوسی پھر میرے طرفدار ہو گئے اور شام ہونے سے پہلے پہلے لڑکے کو میرے حوالے کر دیا گیا......... وہ میری ہمراہی میں "گارڈن بوائز" کے مضافاتی "ہوم" میں خود اپنی مرضی سے چلا گیا۔ "تجربہ احمقوں کا استاد ہوتا ہے"۔"

پولیس کے سپاہی کی وردی تمام وردیوں میں سب سے زیادہ مشتبہ چیز خیال کی جاتی تھی اور اسی لئے اینڈریوز نے پولیس سے کبھی سروکار نہ رکھا۔ لیکن بعض واقعات اس اصول کی استثنا تھے۔

"ایک دن خصوصیت کے ساتھ چوری کا ایک نفرت انگیز واقعہ ویپنگ

---

[1] سوسائٹی فار دی پری وِنشن آف کروئیلٹی ٹو چلڈرین۔ اس سوسائٹی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کو مختلف مظالم کا شکار ہونے سے بچائے۔ مترجم

میں وقوع پذیر ہوا۔ مزدوروں کا ایک سرغنہ ان کی بچت کے روپے میں سے ۔۔۔ پونڈ کی رقم لے کر فرار ہو گیا۔ جس گھر میں اس کی بیوی رہا کرتی تھی وہ ہمارے مشن سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہاں ایک کھڑکی تھی۔ جس میں سے ایک سراغ رساں سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ کسی کو اس کا علم نہ تھا حتیٰ کہ گھر کا محافظ بھی ناواقف تھا۔ ہم جس آدمی کی تلاش میں تھے وہ آٹھویں دن متجسسانہ نگاہوں سے بازار میں سے ہوتا ہوا سیدھا اُدھر چلا گیا۔ سراغ رساں بھی فوراً اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس نے پشت کی جانب سے آدمی کو اس حالت میں پکڑا جبکہ وہ مال غنیمت کا کچھ حصہ اپنی بیوی کے حوالہ کر رہا تھا چور نے اپنا ریوالور نکال لیا مگر بے حد تاخیر سے، کیونکہ ریوالور چلانے سے پہلے ہی ہتھکڑیاں اس کے ہاتھوں میں پڑ چکی تھیں۔۔۔۔۔۔

"سراغ رساں کے ساتھ جب میری ساز باز ختم ہو گئی تو مجھے اپنے مزدوروں کو بتانا پڑا کہ اس کی گرفتاری میں میرا کتنا حصہ تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد اطمینان ہوا کہ وہ سب میرے طرف دار تھے اور جب میں نے یہ سارا واقعہ اپنے "بوائز کلب" میں پیش کیا جو چوروں اور گرہ کٹوں پر مشتمل تھا تو کسی نے بھی ایسے شخص پر رحم نہیں کھایا جو اتنا سنگدل ہو سکتا تھا کہ غریبوں کو لوٹ لے۔"

اینڈریوز نے جو پُر تاثیر رپورٹیں لکھ کر بھیجی تھیں، ان کے اقتباسات سے معلوم ہو سکے گا کہ اس وقت کے جنوبی لندن کی عام زندگی کیسی تھی۔ چنانچہ ذیل میں ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ پولیس کو عام طور پر کس قدر بے اعتمادی سے دیکھا جاتا تھا۔

مسز ایم چھٹی منانے کے لئے آئرلینڈ جا رہی تھیں اور اپنا بکس یوسٹن لے جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ کیا تم ہاتھ گاڑی پر اُسے لے چلو گے؟ موعودہ دن ایک سوالی بینڈی آتا ہے اور کہتا

ہے کہ چونکہ وہ پوسٹن جا رہا ہے اس لئے اسے سارے بکس لے جانے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ وہ ٹھیلا لاتا ہے اور اس پر بکس رکھ کر چلا بنتا ہے۔ قریب ہی سڑک پر اس کی ملاقات ہیفرے سے ہوجاتی ہے جو خود بھی ایک موالی قسم کا انسان ہے ....
وہ دونوں اس امر پر متفق ہوجاتے ہیں کہ پڑوسیوں کے سامنے جھگڑنا مناسب نہیں اس لئے وہ ٹھیلے اور بکس کو لے کر چلے جاتے ہیں لیکن جب پُل کے قریب پہنچتے ہیں تو آپس میں جھگڑا شروع ہوجاتا ہے اور پولیس کے سپاہی امنِ عامہ میں خلل ڈالنے اور بکس پر ناجائز قبضہ رکھنے کی علت میں انہیں گرفتار کرلیتے ہیں۔ مسز ایم پوسٹن پہنچ جاتی ہیں مگر بکس نہیں پہنچا۔ پولیس (بینڈٹی اور ہیفرے کے کہنے کے مطابق) خاتون کے مکان پر آتی ہے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بکس ٹھیک حالت میں پہنچ گیا یا نہیں لیکن وہ مکان پر نہیں ملتیں اور پڑوسی بھی کچھ نہیں بتاتے۔ مسز ایم بغیر بکس کے رہتی ہیں اور ہیفرے اور دوسرا شخص پولیس اسٹیشن پر رُکے رہتے ہیں یہاں تک کہ مسز ایم کے خاوند کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور وہ جا کر دونوں کو ضمانت پر چھڑا لاتا ہے۔ اس پر وہ اس سے کہتے ہیں کہ اگر وہ ان کو شراب پلانے کا وعدہ کرے تو خود اس کی بُوڑھی عورت کی اور بکس کی خیریت ہے ورنہ وہ اس کے مکان کو تاخت و تاراج کردیں گے۔ لہٰذا وہ وعدہ کرلیتا ہے، اور وہ تینوں 'والو' رتھ روڈ پر واپس آجاتے ہیں اس طرح سے کہ ہیفرے ٹھیلے پر بیٹھا آئرلینڈ کے قومی گیت گاتا رہتا ہے اور تقریباً ایک ہزار آدمیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے، ٹرام گاڑیاں تک رُک جاتی ہیں اور انہیں پھر گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ اس مرتبہ کارٹرا اسٹریٹ کے تھانہ پر اور انہیں ۱۰ بید یا پندرہ دن کی سزائے قید کا حکم ملتا ہے "
ہم یہ بیان پڑھنے کے بعد ہنس پڑتے ہیں، لیکن اینڈریوز تصویر کا دوسرا رُخ یوں پیش کرتے ہیں:
"ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں فرنیچر نام کو نہیں جس کی دیواروں سے سیلن کی وجہ سے سیمنٹ اُکھڑا پڑتا ہے اور جس کا فرش نہایت خراب ہے، اور جہاں پانچ بچوں

ادسان باپ کے لئے گندے ٹاٹ کا ایک بستر ہے۔ ان کی آمدنی ۹ شلنگ فی ہفتہ ہے جس میں سے ۴ شلنگ کرایہ میں چلے جاتے ہیں۔ شیرخوار بچہ رات میں سانس رک جانے کی وجہ سے مرچکا تھا، دو بچے خناق کے مرض میں مبتلا تھے، ایک کو لال بخار تھا اور یہ سب ایک ساتھ سویا کرتے تھے۔

اسی مکان میں تین اور گھرانے رہتے تھے۔ حفظانِ صحت کے انسپکٹر نے اس عمارت کو ناقابلِ سکونت قرار دے دیا تھا، اور جب بچوں کی صحت بحال ہوگئی سب گھرانے دوسری جگہ منتقل ہوگئے، لیکن مالکِ مکان نے ان کے سامان کو غیر محفوظ حالت میں پڑا رہنے دیا۔ دوسرے دن میں نے دیکھا کہ پڑوس کے کوئی پانچ سو بچے بھیڑوں کی طرح وہاں جمع ہیں اور لکڑی اور لوہے کے ٹکڑوں کو دفینہ کی طرح لئے جا رہے ہیں جن میں سے بیماری اور جراثیم کی وجہ سے بدبو آرہی تھی۔

کیمبرج میں انہوں نے پیمبروک کالج سے قریبی تعلقات رکھے۔ امداد کے لئے انہوں نے جو اپیلیں کیں ان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ انڈر گریجویٹوں کی تعداد میں بھی معتد بہ اضافہ ہوگیا جو موسم گرما کی تعطیلات میں مشن میں آکر قیام کرتے۔ انہوں نے ان کے سامنے کام کا اعلیٰ معیار پیش کیا، انہیں دوروں پر جانے کے لئے جن میں بسا اوقات سخت بیماریوں کے کیس بھی ہوتے تھے، طویل فہرستیں دیں، اور انہیں ترغیب دی کہ وہ سینٹ جانز کالج مشن کے پادریانہ طریقوں اور کیمبرج ہاؤس کے اختیار کردہ معاشرتی منصوبوں کا مطالعہ کریں جن کے وہ خود بھی بے حد معترف تھے۔ ۱۸۹۶ کے موسم خزاں میں ان کے کالج کے قدیم رفیق ڈبلیو۔ ایل۔ بی۔ پارسنز اسسٹنٹ کی حیثیت سے ان کے ساتھ شامل ہوگئے اور اینڈریوز کو دیکھ کر دو خواتین کارکن بھی مانک ویئرماؤتھ سے ان کے ساتھ ہوگئیں تاکہ کام کرنے والے عملہ کو تقویت بخشیں۔ یہ کام چھوڑ دینے کے بعد پارسنز کیمبرج گئے اور کالج کے ایک اور دوست ڈبلیو آؤٹرم کو ترغیب دی کہ وہ ان کی جگہ لے لیں۔ ۱۸۹۷ کے کرسمس، ایسٹر اور ایامِ گرما کی تعطیلات میں ۲۰۷۔۱ ایسٹ اسٹریٹ میں بعض اوقات اسٹنے

رضاکار جمع ہو جاتے تھے کہ ان کے بیٹھنے کے لئے بھی وہاں جگہ نہ ملتی تھی۔ اینڈریوز نے نہایت مسرت کے ساتھ لکھا ہے،

"اس مشن میں ایک شخص ریبٹ وارین نامی ہے جو بستروں کا انتظام نہایت خوبی سے کرتا ہے اور جب اس جگہ کے رہنے والے دسمبر کی کسی صبح کو باتھ روم میں جانے کے لئے ہجوم کرتے ہیں تو میدانِ جنگ کا سماں بندہ جاتا ہے۔ کھانے کے چھوٹے سے کمرے میں آدمیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد جو بھیچ بھچا کر وہاں بیٹھ سکتی ہے، سترہ ہے اور ایک کتا بھی ۔۔۔ یہ کتا بعد کو مر گیا۔"

اندر گریجوایٹوں کی موجودگی کا جو اثر لوگوں پر پڑا، اینڈریوز نے اس کا جو حال لکھا ہے۔ اس سے خود ان کے دل و دماغ کی اندرونی کیفیت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ناقابلِ عمل سوشلزم سے وہ اتنے ہی بیزار تھے جتنے سرمایہ داری سے اور اس کی وجہ ایک ہی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کی تہ میں جو جذبہ کار فرما ہے وہ انسانی شخصیت سے گہری منافرت ہے۔

مفروضہ سوشلسٹ سڑک کے ہر کونے پر دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا آتش فشاں پہاڑ پھٹنے کو ہے، اس لئے کہ مالدار اور غریب میں انتہائی بُعد ہے۔ لیکن طلبا کی موجودگی نے مال داروں کی بڑھتی ہوئی مذمت کو "شریف آدمیوں" اور "روپیہ ہڑپ کرنے والوں" میں تبدیل کر دیا ہے وہ کہتے ہیں: ہمارا ان "شریف آدمیوں" سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ وفاداری، خیر سگالی اور بہادرانہ احساس ہمارے لوگوں میں کالج سے تعلق کی وجہ سے از سرِ نو پیدا ہو رہا ہے۔ جماعتی حس اور سخت قسم کی ناخوشگوار انقلابی اسپرٹ ختم ہوتی جا رہی ہے اور امرا اور غربا میں بہترین قسم کا قدیم انگریزی فیاضانہ احترام پھر سے ان کی جگہ لے رہا ہے۔"

(۴)

جون ۱۸۹۷ میں اینڈریوز کلیسائے ساؤتھ وارک میں باقاعدہ پادری بنا دیئے گئے وہ اس رسم کی ادائگی کے دل وجان سے متمنی تھے، اس کے باوجود جب اس کا وقت قریب آیا تو ان کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو گئے۔ جب انہوں نے "عقائد" کا مطالعہ کیا جو "عام دعا کی کتاب" میں ضمیمہ کے طور پر درج رہتے ہیں، تو انہوں نے محسوس کیا کہ وہ صدق دلی سے ان میں سے بعض عقائد کو نہیں مان سکتے، لیکن صرف "سرسری طور پر" ان پر یقین رکھ سکتے ہیں۔ کلیسائی قواعد کی رُو سے صرف "سرسری طور پر" عقیدہ رکھنے کی ضرورت تھی، مگر خدمت کا بے پناہ جذبہ بالآخر اُن کے شکوک پر غالب آگیا حالانکہ اندرونی کشمکش ابھی پوری طرح دور نہ ہوئی تھی، چنانچہ دبے ہوئے شبہات بعد میں شدت کے ساتھ ابھرے بغیر نہ رہے۔

پادری بننے کی مسرت کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ذریعہ انہیں وہ اختیارات حاصل ہو گئے جن کی رو سے وہ کلیسائی حلقۂ اختیار میں پورے طور پر مذہبی خدمت انجام دے سکتے تھے۔ اب اینڈریوز کو دنیادی سطح پر "کلب کے طریقوں" پر کام کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے ۱۸۹۸ میں لکھا کہ "کام پھیلانے سے پہلے سرگرمی کی ضرورت ہے، فصل کاٹنے سے پہلے بتدریج بیج بونے، چھوٹی سی جماعت کو مسلسل تربیت دینے اور عام لوگوں کے گھروں پر بار بار جانے کی ضرورت ہے۔ مذہب میں سنجیدگی اور قربانی سے احترام حاصل کیا جا سکتا ہے"۔

چھوٹے سے گرجا کی زندگی میں ان کے جوشِ عمل سے نئی روح دوڑ گئی۔ انہوں نے شام کی نماز کا وقت ۶½ بجے کی بجائے ۸ بجے کر دیا تا کہ لوگ زیادہ آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو سکیں، چنانچہ عورت مرد اپنے پھٹے پرانے کام کرنے کے کپڑوں میں نماز میں شریک ہونے کے لئے آنے لگے۔ وہ ہر شام کو پانچ منٹ تک تقریر کرتے تھے جو تفسیر ہوتی تھی۔ اس آیت کی جو نہایت سادہ الفاظ میں پڑھی جاتی تھی اور بسا اوقات فی البدیہ،

مگر ہمیشہ موثر پیرایہ میں اور خوبصورت الفاظ میں ہوتی تھی۔ انہوں نے ان تھکی ماندی عورتوں کو جو گھریلو فرائض کی وجہ سے شریک نماز نہ ہو سکتی تھیں، یہ کہہ کر ڈھارس دی کہ جب وہ گھنٹے کی آواز سنا کریں تو یہ تصور کر لیا کریں کہ دعاؤں میں انہیں یاد رکھا جا رہا ہے۔ ایک شخص نے جو سینٹ ٹامس ہاسپٹل میں بیمار پڑا تھا کہا: "میں یہاں پڑے پڑے گھنٹے گنا کرتا ہوں یہاں تک کہ نماز کا وقت آجاتا ہے۔ اب گھنٹے بج رہے ہیں ـــ اب وہ سب گرجا کے اندر ہیں اور وہ میرا خیال کر رہے ہوں گے اور میں ان کا۔"

اس زمانہ میں وہاں گرجا کی کوئی عمارت نہ تھی۔ زمین دوز کلب روم کے شرقی حصے کو ایک متحرک پردہ کے ذریعہ علیٰحدہ کرکے منبر اور قربان گاہ کی جگہ بنالی گئی تھی۔ جب نماز نہیں ہوتی تھی اس وقت بچوں کے کھیل، کُتّے بازی، ڈرافٹس کا کھیل اور مختلف قسم کے جلسے پردہ کی دوسری جانب یکے بعد دیگرے ہوتے تھے۔ اینڈریوز ہی پہلے شخص تھے جنہوں نے اپنے لوگوں کے سامنے گرجا کی عمارت کا منصوبہ پیش کیا اگرچہ ان کا یہ خواب کئی برس کے بعد عملی شکل اختیار کر سکا۔

اینڈریوز نے اپنے حلقہ کے لوگوں کو نہ صرف یہ سکھایا کہ وہ اپنی مقامی ضروریات کے لئے روپیہ دیں بلکہ دنیا بھر میں مسیح کے کام کے لئے بھی روپیہ دیا کریں۔ انہوں نے وسطِ افریقہ میں یگنڈا کے گرجا کی پُرشوکت کہانی سنائی اور اس کام کی بھی تشریح کی جسے بیل ویسٹ کوٹ دہلی میں انجام دے رہے تھے اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ لینٹ[1] کے سات ہفتوں میں ہندوستان کے غربا کے لئے بھی کچھ رقم جمع کریں۔ اس مدت کے اختتام پر ایک بوڑھے جوڑے نے انہیں ایک چھوٹا سا بکس لا کر دیا۔ وہ دونوں بہت ہی غریب تھے اور ۵ شلنگ فی ہفتہ کی پنشن پر بڑی مشکل سے اپنا گزارہ کرتے تھے مگر اینڈریوز کے تعجب کی حد نہ رہی جب بکس میں سے ۳½ شلنگ نکلے۔ یعنی روزے کے سات ہفتوں

---

[1] ایسٹر سے پہلے کے چالیس دن جن میں سوائے اتوار کے ہر روز روزہ رکھا جاتا ہے۔ مترجم

میں چھ پنس فی ہفتہ کے حساب سے۔ انہوں نے کہا: "مسٹر اینڈریوز، ہمیں بہت افسوس ہے کہ یہ رقم بہت کم ہے۔" ان غریبوں کی اس حیرت انگیز فیاضی کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

سیدھے سادے، پرپی عیسائیوں کی یہ چھوٹی سی جماعت ان بے شمار مردوں اور عورتوں کے درمیان جنہیں حسرت اور تنگدستی نے گھیر رکھا تھا، الگ تھلگ اپنی زندگی کے دن گزار رہی تھی۔ دوسری طرف شرابی سڑکوں کے نکڑوں پر بیکار وقت گنواتے پھرتے تھے، چوری کرنے والے بداخلاق نوجوان اور سرکش لڑکیاں گلیوں میں آوارہ پھرتی رہتی تھیں۔ گڈ فرائڈے کی نماز کی سنجیدہ خاموشی کے دوران میں غنڈوں اور موالیوں کے جتھے باہر سڑک پر مستی میں فحش گیت گاتے پھرتے تھے اور جب اینڈریوز بیمار اور جاں بلب اشخاص کے یہاں دورے پر جاتے تو انہیں اندیشہ رہتا کہ کہیں راستہ میں بدمعاشوں کی کسی بہیمانہ حرکت کا شکار نہ ہو جائیں۔ ایک مرتبہ چھ برس کے ایک چھوٹے سے سرکش لڑکے نے انہیں چاقو دکھا کر دھمکی دی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ کلب میں اس امر کا ذکر کرتے کہ وہ کسی بدنام علاقہ میں جا رہے ہیں تو اس وقت اچھی قسم کے مزدور "ساتھ دینے کے لئے" ان کے ہمراہ جانے پر اصرار کرتے۔ اینڈریوز سنگ دلانہ بے رحمی یا دشمنی کو خود اپنے عقیدہ اور جوش کے لئے چیلنج قرار دیتے اور ایسے مواقع پر بھی ایسی باتیں ہو جاتیں جو معجزے سے کم نہ ہوتیں۔

پھر ایک وقت ایسا آیا کہ "ان گم کردہ راہ لوگوں" کی تلاش کی خواہش کا ایک دوسرے جذبہ کے ساتھ تصادم ہو گیا۔ سینٹ جانز کالج مشن کے ایک پادری جن کا اینڈریوز بے حد احترام کرتے تھے، سخت بیمار ہو گئے۔ اینڈریوز نے حسب معمول ان کی تیمارداری اپنی طبیعت کے تقاضہ کے مطابق اس قدر گہرے ذاتی انہماک سے کی کہ انہوں نے اپنے دوست کی خدمت میں اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ لیکن ساتھ انہیں اس بات کا غم تھا کہ وہ اس تمام عرصہ میں اپنے حلقے کے لوگوں کی روحانی خدمت کرنے سے معذور رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا ضمیر اس غفلت پر انہیں ملامت

کر رہا تھا۔

ان کی اس ذہنی کش مکش میں شدت یوں پیدا ہو گئی کہ پادری بننے سے پہلے جن شکوک سے وہ نبرد آزما رہتے تھے۔ وہ اب پھر ابھر آئے تھے۔ ۱۸۹۸ کی رپورٹ میں انہوں نے "بک آف کامن پریئر" کی اہمیت کے بارے میں ذیل کے الفاظ کہے تھے،

"پریئر بک" (دعا کی کتاب) مکمل طریقہ سے ہمارے علاقہ کی عمیق ترین ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ وہ ایسی اخلاقی طاقت بخشتی ہے جس کے ہم سب متمنی ہیں ـــ ساتھ ہی اس قدر سنجیدہ، اس قدر پُر از احترام اس قدر طاقتور اور پھر اس قدر نرم ـــ وہ کوئی سنسنی خیز چیز نہیں ہے، نہ وہ کوئی مقبولِ عام معیار ہی پیش کرتی ہے، نہ اس کی خوفناک سختی میں کوئی کمی ہی واقع ہوئی ہے، نہ اس میں کوئی کمزور، غیر واضح، فرقہ وارانہ ابہام ہی موجود ہے۔"

اس ہدیۂ عقیدت کی گہری سچائی کے بارے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود ایسی بھی راتیں آئیں جبکہ وہ ذہنی کرب و اضطراب میں گھنٹوں جاگتے تھے اس لئے کہ "دعا کی کتاب" کے بعض نغمات میں اور "اتھےنیسی اَس کے عقائد" کی تمہید میں گنہگاروں اور غیر عیسائیوں کے متعلق بد دعا کے الفاظ بھی تھے جو صریحی طور پر ان کے ضمیر کے خلاف تھے۔ اور اس لئے وہ اس سوچ میں پڑ جاتے تھے کہ آیا پادریت کا لباس پہننے میں اُنہوں نے کچھ غلطی تو نہیں کی؟

یہ اندرونی کش مکش اور زیادہ تکلیف دہ یوں ہو گئی کہ اس وقت اینڈریوز کے ذہن میں پادریوں کی کسی ایسی جماعت میں شرکت کا تصور تک بھی نہ تھا جو اس کلیسا سے باہر ہو جس کا حلفِ اطاعت وہ اُٹھا چکے تھے۔ اپنے تبلیغی جوش کے باوجود وہ "اسٹوڈنٹ والنٹیئر مشنری یونین" سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے کہ وہ خالصۃً کلیسائے انگلستان سے متعلق نہ تھا۔ ڈاکٹر ٹیٹ لو جو اس یونین کے سکریٹری تھے، لکھتے ہیں: "مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب ہم دونوں قلم پلیس کے

باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے، انہوں نے مجھ سے فرمایا، میں جانتا ہوں کہ یہ یونین سرگرم عیسائیوں کی ایک جماعت ہے۔ لیکن میں آپ سے ذاتی طور پر کوئی تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ اُن لوگوں کو بھی اس کا ممبر بنا لیتے ہیں جو قومی کلیسا کے مخالف ہیں۔' اس وقت میں نے ان کے متعلق یہ خیال کیا تھا کہ وہ آدمی تو بہت اچھے ہیں، لیکن انتہائی ضدی اور تنگ خیال پادری ہیں۔"

بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے وہ بے خوابی اور ہلکے بخار میں مبتلا ہو گئے اس کے بعد اُن کی صحت بالکل گر گئی یہاں تک کہ یارک شایر میں کلیسائی عہدیداروں کی معیت میں تعطیلات کا زمانہ گزارنے سے بھی ان کی صحت بہتر نہ ہوئی۔ ۱۸۹۹ء کے موسمِ گرما میں وہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن انہوں نے دالورتھ چھوڑتے وقت ایسے دلی رنج کا اظہار کیا کہ ان کی زندگی میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔

اُس زمانہ میں کالج کے مشن اپنی ابتدائی حالت میں تھے، پالیسیاں بن رہی تھیں اور تجربات کئے جا رہے تھے۔ اینڈریوز سے بالعموم مشورہ لیا جاتا تھا۔ انہوں نے ایک وسیع منصوبہ تیار کر دیا اور اسے کامیاب بنانے کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی امداد یہ تھی کہ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے تھے (اور ان کے رفقائے کار اس کے تسلط میں) اسے وہ عبادت کے درجہ تک پہنچا دیتے تھے اور دیکھنے والوں پر یہ تاثر باقی رہ جاتا تھا کہ وہ روحانی حقائق سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں ساؤتھ ورک کے پادریوں کا جو تفریحی اجتماع ہوا تھا وہ ان کی زندگی میں سنگِ میل کا درجہ رکھتا تھا اس لئے کہ وہاں آر۔ ایل۔ آوٹلے نے عیسائی تصوف کی جانب جس سے اس قدر غفلت برتی جا رہی تھی، سب سے پہلے ان کے خیالات کو منعطف کرایا اور

۵۱؎ یہ قدامت پسند گرجا کے عقائد کا نام ہے جس میں ہر قسم کی بدعت کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی ہے ان عقائد میں باپ بیٹا اور روح القدس کی الوہیت کو مساوی درجہ دیا گیا ہے۔ مترجم

والورتھ کی ہڑبونگ میں رہتے ہوئے بھی وہ شانتی اور سکون کا راز معلوم کرنے میں مصروف رہے۔

(۴)

پیمبروک کالج مشن کے زمانۂ قیام میں اینڈریوز نے تین مختلف کالجوں کی جانب سے فیلوشپ کی درخواستوں کو قبول کرنے سے اس بنا پر انکار کردیا تھا کہ وہ اپنے پسند کردہ کام سے بیحد خوش تھے۔ لیکن جب خرابیٔ صحت کی وجہ سے تبدیلی ناگزیر ہوگئی تو انہوں نے ٹمنرجی ٹریننگ اسکول کے وایس پرنسپل کے عہدہ کو قبول کرلیا اور کیمبرج واپس آگئے تاکہ وہاں دینیات کی تعلیم دیں۔ نومبر ۱۸۹۹ میں خود پیمبروک کالج کی فیلوشپ پر ان کا انتخاب ہوگیا۔ آیندہ چند سال تک ان کے وقت کا زیادہ حصّہ درس وتدریس اور مطالعہ میں گزرا، انہیں خصوصیت کے ساتھ جس چیز سے دلچسپی رہی وہ مذہب کی تاریخ تھی۔

والورتھ کی مصروف اور ہم آزما زندگی کے مقابلہ میں یہاں کوئی خاص واقعہ رُونما نہیں ہوا، لیکن اینڈریوز کے لئے یہ دَور پُرآشوب ذاتی غم واندوہ کا زمانہ تھا۔ جس سے انہیں نئے نئے تجربے ہوئے اور تحقیق کا بھی موقع ملا۔ جب وہ کیمبرج پہنچے، سی۔ایچ۔ پرائر سرطان کے مرض میں لب گور ہورہے تھے، اور اینڈریوز کے لئے ان کی موت صدمۂ عظیم تھا۔ اس کے بعد اور بھی موتیں ہوئیں۔ ۱۹۰۰ میں بیسل ویسٹ کوٹ دہلی میں ہیضہ سے انتقال کرگئے، اور بشپ آف ڈرہم بھی اپنے بیٹے کی وفات کے بعد زیادہ دن تک زندہ نہ رہے۔ خود پیمبروک کالج کو بھی سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ آر۔اے۔نیل جو یونانی اور لاطینی میں اینڈریوز کے ٹیوٹر رہ چکے تھے، ڈاکٹر سی۔ای۔ سرلؔ جو ہیڈ ماسٹر تھے اور سرجارج گیبرئیل اسٹوکس جو ان کی جگہ ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے، یہ سب دو سال کے اندر اندر انتقال کرگئے۔ یہ وہ محترم ہستیاں تھیں جن سے اینڈریوز احترام آمیز محبت کرتے تھے۔

ان موتوں نے خدمت کے نئے مواقع پیدا کردئے۔ بارہ برس تک مسلسل پیمبروک کالج کے ساتھ اینڈریوز کے تعلقات قائم رہے اور اپنی گہری واقفیت کی بنا پر وہ یکے بعد دیگرے دو ماسٹروں کی موت کے بعد کے زمانہ میں مختلف بیش قیمت طریقوں سے کالج کی خدمت کرتے رہے۔ وہ چیپلن بھی مقرر کردئے گئے تھے اور نئے رئیس المدارس اور ان کے رنقائے کار کو ان کے مشوروں پر بیحد اعتماد تھا۔ مزید برآں کشتی رانی کے شوق کی وجہ سے انڈر گریجوایٹوں کے حلقہ میں بھی مسرت آمیز طریقہ سے ان کی رسائی ہوگئی اور وہاں وہ سب کے مسلمہ معلم بن گئے۔ کیمبرج کالج کی "بوٹ کلب" کے ایک سابق کپتان ریورینڈ ایف۔ اے۔ جیمس رقمطراز ہیں: "اینڈریوز آٹھوں کشتی رانوں میں سے ہرایک کو تعلیم دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے اور عملہ میں جو لوگ نہایت ناتجربہ کار اور ناتراشیدہ ہوتے تھے، ان کے ساتھ تو وہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتے تھے۔ وہ ان سے کشتی رانوں کے عملہ کی حیثیت سے ایسے طریقہ سے ایک ساتھ کشتی رانی کراتے تھے کہ بہت کم لوگ ایسا کرسکتے تھے، اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ نوآموزوں کی ہمت بندھانے میں بیحد دلچسپی لیتے تھے۔ ...... اپنی اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے وہ انڈر گریجوایٹوں کے اور قریب آگئے۔ یہ بات کالج کے بہت سے افسروں کو نصیب نہیں ہوسکی۔ مجھے اس پر کبھی تعجب نہیں ہوا کہ وہ ٹہلتے ٹہلتے میرے کمرے میں آجاتے تھے تاکہ کالج کے مسائل پر گفتگو کریں یا اس امر پر بحث کریں کہ ایسے طلبا میں جو اپنے کام میں لاپرواہ واقع ہوئے تھے، کس طرح سرگرمی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔"

پیمبروک میں جو پے درپے موتیں ہوئیں، اور جن کا سوگ اینڈریوز کو منانا پڑا ان میں اینڈریوز کی بہن کیتھلین کی موت بھی شامل ہے۔ یہ پہلا قطع تعلق تھا جو ایک گھٹے ہوئے متحد خاندان میں رونما ہوا اور یہ قدرتی بات تھی کہ اینڈریوز کے خیالات روح کی بقا اور نادیدہ روحانی دنیا کی طرف منعطف ہوں۔ ۱۹۰۳ء کے

موسم گرما کی تعطیلات میں ایک شام کو جب کالج میں خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا، انہیں ایسی شدت کا تجربہ ہوا جس سے ان کی روح کو آیندہ کئی سالوں کے لئے سہارا مل گیا۔ وہ کالج کی چلمنوں کے پیچھے شام کی خاموش افق کی روشنی میں تنہا کھڑے ہوئے اولڈ کورٹ سے پورٹرز لاج کی طرف دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے ایک صورت کو اپنی طرف آتے دیکھا "جو عشائے ربانی کا منصبی لباس پہنے ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں مقدس ظروف بھی تھے" وہ احتراماً الگ کھڑے ہوگئے تاکہ اُس پادری کو گزرنے دیں کہ اتنے میں وہ صورت اولڈ کورٹ کے دروازہ کی جانب چلی گئی اور غائب ہوگئی۔ اس دروازہ پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور وہ استعمال میں نہیں آتا تھا۔ یہ دروازہ صدیوں پیشتر پرانے گرجا کے اس کمرے کی طرف جاتا تھا جہاں قدیم گرجا کے متعلقہ ظروف رکھے جاتے تھے۔ بہت رات گئے تک وہ اس سایہ پر غور کرتے رہے اور بتدریج ان پر اس امر کا انکشاف ہوا کہ یہ ساری روشنی تو خود اُن کے دِل میں سے نکل کر باہر آئی ہے

مانک ویرما ؤتھ کی بوڑھی عورت کی طرح اینڈریوز اس شخص کے مذہبی تجربہ کی حقیقت سے وجدانی طور پر واقف ہوگئے تھے اور اس لئے وہ ان کے پاس اور زیادہ تعداد میں اپنی مشکلات کا حل ڈھونڈنے کے لئے آنے لگے۔ یہ کام اسقدر ضروری اور اس قدر اہم معلوم ہوا کہ دہلی میں بیل ویسٹ کوٹ کی وفات کے بعد بھی اینڈریوز کو یقین نہ ہو سکا کہ انہیں آنجہانی کی جگہ لینے کے لئے طلب کیا گیا ہے۔ ایک زمانہ میں ان کی جوشیلی طبیعت میں وسط افریقہ جانے کا شوق پیدا ہوا تھا جہاں انہیں "سخت مصائب سے دو چار ہونا پڑتا،" لیکن بیل کے انتقال کے بعد وہ سمجھ گئے کہ انہیں صرف ہندوستان جانا ہوگا اور کہیں نہیں۔

اس کے باوجود وہ متامل تھے۔ کیمبرج کے بھی مطالبات اُن پر بہت تھے اور وہیں رہنے کے لئے ان پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا جارہا تھا۔ کوئینز

کالج کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر رائل نے اس معاملہ کا فیصلہ کر دیا۔ انہوں نے کہا: "ابھی تمہاری عمر ۳۳ سال کی ہے اور ہر سال جو گزریگا، تمہارے لئے کیمبرج سے باہر جانے کے سوال کو اور زیادہ مشکل بنا دیگا۔ لہذا اگر تم ہندوستان جانا چاہتے ہو، تو تمہیں فوراً چلا جانا چاہیے۔ پانچ سال کے عرصہ میں تم ضرورت سے زیادہ بوڑھے ہو جاؤ گے۔" اب ان کے سامنے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اور نہ ان کے دل میں اپنے ہندوستان جانے کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ ہی باقی رہ گیا تھا۔ اب انھیں چلا جانا چاہیئے۔

چونکہ الوداعی جلسے ان کی گہری محبت سے معمور فطرت کے لئے غیرموزوں تھے، اس لئے پیمبروک مشن کے مردوں اور عورتوں نے ایک دعائیہ سروس (نماز) میں جو ساؤتھ وَرک کے گرجا میں بشپ ٹیلبوٹ کی رہنمائی میں ادا کی گئی تھی، انہیں نہایت سادگی سے یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ ان کے لئے اس بات کی دعا مانگتے رہینگے کہ آدم خور انہیں نہ کھانے پائیں[1] تھرا کر وہ اپنی ماں کے گھٹنے کے پاس جیسا کہ وہ بچپن میں کیا کرتے تھے، نماز میں دوزانو ہو گئے۔ انہوں نے آخری اتوار کیمبرج میں صرف کیا، اور ۲۸ فروری ۱۹۰۴ کو ژالہ باری کے سخت طوفان میں لندن سے روانہ ہو گئے اور پریشانی کے عالم میں وہ یہ سوچ رہے تھے کہ آیا جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔

سوئٹزرلینڈ کے سورج اور حسن نے اور لگانو میں پیمبروک کے ایک قدیمی دوست کی پُرتپاک خوش آمدید نے ان کی ہمت کو بحال کر دیا۔ انہیں ہم آخری مرتبہ ٹریسٹ میں دیکھتے ہیں جب وہ یورپ کی سرزمین کو الوداع کہہ رہے تھے اس وقت وہ انگلستان کے ایک مثالی نوجوان اور کالج کے طالب علم کی طرح

---

[1] اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے ان پڑھ مردوں اور عورتوں کے دلوں میں اُس زمانہ میں ہندوستان کے متعلق کیا کیا خیالات موجود تھے۔ مترجم۔

نظر آتے ہیں، اطالوی قلیوں کو بتاتے ہیں کہ گولف کے ڈنڈے کو کس طرح سے تھمانا چاہیئے اور مسز حم کے ساتھ مسکرا دیتے ہیں جب وہ ایک جرمن کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں: "اسے کرکٹ کہتے ہیں۔" لیکن یہ بالکل مثالی طالب علم نہ تھے۔ اس لئے کہ ان کی جیب میں راستہ کے مطالعہ کے لئے سنسکرت کی ایک ڈکشنری بھی تھی۔

پانچ دن کے بعد پورٹ سعید میں انہیں پیمبروک سے ایک تار ملا جس میں انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ کشتی رانوں کی جس ٹیم کو انہوں نے تربیت دی تھی، وہ مقابلہ میں جیت گئی۔

اس وقت اینڈریوز بہت مسرور تھے اور انہوں نے اپنا رخ مشرق کی طرف کرلیا۔

باب ۴

سینٹ اسٹیفنز کالج، دھلی

(۱۹۰۴ سے ۱۹۰۷ تک)

(۱)

اینڈریوز یادگار دن ہمیشہ منایا کرتے تھے۔ اپنی پیدائش کا دن اور کلیسائی تہواروں کے دن اُن کی نظر میں خاص مفہوم رکھتے تھے۔ وہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۴ کا دن یعنی جس دن انہوں نے ساحلِ بمبئی پر قدم رکھا، "ہندوستانی جنم دن" کی طرح مناتے تھے اس لئے کہ اُس دن وہ تجربہ کی نئی دنیا میں داخل ہوئے تھے اور جیسا کہ وہ خوش ہو کر کہا کرتے تھے، "اس حقیقت نے مجھے 'دوجنمی' کا درجہ دیدیا ہے" دہلی میں اُن کے ابتدائی ایام اس طرح سے گزرے جیسے وہ کوئی مسحور کن خواب دیکھ رہے ہوں۔ صبح کے وقت وہ قدسیہ باغ میں سیر کے لئے چلے جاتے اور وہاں بیٹھکر وہ کیف و رنگ کے نازک اور حسین پیکروں کا مشاہدہ کرتے جب کہ عورتیں جمنا گھاٹ والے مندر میں جاتے وقت پھولوں کی ٹوکریاں لیکر جاتیں بعض مرتبہ وہ رات گئے تک تاروں بھرے آسمان کے نیچے جاگ کر وقت گزارتے اور محسوس کرتے کہ "تارے نیچے اُتر کر انہیں ابدیت کے گیت سنا رہے ہیں" بعد

میں حیرت روز بروز کم ہوتی گئی: لیکن غروب آفتاب، تاریکی اور طلوع سحر کے نظارے اپنے پُراسرار حسن کے جلووں کے ساتھ جن کا مشاہدہ اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں ہوا تھا، بدستور اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گزرتے رہے۔

سینٹ اسٹیفنز کالج کے پرنسپل ہبرٹ ویسٹ کوٹ جو کیمبرج میں ان کے ہمعصر رہ چکے تھے اور جو اُس جلسہ کے نتیجہ کے طور پر جسے انہوں نے اپنے اَنڈر گریجوایٹ دَور میں طلب کیا تھا،" برادر ہڈ" میں شامل ہوئے تھے (اگرچہ خود اینڈریوز کو عرصۂ دراز تک یہ حقیقت معلوم نہ ہو سکی)۔" پَیڈی" ڈے ایک نوجوان آئرشمین جو بیسِل ویسٹ کوٹ کی وفات کے بعد کالج کے اسٹاف میں شامل ہوگئے تھے، ایک زمانہ میں دینیات اور کشتی رانی میں اینڈریوز کے شاگرد رہ چکے تھے دہلی میں" کیمبرج برادر ہڈ" کے افسرِ اعلیٰ ایس۔ایس۔آلنٹ تھے جنہوں نے گزشتہ صدی کے آخری سالوں میں سینٹ اسٹیفنز کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کشمیری دروازہ کے قریب کالج کی عمارات تعمیر کرائی تھیں۔ان کی مغلیہ طرزِ تعمیر (جسے رجعت پسندانہ مشنری جذبہ کے خلاف اختیار کیا گیا تھا) زندگی اور تخیل کی ہندوستانی روایات کے اعتراف کی مرئی نشانی تھی جو ہمیشہ سے کیمبرج مشن کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔ اینڈریوز انگلستان میں آلنٹ سے مل چکے تھے اور وہ ان کے دل ودماغ کی صفات کے بیحد مداح تھے۔ ایسے آدمیوں میں وہ بہت جلد گھُل مل جاتے تھے، لیکن جس شخص نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ کالج کے وائس پرنسپل سُوشِیل کمار رُدرا تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے تین چھوٹے بن ماں کے بچوں کو دیکھکر اینڈریوز کے مادرانہ جذبات گہرے طور پر متاثر ہوتے اور ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ وہ ان کے گھر میں اپنے وقت کا کافی حصہ گزارنے لگے۔اس طرح جو گہرے مراسم دہلی میں ان تین ہفتوں میں قائم ہوگئے وہ اس راہ کا تعیّن کرنے میں معاون ثابت ہوئے جس میں اینڈریوز کے خیالات کی نشوونما ہونے والی تھی۔ انہوں نے ۱۹۲۳ میں لکھا: میں سُوشِیل رُدرا کا جس قدر احسان مند ہوں، اتنا دنیا میں کسی اور شخص

کا نہیں ہوں۔اسی دوستی کی وجہ سے ہندوستان میرے لئے ابتدا ہی سے اجنبی ملک نہیں رہا بلکہ اس نے ایک ایسے ملک کی حیثیت اختیار کرلی جس سے میں ایک گونہ واقف ہو چکا تھا۔"

۱۲ اپریل کو اینڈریوز رسمی طور پر "برادرہڈ" میں شامل کر لئے گئے اور وہاں سے وہ فوراً شملہ چلے گئے تاکہ وہاں رہ کر اُردو سیکھیں۔ یہاں جس پادری کے ساتھ وہ مقیم تھے، وہ پیمبروک کالج کے زمانہ کا دوست نکلا۔ ان کے جونیئر افسروں میں پیمبروک کے ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے ۲۰۷۔اے ایسٹ اسٹریٹ میں ایسے جلسے دیکھے تھے جنہیں خوب ادہم مچتا تھا۔ اینڈریوز خود کچھ عرصہ تک قائم مقام وائسرائے لارڈ ایمپتھل کے بچوں کے اتالیق رہے، اور اس طرح ابتدا ہی میں سرکاری اور فوجی حلقوں سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے، اگرچہ دہلی اس وقت محض ایک غیراہم صوبائی شہر کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستان میں اپنی آمد کے ایک مہینے کے اندر اندر ہی اُن تباہ کن حالات سے واقف ہو گئے جو نسلی تفاخر کی بنا پر انسانی تعلقات میں نشو نما ہو رہے تھے۔ کیمبرج یا جنوبی لندن میں ان کے کام کے ریکارڈ میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے ظاہر ہو کہ نسلی تعصب (عصبیت) کا سوال کبھی ایک خصوصی عیسائی مسئلہ کی حیثیت سے ان کے سامنے آیا ہو۔ صدی کے آخر میں انگریزی یونیورسٹیاں صحت بخش طریقہ سے اس سے مبرا تھیں۔ مثلاً اینڈریوز بیان کرتے ہیں کہ جب وہ پیمبروک کالج مشن کے انچارج تھے اسوقت یہ رسم تھی کہ دوران سال کے ایک نہایت معتبر و نمبر دار انڈر گریجوایٹ کو کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے کام کے لئے منتخب کیا جاتا تھا اور اس زمانہ میں یہ عزت رائے عامہ کے ذریعہ ایک ہندوستانی طالب علم کو دی گئی۔ لیکن جس صورتِ حال کا انہوں نے ہندوستان میں مشاہدہ کیا وہ تکلیف دہ طریقہ پر اس سے کہیں مختلف تھی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کے بعض طلبا میں ذات پات کے تعصبات کی شدت دیکھکر انہیں بہت صدمہ ہوا، لیکن سفید فام لوگوں کی برتری کا جو احساس انہیں شملہ میں ہوا اس سے وہ اور زیادہ رنجیدہ ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں بہت سے امور ایسے پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین معاشرتی اختلافات کی خلیج وسیع تر ہو گئی تھی۔ مختلف ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں کے لئے ایسے آدمی آنے لگے تھے جنہیں ملک سے کسی قسم کی ذاتی دلچسپی نہیں تھی، ترقی یافتہ رسل و رسائل اور دوسری سہولتوں کی وجہ سے ان کی بیویوں کے لئے ممکن ہو گیا تھا کہ وہ اپنے شوہروں کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ ان عورتوں نے اپنی تکلیف دہ تنہائی اور عدم شغل کی وجہ سے ہل اسٹیشن پر مصنوعی قسم کی سوسائیٹی کی مسرفانہ حماقتوں کو جنم دیدیا۔ صحت بخش اور آزادی پسندانہ قدامت پرستی جس میں خود اینڈریوز کی تربیت ہوئی تھی کی جگہ متمردانہ اور جنگجویانہ امپیریلزم نے لیلی۔ مشنری حلقے بھی اس زہر سے نہ بچ سکے۔ ۱۹۰۷ میں ایک انگریز عیسائی نے جو پادری تو نہ تھا مگر جس نے زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں بسر کیا تھا، کھلم کھلا اس رائے کا اظہار کیا کہ "پادریوں کا اثر و رسوخ تیزی کے ساتھ کم ہو رہا ہے اور اس راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں وہ مشنریوں میں نسلی تفاخر اور پادریوں میں عہدے کا غرور ہے"۔

اینڈریوز کا شروع ہی سے خیال تھا کہ ذات پات کی وجہ سے ہندوؤں کی اور نسلی تفاخر کی وجہ سے انگریزوں کی الگ تھلگ رہنے کی خواہش ایک ہی جذبہ کا نتیجہ ہے۔ وہ اس "صاحب" میں جو ہندوستانی ریل کے ڈبے میں "نیٹو لوگوں" کے ساتھ سفر کرنے سے انکار کر دیتا تھا اور اس قحط زدہ پہاڑی لڑکے میں جس کا چہرہ فاقہ میں مبتلا ہونے کے باوجود اینڈریوز کے ہاتھ سے روٹی کی پیشکش پر غصہ اور حقارت سے تمتما اٹھا تھا"، کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود نسلی زہر سے متاثر نہیں ہوئے اس لئے کہ انہیں اخلاقی اصولوں کا واضح احساس تھا اور دوسری طرف رودرا کی دوستی ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ وہ اور زیادہ ہندوستانی دوستوں کے متمنی تھے، لیکن جس واحد ہندوستانی سے شملہ میں ان کے تعلقات قائم ہوئے وہ ان کے شریف اور بوڑھے اردو کے استاد مولوی شمس الدین تھے۔ ان دونوں

نے شملہ کے رسم و رواج کا اس حد تک کا مقابلہ کیا کہ دونوں جنگی علاقوں میں ایک ساتھ سیر کے لئے دُور دُور نکل جاتے۔ انہی سیر سپاٹوں میں اینڈریوز کو ایک دوسرے مذہب کے مذہبی انسان سے ارتباط رکھنے کا پہلا تجربہ حاصل ہوا۔

کیمبرج میں پروفیسر براؤن کے مکان پر شام کے جو طویل گھنٹے صرف ہوتے تھے اس نے سب سے پہلے اینڈریوز کے دل میں مذہب اسلام سے دلچسپی پیدا کی۔ مولوی شمس الدین نے اُن کی اِس خواہش میں کہ وہ اسلامی روح کو سمجھنا چاہتے ہیں، اور زیادہ شدت پیدا کر دی اور جب وہ دہلی واپس آئے تو انہوں نے ایسے اشخاص کی جستجو کی جن کی صحبت ان کے اس ذوق کی تکمیل میں مدد دے سکے۔ یہاں ابھی تک ایسے لوگ زندہ تھے جو دربار مغلیہ کی قدیم ایرانی شرافت کی شاندار روایات کے حامل تھے۔ قدیم دبستان سے تعلق رکھنے والے شریف اشخاص جنہوں نے ۱۹ویں صدی کے آخری دور کی "دہلی کی پُرشکوہ نشاۃِ ثانیہ" میں عملی حصہ لیا تھا۔ مولوی ذکاء اللہ اور مولوی نذیر احمد اسی قبیل کے آدمی تھے۔ ان دونوں کے دلوں میں مذہبی اعتقاد اور ماضی کے احترام کے ساتھ ساتھ یہ یقین بھی جاگزیں تھا کہ جدید علوم میں فیض رسانی کی زبردست قوت موجود ہے اور اسی لئے وہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے زبردست حامی بن گئے تھے۔ وہ ایک غیر رسمی کلب سے متعلق تھے جس کا اجتماع ملکہ کے باغ کی قدیم لائبریری کی چھت پر غروب آفتاب کے بعد ہوا کرتا تھا اور جہاں اس نوجوان انگریز کو خوش آمدید کہا جاتا تھا، انہوں نے اس شخص کے دوستانہ انداز اور انکسار پسندی کو اس کی دلربائی کے پیش نظر نا قابل مزاحمت سمجھا اور وہ اس سے اپنے مذہبی تجربات کے متعلق کھل کر بات چیت کرنے لگے۔ وہ اُن سے کہتے: "آپ مذہب کی اُس قوت اور جوش کو جو ہم لوگوں میں ہے، کبھی نہیں سمجھ سکینگے۔ تاوقتیکہ آپ کے دل میں قرآن شریف کی شاعرانہ موسیقی کا احساس نہ پیدا ہو جائے۔ اس سے پہلے دنیا میں اس قسم کی موسیقی موجود نہ تھی۔" شریف اور بزرگ ذکاء اللہ اس پر اضافہ کرتے: "بحث و استدلال کی کیا ضرورت ہے؟ آپ مجھے اللہ کے اسمائے حسنیٰ بتائیے جو آپ کے یہاں رائج ہیں اور پھر میں

اپنے یہاں کے اسمائے حسنیٰ بتاؤں گا۔"[1]

شملہ سے واپسی کے بعد جو ہفتہ گزرتا وہ سوشیل رودرا کے لئے اینڈریوز کی محبت اور احترام میں مزید اضافہ ہی کا باعث ہوتا۔ یہ دونوں دوست اپنی شام کے طویل گھنٹے اُس تاریخی پہاڑی پر چہل قدمی میں صرف کرتے جہاں سے غدر کے ایام میں دہلی پر حملہ کیا گیا تھا، یا پھر چاندنی رات میں قدسیہ باغ میں ہاتھ ڈالے اِدھر سے اُدھر پھرتے رہتے اور ہندوستان میں اینڈریوز کے تجربات کے متعلق طویل اور سنجیدہ گفتگو کرتے۔ یہ رُدرا ہی تھے جنہوں نے اینڈریوز کو بتایا کہ رشوت ستانی اور بداعمالی جسے انگریز افسر ہندوستانیوں کی مخصوص کمزوری سے تعبیر کرنے کے عادی ہیں درحقیقت مظلوموں کا عالمگیر حربہ ہے اور ملک کے قدرتی معاشرتی نظام میں اسے کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں ہے۔ ماہر معاشیات کی حیثیت سے رُدرا ہی تھے جنہوں نے انہیں یقین دلایا کہ جب گوپال کرشن گوکھلے جیسے لیڈر نے انگریزی نظم ونسق پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ "باشندوں کے خوفناک افلاس" کا ذمہ دار ہے،[2] تو اس الزام میں اُس سے کہیں زیادہ سچائی مضمر تھی جتنی شروع شروع میں اینڈریوز تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے۔ جب گفتگو سیاسیات سے ہٹ کر مذہب پر آجاتی تو اس وقت رُدرا ہی نے ایک مرتبہ پھر اینڈریوز کو اُس روایتی پرہیزگاری کی خوبصورتی اور طاقت سے واقف کرایا جو بے شمار حقیر زندگیوں کو صبر، سادگی اور فطری نیکی عطا کرتی ہے۔ بالآخر رُدرا ہی تھے جنہوں نے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ جس سخت قسم کی جماعتی علیحدگی کو پادری اب تک برقرار رکھے ہوئے ہیں، وہ حضرت مسیح کی تعلیم سے بالکل مختلف ہے۔ رُدرا کلیسا کے الگ تھلگ رہنے کی روایات

---

[1] مزید حالات کے لئے دیکھئے "ذکاءاللہ دہلوی" مصنفہ سی۔ایف۔اینڈریوز، مطبوعہ تعلیمی مرکز، کراچی

[2] صدارتی ایڈریس، انڈین نیشنل کانگریس، ۱۹۰۵

کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ وہ خود اُن کی ترکیب کلیسا پر ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔ اینڈریوز نے اُن کے اس دلی کرب کو محسوس کیا اور اس کا اثر انقلاب انگیز نکلا۔ایک مرتبہ انہوں نے اس تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "میری آنکھوں پر سے پردے ہٹ گئے" دسمبر ۱۹۰۵ء میں وہ شخص جس نے اسٹوڈنٹ والنٹیر مشنری یونین کے ساتھ اس بنا پر اشتراک عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کے ممبروں میں قومی کلیسا کے مخالفین بھی شامل ہیں، اب اپنے بشپ کو اس امر کے لئے مجبور کرنے میں سب سے پیش پیش تھا کہ نیشنل مشنری سوسائٹی آف انڈیا کو جو غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر نئی نئی قائم ہوئی ہے، تسلیم کریں اور اس کی ترقی کے لئے دعا دیں۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ دن آئے، ہندوستان میں اینڈریوز کے کام میں ایک اتفاقی اور ناخوشگوار رکاوٹ پیدا ہو گئی، یعنی ان کے کان میں مدت سے کوئی تکلیف تھی جو دفعتہً بڑھ گئی۔اپریل ۱۹۰۵ء میں انہیں علاج کے لئے فوراً انگلستان بھیجد یا گیا جہاں وہ چھ ماہ تک قیام پذیر رہے۔انہوں نے دیکھا کہ نسلی تفاخر کی اسپرٹ نے یونیورسٹیوں میں تباہی مچا رکھی ہے۔سینٹ اسٹیفنز کالج کا ایک نہایت ذہین نوجوان طالب علم ہردیال[1] جس نے آکسفورڈ میں داخلہ کے لئے سرکاری وظیفہ حاصل کیا تھا، اس مایوس کن اور غیر دوستانہ ماحول سے اسقدر اکتا گیا کہ قریب تھا کہ وہ اپنی علمی ڈگریوں کو انقلابی مہم کی دشوار گزار راہ پر قربان کر دے۔ناتنے میں اینڈریوز نے اس سے

---

[1] ہردیال دہلی کا رہنے والا تھا اور اس کو شمار نہایت ذہین طلبا میں ہوتا تھا۔جو سلوک اس کے ساتھ انگلستان میں روا رکھا گیا اس نے بالآخر اسے انقلاب پسند بنا ہی دیا۔پہلی جنگ عظیم میں اس نے جرمنی کا ساتھ دیا اور ترکی میں آکر مسلمان ہو گیا۔مگر بعد کو اس نے تبدیلی مذہب کر لیا۔مقدمۂ سازش دہلی ۱۹۱۴ء میں اس کا بار بار تذکرہ آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سازش کی تہ میں ہردیال کا دماغ کارفرما تھا۔بہرحال یہ ان طلبا میں تھا جس پر پنجاب یونیورسٹی سدا فخر کرے گی۔اس کا حافظہ بھی بیحد قوی تھا اور جو کتاب وہ ایک مرتبہ پڑھ لیتا تھا اسے یاد ہو جاتی تھی مترجم

بہت طویل گفتگو کی اور ہندوستانی مسائل پر اپنی تقریروں اور خطبوں میں نسل اور رنگ کے تعصبات کی پرجوش طریقہ سے مذمت کی اس لئے کہ یہی چیزیں ایسے المناک واقعات کو ممکن بنادیتی ہیں۔ ۰۵-۱۹۰۴ کے تجربات اینڈریوز کو نسلی مساوات کا پرجوش پیغمبر بنا چکے تھے اس موسم گرما میں جو کچھ کام انہوں نے کیا اس کا تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن جن لوگوں نے برمنگھم اور کیمبرج میں ان کی تقریروں اور خطبوں کو سنا ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ خطبے خود اُن کے اپنے عیسائیانہ غور وفکر کی نشوونما میں سنگ میل کا درجہ رکھتے تھے۔

(۲)

جس زمانہ میں اینڈریوز نے دہلی میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، اسی زمانہ میں جاپان نے سوشیما کی آبنائے میں روس کے خلاف تاریخی فتح حاصل کی تھی — ہندوستان کے ہر اخبار اور میگزین کے صفحات سے اُس کارنامہ کی گونج بلند ہورہی تھی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کے کامن روم[1] میں ایک لیکچرر نے اس خبر کے ہندوستانی ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے بالآخر کہہ ہی دیا: "جاپان نے دنیا پر ثابت کردیا ہے کہ مشرق مرتی ہوئی اقوام کا مسکن نہیں رہا۔" تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں قومی امنگ کی ایک لہر دوڑ گئی جس کے نتیجہ میں قومی خدمات کی بہت سی شاندار اسکیموں کی تخلیقی تحریک کی بنیاد پڑگئی۔ گوپال کرشن گوکھلے نے "سرونٹس آف انڈیا سوسائیٹی" کی بنیاد ڈالی اور اس کے بلند مطمح نظر کا گہرا اور دُوررس اثر پڑا۔ پرجوش نوجوانوں نے ذات پات کی بندشوں کو توڑ کر ہندوستان کے نام پر ہندوستانیوں کی خدمت کرنے کو اپنا اوّلین فرض سمجھا۔ اینڈریوز کا ایک ہندو شاگرد ۱۹۰۵ میں پنجاب کے طاعون زدہ علاقوں میں "اچھوتوں" میں کام کرنے کے لئے چلا گیا اور اسی سال دھرمسالہ کے زلزلہ کے بعد

---

[1] پروفیسروں کی نشست گاہ۔ مترجم

امدادی فنڈ کے لئے جو اپیل کی گئی اس میں کالج نے کشادہ دلی کے ساتھ حصہ لیا — یہ پہلا موقع تھا جبکہ طلبا نے کسی ایسے مقصد کے لئے خوشی سے روپیہ دیا ہو۔ نیشنل مشنری سوسائیٹی جو دسمبر ۱۹۰۵ میں قائم ہوئی وہ ہندوستانی عیسائیوں میں قومی شعور کی اسی بیداری کا نتیجہ تھی۔

پُرجوش اصول پرستی اور جاگی ہوئی امنگوں کے ایسے زمانہ میں یونیورسٹی کے ایک ایسے ٹیچر کے لئے جس میں تخیل اور جذبۂ ہمدردی ہو، خدمت الناس کے بیشمار مواقع موجود تھے — چنانچہ اینڈریوز نے اُن مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہ اس کام کے لئے ہر طرح موزوں بھی تھے۔ کیمبرج میں مابعد کے سالوں میں تاریخ کے مفہوم کے بارے میں ان کے خیالات میں نئی زندگی اور گہرائی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے لئے وہ لارڈ ایکٹن کے بہت زیادہ احسانمند تھے جن کے "زمانۂ حال کی تاریخ کے لکچر" یونیورسٹی کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو بن چکے تھے، اور دینیات کے ٹیچر کی حیثیت سے مذہب اور کلیسا کی تاریخ ان کا خاص مضمون تھا۔ اگرچہ علم و فضل کی روایتی فضا میں ان کی تربیت ہوئی تھی تاہم جو دلچسپی انہیں اس مضمون سے تھی وہ خود لارڈ ایکٹن کی طرح محض درسیات تک محدود نہ تھی۔ انہوں نے ماضی کے واقعات کا اس لئے مطالعہ کیا تھا کہ ان کی روشنی میں حال کا اندازہ لگائیں اور مستقبل کی کنجی کی تلاش کریں، اور ہندوستان کے فوری حالیہ واقعات پر بنی نوع انسان کے تجربوں کی مدد سے روشنی ڈالیں جو دور دراز زمانہ میں مساوی صورت حالات میں رونما ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ماضی کا اٹلی، شیکسپیئر کا انگلستان، سلطنت روما کے صوبجات جبکہ وہ تنزل پذیر تھے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان کے مسائل پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی رائے میں تاریخ اور علم ادب میں بنی نوع انسان نے جو کارنامے دکھائے ہیں وہ انسانی اسپرٹ کی عظمت کی ضمانت ہیں۔ ایک طالب علم نے بتایا کہ کس پُرجوش حقارت سے انہوں نے جماعت کے سامنے اس کہاوت پر کہ "ایمانداری سب سے اچھی پالیسی ہے" اپنے دلی خیالات

کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "محض ذلیل دور اندیشی ایسے زبردست ماضی کو حاصل نہیں کر سکتی اور نہ اس میں اتنی قوت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ مستقبل کی کسی تخلیقی تحریک کے لئے فیض پہنچانے کا باعث بنے۔" اس تبصرہ کا اثر دلوں کی گہرائیوں تک پہنچا۔ زندگی پر زندگی کے نقوش کی پیمائش کے لئے کوئی گز نہیں ہے، لیکن آج ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر ایسے با اثر اصحاب موجود ہیں جن کے قومی جوش میں سینٹ اسٹیفنز کالج میں اینڈریوز کی جماعتوں کے ذریعہ نئی زندگی پیدا ہوئی اور انسانی زندگی کے متعلق نئے مطمحِ نظر کی بنیادیں پڑیں۔ ان کا درس زندگی بخش اثرات رکھتا تھا۔ وہ جس حکمت کے ساتھ قومیت کے ہمہ گیر جذبہ کو اس سے متعلق کر دیتے تھے، اسی میں اُن کے واقعتہ ناقابل اندازہ اثر و رسوخ کا راز مضمر تھا جو اس دس سالہ دور میں دہلی اور تمام ہندوستان کے طلبا پر پڑا۔

اینڈریوز کو ہندوستان کی قومی آزادی سے ہمدردی رکھنے میں اور اس عقیدہ میں جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی کہ برطانوی تعلق لازمی طور پر ہندوستان کے لئے سودمند ہے، کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ ابھی تک انہوں نے کوئی ایسی وجہ نہیں دیکھی تھی جس کی بنا پر ان کے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو۔ ان کا اصول تھا کہ "دوسروں کے ساتھ وہی کرو جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں۔" اگر انگلستان سیاسی خود ارادیت کا قدر دان ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ سلطنت میں اس کے دوسرے حصہ دار بھی اسی خصوصی حق سے بہرہ اندوز ہوں۔ انہوں نے لکھا:

"انگلستان اور انگریزی کلیسا زمانۂ ماضی میں قومی آزادی کی کشمکش سے اس حد تک فائدہ اٹھا چکے ہیں کہ انہیں اب زمانۂ حال میں ہندوستان کو اور ہندوستانی عیسائیوں کو وہی آزادی عطا کرنے میں پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔"[1] سفید ذات کی برتری کے جن اصولوں کا انہیں خود تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اس کے باوجود برطانوی سلطنت کے مطمحِ نظر

---

[1] "ایسٹ اینڈ ویسٹ" ۱۹۰۵ اکتوبر ۱۹۰۵

پر ان کے اعتقاد میں تو لزل پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ انہیں لغزشوں سے تعبیر کرتے تھے اور بس۔ اس سلسلہ میں ان کی پوزیشن کی وضاحت اس لیکچر سے ہوتی ہے جو انہوں نے لاہور میں ۱۹۰۶ میں ہندوستانی قومیت پر دیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"میری ایک بڑی خواہش یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے اس امر کا اظہار کروں کہ ایک عیسائی مشنری اور ایک وفادار انگریز کی حیثیت سے مجھے آج کی ہندوستانی قومیت کی زیادہ بلند تمناؤں کے ساتھ پوری پوری ہمدردی ہے۔ کیا میں یہ کہہ سکتا ہوں اور ساتھ ہی اپنے ملک اور بادشاہ کا بھی کلی طور پر وفادار رہ سکتا ہوں ؟ میں پرزور الفاظ میں کہتا ہوں کہ" بیشک برطانوی سلطنت کا دستور اور اس کے بنیادی اصول ایسے ہیں کہ ان کے حدود کے اندر نہایت مکمل اور نہایت آزادانہ ترقی کی گنجائش موجود ہے۔ میں آپ سے پرزور درخواست کرونگا کہ آپ قومیت کے تخیل کی پرورش وفادارانہ اور آئینی طریق پر کریں اور اس کی بنیاد خود ملکہ معظمہ کے اعلان پر رکھیں۔"

انگریزی علم وادب پڑھاتے وقت اینڈریوز جماعتوں میں اپنے ہندوستانی طلبا کے سامنے انگریزی شعرا اور آزادی کے پیغامبروں کے الفاظ کو یہ کہکر پیش کیا کرتے تھے کہ یہ خود اُن کی اپنی جائز میراث ہے۔۔ شیلے اور ٹینی سن، ورڈز ورتھ اور ملٹن اور سب سے بڑھکر شیکسپیئر کے الفاظ کو۔

"ہم شیکسپیئر کی زبان بولتے ہیں۔

لہذا ہمیں یا تو آزاد ہونا چاہیئے یا مر جانا چاہیئے۔"

یہ سبق وہ پڑھاتے تھے مگر اس طرح کہ ساتھ ساتھ یہ ترغیب بھی دیتے جاتے تھے کہ وہ ان الفاظ کو اپنا لیں۔ "شیکسپیئر اور قومیت" ان کا عزیز ترین موضوع تھا اور "ہنری پنجم" ان کے محبوب ترین ڈراموں میں سے ایک۔ وہ اس کی اور دوسرے تاریخی ڈراموں کی صحت بخش اور آزادی پسند حب الوطنی کی تشریح کرکے خوش ہوتے تھے۔ طلبا محویت کے عالم میں سنا کرتے تھے جبکہ وہ ہارفلوز کے روبرو

"ہنری پنجم" کی تقریر سنایا کرتے تھے، اور وہ خود بھی مساوی محویت کے عالم میں فلوائیلن کے طربیہ میں غرق ہو جاتے تھے۔ کالج کے ڈرامے جو اینڈریوز کی زیر نگرانی کھیلے جاتے تھے ان سے تخیل کو شہ ملنے کے علاوہ ساتھ ملکر کام کرنے کا تجربہ حاصل ہوتا تھا اور شائستہ تفنن طبع کے اظہار کا موقع بھی ملتا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ رومیو اور ہیملیٹ قوم کے نوجوانوں کے لئے اس تنبیہ کے آئینہ دار ہیں کہ وہ ایک طرف ضرورت سے زیادہ کمزوری کے جذبہ کا اظہار نہ کریں اور دوسری طرف محض منصوبے باندھنے والی قیاس آرائیوں سے کام نہ لیں، اور اُن پر زور دیکر کہتے تھے کہ وہ ان تمام کاموں میں جو قومی بہبودی پر اثر انداز ہوں، منضبط تخیل اور سرگرم عمل کی اہمیت کو پیش نظر رکھیں۔

تاہم جہاں وہ طلبا میں ماڑنی کے "انسانی فرائض" کے لئے اپنا سا جوش پیدا کرتے تھے وہاں وہ انہیں بار بار یورپین خیالات کی بیجان نقالی سے بچنے کی بھی نصیحت کرتے تھے۔ سینٹ اسٹیفنز کالج میگزین میں انہوں نے لکھا۔

"ایک آزاد اور خود دار ہندوستانی زندگی کی تصویر کے لئے تمہیں چاہئے کہ خود اپنی تاریخ کی طرف لَوٹ جاؤ۔ آزادی اور حریت کے سلسلہ میں مغرب سے اپنے خیالات مستعار لینے پر قناعت نہ کرو۔ ...... ان وقتوں کا اپنے زمانہ سے غور وفکر اور احتیاط کے ساتھ عملی طریقہ سے مقابلہ کرو، اور اپنی عملی زندگی کے لئے یہ سوال کرو کہ میں رسم ورواج کی کون کونسی بندھنوں کو توڑ سکتا ہوں، رکاوٹیں پیدا کرنیوالی عادت کی کون کونسی زنجیر کو میں کھول سکتا ہوں تاکہ میں جدید ہندوستان کی تشکیل میں حصہ لے سکوں، ایسا ہندوستان جو قدیم ہندوستان کے شایانِ شان ہو"

اینڈریوز نے جان بوجھکر الفاظ "عملی طریقہ سے" استعمال کئے تھے۔ وہ یہ سکھانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کے لئے صرف یہ ضروری نہیں ہے کہ دلوں میں قومی اتحاد کا بے پناہ جذبہ ہو جو بنی نوع انسان کے مابین رسمی قیود کو توڑ کر پھینک دے بلکہ ساتھ ہی واقعات کا سائنٹفک مطالعہ بھی ہونا چاہیے۔ وہ کہا کرتے تھے: "نیکی ہم جنسوں کی ضروریات کی محتاط تحقیقات کا نام ہے تاکہ ایک شخص اس قابل ہو جائے کہ وہ صحیح

قسم کی مطلوبہ امداد دے سکے۔" انہوں نے اپنے طلبا کو بتایا کہ کس طرح سے دہلی میں ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے شراب نوشی اور کوکین خوری[1] وغیرہ کی عادات ایسے طریقہ سے پھیل رہی تھیں جو قومی صحت اور سیرت کی بنیادوں کے لئے خطرہ کا باعث بن رہی تھیں۔ موسمی بخار اور دق سال بہ سال چھاپے مارتے رہتے تھے جس سے قوم کی قوتِ برداشت کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی تھیں۔" یہ وہ خرابیاں ہیں جنہیں تمام مذاہب کے افراد ایسے مشترکہ عملی پروگرام کے ذریعہ دور کرنے میں متحد ہو سکتے ہیں جس کی بنیاد مکمل اور واقعیت پسندانہ مطالعہ پر ہو۔" سب سے بڑھکر انہوں نے اپنی پوری لسانی طاقت سے اس امر پر زور دیا کہ نوجوانوں کے قومی تخیل کو یوں عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے حقیر اور کم تنخواہ والے مگر زندگی بخش کام کو اپنایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ" اگر تعلیم سے غفلت برتی گئی تو جدید ہندوستان کی بنیادیں ایسی ریت پر تعمیر ہونگی جو کوئی استحکام نہیں رکھتی۔"

ان کے بعض ہندوستانی دوستوں نے ان کے اس بیان پر نکتہ چینی کی کہ وہ ترقی کے ان "مغربی سائنٹفک" طریقوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہندوستان اس وقت ترقی کریگا جب دوسرے راستوں کے ذریعہ اس کا مناسب وقت آجائیگا یعنی جب عوام کسی ایسے گروہ کے ساتھ ذاتی عقیدتمندی رکھینگے جو کسی خاص مطمح نظر کی خاطر اپنی ذاتی قربانی کی طاقت سے ان کے تخیل پر چھا جائے۔ یہ ایک الہامی دلیل تھی اور اینڈریوز اس کے زورِ استدلال کو تسلیم کرتے تھے، مگر اس کے باوجود ان کا اصرار تھا کہ قوتِ متخیلہ سے ایسی اپیل ممکن ہے بیکار اور بے نتیجہ ثابت ہوتا وقتیکہ تعلیم، حفظانِ صحت اور مادّی ترقی کے بے لطف اور عملی کام کے ذریعہ اس کے لئے فضا

---

[1] برطانوی قبضۂ ہند کے دوران میں شراب بندی کے لئے کبھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ اسی طرح اس صدی کی ابتدا میں کوکین دہلی میں کھلے بندوں بکا کرتی تھی اور استاذی اینڈریوز نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مترجم

تیار نہ کرلی جائے۔"

دسمبر ۱۹۰۶ء میں دادا بھائی نوروزجی نے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں اپنا حیرت انگیز صدارتی خطبہ پڑھا۔ وہ ایڈریس کانگریس کی سیاسی زندگی میں انقلاب کا پیش خیمہ تھا اس لئے کہ پہلی مرتبہ ہندوستان کے لئے کھلم کھلا ایک ایسی "خود اختیاری حکومت (سوراج) کا مطالبہ کیا گیا تھا جو ریاستہائے متحدہ یا ڈومینینوں کی وضع پر قائم کی گئی ہو۔" اینڈریوز نے اس خطبہ پر جو تبصرہ کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک یہ یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کے اپنے معاشرتی اختلافات اس مقصد کے حصول میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ وہ صدر کے مطمح نظر کو سراہتے ضرور ہیں، لیکن اس امر پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ ان کے خطبہ میں معاشرتی اختلافات پر بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں :-

"انہوں نے معاشرتی مسئلہ کا تقریباً ایک ہی فقرے میں بھگتان کر دیا اور یہی خطبہ کا کمزور پہلو معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً ذات پات اور نسل کے اختلافات اگرچہ تعلیم یافتہ اشخاص کے محدود حلقہ سے کم ہو رہے ہیں، تاہم عوام میں وہ ابھی تک اتنے ہی زیادہ ہیں کہ ایک فقرے میں انہیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سیلف گورنمنٹ کی راہ میں حقیقی طور پر سدِّ راہ بنے ہوئے ہیں۔" ہندوستان کا ایک انگریز دوست ؎

اینڈریوز دہلی کے تنگ و تاریک اور گندے علاقوں سے کیمبرج برادرہڈ کے کلیسائی کام کے سلسلہ میں واقف ہو گئے تھے جو عیسائی چوہڑوں اور چماروں کے لئے کیا جاتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ سینٹ اسٹیفنز کالج کے عیسائی طلبا ان غریب عیسائی اچھوتوں کی خدمت اسی جذبہ کے ساتھ انجام دیں جس کا اظہار پیمبروک کالج مشن نے والورتھ میں کیا تھا لیکن ہندوستانی ضروریات اور حالات کے مطابق اس پروگرام میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کالج میں عیسائی طلبا معمولی اقلیت میں تھے اور جو لوگ ان میں حسّاس واقع ہوئے تھے انہیں اس التزام سے صدمہ ہوتا تھا کہ کسی "غیر ملکی مذہب" سے متعلق

ہونا "حب وطنی کے خلاف" ہے۔اینڈریوز نے انہیں ترغیب دی کہ وہ ہر مذہب وملت کے غربا کی خدمت مستعدی اور وفاداری سے کرکے یہ دکھادیں کہ عیسائی قومیت ہندوستان کو کیا چیز دے سکتی ہے۔ انہوں نے لکھا:۔

"مجھے اعتماد ہے کہ کچھ عرصہ بعد غربا کے ساتھ یہ تعلق اور ہمدردی کالج کے غیر عیسائی طلبا۔کے لئے اس امر کی ایک زندہ شہادت ہوجائیگی کہ عیسائی کلیسا کے اندر ذات پات کی قیود ٹوٹ رہی ہیں۔"

ان کی نظر میں ایسے مواقع میں سے ایک بڑا موقع بیماروں کی تیمارداری کی صورت میں پیدا کیا جاسکتا تھا اس لئے کہ اس میں ادنیٰ درجہ کی خدمات کرنی پڑتی تھیں۔انہوں نے اس کی ایک ذاتی مثال بھی قائم کی۔ان کا ایک ہمعصر لکھتا ہے:۔"اگر ہوسٹل کا کوئی لڑکا موسمی بخار میں مبتلا ہوجاتا تو وہ اس کی تیمارداری کرتے اور ایسا کرتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک جذباتی اور گھبرا جانے والی ماں کی ہمدردی کی طرح تیمارداری کررہے ہیں۔"[1] جس فطری اخلاص کے ساتھ اینڈریوز ذاتی تعلقات کی حدود میں داخل ہوتے جس کے ساتھ ان کی پُرخلوص محبت کی "مادرانہ" صفت کو بھی شامل کرلینا چاہیئے، وہ اس امر کو لازمی بنادیتی تھی کہ ان کی قلبی رحمدلی جذبات کی سرحد میں داخل ہوجائیگی، اور ان کے ہمعصر فوراً اندازہ کرلیتے تھے کہ کس حد تک ان کی مثال عیسائی طلبا کے دلوں میں فیضان کا جذبہ پیدا کررہی ہے۔ان کی رہنمائی میں ان طلبا نے کالج کے ایک اچھوت بھنگی کی تیمارداری کی حالانکہ کٹر خیالات رکھنے والے طلبا حیرت سے دیکھتے رہے۔ وہ شہر کے گندے اور غلیظ علاقوں میں بسا اوقات ہندو اور مسلم طلبا کے ساتھ جاتے تاکہ وہاں کے رہنے والوں میں شراب نوشی کے خلاف پرچار کریں۔اور صحت کے اصولوں سے انہیں واقف کرائیں۔وہ حفظانِ صحت کے ابتدائی اصولوں کو اور بیماروں کی تیمارداری کے طریقوں کو عملی تجربے کرکے

---

[1] کالین شارپ کا مکتوب بنام مصنفین۔

سمجھاتے۔وہ ہولی کے زمانہ میں شراب نوشی میں اور اس غیر معتدل آزادی کے مظاہرہ میں جو بالعموم ہولی کے موقع پر حقیقی تہوار کی ہیئت کو بگاڑ دیتے ہیں، کمی کرانے کی غرض سے اس طرح کوشش کرتے کہ وہ ان کے مقابلہ میں کھیلوں اور منظم تماشوں کا انتظام کردیتے۔ رُورا نے سینیر مسٹر اینڈریوز کو گزشتہ ۱۰ سالہ دوستی پر نظر رکھتے ہوئے ایک خط میں لکھا: "ان سب لڑکوں نے آپ کے صاحبزادے چارلی سے سیکھ لیا ہے کہ وہ کس طرح بنی نوع انسان سے محبت کریں اور کس طرح ان کی خدمت کریں۔"[۱]

(۳)

جب اینڈریوز ۱۹۰۵ کے آخر میں دہلی واپس آئے تو وہ ٹھیک اس یقینی سمجھوتہ کے ماتحت آئے تھے کہ وہ صحت کی خاطر ہر موسم گرما کا زمانہ پہاڑوں پر بسر کیا کرینگے۔ لہذا ۱۹۰۶ سے بعد کے سالوں تک ان کے درس و تدریس کے کام کا نظام اس طرح سے رکھا گیا کہ ان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہوجائے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ "لارنس ملیٹری اَسائی لَم" کے پرنسپل اور چیپلین کی فرلو واجب الادا تھی یہ برطانوی سپاہیوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے شملہ کے پہاڑوں کی نشیبی ڈھلوانوں پر سناور میں ایک اسکول تھا۔ یہ طے کیا گیا کہ اینڈریوز اُن کی جگہ پر کام کریں۔ ان کے کام کے ابتدائی ہفتے بہت ہی مسرت میں گزرے۔ کام بہت سخت نہ تھا، سُوشِیل رورا اور ان کے بیٹے شدھیران کے ساتھ تعطیلات کا زمانہ بسر کرتے تھے، اور وہاں انہیں اتنی فرصت مل جاتی تھی کہ وہ اپنی تصویروں میں رنگ بھرا کریں اور شدھیر کو پہاڑوں پر سیر سپاٹے کے لئے ساتھ لیجایا کریں۔

سناور میں برطانوی "ٹامیوں" سے ملنے جلنے کے انہیں کافی مواقع ملے جو قریب ہی متعین تھے۔ وہ فوراً ہی ان سے گھل مل گئے اس لئے کہ وہ سوسائیٹی کے

---

[۱] ایس۔ کے۔ رورا کا مکتوب بنام جے۔ ای۔ اینڈریوز مورخہ ۲۴ جون 1915

اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس طبقہ سے مانک ویئرماؤتھ اور والورتھ میں ان کے "کلب بوائز" تعلق رکھتے تھے۔ جب کبھی وہ گیریزن چرچ میں وعظ کہنے کے لئے ڈاگ شائی یا کسولی جاتے تو سُشیل رُدر بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ چلے جاتے۔ اُن کے وعظ مختصر اور پُرتاثیر ہوا کرتے تھے اور موقع کے عین مطابق۔ وہ ان مواقع پر سینٹ فرانسس یا فادر ڈیمیئن کی کوئی کہانی بیان کرتے اور پھر ہندوستان کے غربا کی ضرورتوں کا حال بیان کرتے ہوئے عیسائیوں کو آمادہ کرتے کہ وہ مسیح کی طرح ان کی خدمت کریں۔ نیک سرشت سپاہیوں کو اس قسم کے وعظ سننے کا کبھی کبھی موقع ملتا تھا اور اس لئے وہ ان پر بہت توجہ دیتے تھے۔ ایک اتوار کو شُدھیر نے ایک ٹامی کو دیکھا جو اُن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے نماز کے بعد چندہ کی پلیٹ میں اپنی جیبیں الٹ کر رکھ دیں۔"

ایک سہ پہر کو بہت ہی مسرور کُن واقعہ رونما ہوا۔ اینڈریوز لکھتے ہیں:

"میں پرنسپل کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک نوجوان سپاہی باغ کے ڈھلوان راستہ سے چلتا ہوا آیا اور میرے سامنے اس طرح کھڑا ہوگیا کہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر رقصاں تھی اور اس نے کہا: 'ہیلو، مسٹر اینڈریوز، کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے؟'

میں نے اس کے سرخ بالوں اور پھر اس کے جھائیوں دار چہرہ کو غور سے دیکھا اور ایک لمحہ میں مجھے سب باتیں یاد آگئیں ــــ والورتھ کا چھوٹا سا مطالعہ کا کمرہ، اتوار کی سہ پہر کی جماعت، ایپنگ فارسٹ میں سیر سپاٹے۔ میں کرسی سے اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اُسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: 'جنجر، تم یہاں کہاں؟'

وہ یہ دیکھ کر مجھ سے کہیں زیادہ خوش ہوا کہ میں ابھی تک اسے بھولا نہیں، اس نے نہایت آزادی سے اپنی گزشتہ مہمات کے واقعات سنائے۔ والورتھ سے میرے چلے آنے کے بعد اس نے ایک خاص قسم کا بہادرانہ ڈاکہ ڈالا تھا پھر اُسے معلوم ہوا کہ پولیس سرگرمی سے اُس کا تعاقب کر رہی ہے تو اس سے بچنے کی خاطر وہ فوج میں بھرتی ہوگیا۔ بعد میں اس کی پلٹن ہندوستان آگئی اور موسم گرما میں اسے سباتھو میں متعین کیا گیا۔ جنجر اسی جماعت میں تھا اور رنگ چلنی کا چوڑی دھاری

کا انعام بھی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں اس کی جماعت سے ملنے آؤنگا اور اس کے ساتھ کھانا کھاؤنگا۔ یہ ایک بہت بڑی آزمایش تھی مگر میں اس میں پورا اترا!! ان لوگوں نے مجھے ہر وہ چیز کھانے کو دی جسے پلٹن کا باورچی تیار کر سکتا تھا اور جھجر کو مجھ پر متعین کر دیا گیا تاکہ وہ اپنے قدیم انداز میں مجھے آمادہ کرتا رہے کہ میں کسی چیز کے کھانے سے انکار نہ سکوں۔ اس نے مجھے والورتھ کی ٹولی کے بہت سے قصے سنائے ۔۔۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک تکلیف دہ اعمال نامہ تھا، لیکن جھجر کو یہاں ایک مستعد سپاہی اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے دیکھکر جو شراب نوشی ترک کر چکا ہو، جسے اس کے افسر پسند کرتے ہوں اور جس کا احترام اس کی رجمنٹ والے کرتے ہوں، بجائے خود کم مسرت کا باعث نہ تھا۔ میں سناور کی وہ سہ پہر کبھی نہ بھولونگا جبکہ اس کا سرخ ہنس مکھ چہرہ مجھے مطالعہ کے کمرہ میں نظر آیا اور اس کی پُر شوق آواز فضا میں گونجی: "ہیلو' مسٹر اینڈریوز، کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے ؟" [1]

اسی قسم کا ایک اور دل خوش کن واقعہ چند مہینے بعد وقوع پذیر ہوا جبکہ قدیم والورتھ والی ٹولی کے ایک اور فرد "اسمائلر" کی کلکتہ میں اینڈریوز سے ملاقات ہوگئی۔ اس شخص نے رائل نیوی میں نام پیدا کیا تھا۔ اور اس کی ایماندارانہ زندگی اور پاکیزہ جوانی کو دیکھکر اینڈریوز کو بے تحاشا خوشی ہوئی اس لئے کہ اس کی آنکھوں کی مسرت بخش چمک سے یہ بات ظاہر تھی کہ وہ شرارت آمیز اسپرٹ جس نے اسے اپنی حد سے زیادہ شرارتوں کے باعث بدنام کر رکھا تھا، ابھی تک اسمیں مردہ نہیں ہوئی تھی!

شدھیر رودرا کو ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ابتدا میں سناور کے انگریز طلبا کے ہاتھوں ذرا سرد مہری کا تجربہ ہوا، لیکن ہاکی میں اس کی دلیری اور دوڑ نے بہت جلد اُن تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیا۔ اینڈریوز کو یہ دیکھکر مسرت ہوتی تھی کہ ان کے مراسم بڑھ رہے ہیں اور اپنی معمولی جسارت سے انہیں نسلی تعصبات پر چھوٹا سا مزید حملہ کرنے کا ایک موقع

---

[1] گزرے ہوئے واقعات کی جھلک مطبوعہ "ماڈرن ریویو" مارچ ۱۹۱۵

ہاتھ آگیا۔ شدھیر سینٹ اسٹیفنز کی ہاکی ٹیم کو سناور میں میچ کھلانے کے لئے لائے تھے، اور کچھ عرصہ بعد سناور کے رولڑ کے کالج میں داخل ہو گئے تھے۔

لیکن بعد کو موسم گرما میں نسلی امتیاز کی ایک ایسی مثال دیکھنے میں آئی جو اپنے ناگہانی پن کی وجہ سے اور زیادہ تکلیف دہ تھی۔ اینڈریوز کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک انگریز رفیقِ کار کے طرزِ عمل کی وجہ سے شوشیل رودرا کے لئے ناممکن ہو جائیگا کہ وہ موسم گرما کی طویل تعطیلات میں دوبارہ قیام کر سکیں۔ وہ رودرا کو اپنے ساتھ قیام کرنے کی دعوت دے چکے تھے اور انہیں اُس دعوت نامہ کو منسوخ کرنے سے اسقدر شرم محسوس ہوئی کہ وہ چاہتے تھے کہ اپنی دلی نفرت کا اظہار کرنے کے لئے اسی وقت اپنا استعفا بھیجدیں لیکن رُدرا کی پُرزور وکالت مانع آئی۔

ایک اعتبار سے یہ معمولی واقعہ تھا کیونکہ جس طرزِ عمل کا یہ نمایندہ تھا وہ اُن دنوں بہت عام تھا۔ لیکن ابھی اس واقعہ کی تلخ یاد اینڈریوز کے دل میں کھٹک ہی رہی تھی کہ اتنے میں لاہور کے "سول اینڈ ملیٹری گزٹ" میں جس کی ملکیت انگریزوں کے ہاتھ میں تھی خصوصیت کے ساتھ ایک گستاخانہ خط شایع ہوا۔ جس میں ہندوستانی قوم پرستوں کو حقارت آمیز طریقہ سے غلط قسم کے تعلیم یافتہ شورش پسندوں کے گروہ سے تعبیر کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ انکے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کیا جانا چاہیئے جو اسکولوں کے سرکش طلبا کیساتھ رُوا رکھا جاتا ہے۔ موخرالذکر واقعہ کی جارحانہ بے انصافی کی وجہ سے وہ ذاتی ہتک اور زیادہ نمایاں ہو گئی جو رودرا کے ساتھ روا رکھی گئی تھی اور جس کی تلخ یاد ان کے دل میں ابھی تک ٹیسیں پیدا کر رہی تھی۔ وہ اب بے قابو ہو گئے اور انہوں نے ایڈیٹر کے نام ایک مراسلہ بھیجا جو اگرچہ سخت الفاظ میں لکھا گیا تھا تاہم اس میں وقار اور اعتدال کی جھلک نمایاں تھی۔ انہوں نے اپنا پورا نام، پتہ اور عہدہ بھی لکھ دیا تھا۔

ستمبر ۱۹۰۶ کے آخر میں اس مراسلہ کی اشاعت نے ہر جگہ ہندوستانیوں میں زندگی بخش استعجاب پیدا کر دیا۔ اکثر ہندوستانی ان کے نام سے بھی واقف نہ تھے اور وہ شوق کے عالم میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ ان کا نیا حمایتی کون شخص ہو سکتا ہے۔ شملہ کی پہاڑیوں کے ایک فوجی پادری کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں گیا کہ یہاں سے بھی اور ایک اور اعانت

حاصل ہو سکتی ہے۔ خود اینڈریوز کے لئے اس مراسلہ کے نتائج نہایت اہم ثابت ہوئے اس کے نتیجہ کے طور پر دو زبردست ہستیوں نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ان میں ایک پنجاب کے محبِ وطن لالہ لاجپت رائے تھے اور دوسرے بنگال کے راما نند چیٹرجی جو "ماڈرن ریویو" نکالنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ تین مہینے کے اندر اندر شمالی اینڈریوز کو ہندوستان کے تقریباً تمام سیاسی لیڈروں کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں بیک جنبشِ قلم ایسے ہمدرد عوام کی تائید حاصل ہو گئی جو دوستانہ توجہ کے ساتھ ان کے ہر لفظ کو جو اُن کے منہ یا قلم سے نکلتا، پڑھتے تھے اور اس کی وجہ سے وہ تمام ملک کے اخبارات اور رسائل میں قومی دلچسپی رکھنے والے موضوعات پر مضامین لکھنے لگے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کے انعقاد سے انہیں اپنے ہندوستانی دوستوں کے حلقہ کو بڑھانے کا ایک زبردست موقع ہاتھ آ گیا۔ پریذیڈنٹ (دادا بھائی نوروزجی) کے علاوہ جن کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے، وہ مشہور و معروف اور عیسائی قوم پرست کالیچرن بینرجی، اور جی۔ کے۔ گوکھلے سے بہت گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ موخرالذکر کے ساتھ ان کی واقفیت بہت جلد احترام آمیز دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ بنگال کی پُرجوش قوم پرستی ان کے لئے ایک بالکل نئی چیز تھی لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ ان میں اور اس تحریک کے لیڈروں میں بہت کم چیزیں ایسی ہیں جو مشترک ہیں بہ نسبت تیج بہادر سپرو الہ آبادی کے جن کے ساتھ وہ رات گئے تک گفتگو کیا کرتے تھے جب کبھی وہ واپسی پر الہ آباد ٹھہر جاتے۔ سپرو بھی معاشرتی اصلاحات کی اہمیت کے سلسلہ میں انکے ہمنوا ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "جب تک ہم معاشرتی اور گھریلو غلامی میں گھرے رہینگے ہم سیاسی آزادی کے لئے اپنے مقدمہ کو کمزور بناتے رہینگے۔"

تاہم ان کے الہ آباد آنے کے دوران میں ایک ایسا واقعہ رونما ہو گیا جس نے اینڈریوز کی آنکھیں کھول دیں اور انہوں نے سمجھ لیا کہ برطانوی تسلط کے ذریعہ جو ضرب ہندوستان پر لگائی جا رہی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ بنیادی ہے جیسا وہ اب تک

بھگتے بیٹھے تھے۔ سپرو کی کوٹھی پر ایک جلسہ کے موقع پر انہوں نے زور دیا کہ نسلوں کے مابین باہمی اعتماد پیدا ہونا چاہئے۔ جلسہ میں جو لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھے شخص نے تلخی کے لہجہ میں کہا: "یہ ناممکن ہے۔ ہم آپ سے دلی بات کر سکتے ہیں لیکن اپنے سرکاری حکام سے بالکل دوسری بات کہینگے۔ ہم اس بارے میں مجبور ہیں۔ ہم غلام قوم ہیں" اینڈریوز کے لئے یہ انکشاف خوفناک اقرار سے کم نہ تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان میں برطانوی حکومت ایک اہم معاملہ میں بالکل ناکام رہی ہے۔ بعد کے بارہ مہینوں کے تجربات نے بالآخر انہیں بادلِ ناخواستہ اس امر کی سچائی کا یقین دلا دیا۔

کلکتہ کی کانگریس میں دادا بھائی نوروزجی نے ہندوستانی باشندوں سے درخواست کی تھی کہ وہ پُرامن طریقہ سے جدوجہد کریں تاکہ سوراج کے متعلق ان کے مطالبہ کو تسلیم کیا جائے۔ برطانوی عمّال کو بالکل یقین نہیں تھا کہ موعودہ جدوجہد پُرامن رہ سکےگی اور وہ خوف و دہشت کے ساتھ غدر کے بچاس سالہ جشنِ سالگرہ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے جب ۱۹۰۷ شروع ہوا تو اس وقت سیاسی مطلع طوفانی تھا۔ بنگال جیسے ناقابلِ انتظام صوبہ کی تقسیم اگرچہ بہت ضروری تھی[1] تاہم وہ ایسے طریقہ سے عمل میں لائی گئی جس سے بنگالی جذبات سخت مجروح ہوئے اور جس کی وجہ سے قاتلانہ سازشوں اور پولیس کی سختیوں کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ پنجاب میں "کنال کولونیز بل" کو جس میں "فتوریّت کی جھلک موجود تھی"، بہ عجلت تمام قانونی شکل دیدی گئی اگرچہ عامتہ الناس للہ لاجپت رائے کی سرکردگی میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ تحقیر کا برتاؤ تھا جس کے خلاف ہر جگہ شدید غم و غصّہ کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ طلبا کی آبادی جسے قومی شعور رکھنے والے طبقوں میں سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ منظم کیا جا سکتا ہے، انارکسٹوں اور دہشت پسندوں کے پروپیگنڈے کو قبول کر رہی تھی، اور چونکہ اکثر کالج برطانوی نگرانی

---

[1] تقسیم بنگال سے پہلے آسام، بنگال، بہار اور اڑیسہ ایک ہی صوبہ میں شامل تھے۔

کے ماتحت تھے، اس لئے اس شورش نے لازمی نسلی رنگ اختیار کر لیا۔

اس موقع پر دہلی کے کیمبرج مشن نے ایک نہایت اہم قدم اٹھایا۔ جب ۱۹۰۷ میں ہیبرٹ ویئر نے سینٹ اسٹیفنز کالج کی پرنسپلی سے استعفا دیدیا، تو اس نے ان کی جگہ پر سوشیل کمار رُودرا کو پرنسپل مقرر کر دیا۔ اس وقت تک کوئی ہندوستانی کسی مشن کالج کا پرنسپل نہیں بنایا گیا تھا چنانچہ ہندوستانی پبلک پر اس کا برقی اثر پڑا۔ یہ اقدام اس امر کا ثبوت تھا کہ نسلی مساوات کے بارے میں عیسائی دعاوی سچے ہیں۔ ان کٹھن سالوں میں جو اس کے بعد آئے، سینٹ اسٹیفنز کالج کی مسرت بخش استقامت کے لئے کوئی تنہا واقعہ اس سے زیادہ ممد و معاون نہیں ہوا جتنا یہ نظارہ کہ نامی گرامی انگریز فضلا کی جماعت ایک ہندوستانی لیڈر کی ماتحتی میں پُرجوش وفاداری کے ساتھ کام کر رہی ہے۔

اس امر کا سہرا کہ اس شاندار موقع سے کما حقہٗ فائدہ اٹھایا گیا، بلاشبہ ایک بڑی حد تک اینڈریوز کے سر رہنا چاہئے۔ جب تقریباً دس سال پیشتر جے۔ ڈبلیو۔ ٹی رائٹ نے رُودرا کو اپنا وائس پرنسپل بنایا تو اس وقت انہوں نے موخر الذکر کی صدائے احتجاج کو ترش روئی مگر دوستانہ پیش گوئی کے ساتھ یہ کہکر خاموش کر دیا تھا "تم اب وائس پرنسپل بنائے جا رہے ہو اور ایک دن تم پرنسپل بنو گے" لیکن جب ۱۹۰۲ میں رائٹ کا انتقال ہو گیا اس وقت یہ تقرر نہیں کیا گیا۔ ۱۹۰۷ میں بھی بہت سے اشخاص ایسا اقدام کرتے وقت تذبذب میں تھے۔ اس لئے نہیں کہ رُودرا ہندوستانی تھے، بلکہ اس لئے کہ وہ اُس برادرہُڈ کے ممبر نہ تھے جو کالج چلانے کی ذمہ دار تھی۔ لاہور کے بشپ نے جن کی رائے بہت وزنی خیال کی جاتی تھی، یہ محسوس کیا کہ ابھی تک اس بات کا خطرہ ہے کہ کچھ والدین ایک ہندوستانی کے تقرر کو "رجعت پسندانہ" اقدام سے تعبیر کر بیٹھیں جس کی وجہ سے کالج کے ڈسپلن کے کمزور ہو جانے کا امکان ہے۔ مگر اینڈریوز جو ہندوستان کی نبض کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے، جانتے تھے کہ اس قسم کا خیال اب موجود نہیں ہے اور انہوں نے اپنی معلومات کی بنا پر عمل کیا۔ ان کی پشت پناہی ایک

اور نوجوان انگریز لیکچرر ریوینڈ ایف۔ جے ویسٹرن نے بھی کی۔ ان دونوں نے بحث و تمحیص کے سلسلہ میں طرح طرح کے استدلال پیش کئے اور اس سوال پر استعفٰی دینے کی بھی دھمکی دی، بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ مرحوم بشپ کے ساتھ انصاف کرنے کی غرض سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بعد میں فیاضی کے ساتھ یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اس معاملہ میں ان سے اجتہادی غلطی ہوئی۔

رُودرا کے تقرر کا جو اثر سینٹ اسٹیفنز کالج کی زندگی پر پڑا اسے اینڈریوز نے ۱۹۰۹ کی کالج رپورٹ میں ایک مضمون کی شکل میں بیان کیا ہے۔ ۱۹۰۹ کا سال وہ سال تھا جبکہ طلبا میں شورش خطرناک حد تک پھیلی ہوئی تھی اور جبکہ دوسرے مشن کالجوں کے لکچرار دل نے ان کے سامنے یہ اقرار کیا کہ وہ نہیں کہہ سکتے کہ کب وہ کھلی بغاوت سے دوچار ہو جائیں۔ اینڈریوز رقمطراز ہیں:

"ہمارے طلبا میں ہر طرف سے اس روز افزوں خواہش کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ ایسی دوستی برتی جائے جو بسا اوقات محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انہیں اپنے کالج پر فخر ہے، انہیں اس طرزِ عمل پر فخر ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے، اور جو راہ ہم نے دکھائی ہے اس پر وفاداری کے ساتھ گامزن ہیں۔ یہ اسی رہنمائی کا اثر ہے کہ انہوں نے ایک طرف نہایت پرزور الفاظ میں انارکسٹوں کے پروپیگنڈے کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور دوسری طرف یہ کہا ہے کہ وہ قومی تحریک کی ہر اچھی اور شریفانہ چیز کا اعتراف کرنے میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ ..... (وہ ایس۔ کے۔ رُودرا اور ان کے وائس پرنسپل پی۔ سی۔ بکرجی) اس سے کہیں زیادہ سخت ڈسپلن رکھتے ہیں جتنا ہم جارحانہ طرز عمل اختیار کئے بغیر رکھ سکتے، اور کوئی چیز کبھی نسلی اختلاف کی شکل اختیار نہیں کر سکتی جب تک حکومت خود ہندوستانیوں کی طرف سے کی جا رہی ہو۔"

ایک انگریز نے جس نے اسی زمانہ میں دہلی کا دورہ کیا تھا، اس خوشگوار نتیجہ کے حصول میں اینڈریوز کی کوششوں کا ذکر پُرزور الفاظ میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "میں نے سینٹ اسٹیفنز کالج میں ایسے بہت سے واقعات کا مشاہدہ کیا جو کم روشن خیال انگریزوں

کی زیر نگرانی آسانی کے ساتھ بغاوت بن سکتے تھے، لیکن وہ زیادہ بہر بعد قومی زندگی کے لئے ایک پُر جوش جذبہ اور جوش میں تبدیل ہو گئے۔"[۱]

مگر بدقسمتی سے کالج کے تعلقات حکومت پنجاب کے ساتھ خوشگوار نہ رہے۔ اس لئے کہ وہ اُس کے کام کے افادی پہلو کو بہت دیر میں سمجھی۔ ۱۹۰۷ میں ایک مشہور سرکاری سرکلر جاری کیا گیا جو رِزلے سرکلر کے نام سے مشہور تھا اور جس میں سرکاری اور سرکاری امداد پانے والے کالجوں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ اپنے طلبا کے سامنے سیاسی مسائل کا ذکر تک نہ کریں۔ "اس قسم کی ہدایات نہ صرف کالج کی ذہنی آزادی کے خلاف تھیں بلکہ اس ابتدائی تعلیمی اصول کے بھی خلاف تھیں کہ بالغ طلبا کو ایسے قومی مسائل کی آزادانہ بحث کی اجازت ہونی چاہئے جو قدرتی اور صحیح طریقہ پر ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوں۔ سینٹ اسٹیفنز کالج نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس سرکلر کو نظرانداز کردے" خواہ ایسا کرنے میں اسے سخت سے سخت عتاب ہی کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔"[۲]

اِس سرکاری "عتاب" کے نتائج میں ایک چیز یہ تھی جسے اینڈریوز نے رنج و افسوس کے ساتھ دیکھا کہ اُن تمام اشخاص کے خلاف جن پر قومی ہمدردیوں کا شبہ ہو سکتا تھا، خفیہ پولیس کے طریقے استعمال کئے جانے لگے۔ کالج کے عملہ کے چند افراد کے پاس یہ یقین کرنے کے وجوہ موجود تھے کہ ان کی خط وکتابت میں مداخلت کی جارہی ہے اور اینڈریوز کو یہ دیکھکر سخت رنج ہوا کہ ان کے گھر سے آنے والے ہفتہ وار خطوط میں تاخیر ہو جاتی ہے اور ان کی والدہ کو غیر ضروری فکرمندی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تب ایک دن انہوں نے ایک شخص کو عین واردات کے موقع پر پکڑ لیا جو میٹ لینڈ ہاؤس میں ان کی میز کے پرائیویٹ کاغذات کی تلاشی لے رہا تھا۔ کئی سال بعد جب ان سے اس جاسوسی کی یقینی شہادت پیش کرنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے یہ کہانی شایع کی

---

[۱] "چرچ ٹائمز" مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۱۳

[۲] تاریخ سینٹ اسٹیفنز کالج مصنفہ ایف۔ ایف۔ مانٹک

"اس شخص نے اقرار کرلیا کہ اسے پولیس کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ قدرتاً مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے ایک خط ڈپٹی کمشنر کے پاس بھیجا، وہ صاحب کیمبرج میں میرے ساتھ تھے اور میرے ذاتی دوست تھے، ان سے فوری معافی کا مطالبہ کیا۔ جواب میں ایک گھوڑا سوار سپاہی بہ عجلت تمام ایک خط لیکر آیا جس میں ذیل کے الفاظ درج تھے: "مائی ڈیر اے، اس کارروائی کا ذرا سا تعلق بھی مجھ سے نہیں ہے۔ یہ ملعون سی۔آئی۔ڈی والوں کی حرکت ہے" جو اسم صفت ڈپٹی کمشنر نے استعمال کیا اس کے بعد ان کے لئے ضروری نہیں رہا کہ وہ معافی مانگتے۔"[1]

مگر اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی واقعہ نہ تھا۔ ایک نوجوان انگریز پولیس افسر نے جس کے ساتھ اینڈریوز کے تعلقات دوستانہ تھے اور جو ان کے بلند خیالات کی وجہ سے ان کا بہت مداح تھا، انہیں بتایا کہ اسے بعد میں ان کے خلاف جاسوسی کرنے کرنے کی دعوت دی گئی تھی (مگر اس نے برہمی کے ساتھ صاف انکار کر دیا تھا) ایک ڈنر پارٹی میں جس میں اینڈریوز موجود تھے، ایک برطانوی افسر نے یہ کہکر اپنی چالاکی کا فخریہ اظہار کیا کہ "جب سوشلسٹ لیڈر کیئر ہارڈی ہندوستان کی سیاحت کو آئے تو اس وقت میں نے ذاتی ملازم کی حیثیت سے ایک ایسے شخص کو مقرر کرا دیا جو دراصل سرکاری جاسوس تھا۔" سوشل اخلاق کے تمام تقاضوں کے باوجود اینڈریوز اس بات کو خاموشی سے برداشت نہ کر سکے، اور انہوں نے غصہ میں اس سے کرخت لہجہ میں کہا: "اے رذیل شخص!" لیکن جس چیز سے انہیں سب سے زیادہ دکھ پہنچا وہ یہ تھی کہ سینٹ اسٹیفنز کالج اور دوسرے کالج کے طلبا کو روپیہ دیا جاتا تھا تاکہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جاسوسی کریں اور ان باتوں کا اُن کے پاس ثبوت بھی تھا۔ اس قسم کے تجربات نے ان کے دل کو بری طرح سے مجروح کیا اور ان کے لئے ناممکن ہوگیا کہ وہ سکون سے دوستی کے اُن سوتوں کو زہر آلود ہونے دیں جو یونیورسٹی کے طلبا میں باہم قائم

---

[1] "اسٹیٹسمین" مورخہ ۲۰ اپریل 1919

ہونی چاہیئے۔ جو لوگ ایسے اوچھے ہتھیاروں کو کام میں لاتے تھے ان کی وجہ سے اُن کے اس اعتقاد میں کہ ان کا اپنا پیارا ملک دیانتدارانہ مقاصد رکھتا ہے، سخت تزلزل واقع ہوگیا، اور جو "تلخی" یا "جانبداری" اس زمانہ میں ان کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوئی، اس کے کافی اسباب موجود تھے۔

۱۹۰۷ کے تجربات نے اینڈریوز پر واضح کر دیا کہ حکومت کے عمال اور عوام کے درمیان جس پر وہ حکومت کر رہے ہیں، اختلاف کی کتنی وسیع خلیج حائل ہے۔ وہ جانتے تھے کہ "کنال کولونیز بل" کے خلاف جو شورش کی جارہی ہے وہ حق بجانب ہے اور انہوں نے اپنے سولین دوستوں سے کہا کہ وہ خود لوگوں سے ربط ضبط پیدا کریں اور ان کی حقیقی ضروریات سے براہ راست واقفیت حاصل کریں۔ ان میں سے ایک نے اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے جواب کے طور پر کہا: "ذرا اُن تمام فائلوں کو تو دیکھو" اینڈریوز کی نظر میں 'فائلوں کے ذریعہ کی جانے والی حکومت' کے نظام کی اس سے زیادہ فصیح و بلیغ مذمت اور کیا ہوگی کہ وہ ذاتی ربط ضبط کو ناممکن بنا دیتا ہے!

مئی ۱۹۰۷ میں لاجپت رائے پنجاب سے جلاوطن کر دیئے گئے اور اینڈریوز اُن پابندیوں کے خلاف سخت پیچ وتاب کھاتے رہے جو بماد رہُڈ کے ڈسپلن اور کالج میں ان کی پوزیشن کے باعث ان کی اپنی آزادی رائے پر لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ۲۴ جون کو گوکھلے کے نام خط میں لکھا: "میں اس امر کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں کہ حالیہ واقعات کے پیش نظر مجھے خاموش رہنے کے لئے جس طریقہ سے مجبور کیا جارہا ہے وہ میرے لئے کسقدر سوہان روح بن رہا ہے" لیکن وائسرائے لارڈ منٹو نے "کولونائی زیشن ایکٹ" پر اپنی منظوری ثبت کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ۹ نومبر کو آخرکار یہ خبر بھی آگئی کہ لاجپت رائے رہا کر دیئے گئے ہیں۔ رُدرا اس وقت شہر میں موجود نہ تھے۔ ان کی غیر حاضری میں طلبا اینڈریوز کے پاس آئے۔ یہ کہنے کے لئے کہ انہیں اپنی دلی مسرت کے اظہار کے طور پر کالج کی عمارات میں روشنی کرنے کی اجازت دیجائے۔ اینڈریوز نے ہنسکر کہا، "اس موقع کو باقاعدہ دیوالی بنالو" اور انہوں نے اپنی جیب سے

معارف کے سلسلہ میں فیاضانہ چندہ بھی دیا۔ ساری دہلی اس شاندار چراغاں کو دیکھنے کے لئے اُمڈ آئی تھی، لیکن شاید اس واقعہ کی وجہ سے "باغیانہ" کالج کے اعمالنامے میں ایک اور سیاہ بندی کا اضافہ ہوگیا!

حقیقت یہ ہے کہ اینڈریوز کے خلاف "عدم وفاداری" کے جو الزامات اس موقع پر عائد کئے گئے تھے وہ سخت مضحکہ خیز تھے۔ ان کا ایک خط ۱۹۰۷ میں "اسپیکٹیٹر" (لندن) میں شایع ہوا جس نے ہندوستان میں ایک ہیجان برپا کردیا، لیکن انگلستان میں ایک سے زیادہ تجربہ کار "انڈین سولین" نے اس کی تائید کی۔ اس میں انہوں نے بنگال کے ایک شرمناک عدالتی واقعہ کی طرف توجہ دلائی تھی اور بطور علاج کے حکومت کے عدالتی اور عاملانہ اختیارات کی علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ کلکتہ کی آزاد ہائی کورٹ نے اپیل کرنے پر اُس فیصلہ کو ساقط کردیا جس کی رُو سے ایک شخص کو تو پھانسی کی اور دو کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی، اور بطور رائے کے ظاہر کیا کہ جس سولین جج نے ایسا فیصلہ دیا ہے وہ قانون سے نابلد ہے، نیز یہ کہ استغاثہ کی طرف سے جو شہادت پیش ہوئی وہ بالکل مہمل ہے اور یہ بھی کہ یورپین گواہوں کو جو ممکن تھا کہ استغاثہ کے خلاف گواہی دیتے، پیش ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ اینڈریوز نے اس رائے پر معتدل الفاظ میں جو تبصرہ کیا وہ یہ ہے:

"موجودہ نازک موقع پر اس خیال کو دور کرنے کے لئے کہ غیر منصفانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ جتنا بھی خرچ برداشت کیا جائے، کم ہے۔"[1]

"اسپیکٹیٹر" میں لکھتے وقت اینڈریوز شدت کے جذبات سے بے قابو ہوجانے والے اینگلو انڈیا کے خلاف اوسط درجہ کے انگریزوں کے جذبۂ انصاف پسندی سے اپیل کررہے تھے۔ یہی اپیل ایک دوسرے معاملہ میں جس میں خود اینڈریوز نے مرکزی حیثیت اختیار کرلی تھی اور جس میں "رِزلے سرکلر" کی طرح تعلیمی آزادی خطرہ میں

---

[1] "اسپیکٹیٹر"، ۲۶ اکتوبر ۱۹۰۷

پڑ گئی تھی، نہایت موثر ثابت ہوئی" ریورینڈ سی۔ایف۔اینڈریوز، فیلو، پیمبروک کالج، کیمبرج، کا نام پنجاب یونیورسٹی کی فیلوشپ کے لئے نامزد اشخاص کی فہرست سے خود لفٹننٹ گورنر کے قلم سے محض اس بنا پر کہ وہ ہندوستانیوں کے دوست ہیں، خارج کر دیا گیا اور ان کی جگہ پر ایک ایسے شخص کا تقرر کیا گیا جو کسی قسم کی تعلیمی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔" اُس فقرے پر جو ریمزے میکڈانلڈ کی کتاب "بیداری ہند" میں تقریباً دو سال بعد شایع ہوا، وزیر ہند لارڈ مارلے سے بار بار سوالات پوچھے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اینڈریوز کی نامزدگی منظور کر لی گئی، انہیں فوراً سنڈیکیٹ میں لے لیا گیا جہاں وہ یونیورسٹی کے نصاب ہائے تعلیم پر اپنی قابلیت اور علم و فضل کا ہمیشہ کے لئے مستقل نشان چھوڑ گئے ہیں۔

(۴)

جہاں تک سینٹ اسٹیفنز کالج کا تعلق ہے، ۱۹۰۷ کا طوفانی اور پُر آشوب سال مسرت بخش حالات میں ختم ہوا اور اس سیاسی کشمکش کے کسی ناخوشگوار واقعہ نے اسے داغدار نہیں بنایا۔ دسمبر کے آخر میں سینٹ اسٹیفنز کالج کی کرکٹ ٹیم کا مقابلہ پنجاب یونیورسٹی کرکٹ شیلڈ" کے حصول کے لئے گورنمنٹ کالج لاہور کی ٹیم سے ہوا جو اب تک ناقابلِ فتح خیال کی جاتی تھی۔ تمام دن بہادری سے مقابلہ ہوتا رہا، لیکن جب آخری کھلاڑی کھیلنے کے لئے گیا اس وقت بھی جیتنے کے لئے بائیس رنوں کی ضرورت تھی۔ یہ بہت ہی تشویشناک صورتِ حال تھی، لیکن آخری دونوں کھلاڑی بڑے دلیر اور مستقل مزاج تھے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ سکور بڑھتا گیا۔ اب صرف ۱۰ رنوں کی ضرورت تھی — اور پھر صرف چار کی! تمام فیلڈ میں اُس وقت جوش و خروش کا عجیب و غریب سماں دیکھنے میں آ رہا تھا۔ کھلاڑیوں نے سنبھل سنبھل کر بولنگ کا مقابلہ کیا۔ ایک دوسرے لمحہ میں بال باؤنڈری کے پار تھی اور دوست دشمن سب اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے کے لئے بے اختیار کھڑے ہو گئے۔ شدھیر رُدرا نے نہایت خوشی کے عالم میں لکھا: " تمام

لاہور نے ہماری ٹیم کے اعلیٰ کھیل کی تعریف کی ہے اور تمام دہلی اینڈریوز کی تعریف میں رطب اللسان ہے کہ انہوں نے ٹیم کو ایسا بنا دیا۔[۱]

یونیورسٹی شیلڈ کا جیتنا اس نسل کے کالج کے کرکٹ کھیلنے والوں کی سب سے بڑی فتح تھی۔ ابتدا ہی سے اینڈریوز نے کھیلوں پر اپنی پوری توجہ مبذول کر دی تھی۔ دہلی میں ان کی پہلی شام پیڈی ڈے کی معیت میں کھیل کے میدانوں میں صرف ہوئی اور اس کے بعد سے "ان کی دبلی پتلی اور قدرے جھکی ہوئی صورت فلالین کی پتلون میں ملبوس ہر شام کو کرکٹ کے میدان میں کشمیری دروازہ کے باہر دکھائی دیتی رہی۔ وہ اوسط درجہ کے کھلاڑی تھے۔ لیکن بہترین معلم بالکل اسی طرح جس طرح سے وہ کیمبرج میں دریا پر کشتی رانی کی تعلیم دینے میں بہترین معلم ثابت ہوئے۔ ان کی خوش مزاج نوجوان رفاقت نے شرمیلے پن اور نا آشنائی کی رتی تک کو دور کر دیا تھا اور لکچرار اور طلبا دونوں ہنستے رہتے تھے، مذاق کرتے رہتے تھے اور میدان میں مسرت بخش مقابلہ میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔ ایک طالب علم لکھتا ہے: "کھیل کے میدان میں ہم نے انہیں کبھی استاد نہیں سمجھا۔ وہ ہم میں سے ایک تھے اور ایک سچے دوست کی حیثیت رکھتے تھے"[۲] ایسے ماحول میں رہ کر طلبا کھیل کی سچی روح اور معیار کو بہت جلد سمجھ لیتے تھے۔ اینڈریوز کی بروقت اور فیاضانہ ستایش ٹیم میں اخلاص مندی اور بے غرضی کی روح پھونکنے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ خلوت میں ان کے ایک کم آواز مگر دوستانہ فقرہ سے کھیل میں ہر ناکامی کا تدارک ہو جاتا تھا۔ تعریف اور تنبیہہ ہر ایک اپنا اثر رکھتی تھی اور کھلاڑی انہیں کبھی بھولتے نہ تھے۔

دہلی میں جب تک اینڈریوز رہے ان کا قیام کالج کے قریب میٹ لینڈ ہاؤس

---

[۱] شدھیر رودرا کا مکتوب بنام جے۔ اے۔ اینڈریوز، ۲۶ دسمبر ۱۹۰۷
[۲] مسٹر سہاریا کا مکتوب مصنفین کے نام

میں دوسرے غیر شادی شدہ لکچراروں کے ساتھ رہا ان کا اور ڈسے کا دروازہ دونوں ورانڈسے میں کھلتے تھے جس کا تعلق براہ راست کالج ہوسٹل سے تھا اور طلبا دن بھر وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ جس مکمل طریقہ سے انہوں نے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اس کی تشریح ایک چھوٹے سے مگر تکلیف دہ واقعہ سے کی جا سکتی ہے اور جس کی یاد عرصۂ دراز تک باقی رہی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج والوں کا یہ معمول تھا کہ وہ ہر ٹرم کا آخری دن دہلی کے قریب تاریخی دلچسپی کے کسی مقام پر سیر سپاٹے یا پکنک میں گزارا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر اینڈریوز اور ویسٹرن نے اپنے عیسائی طلبا کو سینڈوچ پیش کئے۔ ایک دو ہندو لڑکوں نے بھی جن کا کھانا ابھی تیار نہیں ہوا تھا کسی قسم کا خیال کئے بغیر سینڈوچ اٹھا کر کھا لئے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سینڈوچوں میں گائے کا گوشت تھا جسے ہندو نہیں کھاتے۔ اس پر کھلبلی مچ گئی۔ ایک دو آدمیوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اینڈریوز نے دیدہ و دانستہ یہ حرکت کی ہے۔ دوسرے کالجوں میں ان کے ہم نوا پیدا ہو سکتے تھے، مگر سینٹ اسٹیفنز میں یہ بات ممکن نہ تھی۔ چنانچہ دفعتہً تمام طلبا غصہ کی حالت میں ان لڑکوں پر ٹوٹ پڑے۔ جنہوں نے اس قسم کی بدگمانی کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ "یہ تمام تر ہمارا اپنا قصور ہے۔ ہمیں اور زیادہ محتاط ہونا چاہیئے تھا۔" جہاں تک اینڈریوز اور ویسٹرن کا تعلق ہے، انہوں نے بعد کو اس کا انتظام کر لیا کہ آئندہ سے میٹ لینڈ ہاؤس میں گائے کا یا سور کا گوشت سرے سے آنے ہی نہ پائے۔

۱۹۰۵ ہی میں ہبرٹ دیٹرا اور رُدرا نے اینڈریوز کی ادبی جوہروں اور صفتی کرنے کے لئے اُن کی خداداد قوت کی اہمیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور روزمرہ کے فرائض کی تقسیم میں انہوں نے کوشش کی تھی کہ وہ انہیں ان قوتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع دیں اگرچہ ان سالوں میں جبکہ اسٹاف میں کمی ہو گئی تھی، ان کے لئے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھنا ممکن نہ ہو سکا۔ میٹ لینڈ ہاؤس میں ہر مذہب و ملت، ہر پیشہ اور ہر درجہ کے وزیٹروں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور یہ سب لوگ اینڈریوز کی

ہمدردی، انصاف پسندی اور اخلاص سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔" حق کہ ان کے ساتھ رہنا ہی بجائے خود ایک قسم کی فیاضانہ تعلیم تھی۔"[1] ہندوستان کے ہر حصہ سے طلبا ان سے مشورہ لینے کے لئے آتے تھے۔ وہ ان سب سے خط و کتابت رکھتے تھے اور انہوں نے صرف اس کام کے لئے دن کا کچھ حصہ وقف کر رکھا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے اور صبح کے لطیف اوقات میں برانڈے میں بیٹھکر اپنے مضامین لکھا کرتے تھے۔ وہ اپنے رواں اسٹائل میں رُکے بغیر یا تصحیح کئے بغیر پیرا گراف پر پیرا گراف لکھتے چلے جاتے تھے۔" ان کے کام کی مقدار حیرت انگیز تھی۔ لکھنا، مطالعہ کرنا (جس میں ہندوستانی اخبارات، رسالہ جات، دینیات کی کتب وغیرہ کا پڑھنا بھی شامل تھا)، اور ان سب کے علاوہ بعض سالوں میں کالج میں درس و تدریس کا مکمل پروگرام بھی ہوتا تھا۔ ہر خالی گھنٹہ میں وہ اپنے بعض طلبا کو نہایت قابلیت سے اور تکان محسوس کئے بغیر پڑھایا کرتے تھے۔ اپنے کام سے انہیں اس درجہ شغف تھا اور وہ اس میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ اس کی وجہ سے ان کے بعض رفقائے کار یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید یہ گھریلو تعلقات نہیں رکھتے حالانکہ ان تمام سالوں میں وہ ہفتہ وار خط کبھی ناغہ نہیں ہوا جو وہ اپنی والدہ کے نام بھیجا کرتے تھے۔

سفر میں بھی ان کا اچھا خاصا وقت گزرتا تھا، لاہور، الہ آباد، کانپور اور کلکتہ۔ جہاں کہیں وہ جاتے مشنریوں کے یہاں قیام کرتے، ان کو اپنے ہندوستانی دوستوں سے متعارف کرتے اور انہیں قومی تحریک سے واقف کراتے۔ جو لوگ سینٹ اسٹیفنز میں پیچھے رہ گئے تھے انہیں ہمیشہ اس امر سے تکلیف ہوتی تھی کہ اینڈریوز نہ اسوقت نہ اس کے بعد کبھی بھی درسگاہ کے روزمرہ کے مشاغل کے ساتھ باقاعدگی سے کامیاب مطابقت کر سکے۔ وہ انتہائی خلوص کے ساتھ اس امر کی تلقین کرتے کہ قوم کی تعمیر کے لئے نام و نمود کے بغیر انتھک طریقہ سے کام کرنے کی ضرورت ہے، لیکن جب

---

[1] کالبٹ شاڑپ کا مکتوب بنام مصنفین۔

کبھی کالج کے درس و تدریس کے کام کا ذاتی دوستی یا نادیدہ قومی ضرورت کے تقاضوں کے ساتھ تصادم ہو جاتا تو اس وقت موخرالذکر ہی کو وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتے۔ اپنے فرض منصبی کے معاملہ میں ان کا فیصلہ غالباً صحیح ہوا کرتا تھا، لیکن بہرحال وہ دوسروں کے لئے کچھ کم پریشان کن نہ ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کے رفقائے کار تعریف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کمال دور اندیشی اور فیاضی سے ان کی ہندوستانی زندگی کی ابتدا ہی میں ان کے پیشہ کی لازمی الہامی نوعیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اس بات کو ممکن بنا دیا تھا کہ وہ اپنی راہ پر گامزن رہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے کسی پڑوسی کے کمرہ میں پہنچ جاتے اور کہتے: "مجھے کل لاہور جانے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ کیا آپ میری کلاس بی۔ اے کی جماعت کو انگریزی پڑھا دیں گے؟ — لڑکے پینڈے بنس پڑھ رہے ہیں۔" ایک مرتبہ انگلستان کے ایک نووارد پروفیسر پر اس کی آمد کے دو تین دن بعد ہی کالج کی انگریزی جماعتوں کا تمام کام ڈال دیا گیا اور اینڈریوز اور رڈے آرام کے کچھ دن گزارنے کے لئے کانپور چلے گئے۔ اس پر پروفیسر نے گھبرا کر پوچھا: "لیکن میں یہ سارا کام کس طرح سنبھال سکتا ہوں؟" اینڈریوز نے کہا: "اوہ، دینا ناتھ کے اِن جوابات کو پڑھ کر اسے پورے نمبر دے دینا۔ اسی روشنی میں دوسرے تحریری کام کو بھی دیکھ لینا۔ یہ رہیں دوسری جماعتوں کی درسی کتابیں!"

کبھی کبھی ذاتی کمزوریاں بھی نمایاں ہو جاتی تھیں۔ یہ بات نہیں تھی کہ اینڈریوز نے غربت کی زندگی بسر کرنے کا جو عہد کچھ عرصہ بعد باندھا تھا اس کی وجہ سے وہ اکثر اوقات دوسروں کے جوتے پہن لیا کرتے ہوں، نہیں، انہیں کپڑوں جیسی ثانوی اہمیت کی چیزوں سے مطلق کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ معصومانہ طور پر چیزوں کی ملکیت کے دعاوی کو بالکل غیر اہم سمجھتے تھے اور بعض اوقات اس کے نتائج صبر آزما نکلتے تھے۔ ایک شخص نے جس کا سوئیٹر غائب ہو چکا تھا، یہ واقعہ بیان کیا کہ "تلاش کے باوجود مجھے اپنا سوئیٹر نہیں ملا۔ میں نے سی۔ ایف۔ اے سمیت ہر ایک سے پوچھا اور اس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہاکی کھیلنے کے بعد مجھے زکام بھی ہو گیا اور پھر یکایک میں نے

دیکھا کہ اینڈریوز اسے زیب تن کئے ہوئے ہیں!" اس بے پروائی کا تدارک علاج بالمثل کے ذریعہ بالکل بیکار تھا، اس لئے کہ انہیں معلوم ہی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کی کونسی چیز گم ہو گئی ہے اور اگر انہیں معلوم بھی ہو جاتا تو وہ اپنے آپ ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے۔ اسی طرح انہیں اس کا بھی احساس نہ ہوتا کہ دوسرے لوگ غذا میں تبدیلی چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود صرف یہ دیکھتے کہ غذا صاف اور ستھری ہے جب ایک مرتبہ گھر کے لوگ کئی ہفتے تک ناشتہ میں ساگودانہ، دن کے کھانے میں دال اور شام کے کھانے میں بکری کا گوشت کھاتے رہے تو اگرچہ وہ ان کی سادگی کی تعریف کرتے لیکن دل ہی دل میں ضرور کہتے کہ انہیں گھر سنبھالنا نہیں آتا۔"

اوسط درجہ کا یورپین انہیں خاص شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا اور اس کی وجہ کچھ تو ان کی ذاتی خصوصیت تھی اور کچھ یہ کہ وہ سیاسیات میں غیر مقلدانہ رائے رکھتے تھے۔ جب ان کے جذبات بھڑک اٹھتے تو وہ بہت زیادہ بحث و تمحیص کرتے۔ مظلوم کے ساتھ وہ دل و جان سے ہمدردی کرتے اور ہندوستان میں معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی طور پر ہندوستانی ہی مظلوم کہے جا سکتے تھے۔ ان کے ایک سے زیادہ ہندوستانی دوستوں نے بیان کیا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں اینڈریوز نے جس زبردست محبت کا اظہار کیا اس کی وجہ سے وہ ان کی نیت پر شک و شبہ کرنے لگ گئے تھے۔ اور جب ہندوستانیوں کی یہ کیفیت ہو تو انگریزوں کی حالت اس سے کچھ زیادہ ہی ہونی چاہیئے۔ لیکن وہ لوگ بھی جو اُن کی محبت کی اس "فراوانی" سے گھبرا جاتے تھے بشرطیکہ وہ انسان کی حیثیت سے انہیں اچھی طرح سے جانتے ہوں، ان کے خلوص کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور "سخت دل" عمالِ حکومت بھی ان کے لئے محبت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ایک انگریز وزیٹر نے جسے اپنے موضوع سے نہایت کم واقفیت تھی، ان کی موجودگی میں "اینگلو انڈیا" کے خلاف سخت قسم کی یکطرفہ نکتہ چینی شروع کر دی جس پر اینڈریوز یکایک اور حیرتناک طریقہ سے اپنے ہم ملکیوں کی صفائی میں بولنے

رہے۔ اگر انگریز خواہ عارضی طور پر خواہ اثنائے گفتگو ہی میں سہی، مظلوم ٹھہرتے تو اینڈریوز فوراً ان کی حمایت میں سینہ سپر ہو جایا کرتے تھے۔

باب ۵

ہندوستان میں عیسائی کلیسا

(۱۹۰۷ سے ۱۹۱۲ تک)

اینڈریوز کا جو زمانہ سینٹ اسٹیفنز کالج میں گزرا اُس کے آخری حصہ میں انہوں نے نسلی علیحدگی اور معاشرتی بے انصافی کے خلاف مسلسل جدو جہد کی۔ انہوں نے مقدمہ چلائے بغیر جلاوطن کر دینے کی سیاسی پالیسی اور پریس ایکٹ کے جارحانہ عملدرآمد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ہندوستانی صورتِ حال کا جو مطالعہ انہوں نے کیا وہ انہیں بتدریج اِس عقیدہ پر لا رہا تھا اور وہ خود بھی ۱۹۱۰ میں اس پر پہنچ گئے تھے اگرچہ انہوں نے کئی سال بعد تک اسے تحریری سانچے میں نہیں ڈھالا — کہ صرف مکمل آزادی ہی ہندوستان کی صحت بخش قومی زندگی کو مکمل طور پر بحال کر سکتی ہے۔

پھر بھی ۱۹۰۷ کے بعد سے ان کی دلچسپیوں میں ایک گونہ تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اسے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ قیام دہلی کے ابتدائی تین چار سالوں میں اینڈریوز یہ سمجھتے تھے کہ "مشنری برادرہڈ" میں اور ایک عیسائی کالج کے تعلیمی عملہ میں رہنے سے انہیں عیسائی کی حیثیت سے خدمت کرنے کے پورے مواقع حاصل ہیں۔ مگر ۱۹۰۷ کے بعد سے وہ روز بروز ان حالات سے غیر مطمئن ہوتے گئے۔ مذہب کی محبت

ان کے دل کے اندر فروزاں تھی اور ان کی خواہش تھی کہ وہ آزاد ہو جائیں تاکہ وہ اس کا اظہار اس طرح سے کریں کہ کالج کے مقررہ فرائض کے تقاضے یا کسی غیر ملکی مذہبی روایت کے حشو و زوائد کی جکڑ بندیاں ان کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اس زمانہ میں انہیں جو تجربات ہوئے ان میں سب سے نمایاں وہ تھے جن کے ذریعہ وہ عیسائی خدمت کے جدید طریقوں اور عیسائی تخیل کے نئے زاویوں سے رُوشناس ہوئے۔ ہندوستان نے انہیں دینیات اور مذہبی تجربہ کی تکمیل کی نئی راہیں سوچنے پر اکسایا۔ یہ تلاش نامکمل رہی مگر ایسا نہیں ہوا کہ انہیں اس کا انعام نہ ملا ہو تاہم وہ اس دور میں ان کے خیالات کے سمجھنے کی کنجی ہے۔

(۱)

یہ قدرتی بات تھی کہ اینڈریوز بشپ ویسٹ کوٹ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے شروع ہی سے عیسائیت کے متعلق یہ رائے رکھیں کہ وہ بلند ترین ہندوستانی مذہبی تخیل کی دشمن نہیں ہے بلکہ اس کی شاندار تکمیل ہے۔ جنگجویانہ اسپرٹ جو اس دور کے پادریوں کی تحریر و تقریر کا طرۂ امتیاز تھی، ان کی نظر میں، اتنی ہی قابل نفرت تھی جتنی یہ رائے کہ ہندوستانی رسوم، روایات، نیز لباس وغیرہ کلیتہً ناقابلِ قبول ہیں جن کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی عیسائی اپنے ہی وطن میں غیر ملکی بن گئے تھے یوحنا کی انجیل میں ایک آیت ہے جو انہیں بہت محبوب تھی اور جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح سے "اقوام کی شان اور عزت" خدا کے مقدس شہر میں لائی جائیگی۔ وہ ہندوستان کی "شان اور عزت" کا مشاہدہ اس کے دیہاتی باشندوں کی سیدھی سادی پاکیزگی میں کر چکے تھے، انہوں نے وہی خدائی شان اس کے غیر عیسائی مقدس اشخاص اور پیغامبروں کے کام میں محسوس کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ "ملحدوں کے مشن جیسے جملہ کا بے تکا استعمال میرے کانوں پر گراں گزرتا ہے۔" اور وہ دو اقتباسات سنایا کرتے تھے جو انہیں عہدِ جدید کی طرح محبوب تھے:

فرید، اگر کوئی شخص تجھے مارے،
تو بدلے میں اسے نہ ماریو، بلکہ اس کے پاؤں کو بوسہ دیجیو۔
فرید، اگر تیرے دل میں سب قوموں کے خدا کی تمنا ہے،
تو تو گھاس کی طرح بن جا جس پر لوگ چلتے ہیں
فرید، جب کوئی شخص تجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دے
اور کوئی دوسرا شخص تجھے اپنے پاؤں تلے روند ڈالے اس وقت
تو خدا کی بارگاہ میں داخل ہوگا۔

انسان کو چاہیئے کہ محبت کے ذریعہ غصہ پر قابو پائے
اسے چاہیئے کہ نیکی کے ذریعہ بدی پر غلبہ حاصل کرے۔
انسان کو چاہیئے کہ فیاضی کے ذریعہ لالچ پر فتح پائے
اسے چاہیئے کہ جھوٹ پر سچائی کے ذریعہ قابو پائے۔[1]

ہندوستانی بھگتوں کی تعلیم اور مسیح کی تعلیم میں ایسی مماثلتوں کی موجودگی میں اینڈریوز نے اندازہ لگایا کہ روح القدس عیسائی مبلغِ انجیل کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بھگتی لٹریچر کا بہت سا حصہ ایسا ہے جو بصیرت کے اعتبار سے براہِ راست عیسائی اثرات اور قدیم نسطوری پادریوں سے متاثر ہوا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"اس امر کی بہت کچھ شہادت ملتی ہے کہ کبیر سے لیکر شمالی ہندوستان کے بھگتی دبستان کے اشخاص عیسائی تعلیم سے آشنا تھے۔... یہ کہ ایشیا کی سرزمین میں صدیوں پیشتر کلام کا بیج بو دیا گیا تھا اور یہ کہ اس نے ان مذاہب میں جو پکڑ لی تھی جو وہاں پہلے سے موجود تھے اور اس طرح سے اس نے خود ہمارے

---

[1] اقتباسات از "گرنتھ صاحب" و "دھماپد"۔

زمانہ میں پورے عیسائی پیغام کی آمد کے لئے راستہ تیار کر دیا ہے۔"

اس زمانہ میں اینڈریوز محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان کی قومی امنگوں میں جو قوت پائی جاتی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "مشرقی سرزمین میں عیسائی تخیل کی تخم ریزی" ہو چکی ہے۔ انہوں نے لکھا: "قومیت، روشنی اور عوام کے معیار کی بلندی یہ سب چیزیں مشرق میں عیسائی مغرب سے آئی ہیں۔" انہوں نے بتایا کہ انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس کی ابتدا "خالصتہً عیسائی دعائیہ الفاظ سے" کی تھی[1]۔ ان کی تحریروں سے ان کے اس عقیدہ کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ یہ قومی آرزوئیں امنگوں کی مذہبی امنگوں کی طرح صرف اسی وقت صحیح طریقہ سے پایۂ تکمیل کو پہنچیں گی جب وہ عیسائیت قبول کر لیں گی اور اس پر عمل پیرا ہو جائینگی۔" "اسٹیفینین" اور دوسرے رسائل میں انہوں نے اس امر کے ثبوت میں تاریخی شہادت پیش کی کہ عیسائی مذہب قومی خصوصیات کو زائل کرنے کی بجائے اس امر کا امکان رکھتا ہے کہ بلند ترین حب الوطنی کو بیدار کرے اور پاکیزگی اور اتفاق پیدا کرنے کا سبب بنے۔ انہوں نے بتایا کہ اس نے رومی سلطنت (جس کی تاریخ کا مخصوص مطالعہ اس زمانہ میں اینڈریوز کر رہے تھے) کے صوبجات میں کس طرح سے بیداری کی لہر پیدا کی اور کسی طرح سے بے کیف یکسانیت کو ایک طاقتور اور متنوع زندگی میں تبدیل کر دیا، کسی طرح سے اس نے اٹلی میں میزینی کو، ہندوستان میں کالی چرن بنرجی کو متاثر کیا اور کس طرح سے جدید قوم پرست جاپان کا احترام حاصل کیا۔ انہوں نے یورپ کی تاریخ سے مثالیں لیکر بیان کیا کہ "سماج کی گہری بنیادوں تک پہنچنے کے لئے" اس میں طاقت موجود ہے اور انہوں نے اپنے بیان کے ثبوت میں "ایک نہایت جوشیلے قوم پرست" کے اس قول کو پیش کیا جسے انہوں نے خود اپنے

---

[1] "ایسٹ اینڈ ویسٹ"، جولائی ۱۹۰۰۔ اس میں قدرے غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ کلکتہ کانگریس میں جو دعائیہ الفاظ استعمال کئے گئے تھے، وہ عیسائی رسم و رواج کے مطابق ضرور ہیں، لیکن ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی مروجہ عیسائی عقیدہ کا ماخوذ ہیں۔

کانوں سے سنا تھا: "بہرحال جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس وقت صرف عیسائیت ہی وہ کام کرتی ہے جس کے حصول کے لئے ہم قوم پرست کوشش کرتے رہتے ہیں — یعنی عوام کی ترقی اور ان کی بلند معیاری۔"

آخر میں وہ عیسائیت کو ایسا مذہب خیال کرتے تھے جو ہندوستان کی مخالفانہ جتھے بندیوں میں ان سے ماورا ہونے کی وجہ سے اتحاد پیدا کرا سکتا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ دنیا کے زندہ مذاہب دو گروہوں میں منقسم کئے ہیں: "ساکن" جس کا نمونہ اسلام ہے اور "متحرک" جس کی نمائندہ ہندو اور بدھ مذاہب کی روایات ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان عیسائیت پُل کی حیثیت رکھتی ہے، یہ ساکن ہے اس لئے کہ اس کا مرکز نہ بدلنے والے یسوع مسیح کی ذات ہے، یہ "متحرک" ہے اسلئے کہ روح القدس کی زندہ طاقت پر وہ اعتقاد رکھتی ہے۔

ان کی صحیح صورتِ حالات کے متعلق ایک نہایت مکمل واحد بیان ایک پمفلٹ میں درج ہے جس کا نام "انڈیا اِن ٹرانزیشن" (India in Transition) ہے جسے کیمبرج مشن نے ۱۹۱۰ میں شائع کیا تھا۔ اس میں مزید دلچسپی یوں پیدا ہوگئی ہے کہ اس میں رابندرا ناتھ ٹیگور کا ایک طویل اقتباس دیا گیا ہے جس میں ہندوستان کی ضروریات کی تشخیص کو مخلصانہ اعتراف کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"اگر عیسائیت کو کامیاب ہونا ہے تو اسے ماضی کی عظیم الشان مذہبی کوششوں کے مخالف اور حریف کی حیثیت سے آگے نہیں آنا چاہئے، بلکہ اسے مددگار اور تکمیل کنندہ کے طور پر، صلح کرانے والے اور دوست کی حیثیت سے آنا چاہئے۔ اس امر کی خواہش نہیں ہونی چاہئے کہ ہندومت سے نو مذہب حاصل کئے جائیں، بلکہ مصیبت کے وقت اس کی مدد کو پہنچنا چاہئے۔ اور ان فرائض کی تکمیل میں جن سے وہ عرصۂ دراز سے غفلت برت رہا ہے، اس کی اعانت کرنی چاہئے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور نے اپنے الفاظ میں بتایا ہے کہ ہندوستان ہم سے کیا چاہتا

ہے۔ وہ چلّا کر کہتے ہیں: "کیا ہمیں زیادہ بلند سوشل خیالات کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں ضرورت نہیں ہے؟ کیا ہمیں انسانیت کے زیادہ بلند تخیل کی ضرورت نہیں ہے جو ہمیں آمادہ کرے کہ ہم ان زنجیروں کو اتار کر پھینک دیں جنہوں نے ہماری انفرادی زندگی کو جکڑ رکھا ہے؟ ہم نے محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ انگلستان اس عظیم الشان موقع کی بلندی تک پہنچنے سے قاصر رہا ہے اور اس لئے ہم ایک ایسی پریشانی میں مبتلا ہیں جس کے متعلق ہم ابھی تک یہ بھی نہیں جانتے کہ اسے کس نام سے پکاریں؟

اگر کبھی کلیسائے مسیح سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے آقا کے نام سے آگے آئے، تو وہ ہمیں ان جیسے الفاظ سے ملتا ہے کیا وہ "زیادہ بلند سوشل خیالات کی آمد"، اور "انسانیت کے زیادہ بلند تخیل" کی پیشکش نہیں کر سکتا؟ جہاں انگلستان عظیم الشان موقع کی بلندی تک پہنچنے سے قاصر رہا ہے کیا وہاں کلیسائے مسیح کامیاب نہیں ہو سکتا؟

نہیں! وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے ہی حلقہ کے اندر اُن نسلی اور ذات پات کی خرابیوں کی اجازت دیتا ہے جن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کش مکش کر رہا ہے۔.....

ہندوستان میں عیسائی مذہب کی آخری فتح کا دارومدار اس روحانی طاقت میں مضمر ہے۔ جو عیسائی کی حیثیت سے، انگریزوں اور ہندوستانیوں میں اتحاد کرانے میں، عیسائی کی حیثیت سے برہمنوں اور اچھوتوں میں اتحاد کرانے میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ صرف اور صرف اسی وقت ہندوستان کا دل عیسائی پیغام پر پورے طور سے لبیک کہیگا اور ایک نئی ہندوستانی قوم اٹھیگی جو دنیا میں اپنے عظیم الشان مستقبل کی تکمیل کر سکے گی۔"

اس اقتباس سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ ایک دماغ ہے جو بے شمار غیر حل شدہ مسائل سے نبرد آزما ہو رہا ہے۔ ایک شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں میں عیسائی کی حیثیت سے اتحاد" کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے اگر ساتھ ہی

"ہندومت سے (اور غالباً اسلام سے بھی) تو مذہب حاصل کرنے کی خواہش بھی ترک کرنا مقصود ہو؟ کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ "عیسائیوں" سے اینڈریوز کی مراد مرئی منظم عیسائی کلیسا سے تھی۔" عیسائیت" کے بارے میں جو حوالے ملتے ہیں ان میں بھی اسی قسم کا ابہام موجود ہے۔ ایک مضمون میں جس کا عنوان تھا "ہندوستان میں مسیح" اور جو ۱۹۱۰ میں تحریر کیا گیا تھا، وہ اس ہمدردی اور ادراک کا ذکر کرتے ہیں جو غیر عیسائی مذہبی آدمیوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں انہیں نظر آئی، نیز اس بات کا کہ انہیں کس طرح کے تخیل میں اپنے تجربہ کا حل تلاش کرنے میں امداد ملی:

"چونکہ مسیح ابن آدم ہے، لہذا عیسائیت کو بھی ہمہ گیر ہونا چاہئے۔ اس سے بھی وسیع تر جس کا اظہار بپتسمہ لئے ہوئے عیسائیوں کے کلیسا سے ہوتا ہے۔ عیسائی تجربہ ایسے ہمہ گیر عہد و پیمان پر مشتمل ہونا چاہئے جس میں یسوع مسیح سب لوگوں میں نظر آئے اور سب سے خراجِ عقیدت حاصل کرے۔" [1]

لیکن جب وہ اپنے تجربہ کے دوسرے پہلو پہ آتے ہیں اور ایسی اساس کی تلاش کرتے ہیں جس پر مختلف عیسائی کلیسا اپنے تبلیغی کام میں متحد ہوسکیں، اس وقت وہ بپتسمہ کو لازمی خیال کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ:

"ہندوستان میں جس شدید خطرہ کو روکنا ہے وہ بے راہ رو غیر متعلقہ عیسائیت ہے جو کلیسا کی ممبری کے ابتدائی عیسائیانہ فرض کی مطلق قائل نہیں ہے۔" [2]

یہ بالکل بیکار سی جدوجہد ہوگی اگر اسی قسم کے بیانات میں منطقیانہ طریق پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اینڈریوز اپنی مہم تلاش پر نکلے تھے اور ان کا تیز فہم دماغ کبھی مسئلے کے ایک پہلو پر اور کبھی دوسرے پہلو پر اپنی توجہ کو مرکوز کرتا رہا۔ خیالات کی قدیم سالمیت ان کے ہندوستانی تجربہ سے

---

[1] یہ مضمون ٹائپ شدہ صورت میں موجود ہے۔ مقام اشاعت معلوم نہیں ہوسکا۔

[2] دی ایسٹ اینڈ دی ویسٹ، جولائی ۱۹۱۲

تیزاب سے دُھل چکی تھی اور ان کی جگہ ابھی نئے خیالات نے نہیں لی تھی۔

اس کے برخلاف اُن کی اخلاقی بصیرت بہت تیز اور گہری تھی۔ہندوستان میں اپنے ابتدائی سالوں میں انہوں نے کبھی کبھی غیر عیسائی مذہبی تحریکات پر کھلم کھلا تنقید کی ہے جس سے بعد کے زمانہ میں وہ بہت محتاط طریقہ سے اجتناب کرنے لگے تھے کیونکہ اس کا نتیجہ بے سُود اور تنگ دلانہ بحث وتمحیص کی شکل میں نکلتا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس نوع کی نکتہ چینیاں دوبارہ شایع ہوں لیکن جن چیزوں کے خلاف وہ ہمیشہ اظہارِ نفرت کرتے رہے وہ ایسی باتیں ہوتی تھیں جن میں ذہنی یا اخلاقی بددیانتی کا ذرا سا بھی شائبہ ہو، لیکن حقیقی روحانی عقیدہ کے ساتھ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ ہمدردی کا اظہار کرتے رہے خواہ اس طریقہ اظہار میں غیر ملکی پن ہی پایا جائے مگر ایسے عقیدہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی ہر کوشش خواہ سیاسی یا فرقہ وارانہ مقاصد سے کی جائے، ہمیشہ انہیں مشتعل کر دیتی تھی۔

مزید برآں اس اخلاقی بصیرت کی راہ پر چلنے کا نتیجہ تھا کہ وہ غیر عیسائی ہندوستان کے دل سے قریب ترین ہوتے گئے ـــــ ایک طرف نیک دل مولوی ذکاء اللہ سے اور دوسری طرف جدید ہندو مذہب کے مقدس آدمیوں سے ان کے تعلقات گہرے تھے۔ان بزرگ ترین ہستیوں میں صرف سوامی رام تیرتھ سے اینڈریوز ذاتی طور پر واقف نہ تھے، مگر ان کی تحریرات میں بہت سی باتیں ایسی تھیں جنہوں نے گہرے طور پر ان کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا تھا۔مثلاً مسیح کی دعا پر جو تبصرہ سوامی جی نے کیا اس سے ان کے دل کی عمیق ترین گہرائیاں تک متاثر ہوئیں۔اس مقدس ہندو مبلّغ کی نظر میں "آج کے دن ہمیں روز کی روٹی دے" میں لالچ کی تمنا موجود نہیں ہے بلکہ یہ نفس کشی کی، اس عاجزانہ اعتراف کی دعا ہے کہ حال اور مستقبل کی ضروریات کی تکمیل امیر و غریب کے لئے یکساں طریقہ سے خدا کے ہاتھ میں ہے۔اینڈریوز ایسی تعلیمات کے بیحد معترف تھے اور جب ۱۹۱۱ میں ان سے سوامی رام تیرتھ کے مجموعہ مضامین کے لئے تمہید لکھنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے نہایت مسرت سے اسے قبول کر لیا۔ان کے مضمون سے اس ذہنی غیر یقینیت اور اخلاقی یقینی ہمدردوں کا اظہار ہوتا ہے جو اس دور میں اُن کی دوسری تحریرات کا امتیازی

پہلو تھا۔

"مجھے اقرار ہے کہ ادویت ویدانت کے فلسفہ سے مجھے صرف ہلکی اور دور کی ہمدردی ہے ..... مغرب انسانی شخصیت کی ابدی صفات پر اصرار کرتا ہے اور ذاتی شخصیت کے فقدان کے خیال کے خلاف بغاوت کرتا ہے جیسا کہ ٹینی سن کی نظم ان میموریم[1] کے شریفانہ عزم اور عقیدہ سے ظاہر ہے۔ میں خود اد عائی اور خود غرضانہ انفرادیت پر زور دینے کے خطرہ کو تسلیم کرتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ مشرق کی طرف سے اس میں کسی قدر توازن پیدا کرنے اور اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ لیکن مغرب کسی ایسے فلسفہ کو جو اسے یہ یقین دلانے کی اجازت نہیں دیتا کہ انسانی روحوں کے درمیان محبت ایک دائمی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے آخری اطمینان دلانے والے فلسفہ کے طور پر کبھی قبول نہیں کریگا۔

..... تیرتھ رام میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میرے دل کو متاثر کرتی ہیں۔ مثلاً ابدی زندگی کے قانون کی حیثیت سے نفس کشی پر ان کے خیالات، فطرت کی خوبصورتی کے بارے میں ان کی گہری قدر شناسی اور شادی شدہ زندگی کے متعلق ان کا مطمح نظر مجھے یقین ہے کہ ان پر نکتہ چینی کرتے وقت جو صاف صاف باتیں میں نے اپنی پوزیشن کو واضح کرنے کی غرض سے تحریر کی ہیں، میں نے ان میں وسعت قلبی اور اخلاص کی اُس اسپرٹ سے سر مو تجاوز نہیں کیا ہے جو خود مصنف کتاب کی اس قدر نمایاں صفت رہی ہے۔"

ٹینی سن کی نظم "ان میموریم" کی جانب حوالہ جو سینٹ اسٹیفنز کالج کے سینیئر طلبا کے ساتھ عقیدہ کے موضوع پر ان کی گہری ذاتی گفتگوؤں کا عنوان رہی ہے معنی خیز ہے۔ غالباً اس دور کی نہایت گہری ذہنی بصیرت ہی وہ خیال تھا جسے انہوں نے اپنی کتاب "ہندوستان کی بیداری" میں جو اُس زمانہ میں زیر ترتیب تھی، پھیلایا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"زندگی اور تخیل کے ہندوستانی حالات کے درمیان عیسائی پیغام مذہبی

---

[1] اس خوبصورت اور طویل نظم میں ٹینی سن نے فلسفہ موت پر مختلف اور اچھوتے انداز میں بحث کی ہے۔ مترجم

بحث و استدلال کی راہوں کے مقابلہ میں آرٹ، موسیقی اور شاعری کی وساطت سے برگ و بار لا سکتا ہے"

(۲)

بہت سے جارحانہ اور بے بنیاد الزامات میں سے جو اینڈریوز پر ان کی زندگی کے دوران میں لگائے گئے تھے، ایک یہ تھا کہ انہوں نے غیر عیسائی ہندوستانیوں کی امنگوں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کے جوش میں سینٹ اسٹیفنز کالج کے عیسائی طلبا کی چھوٹی سی جماعت سے قطعاً غفلت برتی۔ لیکن یہ بات سچائی سے بہت دور تھی اور جب یہ الزام چھپ گیا تو اس وقت رُدرا اور آلحٹ دونوں نے اینڈریوز کی صفائی میں بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا۔ عیسائی طلبا کی جو دیکھ بھال وہ کرتے تھے، وہ گہری ہمدردی اور دُور بینی پر مبنی تھی۔ جہاں وہ ان کی نسبت یہ سمجھتے تھے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) کہ وہ معاشرتی نا انصافی کے خلاف قوم پرستوں کے حملہ میں زبردست ہراول کا کام دینگے، وہاں وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ ان کا مفاد اسی میں ہے کہ انہیں ایک جداگانہ "عیسائی ہوسٹل" میں دوسرے طلبا سے الگ تھلگ نہ رکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کی منسوخی کے لئے کوشش کی اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔ مگر ان کے ساتھ ان کا سب سے بڑا احسان ذاتی دوستی تھی۔

۱۹۰۶ میں وہ فاربس رابنسن (Forbes Robinson) کے مطبوعہ مکاتیب سے جو مصنف کی وفات کے بعد شائع کئے گئے تھے، بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ رابنسن سے ان کی واقفیت کیمبرج کے زمانہ سے تھی اور ان مکاتیب سے مرحوم کی اُس گہری ذاتی محبت اور دوسروں سے ہمدردی کا پورا پورا اظہار ہو جاتا ہے۔ جو انہیں اپنے دوستوں سے تھی۔ انہیں پڑھکر اینڈریوز نے بھی فوراً یہ محسوس کیا کہ کلیسائے ہندوستان کے لئے وہ مکاتیب ایک خاص پیغام رکھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

"ہم اپنی ہی انجمنوں، اسکیموں اور اداروں میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ہم ذاتی رابطہ جیسی ضروری چیز کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ عیسائیوں کی

جماعت کے اندر مختلف نسلوں کے لوگوں کے مابین حقیقی اور مخلصانہ ذاتی دوستیاں ہونی چاہئیں۔ اس اصول کی مطابقت میں وہ اور رُودرا طلبا کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کو جو عیسائیوں اور غیر عیسائیوں پر مشتمل ہوتی تھیں، لمبی تعطیل کا کچھ حصہ شملہ کی پہاڑیوں میں اپنے ساتھ بسر کرنے کی غرض سے بلاتے تھے جہاں وہ گھریلو تعطیل کی اطمینان بخش فضا میں ساتھ کام کرتے تھے اور کھیلتے تھے۔ وہاں وہ ایک خاندان کے افراد کی طرح بیماری اور صحت میں ایک دوسرے کی خبر گیری کرنا سیکھتے تھے اور ان کے سیر سپاٹے کے دوران میں بہت سے مواقع ایسے آتے جب وہ ضرورتمند لوگوں کی عملی خدمت کر سکیں جس کی تعلیم اینڈریوز دہلی میں انہیں دے چکے تھے۔ ان میں سے ایک ایسے واقعہ کی داستان یہاں درج کی جاتی ہے جسے انجیل والے نیک نہاد انسان کی تمثیل کی نقل سمجھنا چاہئے۔ شدھیر رُودرا کا بیان ہے:

"مسٹر اینڈریوز اور میں ایک دن کوٹ گڑھ اور شملہ کے درمیان پیدل چلے جا رہے تھے کہ راستے میں ہمیں ایک قلی ملا جو شدید درد کی وجہ سے سڑک کے کنارے جھکا بیٹھا تھا۔ یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ اس نے اپنی بھوک بجھانے کے لئے برف کھالی تھی۔ ہم اس وقت شملہ سے کوئی دس گیارہ میل کے فاصلہ پر تھے اور بہت سے لوگ آجا رہے تھے۔ ہم نے ایک ایک کو روک کر منت سماجت کے ساتھ اس کے لئے رکشا طلب کی لیکن کوئی شخص بھی اس کی مدد کرنے پر تیار نہ ہوا۔ خچر والے بھی جلدی جلدی اپنا راستہ طے کرتے رہے۔ بارھویں میل پر ہم نے ریسٹ ہاؤس میں ایک برطانوی فوجی افسر کے ساتھ چائے پی تھی۔ اس لئے مسٹر اینڈریوز اس سے امداد حاصل کرنے کے لئے گئے اور میں بیمار آدمی کے پاس بیٹھا مالش کرتا رہا اور اسے ہر ممکن طریقہ سے آرام پہنچاتا رہا۔ مسٹر اینڈریوز اس افسر سے برانڈی اور کمبل لیکر جلد ہی واپس آگئے، اور تھوڑی دیر بعد خود وہ افسر بھی آگیا اور اپنے ساتھ رکشا بھی لایا چنانچہ اس غریب آدمی کو کمبلوں میں لپیٹ کر آرام کے ساتھ شملہ بھیج دیا گیا۔"

جو طالب علم ایسی مہموں میں حصہ لیتے تھے۔ وہ اینڈریوز کے بارے میں ان الفاظ

کا اعادہ کر سکتے ہیں جو خود انہوں نے اپنے کیمبرج کے اساتذہ کے متعلق خراج تحسین ادا کرتے وقت استعمال کئے تھے ۔۔۔ "جن کی دوستی روحانی فیضان کا سرچشمہ ہوتی ہے"۔ ؎۱
اینڈریوز ۱۹۰۶ کے موسم بہار میں بشپ لیفرائے کے ساتھ کوٹ گڑھ گئے جو پہاڑوں میں شملہ سے دور کوئی پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں پر لیفرائے سن شعور کو پہنچنے والے عیسائی بچوں کو عیسوی دین کی تلقین کی رسم ادا کیا کرتے تھے۔ دوسرے دن صبح کو ہتّو کی پہاڑی پر یہ دونوں آدمی چڑھ رہے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ چوٹی پر پہنچیں، بادل چھا گئے۔ لہذا کہر میں کھڑے کھڑے انہوں نے صبح کی دعا مانگی۔ جب وہ حمد کے ان الفاظ پر پہنچے کہ "ہمارا غمخوار روح القدس ہے" تو بادل یکایک چھٹنے شروع ہو گئے اور مطلع بالکل صاف ہو گیا ۔۔۔ بادلوں کے پیچھے جو وادی میں چھائے ہوئے تھے، ایک خیرہ کرنے والی روشنی راستہ سا بناتی ہوئی اوپر کو چلی گئی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کہر سیروں سے بلند ہوتی ہوئی ان ابدی برفانی چوٹیوں کی جانب چلی گئی ہے۔ جو اسکے سروں پر نظر آ رہی تھیں۔ خاموش استعجاب سے انہوں نے اس حیرت انگیز منظر کو دیکھا اور پھر جب کہر دوبارہ چھا گیا، تو انہوں نے حمد و ثنا کے ان الفاظ کو نئے جوش سے گایا: "تو شان و شوکت کا بادشاہ ہے، اے یسوع مسیح"۔ اینڈریوز نے اس دن سے ہتّو پہاڑی کو ایک مقدس عبادت گاہ بنا لیا اور ہر سال وہ وہاں عیسائیوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی کو لیجاتے جہاں ٹھنڈی روشن چٹان کو مذبح بنا کر ایسے عالم میں کہ پُر شکوہ خاموشی چاروں طرف طاری ہوتی، وہ ان کے ساتھ عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ جب اینڈریوز نے "دعا کی کتاب" کے شاندار اور حسین الفاظ پڑھے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ ان میں ایک نئے الہام کی صلاحیت جلوہ گر ہو گئی ہے، اس لئے کہ انجیل کی شاعری اور اسکی حیرت انگیز عبادت کے اعتراف میں ایک آرٹسٹ اور شاعر کی حیثیت سے ان کے دل میں لطیف ترین جذبات پیدا ہوئے اور انہوں نے پھر نہایت خشوع و خضوع کے

؎۱ اینڈریوز کا ایڈریس جو انہوں نے طلبائے کلکتہ کے سامنے تقسیم اسناد کے موقع پہ مارچ ۱۹۳۶ء میں دیا تھا۔

ساتھ نماز پڑھی۔

نوجوان اشخاص جس ذوق و شوق سے اس بے تکلفانہ اور دوستانہ رفاقت پر لبیک کہتے اس کی وجہ سے اینڈریوز کو شدت کے ساتھ صحیح قسم کے اساتذہ کی ضرورت کا احساس ہوا تاکہ اُن کی امداد سے تمام ہندوستان میں اس قسم کے کام کو پھیلایا جا سکے۔

۱۹۰۷ء میں انہوں نے "نیشنل مشنری سوسائیٹی" کے وی۔ ایس۔ ازاریہ اور وانی ایم۔ سی۔ اے کے جے۔ کارٹر کے ساتھ ملکر "برٹش اسٹوڈنٹ کرسچین موومنٹ" کی کانفرنس کے نام ایک تار بھیجا جس میں ہندوستان کے عیسائی طلبا کی طرف سے انگلستان کے طلبا سے امداد کی اپیل کی گئی تھی۔ انہوں نے رودرا کے اشتراکِ عمل سے "قلیل مدت کی خدمت" کی ایک اسکیم مرتب کی جس کا مقصد یہ تھا کہ جو نوجوان انگریز گریجوایٹ ابھی تک اپنے پیشہ کے بارے میں ڈانواڈول ہوں وہ ہندوستان کے عیسائی کالجوں میں رہ کر دو سال تک غیر ماہر ٹیچر کی حیثیت سے کام کیا کریں۔ انہوں نے لکھا: "ہم انگلستان سے جو چیز طلب کرتے ہیں۔ وہ طالب علمانہ اسپرٹ ہے جو عیسائی طلبا میں جلوہ گر ہے۔ جو چیز ہمیں درکار ہے وہ نوجوانوں کا تازگی بخش اور ابھرتا ہوا جوش ہے۔"

ان اپیلوں کے جواب میں۔ جو لوگ ہندوستان آئے، ان پر اینڈریوز کا اثر و رسوخ بہت کافی تھا۔ ان میں سے کئی ایک نے بالآخر انہیں میٹ لینڈ ہاؤس (دہلی) یا شملہ میں ڈھونڈ نکالا۔ ان میں سے ایک (آرتھر ڈیویز) رقمطراز ہیں: "مجھے پادریوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلقات کے متعلق ان کے ساتھ گفتگو کرنے کے جو اصول اور خصوصی مواقع ملے انہوں نے میرے نظریہ کی تعمیر میں بیحد مدد دی۔" ایک دوسرے صاحب (نارمن ٹبز) لکھتے ہیں: انہوں نے میرے خیالات میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔" ایک تیسرے صاحب (جے۔ سی۔ ون سلو) لکھتے ہیں: "میرے لئے تو یقیناً وہ گرو کی حیثیت رکھتے تھے۔" سینٹ جانز کالج، آگرہ، میں ان نوجوان انگریز رنگروٹوں میں سے کچھ اور کچھ اینڈریوز کے اپنے شاگرد جو درس و تدریس میں مشغول تھے، بیچلرز کوارٹرز[1] میں ایک ساتھ رہا کرتے تھے

---

[1] وہ مکانات جہاں غیر شادی شدہ پروفیسر رہا کرتے تھے۔

یہ کھار تر بین الاقوامی تجربوں میں جو دوسرے مقامات میں کئے جا رہے تھے، بعد کو باعثِ تقلید اور مثالی بنے۔

جس زمانہ میں "قلیل مدت کی خدمت" والی اسکیم کی ابتدا کی گئی تھی اس وقت ایس۔کے۔دت جو ہندوستانی عیسائیوں کے لیڈر تھے، برطانیہ میں طلبا کی عیسائی تحریک کے عملہ میں تھے۔ جب وہ واپس ہندوستان آئے، تو وہ اور اینڈریوز اپنے رفقاکار کے ساتھ سیر کی غرض سے ایک یادگار تفریح کے لئے اوکھلے پہنچے جو دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر دریائے جمنا کے قریب واقع ہے۔ اینڈریوز نے اس مشرقی تفریح کو اپنی زندگی کے عمیق ترین لمحات میں شمار کیا ہے۔ اس زمانہ میں وہ پی۔سی موزمدار کی کتاب "مشرقی مسیح" کا مطالعہ کر رہے تھے اور موزمدار کے اس جملہ کو پڑھکر کہ "تاریکی روشنی تجلی میں تبدیل ہو جاتی ہے" انہیں محسوس ہوا کہ یہ تو خود اُن کے اپنے تجربہ کی گونج ہے۔ وہ اپنے نوجوان ساتھیوں کو لیکر نماز میں مصروف ہو رہے تھے۔ ان کی تقریروں کا موضوع یوحنا کی انجیل کے وہ الفاظ تھے جس میں مسیح کہتے ہیں کہ "تمہارے دلوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔" عبادت کی غرض سے انجیل کا مطالعہ کرتے وقت وہ مقدس پولوس کے خط رومیوں کے نام پڑھنے کی بجائے "نغمۂ محبت" پڑھتے جس کا ذکر کورنتھیوں کے نام پہلے خط میں کیا گیا ہے اور پھر پہاڑی کا وعظ کہتے اور مسیح کی بڑی تمثیلوں کو زیرِ مطالعہ رکھتے۔ لیکن بسا اوقات وہ یوحنا کی انجیل کے پانچ لافانی ابواب کو اپنے مطالعہ میں رکھتے جن کا اثر ان کی زندگی پر اس وقت سے پڑ رہا تھا جبکہ وہ برمنگھم میں سات سال کی عمر سے ان الفاظ کو سنا کرتے تھے۔ جو لوگ اوکھلے میں جمع ہوئے وہ ان ہزارہا اشخاص میں سے چند تھے جو طلبا کی کانفرنسوں میں یا ان سیر و تفریح کے مقامات پر ان کی تقریریں سنکر عبادت کی زندگی کے گہرے مفہوم کو سمجھنے کے قابل ہوئے۔

ایک اور اجتماع جس کی یاد مدتوں رہی، "سمر اسکول" تھا جس کی روح رواں اینڈریوز ہی تھے۔ یہ اجتماع شملہ کی پہاڑیوں کے ایک مقام بریری میں مئی اور جون ۱۹۱۱ میں ہوا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے بہت سے کلیساؤں کے نوجوان

پادریوں نے شرکت کی تھی۔ اینڈریوز نے ہندوستان کی مذہبی تاریخ پر بڑے زوردار تجزیے خود ان کی شخصیت نے جس سے مسیح کی محبت جلوہ گر تھی اور انسانی رفاقت کی گرم جوشی کا اظہار ہوتا تھا، ان دنوں کو یادگار بنا دیا تھا، اور بہت سوں کو توقع ہوئی ہوا کہ وہ دن دور نہیں جبکہ شمالی ہند کے متحدہ کلیسا کا خواب سنٹر اسکول کے ذریعہ پورا ہو جائیگا۔

متحدہ کلیسا کا تخیل اس زمانہ میں محض ایک خواب سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا اور خود اینڈریوز ان کلیسائی قواعد کی وجہ سے سخت پریشان رہتے تھے جن کے باعث انہیں "ہولی کمیونین" میں دوسری عیسائی جماعتوں کے افراد کے ساتھ آزادانہ ملنے جلنے کی آزادی نہ تھی، اس وقت انہیں علم ہوا کہ جب ذرا ان قواعد کے متعلق نکتہ چینیاں کیا کرتے تھے اس وقت وہ درحقیقت ہندوستانی عیسائیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے، چنانچہ بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ واقعات نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی رائے قائم کرلیں۔ وہ رقمطراز ہیں:

"ایک مرتبہ ہم نے اپنے ایک دلی صفت ہندوستانی عیسائی ریورینڈ ڈاکٹر چیٹرجی سے درخواست کی کہ وہ مشن کے کارکنوں کے لئے دہلی کے قریب کسی تفریحی پارٹی کا انتظام کریں۔ ڈاکٹر چیٹرجی برہمن تھے اور بعد کو انہوں نے مسیح کی خاطر ذات پات کو خیرباد کر دیا تھا اور اپنی اس جسارت پر برادری سے خارج کر دیئے گئے تھے۔ اس تفریحی پارٹی کے آخر میں "ہولی کمیونین سروس" ہونے والی تھی اور یہاں آتے ہوئے ہر ہندوستانی عیسائی کی یہ خواہش تھی کہ ڈاکٹر چیٹرجی ہی جو پریس بے ٹیرین تھے، اس کی صدارت کریں انہوں نے نہایت انکسار اور محبت سے اس دعوت کو قبول بھی کرلیا اور فرمایا کہ میں ایسے متبرک موقع پر کیسے انکار کر سکتا ہوں؟ اگر میں پیچھے ہٹ جاتا تو کیا پھر ویسا ہی منظر پیدا نہ ہو جاتا جو انطاکیہ میں رونما ہوا تھا، جبکہ مقدس پولوس نے پطرس کو اس کے منہ پر ڈانٹا تھا؟

ایک نوجوان مسلمان جو نیا نیا عیسائی ہوا تھا، میرا روحانی بیٹا تھا۔ اس کا تبادلہ ایسے

ضلع میں ہو گیا تھا جہاں کوئی اینگلیکن مشن نہ تھا تو کیا میں اس سے یہ کہتا کہ وہ اس سے الگ تھلگ رہے محض اس بنا پر کہ اسے بپتسمہ دیا جا چکا ہے، اور اینگلیکن مشن میں اس کی دینی تلقین کی رسم ادا نہوئی ہے جبکہ اس کے دوسرے ہم مذہب عیسائی اینگلیکن نہیں ہیں؟ ہم کون ہیں کہ ان نوجوان عیسائیوں پر ایسا بوجھ ڈالیں جنہیں نہ تو ہم اور نہ ہمارے باپ دادا برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں؟"[1]

ریورینڈ سی۔ بی۔ ینگ کے ساتھ جو بیپٹسٹ مشنری کی حیثیت سے ۱۹۰۸ میں دہلی آئے تھے، اینڈریوز کے تعلقات بہت مخلصانہ ہو گئے تھے۔ انہی کی خواہش پر ینگ نے سینٹ اسٹیفنز میں پڑھانا شروع کر دیا تھا اور اینڈریوز جو اُن دنوں میٹکاف ہاؤس میں بے خوابی کے مرض کا شکار تھے، شہر کے باہر کھلی خاموش فضا میں ینگ کے یہاں شب باشی کے لئے چلے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۱۰ میں ایک دن جمعہ کی شام کو جب اینڈریوز اُن کے گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ینگ ملیریا میں مبتلا ہیں وہ قدرے پریشان تھے کہ وہ آنے والی اتوار کو نماز کیسے پڑھا سکیں گے۔ اینڈریوز نے بے سوچے سمجھے وعدہ کر لیا کہ وہ ان کی بجائے خود جا کر نماز پڑھا دیں گے، انہیں یقین تھا کہ کلیسا کے ڈسپلن کی اس خلاف ورزی کو نظر انداز کر دیا جائیگا لیکن دوسرے دن انہیں معلوم ہوا کہ ان کا یہ خیال غلط تھا اور حقیقتہً انہیں ضروری اجازت نہیں مل سکتی۔ خوش قسمتی سے ینگ اتوار تک اس قابل ہو گئے کہ اس دن کی نماز خود پڑھائیں، مگر ایسے واقعات نے اینڈریوز کو خود اپنے کلیسا کی پالیسی سے سخت بددل کر دیا۔

(۴)

اینڈریوز کو ہندوستان آئے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ایک دن وہ اپنے

---

[1] ایک مضمون کے اقتباسات جو ۱۹۳۷ میں تحریر کیا گیا تھا اور اب صرف ٹائپ شدہ صورت میں موجود ہے۔

کسی ہندوستانی عیسائی دوست کے ساتھ پنجاب کے کسی شہر میں سے گزر رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک انگریز چھوٹی سی ٹٹو گاڑی میں جا رہا ہے اور راہ گیروں کو عبائیں بائیں منتشر کرتا چلا جا رہا ہے۔ ان کے دوست نے کہا: "دیکھئے، یہ ہے آپ کی عیسائیت آپ کا مقامی پادری اس طرح سے کام کرتا ہے۔ اب ذرا میرے ساتھ چلئے" وہاں سے وہ اس جگہ پہنچے جہاں ایک ہندو یوگی ننگی زمین پر بیٹھا تھا۔ ہندوستانی دوست نے کہا؛ "میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی زندگی بسر کرنے والوں میں بہت سے بدمعاش اور دھوکے باز بھی ہوتے ہیں لیکن وہ شخص سچا سادھو ہے اور لوگ میلوں سے اس کے پاس آتے ہیں" اسی قسم کا ایک اور سچا سادھو بھی تھا جو کبھی کبھی سینٹ اسٹیفنز کالج کے قریب ایک درخت کے نیچے آکر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اینڈریوز اسے اپنے مکان (میٹ لینڈ ہاؤس) کی کھڑکیوں سے دیکھا کرتے تھے۔ یہ تقابل بہت پریشان کن تھا۔ خداوند مسیح "جنکے پاس سر رکھنے کے لئے تکیہ نہ تھا" ہندوستان میں کس طرح مقبول ہو سکتے ہیں جب تک ان کے ماننے والے قومی مذہبی مطمح نظر سے ہٹ کر زندگی بسر کرتے رہینگے؟

۱۹۰۷ کے موسم سرما میں جبکہ یہ خیالات اینڈریوز کے دماغ میں گونج رہے تھے، انہیں دو عیسائیوں کی اطلاع ملی جن میں سے ایک امریکی تھا اور دوسرا ہندوستانی کہ وہ پنجاب کے طاعون زدہ دیہات میں عسرت اور ادنیٰ خدمت گزاری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسٹوکس امریکی تھے اور بہت مالدار اور وہ شملہ میں سیر و تفریح میں مشغول تھے کہ محکمۂ جنگلات کے ایک پنشن یافتہ افسر کی بیوہ مسز بیٹس سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اس عورت کی نیک زندگی کو دیکھکر اُس شخص میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ ترکِ دنیا کرکے سادھو کی زندگی اختیار کر لی تاکہ حاجتمندوں کی خدمت کرے۔ دوسرا شخص سندر سنگھ تھا جو ابھی لڑکا ہی تھا۔ وہ اپنے سکھ گھرانے سے اس بنا پر نکال دیا گیا تھا کہ اس نے کھلم کھلا عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور بشپ لیفرائے سے عیسائی مذہب کی تعلیم پانے کے بعد سبا تھو مین اسٹوکس کے ساتھ ملکر جذامیوں کی خدمت میں لگ گیا اور اس کے بعد سے انہی کے ساتھ رہا۔

ان دونوں کی مذہبی زندگی کی کہانی سنکر اینڈریوز کو ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے انکی

دعا قبول کر لی ہے ۔ انہوں نے مسٹر بیٹس کو ڈھونڈ نکالا جو موسم سرما بسر کرنے کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ دہلی میں آئی ہوئی تھیں انہوں نے وعدہ کیا کہ جب وہ موسم گرما میں کوٹ گڑھ آئینگے تو اس وقت وہ ان اشخاص سے ملائینگی جنہوں نے غربت اور خدمت الناس کا عہد لے رکھا ہے ۔ اس طرح سے ان دونوں میں دوستی ہو گئی جس کے نتائج بہت دُور رس نکلے ۔ اینڈریوز نے اپنے نئے دوستوں کو میٹ لینڈ ہاؤس میں مدعو کیا جہاں ان کی عسرت کی مسرت سے طلباء پر بہت گہرا اثر پڑا جنہوں نے بے خیالی میں اوسط درجہ کے عیسائی گھرانے کی مادّی قدروں کو قبول کر رکھا تھا ۔ ان کے ذہین دماغ نے نئے جوش سے متاثر ہو کر مختلف تجویزیں سوچیں تاکہ ان کی اپنی "کیمبرج برادر ہُڈ" بھی ان ہی لوگوں کی مثال کی پیروی کرے ۔ کیا اس کے ممبروں کے لئے ممکن نہیں کہ وہ خاص موسموں میں اپنی مشترکہ اجتماعی زندگی جاری رکھتے ہوئے سال کے باقی ماندہ حصہ میں مقدس فرانسس کے پیروؤں کی طرح یا مسیح کے حواریوں کی طرح دو دو کر کے " اپنے سفر کے لئے کچھ نہ لیتے ہوئے " نکلیں ؟ کیا ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے جو مسیح کی خاطر اپنی بھرپور زندگی مقدس عسرت و افلاس کی نذر کر دے اور یہ چیز ایسی ہو گی جسے ہندوستان سمجھ سکے گا ؟

ایک دوست نے لکھا کہ " وہ خاموش پُرسکون مشن ہاؤس میں زلزلہ کی مانند تھے " ۔ اور بلاشبہ خود اینڈریوز بھی اسی قسم کے خیالات میں غلطاں رہتے تھے ۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ ایک زبردست اندرونی قوت کی ، ایک آتش فشاں مذہبی ضیافت[1] کی ضرورت ہے تاکہ مغربی شعائر کے محدود کرنے والے اثرات غائب ہو سکیں اور ہندوستانی عیسائی گرجا کو خدمت کے لئے آزاد چھوڑ سکیں ۔ انہوں نے نوجوانوں کے جوشیلے جذبات سے ذیل کے الفاظ میں اپیل کی :

" مسیح آپ کو حکم دیتے ہیں کہ مغربی سہاروں سے بے نیاز ہو جائیں اور مردوں

---

[1] اس سے مراد وہ عیسائی ضیافت ہے جبکہ مسیح کے حواریوں پر روح القدس کا نزول ہوا تھا ۔ مترجم

کی طرح زندگی بسر کریں اور اپنے ایمانوں کو طاقتور بنائیں۔ تعلیم یافتہ ہندوستان جس چیز سے متاثر ہوگا، وہ صرف نفس کشی ہے۔ یہ ہمارا روپیہ نہیں ہے، یہ ہماری جماعتی تنظیم نہیں ہے جسے تولا جارہا ہے۔ اصل چیز ہماری روحانی زندگی کی شدت ہے۔" [1]

۱۹۰۷ کے اختتام سے پیشتر اسٹوکس، اینڈریوز اور ویسٹرن نفس کشی اور خدمت کی ایک جدید بین الاقوامی برادری کا خواب دیکھ رہے تھے۔ دوسرے سال اسٹوکس نے انگلستان اور امریکہ کی سیاحت کی اور وہاں انہوں نے اپنی کہانی بیان کرکے بڑی ہمدردی اور دلچسپی پیدا کردی۔ ان کی واپسی پر "اتباعِ مسیح کی برادری" کے قیام کی تجاویز پر بڑی سنجیدگی سے بحث ہوئی۔ یہ بہت جلد ظاہر ہوگیا کہ سندرسنگھ کسی سلسلہ میں شامل نہیں ہوگا بلکہ ایک تنہا عیسائی سادھو کی حیثیت سے اپنی فطری قابلیت کے راستہ پر بدستورِ سابق گامزن رہیگا۔ اینڈریوز اینڈریوز نہ تھے اگر وہ دل وجان سے یہ خواہش نہ رکھتے کہ اس بہادرانہ اولوالعزمی کی مہم میں شریک ہوجائیں۔ وہ یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ وہ دہلی کے غلیظ اور گندے مقامات میں یعنی سبزی منڈی میں چماروں اور چوہڑوں میں جاکر رہیں اور ساتھ ہی کالج کے فرائض کو بھی پورا کرتے رہیں۔ مگر آلنٹ اور رُودرا نے ان کی ایک نہیں سنی ۔ ان کا خیال تھا کہ اینڈریوز کی صحت جو ہمیشہ سے غیر یقینی رہی ہے، کام کی زیادتی کے بوجھ سے بالکل برباد ہوجائے گی۔ لہٰذا اسٹوکس اور ویسٹرن نے اینڈریوز کے بغیر ہی کام شروع کردیا اور ۲۲ فروری ۱۹۱۰ کو جدید "برادری" کی رسمِ افتتاح بشپ آف لاہور کے ہاتھوں ادا ہوگئی۔

دوسرے سال اینڈریوز نے "دی ایسٹ اینڈ دی ویسٹ" میں برادری کے مطمحِ نظر پر ایک واضح مضمون لکھا جس میں انہوں نے بتایا کہ مسیح کے ذریعہ "ہندومت" کی "تکمیل" کے متعلق ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مشنری

---

[1] خطبہ جو آگرہ میں ۲۰ نومبر ۱۹۰۹ کو عیسائیوں کے ایک جلسہ میں دیا گیا تھا۔

کو چاہیے کہ عیسائیت کو مغربی حشو و زوائد سے پاک کر دے، لیکن ساتھ ہی اسے
اس امر کی کوشش نہ کرنی چاہیئے کہ قبل از وقت اسے ہندوانہ لباس پہنا دے۔
وہ لکھتے ہیں:

"یہودیت کی تکمیل جو مسیح کے ہاتھوں انجام کو پہنچی، وہ آسانی سے نہیں
ہوئی بلکہ وہ تدریجی ارتقا تھی۔ یہودیوں نے انہیں صلیب پر چڑھا دیا۔ وہ قانون کی
تکمیل ہیں، اس کے باوجود پولوس کو معلوم تھا کہ قانون کے لئے انہیں اپنی جان دیدینی
چاہیئے تاکہ مسیح کے لئے وہ زندہ رہ سکیں۔ اسی طرح اگرچہ ہندومت بلند اور
شاندار ہے تاہم اس کی موت واقع ہونی چاہیئے اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ پیدا
ہو اور مسیح میں اپنی زندگی گزارے۔"

ان کی دلیل یہ ہے کہ "سچا راستہ یہ ہے کہ مغربیت سے اپنے آپ کو پاک وصاف کرلیا جائے
تاکہ ہم کسی خاص ملک کے شہری نہ رہیں بلکہ ابتدائی حواریوں کی طرح سیدھے سادے عیسائی
بن جائیں۔" آگے چلکر وہ لکھتے ہیں:۔

"سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان میں سچی مسیحی زندگی پیدا ہو تاکہ
ہم ہندوستان کی روحانی زندگی، ماضی، حال اور مستقبل کے خزانوں کے بارے میں
ہندوستانی کلیسا سے کہ سکیں: یہ سب چیزیں تمہاری ہیں کیونکہ تم مسیح کے ہو۔"

1911 کے موسم گرما میں جبکہ اینڈریوز شملہ میں بیمار پڑے ہوئے تھے اور ان کی
جسمانی قوت اسی شدت سے گھٹ رہی تھی جس شدت سے وہ زندگی بسر کیا کرتے تھے ہسٹوکس
اور وہ گھنٹوں ایک نئے مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے۔ اسٹوکس نے کہا کہ لوگ اس نئی برادری
کے متعلق یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ انسانیت کے بوجھ میں کچھ کمی نہیں آئیگی بلکہ وہ ان
مسائل سے بچنے کا ایک راستہ ہے جن سے عام آدمی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ ایسی
حالت میں کیا یہ زیادہ اعلیٰ اتباع کی بات نہ ہوگی کہ مسیح کے بلند معیاروں کو گھریلو زندگی
کی روزمرہ کی الجھنوں میں قائم و برقرار رکھا جائے؟ اینڈریوز کے دماغ میں وہ سب
باتیں تازہ ہوگئیں جو پارک شایر کی بنجر زمین پر چہل قدمی کے دوران میں ہوا کرتی تھیں

جبکہ بشپ ویسٹ کوٹ شادی شدہ عیسائیوں کی جماعت کا ذکر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کے خیال میں اس کے ذریعہ مغرب کا احیا ہو سکیگا۔ اور انہوں نے اسٹوکس کے اس فیصلہ کی پُرجوش تائید کی کہ وہ کسی ہندوستانی عیسائی خاتون سے شادی کرلیں۔

اسٹوکس کی شادی کے بعد اتباعِ مسیح کی برادری ختم ہو گئی۔ لیکن اس تھوڑی سی زندگی میں اس نے اپنا کام کرلیا۔ پنجاب کی نیشنل مشنری سوسائٹی میں اینڈریوز کے کچھ عیسائی شاگرد تھے اور انہوں نے بھی کوشش کی کہ مسیح کے حواریوں کی سی زندگی بسر کریں اور اپنے دیہات کی فضا میں جہاں وہ کام کر رہے تھے، اپنی عیسائی زندگی کا عملی نمونہ پیش کریں۔ برادری کے مطمحِ نظر اور اس کے متعلق اینڈریوز کی تبلیغ کا اثر دور دور پہنچا۔ اپریل ۱۹۱۲ میں نیشنل مشنری سوسائٹی کے ایک جلسہ میں اینڈریوز نے وہ تجویز پیش کی تھی جس کی وجہ سے سارے ہندوستان میں نئی برادریاں قائم ہو گئی تھیں اور انہوں نے کہا: "عیسائی آشرموں کا مستقبل بہت شاندار ہے"

(۴)

"مسیح کے ابتدائی حواریوں کی طرح ایک۔ سیدھا سادہ سچا عیسائی" یہ ہے وہ قلمی تصویر جو ایک انگریز وزیٹر نے جس نے گمنام رہنا پسند کیا ہے، "دہلی مشن نیوز" میں ۱۹۱۱ میں اینڈریوز کو دیکھکر کھینچی تھی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے مطمحِ نظر سے کسقدر قریب زندگی بسر کرتے تھے! اس انگریز نے انہیں مذاہب کے کنونشن منعقدہ الٰہ آباد میں دیکھا تھا:۔

"وہاں یہ طے ہو گیا تھا کہ مذہبی بحث نہ ہو گی بلکہ صرف بیانات دیئے جائیں گے۔ مہاراجہ دربھنگہ صدر تھے اور پان پر پان چباتے جا رہے تھے۔ وہاں سب قسم کے ملکوں کے نمائندے تھے بشمولیت ان کے جنہوں نے مختلف مذاہب سے اچھی باتوں کا انتخاب کر رکھا تھا۔ اس کے بعد ایس۔ کے۔ رُودرا آئے۔ بہت مستحکم، بہت پُروقار اپنے ملک اور اپنے لوگوں سے گہرے طور پر وابستہ اور انہوں نے یوحنا کی انجیل کے اقتباسات پڑھکر سنائے۔ پھر اینڈریوز نے جو ایک مقدس اور تارک الدنیا

شخص ہیں اگرچہ ان کے گال سرخ و سپید تھے، مسیح کے پھانسی پانے کے بارے میں تقریر کی۔ ان کی آواز بہت خفیف تھی، ان کے الفاظ انتہائی سادہ تھے۔ "میں یہاں پر ایک عیسائی کی حیثیت سے آیا ہوں تا کہ اس آقا کے متعلق تقریر کروں جس کی خدمت میں کرتا ہوں"۔ انہوں نے مسیح کی مشہور دعا دہرائی۔ انہوں نے اس خدا کا ذکر کیا جو سراپا محبت ہے اور اس لئے خود دنیا میں آیا۔" یہی وجہ ہے کہ ہم عیسائی کبھی بھی اپنے خداوند مسیح کو دوسرے پیغمبروں کی سطح پر نہیں لا سکتے" وہ خداوند مسیح کے پھانسی پانے کے واقعات اور انسانی گناہ کے بارے میں تقریر کرتے رہے۔ حاضرین تو ان کی باتوں پر دھیان دے ہی رہے تھے، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے آخر کار انجیل کو اسی کی سادگی میں ادا ہوتے سن لیا اور یہ کہ خود مقدس پولوس پہاڑی پر کھڑے وعظ فرما رہے ہیں۔"

(۵)

ان سالوں میں اینڈریوز نہ صرف ایک مقدس انسان اور ہادی کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ وہ عیسائی مدبر بھی تھے جن کی ذہنی چابکدستی نے گرجا سے متعلقہ بہت سے اہم مسائل کی گتھیاں سلجھا دی تھیں۔ ان میں سے ایک نزاعی مسئلہ یہ تھا (جس کی ابتدا بشپ وائٹ ہیڈ آف مدراس نے کی تھی) کہ کارکنوں اور سرمایہ کو اعلیٰ تعلیم کے غیر نفع بخش کام سے ہٹا کر عیسائی مشنوں کو "عوامی تحریک" کے ذریعہ مضبوط و مستحکم بنا دیا جائے۔ سیدھے سادے غیر متمدن قدیم ملکی باشندوں میں عیسائیت کی تبلیغ سے اینڈریوز کو گہری ہمدردی تھی۔ ان کی کتاب "شمالی ھند" میں اس قسم کے بہت سے مسائل سے بحث کی گئی ہے جن پر "تنقیدی نہ کہ جذباتی نقطۂ نظر سے" بحث کرنی چاہیئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ خود مسیح اس محبت کی خاطر جو انہیں عوام سے تھی، الگ ہٹ گئے تھے تا کہ اپنے کام کو جاری رکھنے کی غرض سے حواریوں کو تربیت دیں اور یہ کہ ہندوستان میں کلیسا کو بھی اپنے کالجوں کی وساطت سے یہی کام کرنا چاہیئے۔ وہ جرأت کر کے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ

کالجوں کو ضرور مستحکم کرنا چاہیئے تاہم عیسائی ابتدائی اسکولوں کو کلیسا کے مفاد کی خاطر ترک کیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے میں ہندوستان کو اس مثال پر غور کرنا چاہیئے جو رومی سلطنت میں کلیسا کی جانب سے قائم کی گئی تھی، جہاں ــــ

"عیسائی لڑکوں کو علیحدہ نہیں رکھا جاتا تھا بلکہ انہیں پبلک اسکولوں میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ تعلیم دی جاتی تھی اور جہاں اسکندریہ کے اوریجن اسکول کی طرح عیسائی علم اور فلسفہ پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔"

"عیسائی علم اور فلسفہ" میں ہندوستانی پادریوں کو تعلیم و تربیت دینے کے متعلق اینڈریوز کے خیالات بہت زیادہ قبل از وقت تھے۔ وہ ہندوستان میں اوریجنل عیسائی فکر کی کمی کو مُردہ کرنے والے نصابِ تعلیم سے منسوب کرتے تھے جو ہندوستانی عیسائیوں کی روزمرہ کی زندگی سے اس قدر بے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی اپنی تجویز یہ تھی کہ خالصتہً اینگلیکن اور مغربی مضامین کو اکثر سے خارج کر دیا جائے اور طلبا کی تمام تر توجہ خود بائیبل پر، عیسائی تاریخ کے ابتدائی تحریری دور پر اور عیسائی اصول مذہب اور ہندو اور اسلامی خیالات کی زندہ دھاروں کے باہمی تعلق پر مرکوز کر دی جائے اس لئے کہ ہندوستانی عیسائیوں کو اپنی زندگی اسی ماحول میں گزارنی ہے۔ انہوں نے خود اپنے کالج میں دی جانے والی عیسائی تعلیم کے مسئلہ پر بھی بہت غور کیا۔ وہ اتنے بڑے معلّم تھے کہ مذہب کو نصاب کا ایک مضمون تصور نہیں کرتے تھے جس میں جب چاہا کمی بیشی کر دی، بلکہ ان کا خیال تھا کہ مذہبی تخیل ایسا ہونا چاہیئے کہ کالج کی مکمل زندگی پر اثر انداز ہو ورنہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کی رائے میں مذہبی تعلیم کو برقرار رکھنے کے یہ معنی تھے کہ "تعلیم کے ایک بنیادی اصول کو قائم و برقرار رکھا جا رہا ہے، یعنی یہ کہ اس کی جڑیں مذہب میں قائم ہونی چاہئیں۔" ساتھ ہی ان کی حساس طبیعت کو اس مسئلہ سے بھی گہری دلچسپی تھی کہ مذہبی تعلیم تمام طلبا کے لئے کہاں تک لازمی ہو اور کس حد تک اختیاری۔ یہ ان کی عظمت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اس سوال کا کوئی ایسا آسان اور سطحی جواب نہیں ڈھونڈا جو ہر صورتِ حالات پر منطبق ہو سکے بلکہ جن مضامین میں انہوں نے ان مسائل سے بحث کی ہے وہ نہایت بیش قیمت خیالات سے پر

مشتمل ہیں اور ان کا تعلق صرف عیسائی فرقہ سے نہیں بلکہ تمام ہندوستان سے ہے۔

سینٹ اسٹیفنز کالج ہی ہندوستان میں سب سے پہلا کالج تھا جس نے ان کی رہنمائی میں عیسائی اساتذہ کے عملہ کے ساتھ ساتھ غیر عیسائیوں کو بھی کالج کی مذہبی زندگی میں شامل کر لیا۔ چنانچہ اساتذہ اور طلبا نے یکساں طور پر اس جماعتی بہبودی اور باہمی اعتماد کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جسے ایسے زمانہ میں قائم کیا جا رہا تھا جبکہ عیسائی تعلیمات کو بہت کچھ شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ بہرحال اس اقدام کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا کے دلوں میں کالج کے عیسائی فیضان کا احترام اور بڑھ گیا اور وہ اس سے پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

(۶)

اینڈریوز ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ والے دہلی دربار میں موجود تھے جبکہ ملک معظم نے ایک ایسے فیصلہ کا اعلان کیا جس کے راز کو اس ڈرامائی لمحہ تک بالکل محفوظ رکھا گیا تھا — یعنی یہ کہ حکومتِ ہند کے دارالسلطنت کو کلکتہ سے دہلی کے قدیمی پایہ تخت کو تبدیل کر دینا اور ساتھ ہی ایک طرف آسام کو اور دوسری طرف بہار اور اڑیسہ کو الگ کر کے بنگال کی وحدت وسالمیت کو از سر نو قائم کرنا۔ اینڈریوز نے فوراً اس "صحیح شاہانہ اعلان" کے زبردست بنیادی امکانات پر روشنی ڈالی اور حیرت انگیز صحت کے ساتھ پیشین گوئی کی کہ اس کے بعد سے صوبجات اور صوبائی دارالسلطنت تعداد اور اہمیت میں بڑھتے رہینگے۔ ساتھ ہی انہوں نے زور دیا کہ گرجا کو بھی چاہیئے کہ وہ اس علاقائی نشوونما کی تائید میں اپنے نظام کو ڈھالے اور یہ کہ کلیسائی صوبوں کا پلان اس طرح سے تیار کیا جائے کہ مزاج اور افتادِ طبیعت کے اعتبار سے جو اختلافات شمال کے عملی مگر کٹر، جنوب کے رنگین مگر جذباتی، بنگال کے انتہائی خیالی اور مرکزی اور مغربی ہندوستان کے باشندوں میں پائے جاتے ہیں وہ ان کے عین مطابق ہو جائے۔ ان کی تجویز تھی کہ میٹروپولیٹن یا پرائیمیٹ کو دہلی کے چھوٹے سے کلیسائی علاقہ کا بشپ بنا دیا جائے جہاں اس پر خالصتہً مقامی کام کا بار کم

ہوگا۔

ان باتوں کو دیکھکر بہت سے لوگوں کا خیال ہوگیا تھا کہ اینڈریوز لاہور کے بشپ کی حیثیت سے لیفرائے کے قائم مقام ہونگے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ تمام ہندوستان کے میٹروپولیٹن بن جائینگے!

ملک معظم کا اعلان سینٹ اسٹیفنز کالج کے لئے فوری اہمیت رکھتا تھا اس لئے کہ دہلی کے رتبہ میں جو تبدیلی ہوئی اس کی وجہ سے کالج کے دائرۂ خدمت میں بے انتہا اضافہ کی توقع تھی۔ ۱۹۱۰ میں رُدرا نے ایک فاضلانہ مقالہ میں ان اصولوں کو پیش کیا جن پر ان کے اعتقاد کے مطابق اعلیٰ عیسائی تعلیم کی بنیاد قائم ہونی چاہیئے اور آئندہ دو سالو میں انہوں نے اور اینڈریوز نے ملکر ایک نئے کالج کے دستور سیاسی کے سلسلہ میں کام بھی کیا جس میں وہ اصول مادی شکل اختیار کرنیوالے تھے۔ اعلان کے بعد سے ان کا منتہائے نظریہ تھا کہ کسی نئی جگہ پر ایک جامع رہائشی کالج قائم کیا جائے جہاں طلبا کی تعداد محدود ہو اور جس کے اساتذہ کا عملہ متحد الخیال اشخاص پر مشتمل ہو۔ اپریل ۱۹۱۲ میں وہ دونوں انگلستان روانہ ہوگئے تاکہ کیمبرج میں مشن کے ارباب حل وعقد کے سامنے اپنی تجاویز پیش کریں۔ (ایک شخص نے جو مارسیلز سے کیلے تک ایکسپریس ٹرین میں ان کا ہم سفر تھا، ہمیں بتایا ہے کہ جب اینڈریوز اپنے کمپارٹمنٹ سے نکلے تو اس نے ایک لمحہ تک ان سے بات کی اور پھر تیز آواز میں کہا "اُترن" بات یہ تھی کہ اینڈریوز اس وقت اپنے جس دوست کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اس کا قد بغیر جوتوں کے چھ فٹ تین انچ تھا، یعنی خود اینڈریوز کے قد سے پانچ چھ انچ لمبا)

نئے کالج کا دستور اساسی بڑی حد تک اینڈریوز کی محنت کا نتیجہ تھا۔ یہ بجائے خود ایک بڑا کارنامہ تھا اور باوجود امتداد زمانہ کے اس کی افادیت آج بھی اتنی ہے جتنی اس وقت تھی۔ لیکن انتظامی امور میں غیر اینگلیکن فرقہ کی اور غیر عیسائی عنصر کی شرکت کے لئے دونوں دوستوں کی متحدہ کوشش اور ترغیب وتحریص کی ضرورت تھی تاکہ قدامت پسند اور متامل کمیٹیوں میں اس پر منظوری صادر ہو۔ درحقیقت دونوں اس وقت کامیاب ہوئے جب انہوں نے مستعفی ہوجانے کی دھمکی دیدی۔ مگر اس تنگ نظر فرقہ وارانہ ذہنیت

کے اظہار سے جو اس وقت انگلستان میں غائب تھی، اینڈریوز کو اس قدر تعجب اور صدمہ ہوا کہ ان میں "اخلاقی انقلاب" رونما ہو گیا جس نے ان کی زندگی میں آنے والے انقلاب کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے بہت کچھ کیا۔

ایک اور بحث اینڈریوز کے بے لاگ مضمون کی وجہ سے پیدا ہوئی جس کا عنوان تھا "کلیسا کے اندر نسل کا سوال"۔ اس مضمون میں انہوں نے اسٹوکس کی طرح کی ملی جلی یعنی مخلوط شادیوں کو مکمل طور پر اور فیاضانہ طریقہ سے تسلیم کرانے کے لئے پُر زور وکالت کی تھی اور کہا تھا کہ اگر عیسائی مذہب انسانی مساوات پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے لئے یہ چیز ایک زبردست آزمایش کا حکم رکھتی ہے۔ ان کے پرانے دوست ڈاکٹر گورنے کہا کہ اینڈریوز کے دلائل "لاجواب" ہیں اور جو دلچسپی اس نزاع سے پیدا ہوئی اس نے اینڈریوز کی کتاب "ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ" کو جو کچھ عرصہ بعد شایع ہوئی، حیرت انگیز کامیابی عطا کی۔ بہت کم مشنری نصابی کتابیں ایسی ہیں جو برطانیہ کے طلبا پر اتنا گہرا اثر ڈال سکیں جتنا اس کتاب نے ڈالا۔ اس کتاب نے سینٹ اسٹیفنز کالج کے عملہ کے لئے قابل پروفیسروں کی جماعت کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیا۔ اگرچہ اینڈریوز اور رُدرا کی باہمی گہری اور وفادارانہ دوستی کا نظارہ کتاب سے کہیں زیادہ کشش کا موجب تھا۔ ایسا نظارہ قبل از جنگ کے کیمبرج میں بالکل حیرت انگیز تھا جسے کالج میں بہترین بین الاقوامی رفاقت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۱۲ کے موسم گرما میں معلوم ہوتا تھا کہ یہ رفاقت اور مشارکت جذبۂ خدمت کے نہایت ہی پُر منفعت دَور میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ دھارے جو اینڈریوز کو دہلی سے دُور تخیل اور جوشِ عمل کے زیادہ وسیع سمندروں کی طرف لیجا رہے تھے، آہستہ آہستہ قوی سے قوی تر ہوتے جا رہے تھے۔

باب ۶

نامعلوم سمندر

۱۹۱۲ سے ۱۹۱۴ تک

(۱)

جون ۱۹۱۲ میں اینڈریوز کیمبرج سے لندن گئے تاکہ سلطنت بھر کی یونیورسٹیوں کی کانگریس میں شرکت کریں۔ وہاں ہنری ووڈ نیون سن (مصنف اور جرنلسٹ) سے ملاقات ہوگئی جو دہلی میں ان کے مہمان رہ چکے تھے۔ نیون سن نے کہا: "کیا آپ رابندرا ناتھ ٹیگور سے ملنا چاہیئنگے؟ ولیم راتھینسٹین، آرٹسٹ، نے مجھے اتوار کی شام کو اپنے مکان پر ہیمسٹیڈ میں مدعو کیا ہے۔ ٹیگور بھی وہاں ہونگے اور شاعر آیرلینڈ ولیم ییٹس ان کی نظموں کے کچھ انگریزی ترجمے سنائینگے۔ آپ بھی میرے ساتھ وہاں کیوں نہ چلیں؟"

اینڈریوز کو دوسری مرتبہ کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب سے کیمبرج میں انہیں کچھ دن پیشتر یہ خبر ملی تھی کہ رابندرا ناتھ ٹیگور انگلستان آئے ہوئے ہیں اس وقت سے وہ ان سے ملنے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ہیمسٹیڈ میں اتوار کی شام ان کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوئی۔ جب رابندرا ناتھ ٹیگور کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ بڑے تپاک سے آگے بڑھے اس لئے کہ اگرچہ یہ دونوں اس سے پہلے کبھی نہیں ملے تھے تاہم وہ

اینڈریوز کی تحریرات کے اتنے ہی گرویدہ تھے جتنے اینڈریوز اُن کی تحریروں کے تھے۔ ہندوستان کے قومی مستقبل کے مشترکہ مطمح نظر اور خواہشات نے انہیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب کر دیا۔ اینڈریوز سیاسی مفکر کی حیثیت سے ٹیگور کے بہت زیادہ معترف تھے، لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کی عظمت کا حال انہوں نے صرف دوسروں سے سنا تھا اس لئے کہ اس وقت تک ان کی ایک نظم کا بھی انگریزی میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ راتھنسٹین کے مکان کے جلسہ کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی ادبی دنیا سے ان کی نظموں کا تعارف کرایا جائے۔

جب گیتانجلی کے اقتباسات پڑھے جانے لگے اُس وقت دھندلکا ہو رہا تھا اور اینڈریوز کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔ پیچھے عظیم الشان شہر کی بے شمار روشنیاں جھلملا رہی تھیں ان کے ارد گرد گہری خاموشی تھی اس لئے کہ ٹیگور کمرے میں بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں کے سامنے حسن و رعنائی کی ایک نئی دنیا پیش کر رہے تھے۔ اینڈریوز کے جوش و خروش نے سبقت کی اور انہوں نے اس حسین سادگی، ہمہ گیر انسانیت اور بلند اعتقاد کا استقبال کیا۔ یہ وہ پیغام ہے جو ہزار میل کے فاصلہ اور روایت کے بے شمار زمانوں میں سے گزر کر انگریزی قوم کے دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ وہ اس سے پیشتر بھی بسا اوقات یہ بات کر چکے تھے کہ مذہبی امور میں مشرق اور مغرب موسیقی، آرٹ اور شاعری کے ذریعہ ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس وقت اُن کے ذہن میں زیادہ تر یہ خیال تھا کہ انگریزی شاعری ہندوستان سے کیا اپیل کر سکتی ہے، اب یہ ہندوستانی شاعری تھی جو مغرب سے زبردست اپیل کر رہی تھی۔

اینڈریوز انہی خیالات میں تقریباً آدھی رات تک ان کی شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا وہ ان کے خیالات اور نظموں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ فطرت کے جمالیاتی اور جذباتی تاثرات میں گم ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

• میں ہیمسٹیڈ میدان کے برابر بھا برابر ایچ۔ ڈبلیو۔ نیوِنسن کی معیت میں

واپس چلا۔ لیکن راستہ میں ان سے بہت کم گفتگو ہوئی۔ میں تنہا رہنا چاہتا تھا اور اس شاعری کی حیرت انگیزی اور شان و شوکت پر تنہائی میں غور و فکر کرنا چاہتا تھا جب میں نیونسن سے جدا ہوا تو میدان میں چلا گیا۔ رات مطلق ابر آلود نہ تھی اور اس وقت آسمان پر ہندوستانی فضا کا سا ارغوانی رنگ جھلک رہا تھا۔ وہاں بیٹھکر میں تن تنہا اس کے حیرت انگیز حسن پر غور کر سکا:

"لاانتہا دنیاؤں کے سمندری ساحل پر بچے آپس میں ملتے ہیں،

"لاانتہا دنیاؤں کے سمندری ساحل پر، بچوں کا ایک بڑا اجتماع ہے"

یہ انگریزی ترنم کی طرح میرے دماغ پر چھا رہا تھا، اس قدر سادہ، میرے بچپن کی حسین آوازوں جیسا، جس نے مجھے بیخود بنا دیا۔ میں بہت رات گئے تک آسمان کے نیچے بیٹھا رہا، تقریباً پو پھٹنے تک"

یہی شاید اس افسوں کا راز ہے جو ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ گیتانجلی میں صرف ہندوستان کے گیت نہ تھے بلکہ اس ماں تا کی لوریاں بھی تھیں جنہوں نے بچپن میں اینڈریوز کو پالا تھا اور جس میں دور دراز نارتھمبرلینڈ کے سمندروں کی موسیقی بھی تھی۔

رابندرا ناتھ خود لندن میں نووارد کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے چہرے سے حالیہ علالت کے آثار نمایاں تھے۔ اور وہ اینڈریوز کی نظر میں بہت ہی نحیف اور بے یار و مددگار نظر آتے تھے۔ کیمبرج پہنچکر ان کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ کہیں شاعر کی صحت ان تمام اعزازات کے بار کی متحمل نہ ہو سکے جن کی بوچھاڑ کی جا رہی تھی۔ وہ ان سے ملے بغیر نہ رہ سکے اور جولائی کے آخر میں ان سے ملنے کے لئے خاص طور پر لندن گئے۔ آخرکار وہی ہوا جس کا انہیں خدشہ تھا، یعنی رابندرا ناتھ اپنی بڑھتی ہوئی شہرت کے ہنگاموں سے خستہ ہو رہے تھے اور سکون کے متلاشی تھے۔

سوشل ٹیڈرا اور ان کی صاحبزادی ایلا اینڈریوز نے پیمبروک کالج کے ایکسودست ہل آکسفورڈ کے ساتھ لندن کے مضافات میں ان کی خاموش اور پر سکون قیام گاہ بٹرشن میں مقیم تھے۔ اینڈریوز کی درخواست پر مسٹر اور مسز آکٹرم نے شاعر کو بھی اپنے یہاں

مدعو کر لیا اور اینڈریوز انہیں اگست کی ابتدا میں نبٹرٹن لے آئے۔ آرام و سکون کے یہ ایام دوستی کی ابتدا ثابت ہوئے جس میں جہاں تک اینڈریوز کا تعلق ہے ماں کی دیکھ بھال کرنے والی محبت اور مرید کی سی احترام سے بھری ہوئی عقیدتمندی دونوں ہی جسلوہ گر تھیں۔ ستمبر اور اکتوبر میں جب رابندرا ناتھ واپس لندن چلے گئے تو اینڈریوز کیمبرج سے ان سے ملنے کے لئے بار بار جایا کرتے تھے۔ وہ صبح کا وقت ساتھ گزارتے اور اس دوران میں "گیتانجلی" کے پروف پڑھتے جو اُن دنوں پریس سے آرہے تھے۔ سہ پہر کا وقت وہ راتھنسٹین کے مکان پر بسر کرتے جہاں رابندرا ناتھ اپنی تصویر کی تکمیل اور مزید گفتگو کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک دن کے آخر میں جب ٹرین اینڈریوز کو واپس کیمبرج لے گئی، تو ان کے خیالات اُس سلسلۂ تصورات میں سے ہوتے ہوئے دور نکل گئے جو رابندرا ناتھ کی دوستی کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ بنگالی سیکھینگے اور شاعر کی امداد مزید تراجم کے ذریعہ کرینگے جن کی بہت جلد مانگ ہوگی، اور جو شاید اس طرح نہایت شریفانہ طور پر دنیا کے سامنے ھندوستان کی ترجمانی کرسکینگے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ ٹیگور کی زیرِ ہدایت ہندوستان کے مذہبی خیالات کے عظیم الشان ورثہ کا غائر نگاہ سے مطالعہ کریں۔ لیکن انہیں، توقع نہ تھی کہ سینٹ اسٹیفنز کالج سے ان کا انقطاع ہو جائیگا۔ رُدرا نے انہیں واپس پرنسپل بنا دیا تھا اور جب وہ نومبر ۱۹۱۲ میں دہلی واپس آئے تو وہ اس خیال سے بہت خوش تھے کہ مسیح سے فیض حاصل کرنے والی تعلیم ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں مزید انہماک اور سرگرمی دکھائیگی۔ انہوں نے ٹیگور کو جو انگلستان سے امریکہ چلے گئے تھے، لکھا: "میری اپنی امید زیادہ سے زیادہ تعلیم سے وابستہ ہے۔ میرا اپنا تبلیغی کام کسی دوسرے میدان میں ناممکن العمل ہو جائیگا، لیکن اس شعبہ میں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ جہاں میں اپنے بلند ترین عیسائی جذبات کی تکمیل کرسکوں گا، وہاں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستان کی خدمت بھی کرسکونگا۔"[1]

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۱۲

اسی خط کا ایک اور ٹکڑا اس اعتبار سے بغایت درجہ دلچسپ ہے کہ اس میں اینڈ ریوز نے پہلی مرتبہ ان عقائد کا ذکر کیا ہے جو وہ ہندوستانی قومیت کے صحیح مطمح نظر کے بارے میں رکھتے تھے جو (جیسا کہ وہ رقمطراز ہیں) خود ان کے دماغ میں ۱۹۱۰ میں پیدا ہو چکا تھا:

"میرے خیالات دن بدن ایسے ہندوستان کی طرف منعطف ہو رہے ہیں جو صحیح معنوں میں آزاد ہوگا۔ اور باوجود اس کے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حالات موجودہ یہ کسقدر مشکل چیز ہے۔ اب تو واحد سوال یہ ہے کہ غلامی کے اس ذلیل چکر سے جس سے غلامی کی زنجیریں اور زیادہ مضبوط ہوتی جارہی ہیں، کس طرح سے چھٹکارا حاصل کیا جائے؟"

آزاد ہندوستان! کیا اس صدی میں اینڈریوز ہی سب سے پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے یہ دعویٰ کیا تھا؟

(۲)

باوجود اپنے تبلیغی پیشہ پر اعتقاد رکھنے کے جس کا اظہار انہوں نے ٹیگور والے مکتوب میں کیا ہے، اینڈریوز کے خیالات گہرے طور پر منقسم تھے۔ ہندوستان واپس آتے ہی انہیں کلیسائے پنجاب میں نسلی امتیازات کے مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ انہوں نے دہلی سے لاہور کا تھکا دینے والا رات کا سفر متعدد بار کیا تاکہ ہندوستانی اور انگریز پادریوں کے مابین جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انہیں صلح کرانے والے شخص کی حیثیت سے دور کر دیں اور ایسی نیم المیہ اور نیم مضحکہ خیز خرابیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے یورپین عیسائیوں اور ہندوستانی عیسائیوں کے لئے جداگانہ قبرستان کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دل میں یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے اور مشن کمیٹیوں کے ممبروں کے درمیان جن کے ساتھ انہوں نے اور رُدرا نے انگلستان کے قیام میں بہت کچھ بحث کی تھی، نظریہ کا زبردست اختلاف موجود ہے۔ وہ راتوں کو لیٹے لیٹے

اس بات پر غور کیا کرتے تھے کہ آیا انہیں ایسے اشخاص سے تنخواہ قبول کرنے کا کوئی حق ہے جن سے وہ عیسائی خدمت کے معاملہ میں اسقدر شدید اختلاف رکھتے ہیں۔

اس کے بعد کرسمس کا دن آیا۔ اینڈریوز گرجا گئے، ایسے دل کے ساتھ جو محبت اور عبادت کے جذبات سے مملو تھا۔لیکن عبادت کے دوران میں ہندوستانی سرودخواں لڑکوں کی جماعت نے تھے نی سی اُس کے عقیدہ کے ابتدائی الفاظ دہرائے جس نے والوز تھ میں بھی انہیں بہت پریشان کررکھا تھا۔" اس عقیدہ کے نہ ماننے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں جھونک دئے جانے کی سزا دی گئی ہے"۔ اینڈریوز نے دلی کراہیت کے ساتھ اسے سنا، ایسی شدید نفرت انہیں اس سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ جس کلیسا کا ایسے عقیدہ پر ایمان ہو اس کی نظر میں رابندرناتھ ٹیگور جیسا شخص بھی خدائی رحم وکرم سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا ۔۔ ٹیگور جن کی شاعری نے ان کے دل ودماغ میں نئی مذہبی امنگ پیدا کردی تھی اور جن کے متعلق انہوں نے اولین ملاقات میں یہ محسوس کرلیا تھا کہ وہ دل کے پاک ہیں! اور یہ کہ ایسے خوفناک الفاظ جو سرودخوان جیسے نوعمر نافہم بچوں کے منہ میں ڈالے جائیں ۔۔ وہ بچے جن کا ٹیگور نے ایسی نزاکتِ خیال کے ساتھ اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے ۔۔ انہیں قطعی کلمۂ کفر معلوم ہونے لگے۔

جیسا کہ اینڈریوز کے ساتھ یہ بات بار بار پیش آئی انہوں نے اس عقیدہ کے قابلِ اعتراض حصوں پر اعتراض کرنے شروع کردئے۔ ٹیگور سے ملنے کے بعد سے انہوں نے ایک نئے زاویہ سے ھندو اور بدھ مذہب کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کردیا تھا۔ وہ اپنے دل سے پوچھتے تھے کہ کیا تثلیث کا یہ انتہائی فلسفیانہ عقیدہ خدا کے ساتھ واصل ہوجانے کے بھگتی عقیدہ کی طرح لازمی طور پر عیسائیت کا جزو ہے؟ کیا کنواری مریم کے بطن سے مسیح کی پیدائش ایسے قصہ زیادہ حیثیت رکھتی ہے جس میں ایک اعلیٰ ہستی کے لئے عوام کے احترام کو ایک مادی شکل دیدی گئی ہو اُن قصوں کی طرح جو کرشن جی اور مہاتما بدھ کے بارے میں مشہور ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ انجیل کے دوسرے خیالی قصوں کی طرح محض افسانہ کی حیثیت رکھتی ہو؟ اپنی دماغی پریشانی اور الجھن کی وجہ

سے وہ ایک ایسی تنہائی محسوس کر رہے تھے جس کا تجربہ انہیں اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ وہ دوست بھی ان کے ہم نوا نہ تھے جو نسلی مساوات اور سینٹ فرانسیس کے تخیل خدمت کے بارے میں ان کی پوری ہمنوائی کر چکے تھے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ نئے دوستوں کی محبت کے خصوصی اور گہرے جذبات کے ساتھ پذیرائی کی گئی۔ جنوری ۱۹۱۳ میں جبکہ وہ تنہا تھے اور شک وشبہ کی حالت میں مبتلا تھے، دہلی میں آریا سماج کی عظیم المرتبت اور دلچسپ شخصیت مہاتما منشی رام سے پہلی مرتبہ ان کی ملاقات ہو گئی۔

اس سے قبل آریہ سماج کے بارے میں ان کا طرز عمل غیر جانبدارانہ اور بے لاگ تھا بہ حیثیت مجموعی آریہ سماج عیسائیوں کی شدید مخالف تھی اور اینڈریوز نے اپنی اس رائے کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی کہ "ستیارتھ پرکاش" میں عیسائی مذہب پر جو حملے کئے گئے ہیں وہ جاہلانہ اور متعصبانہ ہیں۔ لیکن جب ۱۹۱۰ کی ابتدا میں سماج کے بانی دیانند سرسوتی اور ان کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" پر اسی قسم کے متعصبانہ حملے کئے گئے۔ تو ان کی انصاف پسندی کا جذبہ بیحد مجروح ہوا اور انہوں نے اسی وقت ان کی صفائی میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے مہاتما منشی رام اور گروکل کانگڑہ میں ان کے تعلیمی کام کے بارے میں جو باتیں سنی تھیں وہ ایسی تھیں جن کی وجہ سے ان کے دل میں جذبۂ احترام پیدا ہو گیا تھا، اور جب وہ مہاتما سے ملے تو انہوں نے گروکل دیکھنے کے لئے اپنا پروگرام مرتب کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۱۳ کی ابتدا میں وہ ایک سے زیادہ مرتبہ وہاں گئے اور دریائے گنگا کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں انہوں نے کئی ہفتے بسر کئے جہاں منشی رام اپنے طلبا کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ ملاقات سرعت کے ساتھ دوستی میں تبدیل ہو گئی اس لئے کہ اینڈریوز مہاتما منشی رام کو اپنا بڑا عزیز بھائی خیال کرتے تھے اور ان کی شاندار انسانیت، ان کے کام کرنے کی طاقت۔ ان کی مزاح پسندی اور ان کی سادہ زندگی کے بے حد معترف تھے۔ انہوں نے مقدس دریائے گنگا اور ہندوستان کی پوتر سرزمین کے لئے ان کی والہانہ محبت کو سمجھنا اور مادر آفرینش (خدا) کے بارے

میں ان کے خیالات کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ ان کی اپنی بے قرار رہنے والی پُر جوش اسپرٹ نے اس جوان تخیل پر لبیک کہا جس کا مشاہدہ انہوں نے گروکل میں کیا تھا اور انہوں نے اپنے یہ تاثرات ایک پُر اثر مضمون کی صورت میں "ماڈرن ریویو" میں شایع بھی کرادئے:

"یہاں صاف اور نیم شفاف دریا کے قریب جاتریوں کی قدیم گذرگاہ تھی، رفیع المرتبت بلندی کی چوکھٹ، جو ابدی برفانی چوٹیوں تک چلی جاتی تھی۔۔۔۔ مادرِ وطن، خستہ اور رنجیدہ حالت میں نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے شاداب اور نوجوان، غیر فانی نوجوانی کی بہار میں ملبوس۔ یہیں گروکل میں نیا ھندوستان تعمیر ہو رہا تھا، نوجوان ھندوستانی زندگی کی مقدس ندی اپنے نتھرے ہوئے صاف وشفاف منبع سے قریب ترین۔"

دہلی کے پادری رفقائے کار عیسائیت کے نہایت خوفناک دشمنوں کے ساتھ ان گہرے روابط کو اور اینڈریوز کی اس ترغیب وتحریص کو کہ عیسائی طلبا کو گروکل کے طلبا کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے چاہئیں، شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے آریہ سماجیوں میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو انہیں "جاسوس پادری" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ انہوں نے اِن غلط فہمیوں کے متعلق مہاتما منشی رام کو ایک خط میں لکھا کہ انہیں ان باتوں کی وجہ سے بیحد دکھ پہنچا ہے، لیکن منشی رام کے مسرت بخش جواب سے انہیں اس دکھ کا کافی بدل مل گیا اس لئے کہ انہوں نے اینڈریوز کو یقین دلایا کہ ان کی محبت سے انہیں "حقیقی مسرت کا لطف حاصل ہوا ہے جو برسوں سے حاصل نہیں ہوا تھا اور ان کا دل نئی امید اور خدا کی محبت کے بر نئے اعتقاد سے معمور ہو گیا ہے۔" انہوں نے لکھا "آپ اور میں اگرچہ گنہگار ہیں تاہم بالآخر ہم اپنے بھائیوں کو یہ یقین دلا سکینگے کہ مادرِ آفرنیش خصوصیت کے ساتھ کسی فرقہ یا ملک سے متعلق نہیں ہے۔ اور یہ کہ اس کی محبت بھری آغوش اس کے تمام بچوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہوئی ہے۔"[1]

---

[1] مہاتما منشی رام کا مکتوب بنام سی۔ ایف۔ اینڈریوز، ۲۵ر اپریل ۱۹۱۳

اینڈریوز نے اُس خط کے لئے خدا کا شکر ادا کیا اور منشی رام سے بمنت درخواست کی کہ وہ انہیں "بھائی" نہ کہا کریں بلکہ "چارلی" کے نام سے یاد کیا کریں ـــ "اس لئے کہ چارلی کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں۔"

گروکل کے ساتھ انہیں جو والہانہ شیفتگی تھی، اس نے عملی شکل اختیار کرلی۔ انہوں نے اس کے باغ کے لئے گلاب کے پودے بھیجے، اسکول کے لئے انگریزی کتب نصاب مقرر کیں، اور ہر ممکن طریقہ سے اُس سرکاری بدگمانی کے بادلوں کو چھانٹنا شروع کیا جو اُس پر منڈلا رہے تھے۔ وہ یہ کام اس لئے انجام دے سکے کہ ان کے اور وائسرائے ہارڈنگ کے مابین بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔

لارڈ اور لیڈی ہارڈنگ کے ساتھ اینڈریوز کی دوستی کی کہانی مثال ہے اس امر کی کہ کسقدر پیچیدہ طریقہ سے ان کا مذہب اور سیاسی اثر ہم رنگ ہو گیا تھا۔ مئی ۱۹۱۱ میں لارڈ اور لیڈی ہارڈنگ نے کرائسٹ چرچ، شملہ، میں نماز پڑھی جہاں اینڈریوز وعظ کہا کرتے تھے۔ ان دونوں کے لئے یہ زمانہ دلی رنج وغم کا زمانہ تھا اور ان کے الفاظ اور اُن کی شخصیت میں انہیں کوئی چیز نظر آگئی جس سے ان کے دل ایسے گہرے طور پر متاثر ہوئے کہ انہوں نے پرائیویٹ طریقہ سے لنچ پر انہیں مدعو کر دیا۔ اس کے بعد سے وہ ان کے دوست بن گئے اگرچہ ابتدا میں یہ دوستی گہری نہ تھی۔ اس کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۹۱۲ کو لارڈ ہارڈنگ دہلی میں ایک بم سے قریب قریب مہلک طریقہ سے زخمی ہو گئے۔ یہ بم ان پر اس وقت پھینکا گیا تھا جبکہ وہ نئے دارالسلطنت میں سرکاری طور پر داخل ہو رہے تھے۔ لیکن وہ انتقامی کارروائی کا کوئی لفظ سننا نہیں چاہتے تھے اور اسی لئے انہوں نے حکام کو نہایت سختی کے ساتھ تشدد کی پالیسی اختیار کرنے سے روک دیا اور دوستانہ اعتماد کی قوت پر اپنا اعتماد بدستور سابق قائم رکھا۔ اینڈریوز نے نہایت گرمجوشی سے ان کے اس طرز عمل کو سراہا اور علالت کے اُن پریشان کن ایام میں انہوں نے لیڈی ہارڈنگ کی جو دستگیری کی اس کی وجہ سے ان کی دوستی پر مہر توثیق ثبت ہو گئی۔ تندرست ہو جانے کے بعد جب لارڈ ہارڈنگ فروری میں ڈیرہ دون میں آرام کر رہے تھے،

انہوں نے اینڈریوز کو بلوا بھیجا تاکہ سیاسی صورتِ حالات پر ان سے بحث کریں۔

وائسرائے کے بچ نکلنے اور صحتِ عاجل حاصل کرنے پر خدا کا شکرا دا کرنے کی غرض سے ہندوستان میں ایک فنڈ جمع کیا گیا۔ لیڈی ہارڈنگ نے دہرہ دون میں اینڈریوز کی آمد سے فائدہ اٹھا کر ان سے مشورہ کیا کہ اس رقم کو کس طرح سے صرف کیا جائے۔ اینڈریوز نے تجویز پیش کی کہ لارڈ ہارڈنگ کی سالگرہ (۲۰ جون ۱۹۱۳) کے دن ہسپتالوں اور یتیم خانوں کے بچوں میں اس خوشی میں مٹھائی تقسیم کی جائے۔ انہوں نے کہا: "ھندوستانی اسے بیحد پسند کرینگے۔ انہیں بچوں سے محبت ہوتی ہے اور غریب سے غریب اور معمولی سے معمولی آدمی بھی مٹھائی کا مقصد سمجھ سکیگا" لیڈی ہارڈنگ نے اسی مشورہ پر پُر جوش طریقہ سے عمل کیا اور مئی کے سارے مہینہ میں اور جون کے ابتدائی ایام میں اینڈریوز اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے شملہ میں محنت کرتے رہے۔ سرکاری عمال کے بعض حلقوں نے تجویز پیش کی کہ اس تقریب کو زیادہ "شاندار" طریقہ سے منایا جائے، لیکن ان کے شکوک کے باوجود یہ اسکیم بہت کامیاب رہی، اور ہر گاؤں نے اس مسرت بخش موقع پر اپنے بچوں میں مٹھائی تقسیم کی۔

اس کام کی وجہ سے لارڈ اور لیڈی ہارڈنگ سے اور تقریباً جملہ اقسام کے ہندوستانی اداروں سے جن میں آریہ سماج بھی شامل تھی، اینڈریوز کے بہت قریبی تعلقات قائم ہو گئے، اور انسانی اشتراکِ عمل کے اسی دوستانہ ماحول میں انہوں نے وائسرائے سے مہاتما منشی رام کی ملاقات کا انتظام بھی کرا دیا۔ انہوں نے سر جیمز میسٹن (گورنر یو پی) کو بھی ترغیب دی کہ وہ گروکل کا معائنہ کریں۔ لیکن عمالِ حکومت نے پس و پیش سے کام لیا اس لئے کہ انہیں اندیشہ تھا کہ مزید بم گرائے جائینگے۔ مگر اینڈریوز نے زور دیکر کہا کہ "ملک کی اصلاحی تحریکات پر اعتماد کرنا چاہیئے، ان سے مربیانہ برتاؤ کرنے سے زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ یہ عمل دنیا بھر کی پولیس کی حفاظت سے کہیں زیادہ موثر ہوگا۔"

اس اثنا میں ابتدائے مارچ میں وہ سابندرا ناتھ کے اسکول کو دیکھنے کے

لئے گئے جو بنگال کے ایک مقام شانتی نکیتن میں سنئے اصولوں پر قائم کیا گیا تھا۔یہاں لڑکوں اور استادوں نے اپنے گرودیو کے دوست کی حیثیت سے ان کا خیر مقدم کیا اور شاعر کے سب سے بڑے بھائی دویجندرا ناتھ اور کھیتم چن سین جیسے فاضلوں کی معیت میں انہوں نے بہت جلد دوستی کے تمام مراحل طے کر لئے، اور بالآخر گروکل اور شانتی نکیتن سے انہوں نے ایسے پھول جمع کئے جنہیں انجام کار انہوں نے ارتباط اور دوستی کی مالا میں گوندھ لیا۔ لارڈ ہارڈنگ نے انہیں موقع دیا کہ وہ شملہ میں وائسریگل لاج میں ٹیگور اور بنگال کی نشاۃ ثانیہ[1] پر لکچر دیں۔ انہوں نے اس لکچر کی تیاری پر بے حد محنت صرف کی تھی۔ یہ لکچر مئی ۱۹۱۳ میں ممتاز سرکاری افراد کے سامنے دیا گیا تھا اور بعد کو بہت سے دوسرے مواقع پر اسے دہرایا گیا۔ اس کے بعد سے گیتانجلی نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین سمجھوتہ کے ایک ایسے مشترکہ رابطہ کی شکل اختیار کر لی جس کی جانب وہ مسلسل اپیل کیا کرتے تھے۔

جون کے مہینہ میں شملہ میں اینڈریوز کو ایک خط ملا جس سے انہیں بیحد مسرت ہوئی۔ یہ خط ان کے دوست سر علی امام کے پاس سے آیا تھا اور اس کے ذریعہ انہیں ایک ایسی ڈنر پارٹی میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی جو "صرف ہندوستانیوں کے لئے" تھی۔ اس کہانی کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے: "میں نے ان سے کہا کہ جب سے میں ہندوستان آیا ہوں اس سے بڑھکر میری تعریف نہیں کی گئی۔" وہ ہنس دئے اور کہا: "آپ جانتے ہیں کہ ہم آپ کو اپنا ہی ایک فرد تصور کرتے ہیں اور غیر نہیں سمجھتے"

وہ اپنے آپ کو ان میں کا ایک فرد اس شدت سے محسوس کرتے تھے کہ کسی غلط فہمی کے خطرہ کے بغیر وہ اب منشی رام کو اس ناشایستہ حملہ کے بارے میں خط لکھ سکتے تھے جو آریا سماج کے ماہانہ پرچہ "ویدک میگزین" میں شایع ہوا تھا۔ اس حملہ کی

---

[1] اُردو میں پہلی مرتبہ اس کا ترجمہ راقم الحروف نے کیا ہے جسے انجمن ترقی اُردو کے رسالہ "اُردو" نے اپریل ۱۹۴۷ء میں اُسے امتیازی جگہ پر شایع کیا۔ مترجم۔

بنیاد جان اسٹوآرٹ. بل کی نکتہ چینیاں تھیں اور اینڈریوز نے شایستہ الفاظ میں مگر بڑی صفائی سے اظہار خیال کیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ تھے: "ہم لوگوں کو جو دنیا میں خدا پر زندہ اعتقاد کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، اس امر کی کوشش نہ کرنی چاہیئے کہ ہم دوسروں کے اس اعتقاد کو تباہ و برباد کردیں اور خدا سے انکار کرنے والوں اور خدا پر یقین نہ رکھنے والوں کے الزامات کو اپنے ہتھیار کے طور پر استعمال کریں۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ ہم زہر آلود ہتھیاروں سے جنگ کر رہے ہیں۔"[1] میگزین کے نوجوان ایڈیٹر کے نام بھی انہوں نے اسی انداز کا ایک خط بھیجا اور ساتھ ہی وعدہ بھی کیا کہ وہ رسالہ کے لئے اپنے قلم سے کچھ مضامین لکھکر بھیجینگے۔

یہ واقعہ جولائی کا ہے اور اینڈریوز پھر شانتی نکیتن پہنچ گئے۔ وہ وہاں کی زندگی بخش تر و تازگی اور قدرتی مناظر سے بیحد متاثر تھے اور اسی لئے رابندرناتھ کی پُر مسرت منظوری سے وہ دہلی کی گرمی کی تعطیلات میں یہاں آگئے تھے تاکہ شاعر کی طویل غیر حاضری میں نوجوان کارکنوں کی بڑے بھائی کی طرح اعانت کریں۔ ٹیگور کے خاندان کی وساطت سے کلکتہ میں برھمو سماج سے ان کے قریبی روابط قائم ہوگئے اور انہیں دعوت دی گئی کہ وہ وہاں آئیں اور اس کے ایک پبلک جلسہ میں تقریر بھی کریں۔ ان کی تقریر جس پر مہاتما منشی رام سے خطوط کے ذریعہ پوری بحث ہو چکی تھی، اس استدلال پر مشتمل تھی کہ برہمو سماج، آریا سماج اور تمام دوسرے سرگرم مصلحین کو ایک دوسرے کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا چاہیئے تاکہ ھندوؤں کی قدامت پسندی اور بت پرستی کے "بوجھ" کو ھٹایا جا سکے۔ انہوں نے زور دیکر کہا کہ مذہب کی سچی اسپرٹ مخالفانہ علیحدگی میں نہیں پائی جانی چاہیئے بلکہ "ایسی سرگرمی کی شکل میں اس کا اظہار ہونا چاہیئے جس کا مقصد ہم آہنگی اور امن پسندی ہو۔"

شانتی نکیتن میں چند ہفتہ کے قیام کے زمانہ میں انہیں شدت کے ساتھ محسوس

---

[1] مکتوب بنام مہاتما منشی رام، ۱۸ جولائی ۱۹۱۳ء

ہوا کہ زبردست انقلاب آرہا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں: "سنیاس کا بلاوا ہے کہ میں کلیتۃً اپنے آپ کو خدا کے ہاتھوں میں سونپ دوں، وہاں جاؤں جہاں وہ مجھے لیجائے اور وہ کام کروں جو وہ مجھے کرنے کے لئے دے۔"[1] انہوں نے اس کام کی تشریح یوں کی ہے کہ وہ ہندوستانی فلسفۂ حیات کا مطالعہ کریں اور پھر اسے اہل مغرب کے سامنے مکمل آزادانہ طریقہ سے نہ کہ تنخواہ دار ایجنٹ کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کریں اور ساتھ ہی عیسائی فلسفۂ حیات کو بھی مشرق کے روبرو پیش کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔[2] اس کے بارے میں انہوں نے دوِجیندرا ناتھ، رابندرا ناتھ اور منشی رام جیسے گہرے ہندوستانی دوستوں کو لکھا اور اُن سے بات چیت بھی کی۔ ان سب نے بلا استثنا انہیں عجلت سے عمل کرنے سے روکا اور رائے دی کہ وہ دعائیں مانگ کر ایک ایسے بلاوے کا انتظار کریں جس کے متعلق کسی غلطی کا شائبہ نہ ہو۔

انتظار کے دوران حضرت عیسیٰ کی تاریخی حقیقت کے بارے میں جو شکوک انہیں پریشان کر رہے تھے، وہ آلبریٹ شوئیٹزر کی زبردست کتاب "تاریخی مسیح کی تلاش" کے مطالعہ سے صاف ہو گئے۔ اُس کتاب کا آخری پیراگراف کچھ اس طرح سے ان کی ضرورت پر پورا اُترا کہ اس کے بعد سے وہ ان کا دل پسند اقتباس بن گیا:

"مسیح ہمارے پاس آتا ہے ایک نامعلوم شخص کی حیثیت سے بغیر نام کے، جس طرح سے قدیم زمانہ میں وہ جھیل کے قریب اُن لوگوں کے پاس آیا جو اُسے نہیں جانتے تھے۔ وہ ہم سے انہی الفاظ کا اعادہ کرتا ہے، 'تو میرے پیچھے پیچھے چل'؛ اور ہمیں ان کاموں میں لگا دیتا ہے۔ جن کی تکمیل وہ ہمارے زمانہ میں کرنے والا ہے۔ وہ حکم دیتا ہے۔ اور جو لوگ اس کا حکم مانتے ہیں، خواہ وہ عقلمند ہوں یا بیوقوف وہ اپنے آپ کو ان کے سامنے محنت، جدوجہد، تکلیف اور دکھ کی شکل میں ظاہر

---

[1] مکتوب بنام مہاتما منشی رام، ۲۸ جولائی ۱۹۱۳

[2] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۲۸ جولائی ۱۹۱۳

کریگا جو اس کی رفاقت کی خاطر انہیں برداشت کرنی ہونگی۔ اور تاگفتنی مادرکی طرح
وہ لوگ اپنے تجربہ کے ذریعہ سیکھ لینگے کہ وہ کون ہے۔"

ان کی عقیدتمندی کا شعلہ دوبارہ بھڑک اٹھا، اور وہ نئے بلاوے کے لئے ہمہ تن گوش برآواز رہے۔ بالآخر وہ بلاوا آ ہی گیا۔

(۳)

کئی سال سے اینڈریوز سلطنت کے دوسرے حصوں میں ہندوستانیوں کی حالت کو دیکھ رہے تھے۔ نسلی امتیاز کے خلاف جو جنگ انہوں نے شروع کر رکھی تھی یہ مسئلہ اسی سے متعلق تھا اور ایسا نہ تھا کہ اسے نظرانداز کیا جا سکے۔ یہ اُن قومی مسائل میں سے ایک تھا جس میں ہر ذات پات اور ہر مذہب وملت کے افراد دوش بدوش ہو کر ایک کھلے اخلاقی اصول کی حمایت میں لڑ سکتے تھے۔ ہندوستان کو سب سے پہلے جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کی تکالیف کا حال اسوقت معلوم ہوا جب گاندھی ۱۸۹۶ میں ہندوستان واپس آئے۔ ۱۹۰۹ میں ہنری پولک جنوبی افریقہ سے آئے تاکہ وہ حکومتِ ہند اور باشندگانِ کے روبرو جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کی شکایات اور تکالیف پیش کریں اور اس امر پر زور دیں کہ جس نظام کے ماتحت پابندِ معاہدہ مزدوروں کو نیٹال بھیجا جاتا ہے، اسے ختم کر دیا جائے۔ مزدوری کا یہ نظام انگریز نوآبادکاروں کی درخواست پر ۱۸۶۰ میں جاری کیا گیا تھا اور ان کے اس وعدہ پر کہ تارکانِ وطن کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائیگا اور انہیں مساوی حقوق دئے جائینگے۔ لیکن پولک کی زبانی ہندوستان کو علم ہوا کہ پابندِ معاہدہ مزدوری کا اور مزدوروں سے کئے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزیوں کا کسقدر رسواکن اثر پڑ رہا ہے اور یہ کہ ۱۹۰۷ سے ستیاگرہ کی مہم گاندھی کی قیادت میں جاری ہے۔ اس سیاحت کا یہ نتیجہ نکلا کہ نیٹال میں ایسے مزدور بھیجنے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ساتھ ہی جی۔ کے۔ گوکھلے اور پولک کے مابین باہمی اشتراکِ عمل وقوع میں آ گیا۔ اینڈریوز پولک سے ملے اور اس صورتِ حال کی تفصیلات کے متعلق جو کچھ وہ بتا سکتے تھے اُسے نہایت شوق کے ساتھ سنا اور دل

بعد جب پولک دوبارہ ہندوستان آئے، تو انہوں نے ان سے متعدد بار ملاقات کی اور پابندۂ معاہدہ مزدوری کے مکمل خاتمہ کی زبردست مہم میں حصہ لیا جس کا آغاز گاندھی کی استدعا پر وہ اور گوکھلے کر چکے تھے۔

۱۹۱۲ میں گوکھلے جنوبی افریقہ گئے اور وہاں نیٹال کے "ہندوستانی مسئلہ" کے تصفیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ گوکھلے رضامند تھے (اگرچہ ان کے ہم ملکی انہیں برابر برا بھلا کہتے رہے) کہ وہ آزادانہ داخلہ اور سیاسی حقوق کے ہندوستانی مطالبہ کو واپس لے لیں، ان کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے اور انصاف اور خیر سگالی کی پہلی قسط کے طور پر انہوں نے مطالبہ کیا کہ تین پونڈ فی کس ٹیکس کو منسوخ کر دیا جائے جس کی ادائگی مزدوروں کے لئے ایک وبال بنی ہوئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی درخواست قبول کر لی گئی ہے لیکن جنوبی افریقہ کی حکومت نے اس امر سے انکار کر دیا کہ اس نے ایسا کوئی وعدہ کیا ہے، اور جب کچھ عرصہ بعد عدالتِ عالیہ کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ ہندوستانی شادیاں ازروئے قانون ناجائز ہیں تو اسوقت ان کا غم وغصہ اپنی انتہائی منزل پر پہنچ گیا۔ موہن داس کرم چند گاندھی نے جو جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی کوئی بیس سال سے رہنمائی کر رہے تھے، ستمبر ۱۹۱۳ میں ستیا گرہ کی مہم کا آغاز کر دیا اور تیاریاں کی گئیں کہ جن قوانین کی روسے ٹرانسوال میں ہندوستانیوں کے داخلہ پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں انہیں توڑا جائے۔ چنانچہ ۶ نومبر کو "ٹرانسوال چلو" کی مہم شروع کر دی گئی اور پانچ دن کے بعد گاندھی اور ان کے ممتاز رفقائے کار جن میں ہندوستانی اور یورپین دونوں شامل تھے، گرفتار کر لئے گئے اور جیلوں میں ٹھونس دئے گئے۔

اس اثنا میں گوکھلے "ستیا گرہیوں" کے لئے مالی اور اخلاقی امداد حاصل کرنے کی زبردست مہم کے سلسلہ میں ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ جب وہ نومبر میں دہلی آئے تو اینڈریوز دل وجان سے اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ وہ دن رات کام کرتے تھے، اور اپنا سب قلیل سرمایہ — ۳۰۰ پونڈ — بھی ساتھ لے آئے تا کہ اسے فنڈ میں شامل کر دیں، مگر گوکھلے نے ایک ہزار روپے سے زیادہ کی رقم قبول نہ کی۔

لیکن ایک معمولی آمدنی والے پادری کی طرف سے اتنی بڑی رقم کی پیشکش دہلی والوں
کے لئے ایک زبردست مثال بنی اور سینٹ اسٹیفنز کالج نے اپنی طرف سے ۶۰۰ روپے
جمع کرکے دیئے۔ یہ اینڈریوز کی حقیر ترین خدمت تھی۔ کوئی شخص یہ نہیں جان سکے گا کہ
لارڈ ہارڈنگ نے ۲۸ نومبر کو مدراس میں جو معرکۃ الآرا تقریر کی اس میں اینڈریوز کا
کتنا حصہ تھا۔ اس تقریر میں وائسرائے نے جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کے لئے
اپنی "گہری اور پُرجوش ہمدردی" کا اظہار کیا۔ لیکن جب گوکھلے نے اینڈریوز سے مزید
یورپین امداد واعانت کا مطالبہ کیا تو وہ ایک ہزار میل کا سفر طے کرکے کلکتہ گئے تاکہ
اپنے پرانے دوست بشپ لیفرائے سے۔ جواب ہندوستان کے لاٹ پادری بن گئے
تھے، درخواست کریں کہ وہ گوکھلے کی اپیل کی تائید میں اپنا تمام اخلاقی زور صرف کر دیں۔
وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ لیفرائے کے فیاضانہ عطیہ اور اس سے زیادہ پریس
میں ان کے خطوط کی اشاعت کا یہ اثر ہوا کہ ہندوستان اور انگلستان میں عیسائی رائے
ان کی تائید میں ہو گئی جس کا جنوبی افریقہ پر کافی اثر پڑا۔

جب ٹرین اینڈریوز کو کلکتہ لے جارہی تھی اس وقت ان کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال
آرہا تھا ــ کیا مجھے جنوبی افریقہ میں جاکر اپنی رضاکارانہ خدمات پیش نہیں کر دینی چاہئیں؟
دہلی چھوڑتے ہی انہیں اطلاع ملی کہ نیٹال میں ہندوستانیوں پر گولی چلادی گئی ہے۔ چنانچہ
شرم اور نفرت کے تاثرات میں ان کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا۔ محض اس وجہ سے کہ وہ انگریز
تھے، انہوں نے سوچا: کیا انہیں اس کی تلافی نہیں کرنی چاہئے؟ اور جہاں رنگ کا امتیاز
اس درجہ زیادہ ہو وہاں کیا ان کا انگریز ہونا بجائے خود ہندوستانیوں کے مقصد کے
لئے قابل قدر چیز نہ ہوگی؟ گوکھلے کے دہلی آنے سے صرف چند دن پیشتر اینڈریوز نے
فروری ۱۹۱۴ میں انگلستان جانے کے لئے جہاز میں اپنی نشست کا انتظام کر لیا تھا اور ساتھ
ہی اپنی بوڑھی ماں کو اطلاع دیدی تھی کہ وسط مارچ تک وہ ان کی خدمت میں پہنچ جائیںگے
لیکن اگر جنوبی افریقہ میں ان کی ضرورت ہوئی تو وہ ضرورت فوری ہوگی اور پھر وہ اپنی والدہ
کی خدمت میں براہ کیپ ٹاؤن اپنے موعودہ وقت تک پہنچ سکیںگے۔ انہیں فرض کا راستہ

صاف نظر آرہا تھا اور جب انہوں نے گوکھلے کو لیفرائے کی امداد و اعانت کی خوش خبری کا تار بھیجا تو اس میں انہوں نے عندالضرورت اپنے جنوبی افریقہ جانے کی پیشکش بھی کردی۔

پھر وہ شانتی نکیتن گئے تاکہ رابندرا ناتھ ٹیگور سے مشورہ کریں جو ابتدا ئے اکتوبر میں وہاں واپس آگئے تھے۔ یہ خبر کہ شاعر کو علم و ادب کے لئے نوبل پرائز دیا گیا ہے، ہندوستان پہنچ چکی تھی اور ۲۳ نومبر کو جبکہ اینڈریوز اُن کے ساتھ تھے، کلکتہ کے دوستوں کا ایک بڑا وفد مبارکباد پیش کرنے کے لئے ان کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت ایک یادگار منظر دیکھنے میں آیا۔ ٹیگور کو ایسے مظاہرہ کے موقع پر ریاکاری کے خطرہ کا بہت احساس رہتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مداحین کی ضرورت سے زیادہ نیازمندانہ تقریروں کا جو جواب دیا اس میں انہوں نے خالص سچائی کا مطالبہ کیا۔ اینڈریوز نے مجمع میں سے ان کے بلند و بالا قامت کو ابھرتے دیکھا اور اگرچہ وہ بنگالی نہیں سمجھتے تھے تاہم انہوں نے ان کے الفاظ کی روح کا مفہوم سمجھ لیا۔ ان کا دل تحسین و توصیف کے نئے جذبہ سے بھر گیا۔ اب وہ نحیف و کمزور انسان نہ تھے جن سے لندن میں ان کی ملاقات ہوئی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں بادشاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جلسہ ختم ہوگیا۔ ٹیگور مجمع سے رخصت ہوکر چلے گئے۔ اینڈریوز ان کی تلاش میں نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ رابندرا ناتھ پرانے مکان کے سامنے جہاں ان کے والد کا آشرم تھا تن تنہا کھڑے ہوئے ہیں۔ عقیدتمندی کے بے پناہ جذبہ کے ساتھ اینڈریوز جھکے اور انہوں نے احتراماً اُن کے پیروں کو چھوا۔ بوڑھے آدمی نے انہیں اٹھایا اور بڑے تپاک سے ان سے بغل گیر ہوئے، اور اس لمحہ انہیں معلوم ہوا کہ جس بلاوے کا وہ اتنے دنوں سے انتظار کر رہے تھے، وہ اب آن پہنچا ہے۔ ٹیگور آشرم سے اسی شام چلے گئے اور اینڈریوز نے تن تنہا وہیں رات بسر کی۔ انہیں بہت کم نیند آئی۔ دوسری صبح کو دہلی روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے ٹیگور کے نام خط لکھا جس میں شانتی نکیتن میں ان کے کام میں شریک رہنے کی

التجا بھی شامل تھی۔

گوکھلے دہلی میں ان سے ملے۔ انہوں نے کہا: "آپ کا تار ایک خدائی تحفہ تھا۔ ہمیں جنوبی افریقہ میں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کب روانہ ہو سکتے ہیں؟"

میٹ لینڈ ہاؤس میں تیاریوں کی وجہ سے ہما ہمی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے رفقائے کار نے مختصر سے نوٹس پر اینڈریوز کے درس و تدریس کے سارے کام کو خوشی خوشی سنبھال لیا اس لئے کہ وہ عرصہ سے ان کی خصوصی قابلیت اور فطری رجحان سے واقف تھے۔ انہوں نے مسکرا مسکرا کر ان کے راہبانہ لباس کی کمی کو پورا کر دیا۔ کسی نے جرابیں دیں، کسی نے قمیص دی اور کسی نے کچھ۔ وقس علی ہذا۔ لیکن سوشل ردرا جانتے تھے کہ چارلی کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی وہ ایک سمجھدار ساتھی ہے اور اس لئے انہوں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کے ایک پرانے دوست لالہ سلطان سنگھ نے اینڈریوز کے مشورہ سے ایک نوجوان انگریز کو اپنے بیٹے کے اتالیق کے طور پر ملازم رکھا تھا۔ ان کا نام ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ پیئرسن[1] تھا۔ تینوں نے آپس میں مشورہ کیا اور تھوڑی دیر میں ولی پیئرسن اس جگہ پہنچ گئے جہاں اینڈریوز اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھے اور اپنے متعلق یوں اطلاع دی:

"جنوبی افریقہ لیجانے کے لئے میں آپ کے پاس ایک تحفہ لایا ہوں — یعنی میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

(۴)

بڑی کشمکش کے بعد پہلی جنوری ۱۹۱۴ کو چھوٹا سا جہاز طوفانوں میں سے گزرتا ہوا بندرگاہ

---

[1] پیئرسن بنگال میں مشنری تھے اور اینڈریوز ان کے ساتھ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی اسٹوڈنٹ کمیٹی میں کام کر چکے تھے۔ وہ خرابی صحت کی بنا پر انگلستان چلے گئے تھے اور وہیں لندن میں اینڈریوز نے ۱۹۱۲ میں ان سے ملاقات کی اور کہا کہ "آپ کی خرابی صحت کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ موسم سرما دہلی میں ملازمت میں گزاریں۔ ۱۹۰۵ میں میری صحت بھی اسی طرح بحال ہوئی تھی۔"

ڈربن میں ۵ دن کی تاخیر سے داخل ہوا۔ ایک مقام پر تو ان طوفانوں کی وجہ سے کوئی چیز نظر ہی نہ آتی تھی۔ اینڈریوز کے لئے یہ بہت تکلیف دہ سفر تھا۔ سمندری بیماری کے ساتھ ساتھ انہیں یہ ذہنی کوفت اور ہوئی کہ کولمبو سے روانہ ہوئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ کلکتہ کا ایک ہندوستانی باورچی جہاز سے غائب ہوگیا۔ خودکشی کے اس واقعہ پر انہیں انسانی تکلیف کے بارِ عظیم کا احساس ہوا۔ اس کے بعد سے انہیں ہندوستانی ملاحوں کی شرائطِ ملازمت کو بہتر بنانے کی جدوجہد سے ہمیشہ ذاتی دلچسپی رہی۔ انہیں اس کا بھی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ یہ لوگ ہر وقت خطرہ اور موت سے دوچار رہتے ہیں۔ اور جوں جوں خطرہ زیادہ حقیقی ہوگیا انہوں نے اس خیال کی مکمل تلخی کو بھی آزمایا کہ شاید وہ دوستی کی نئی دنیاؤں کے دروازہ پر کھڑے ہیں صرف اس لئے کہ وہ ان سے ہمیشہ کے لئے جدا کر لئے جائیں۔ بالآخر جب جہاز ڈربن کے باہر زیادہ پُرسکون سمندروں میں داخل ہوگیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ پانی بلاشبہ ان کی روح پر سے گذر گیا ہے وہاں نئی قسم کی آزادی تو تھی لیکن پریشان کن تنہائی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ زندگی کی قدیم لنگرگاہیں پیچھے چھوڑ دی گئی تھیں اور بالآخر وہ کھلے سمندر میں جا پہنچے تھے۔

ہنری پولک جن سے اینڈریوز اس وقت ملے تھے جب وہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی طرف سے ہندوستان آئے تھے، بندرگاہ پر ان کا انتظار کر رہے تھے ۔۔۔ وہ اور گاندھی اور ہرمین کیلن بیچ بارہ دن پیشتر جیل سے رہا کر دئے گئے تھے۔ اینڈریوز ان سے بڑے تپاک سے ملے اور پوچھا: "مسٹر گاندھی کہاں ہیں؟" پولک نے ایک دبلے پتلے راہب کی طرف اشارہ کر دیا جو پابند معاہدہ مزدور کے لباس کی طرح موٹے جھوٹے کھدر کی سفید دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھے۔ اینڈریوز بہت تیزی سے جھکے اور گاندھی کے پیروں کو چھوا۔

ڈربن کا بڑا پادری دونوں انگریزوں کو اپنے مکان پر لے گیا۔ وہ ان دونوں سے ناواقف تھا لیکن اس کی میز پر "گیتانجلی" کی موجودگی نے بہترین تعارف کا سامان پیدا کر دیا اور اس نے اینڈریوز کے لئے نیٹال کی "سفید فام" سوسائٹی کے دروازے

کھول دیئے۔ شروع ہی سے یہ امر عیاں تھا کہ اگر سارے کام پر احاطہ کرنا مقصود ہے تو اُن کی اور پیئرسن کی راہ ایک دوسرے سے الگ ہونی چاہیئے۔ پیئرسن نے نیٹال کے شکرساز کارخانوں میں ہندوستانی مزدوروں کی حالت کی تحقیقات کا کام اپنے ذمہ لیا اور اینڈریوز نے فوری سیاسی کشمکش میں گاندھی کا ساتھ دیا جس کے ڈرامے میں ایسے ایسے محیّرالعقول مناظر سامنے آئے جن کی وجہ سے تاریخ بعض اوقات افسانے کی طرح کم سنجیدہ بن جاتی ہے۔

بہت سے دوررس اور اصولی سوالات کو فوراً طے کرنا ضروری تھا۔ دسمبر میں جنرل اسمٹس نے ھندوستانی شکایات کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا اور گاندھی اور ان کے رفقائے کار کو اس لئے رہا کر دیا گیا تھا کہ وہ اس کے سامنے شہادت دیں۔ یہ کمیشن اُن کمیشنوں ہی جیسا تھا جو گزشتہ چھ مہینے کے اندر ٹرینڈ کے کان کنوں اور ریلوے کے مزدوروں کے مطالبات کی تحقیقات کر چکے تھے۔ اگرچہ بعض کان کن اور ریلوے مزدور تشدّد کے مرتکب ہوئے تھے تاہم انہیں ان کمیشنوں کے سامنے اپنے نمائندے نامزد کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کو جن کی جدوجہد غیر متشددانہ تھی، یہ حق نہیں دیا گیا۔ اس لئے گاندھی نے جنرل اسمٹس کو مطلع کر دیا کہ یہ امر ہندوستانی وقار کے خلاف ہے کہ کمیشن کے روبرو شہادت دیجائے۔ کیا یہ فیصلہ اٹل تھا؟

مصلحت کے نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ احمقانہ تھا، کیونکہ ھندوستانی مقدمہ بہت مضبوط تھا اور اسے اچھی طرح سے تیار کیا گیا تھا، لیکن اسے نہ پیش کرنا اس طعنہ کو دعوت دینا تھا کہ مقدمہ بہت کمزور ہے۔ اور پھر یہ امکان بھی تھا کہ نام و پیام کے ناکام رہنے کی صورت میں ستیاگرہ کو از سرِ نو شروع کیا جائے گا، اور جیسا کہ نیٹال کے یورپینوں نے اینڈریوز سے صاف صاف کہدیا تھا کہ اس کے معنی یہ ہونگے کہ ان پر گولی چلائی جائے۔ گوکھلے نے پیغامات بھیجے اس التجا کے ساتھ کہ اس فیصلہ پر نظرثانی کی جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ وایسرائے اور دوسرے انگریز حمایتیوں کی پوزیشن خطرہ میں پڑ جائے۔

ہندوستانی لیڈروں نے باہم تبادلۂ خیال کیا، اینڈریوز بھی ان کے ساتھ تھے چند منٹ کی گفتگو کے بعد انہوں نے مسٹر گاندھی کو مخاطب کرکے پوچھا: "کیا یہ محض ہندوستان کی عزت کا سوال نہیں ہے؟" گاندھی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی انہوں نے زور سے کہا: "ہاں، ایسا ہی ہے، ہاں، ایسا ہی ہے۔ یہی سوال اس وقت زیر بحث ہے۔" اینڈریوز نے کہا: "تو پھر مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے الگ رہنے میں حق بجانب ہیں۔ عزت کو کسی حالت میں قربان نہ کرنا چاہئے۔" اس وقت سے وہ اور گاندھی دوست ہوگئے اور کہ دو تین دن کے اندر ان کے تعلقات اس قدر گہرے ہوگئے کہ وہ ایک دوسرے کو "موہن" اور "چارلی" کے نام سے یاد کرنے لگے۔

تشریح کے طور پر ایک طویل تار گوکھلے کو بھیجا گیا اور انہوں نے اور لارڈ ہارڈنگ دونوں نے اس فیصلہ کو قبول کیا اور اس کی تائید کی۔ کیا جنرل اسمٹس نامہ و پیام کریگا؟ اینڈریوز گاندھی کے ساتھ اپنے مکان فینکس آشرم میں چلے گئے جو ڈربن سے سولہ میل کے فیصلہ پر تھا تاکہ جواب کا انتظار کریں۔ وہاں پابند معاہدہ مزدوروں کے ساتھ ان کے ذاتی تعلقات پہلی مرتبہ قائم ہوئے اور وہیں مظلوموں کے لئے گاندھی کی خبرگیری کی رحم دلانہ رقیق القلبی کی پہلی جھلک دیکھنے میں آئی۔ ایک بھاگے ہوئے ٹامل بولنے والے قلی نے جس کے دبلے پتلے جسم پر وحشیانہ مار پیٹ کے نشانات موجود تھے آشرم میں پناہ لینے کی درخواست کی۔ اور اینڈریوز کی آنکھوں میں آنسو آگئے جب انہوں نے گاندھی کا اس کے ساتھ برتاؤ دیکھا۔ لیکن اس خاموش اور سادہ جگہ میں ان کا قیام بہت مختصر رہا اس لئے کہ چند دن بعد اسمٹس نے گاندھی کے نام پیغام بھیجا کہ وہ ان سے پریٹوریا میں ملاقات کریں۔

اسی زمانہ میں ملک اور زبردست صنعتی خطرہ سے دوچار ہو رہا تھا جس کی بنا پر ڈربن کے اسٹیشن ماسٹر نے ان دونوں مسافروں کو دوستانہ مشورہ دیا کہ "بہتر یہ ہے کہ آپ یورپین میل سے سفر کریں کیونکہ بہت بڑی ہڑتال ہونے والی ہے۔ اور ممکن ہے کہ کافرمیل نہ پہنچنے پائے۔" انہوں نے ایسا ہی کیا جیسا ان سے کہا گیا تھا

یہ آخری گاڑی تھی جو پریٹوریا پہنچی اور اس کے بعد پندرہ دن تک کوئی گاڑی روانہ نہیں ہوئی۔

پریٹوریا میں "پریٹوریا نیوز" کے ایڈیٹر نے دوستانہ انداز میں گاندھی کا خیر مقدم کیا۔ اس نے پوچھا: "کیا ہندوستانی عام ہڑتال میں شامل ہو رہے ہیں؟" گاندھی نے جواب دیا: "نہیں، یقیناً نہیں۔ ہم مہذب جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ اس دوران میں ستیا گرہ معطل رہیگی۔"

"کیا میں اسے شایع کر سکتا ہوں؟"

"نہیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟"

ایڈیٹر نے پھر اینڈریوز کی طرف رخ کرکے کہا: "مسٹر اینڈریوز، مہربانی کرکے انہیں ترغیب دیجئے۔ کیونکہ بارہ گھنٹے کے اندر اندر مارشل لا کا نفاذ ہونے والا ہے۔"

اینڈریوز نے اس کا مطلب بھانپ لیا۔ وہ ایڈیٹر کے دفتر کے باہر ادھر ادھر ٹہلتے رہے اور گاندھی سے بحث کرتے رہے۔ اس نے کہا: "بلاشبہ آپ ستیاگرہ کو معطل کرنے میں حق بجانب ہیں، لیکن اگر کسی کو دیر تک اس کا علم نہ ہوا تو سارا اچھا اثر ضائع ہو جائیگا۔ لوگ کہینگے کہ آپ نے یہ قدم خوف و ہراس کی وجہ سے اٹھایا ہے۔" آخر کار گاندھی مان گئے، یہ پیغام کیپ ٹاؤن اور ساری دنیا کو بھلائی کے تمام احساسات کے ساتھ بھیجدیا گیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہڑتالیوں نے ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیئے۔

وہ کئی دن تک پریٹوریا میں انتظار کرتے رہے لیکن اسمٹس کی ساری توجہ قومی خطرہ پر اس قدر مرکوز تھی کہ وہ ان سے نہیں مل سکا۔ اینڈریوز بیکار نہیں بیٹھے۔ وہ کیمبرج میں گلیڈ اسٹون کے خاندان سے واقف تھے۔ لارڈ گلیڈ اسٹون اب گورنر جنرل تھے اور ان کی بہن مسز ڈریو پریٹوریا میں موجود تھیں۔ ان کی وساطت سے وہ حکومت کے بہت سے لیڈروں سے ملے اور ہندوستانی پوزیشن کے بارے میں آہستہ آہستہ ان کی غلط فہمیوں کو دور کردیا۔ ان کی پرتکلف کوٹھیوں سے وہ ہر شام کو اپنے پسندیدہ کوارٹرز میں واپس چلے جاتے تھے جو شہر کے باہر گنجان اور حقیر ہندوستانی

علاقہ میں واقع تھا۔ انہوں نے لکھا:

"پریٹوریا کے دھوبی میرے بڑے دوست ہوگئے ہیں۔ ان کی دلی مسرت یہ ہے کہ مجھے کھانا کھلائیں خواہ وہ ناشتہ ہو یا پورا کھانا۔ انہوں نے مجھے پہننے کے لئے کپڑے بھی دئے، جوتے اور سلیپر بھی دئے۔ انہوں نے بڑے شوق سے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے گرمی کے کپڑے ہر روز دھوکر اور استری کرکے دیدیا کریںگے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پریوں کی کہانی میں جادو کی انگوٹھی جیسی کوئی چیز میرے قبضہ میں آگئی ہے اور ان کی خوشی اس قدر حقیقی تھی کہ میں ان کی کسی پیشکش سے انکار نہیں کرسکتا تھا"

اس کے بعد پریشانی کے ایام آئے۔ مسز گاندھی جو اپنے خاوند کے پریٹوریا روانہ ہونے تک جیل سے رہا نہیں ہوئی تھیں، بہت سخت بیمار ہوگئیں۔ ہڑتال کے زمانہ میں گاندھی کے اخلاق اور ضبط وتحمل سے اسمٹس بہت متاثر ہوئے لیکن نامہ وپیام ایک مقام پر جاکر رک گیا اس لئے کہ وہ ایک ایسے جملہ پر راضی نہ تھے جسے اسمٹس مجوزہ معاہدہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ ڈربن سے ایک اور ارجنٹ تار آیا لیکن گاندھی اپنی بیوی کے پاس جانے کے مقابلہ میں فرضِ عامہ کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اینڈریوز نے اس تشویش بھرے زمانہ کا حال ذیل کے الفاظ میں لکھا ہے:

اس رات ہم ایک بجے تک باتیں کرتے رہے۔ بالآخر ایک اور متبادل جملہ کا تصور میرے دماغ میں آگیا۔ فرق بظاہر بہت ہی معمولی تھا، لیکن گاندھی نے اسے قابل قبول سمجھا۔ جب ہم سونے کے لئے چلے تو انہوں نے کہا: "اگر جنرل اسمٹس آپ کے جملہ کو تسلیم کرلیں تو پھر سب باتیں ختم ہوجائینگی" صبح سویرے گاندھی سے کچھ کہے بغیر میں اسمٹس کے پاس گیا اور ۸ بجے اسے تن تنہا پایا۔ میں نے گاندھی کی ذاتی پریشانی کا حال اس سے بیان کیا اور وہ متبادل جملہ بھی بتادیا۔ اس نے کہا: "جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے اس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا" "کیا آپ اس کو تبدیل کرکے یہیں کے یہیں اس پر دستخط کردینگے؟" اس نے کہا: "یقیناً"

کام مکمل ہوگیا۔ ۱۱ بجے وہ ٹرین میں تھے۔ ٹھیک جب وہ روانہ ہو رہے تھے، ایک اور

اینڈریوز جنوبی افریقہ میں پیرسن
اور گاندھی کے ساتھ (۱۹۱۴)
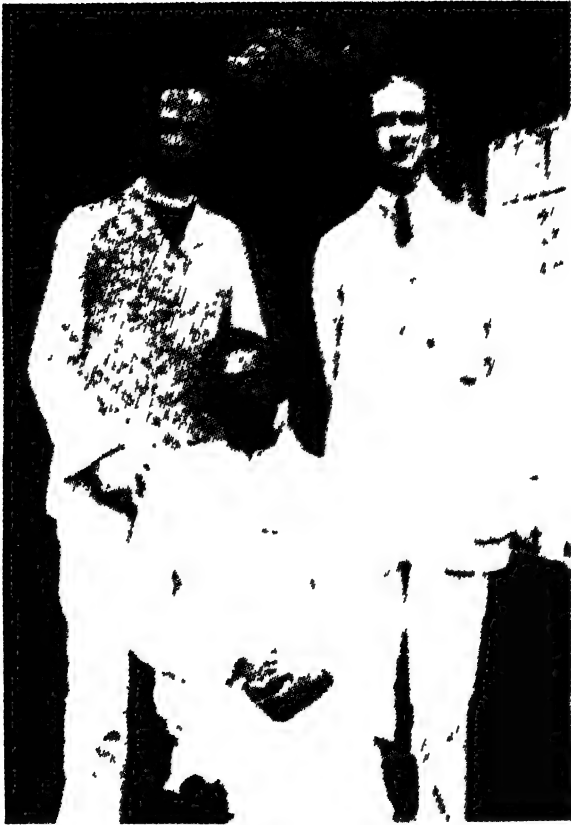
تار آگیا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ مسز گاندھی کی حالت اب بہتر ہے۔ طویل کوفت کا زمانہ ختم ہوگیا لیکن اب اینڈریوز کی باری تھی۔ ان کا دبا دبایا موسمی بخار راستہ ہی میں چڑھ آیا اور جب وہ جوش و خروش کے منظر میں خستہ اور بخار کی حالت میں ڈربن پہنچے تو وہاں ولی پیئرسن ایک خط لئے منتظر کھڑے تھے، جس میں درج تھا کہ ان کی والدہ کرسمس کے دن سردی لگ جانے سے خطرناک طریقہ سے بیمار ہوگئی ہیں اور امید نہیں کہ وہ نمونیہ سے جانبر ہوسکیں۔ چنانچہ دوسرے ہی دن ان کی موت کی خبر آگئی۔ یہ نہایت زبردست اور غیر متوقع صدمہ تھا لیکن مسز گاندھی اور دوسری ہندوستانی خواتین کی مادرانہ ہمدردی وجہ سے نہایت خوبصورت پیرایہ میں اس صدمہ میں ان کی تسلی و تشفی ہوگئی۔ ان خواتین نے کہا: "آج سے ہم آپ کی مائیں ہیں۔" وہ جانتے تھے کہ ان کی والدہ وفات سے پیشتر یہ خیال کرکے بیحد مسرور تھیں کہ وہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی عورتوں کی عزت و توقیر کی خاطر کام کر رہے ہیں اور اس اعتبار سے جو کام انہوں نے بعد کے سالوں میں ہندوستانی عورتوں کے لئے انجام دیا اس میں ان کی والدہ کی وجہ سے ایک خاص تقدس پیدا ہوگیا تھا۔ جس دن یہ روح فرسا خبر ملی انہوں نے ٹیگور کو ایک خط میں لکھا:

"میں نے بسا اوقات اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے مجھے ایسی شدید محبت کے ساتھ ہندوستان سے محبت کرنا سکھایا۔ میں اب دیکھ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے لئے میرے جذبۂ محبت کو بیدار کرنے میں میری محبوب ترین ماں کی محبت اور عقیدت نے کس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔ جو کچھ میں نے ہندوستانی ماتا کے سلسلہ میں دیکھا اور پڑھا اور سیکھا، اس کے ذریعہ مجھے بار بار ان باتوں کی یاد آتی تھی جو میں خود اپنی ماں کے متعلق جانتا تھا...... اب میں ہندوستانی محبت کو یکایک تسلیم کرنے کے قابل ہوگیا ہوں اس لئے کہ وہ میری ماں کی محبت سے ملتی جلتی چیز ہے۔ اسی محبت نے عجیب و غریب طریقہ سے ہندوستان کو میرا گھر بنا دیا ہے، اور ان کی موت مجھے اس قابل کر دیگی کہ میں انہیں ہندوستانی گھروں میں پا سکوں۔ ان کی روح ہندوستانی آنکھوں اور ہندوستانی ماؤں کے

چہروں کی وساطت سے مجھ میں جلوہ گر رہا کرے گی۔"[۵۱]

چھ مہینے بعد یونین کی پارلیمنٹ میں اچھی خاصی اکثریت سے انڈین ریلیف ایکٹ منظور ہوگیا، اور اخبار "انڈین اوپینئن" نے انصاف اور مصالحت پسندی کی روح پر تبصرہ کرتے ہوئے جو دوران بحث میں نمایاں رہی، اینڈریوز کے "محبت کے مشن" کے متعلق یوں خراج تحسین ادا کیا: "معلوم ہوتا تھا کہ ان کی اسپرٹ ایوان کے مباحث کی نگرانی اور رہنمائی کر رہی ہے۔" کیپ ٹاؤن کے ایک انگریز جرنلسٹ نے لکھا: "مسٹر اینڈریوز اپنی نمایاں یکسوئی اور انتہائی منکسر المزاجی کی بدولت جنوبی افریقہ میں کامیاب ہوئے ہیں۔" اینڈریوز کے والد کے نام ایک مکتوب کے دوران میں ایس۔ کے۔ رُدرا نے اپنے عقیدہ کا اظہار یوں کیا ہے کہ "ہندوستان یا ساری برطانوی سلطنت میں کوئی دوسرا شخص یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔"[۵۲]

(۵)

اینڈریوز نے ٹیگور کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں انہوں نے واضح الفاظ میں اس ماحول کا ذکر کیا ہے جس میں رہ کر انہوں نے جنوبی افریقہ میں اپنا کام انجام دیا۔ ڈربن پہنچتے ہی انہوں نے سب سے پہلے گاندھی کی خدمت میں خراج احترام پیش کیا جس پر "سفید فام" اخبارات میں ایک طوفان برپا ہوگیا، اور ایک ایڈیٹر نے تو خود ان کے پاس آکر ذیل کے الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کی:

"میں ابھی تک اسے دیکھ رہا ہوں کہ وہ انتہائی غصہ کی حالت میں اپنے ہاتھوں کو بلند کئے ہوئے کہہ رہا ہے: 'مسٹر اینڈریوز درحقیقت آپ جانتے ہیں، درحقیقت آپ کو علم ہے کہ ہم نیٹال میں اس قسم کی کوئی بات نہیں کیا کرتے۔ مسٹر اینڈریوز

---

[۵۱] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۲۷ جنوری ۱۹۱۴

[۵۲] مکتوب بنام جے۔ ای۔ اینڈریوز، ۱۲ مارچ ۱۹۱۴

ہم ایسا کام نہیں کرتے۔ میں اس فعل کو نہایت ناپسندیدہ خیال کرتا ہوں، نہایت ناپسندیدہ"
......میں اس وقت یہ خیال کر رہا تھا کہ میری حیثیت اُس چھوٹے لڑکے کی سی ہے۔ جو
ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں اس انتظار میں ہے کہ اسے اب بید لگائے جائیں گے!

.....اگرچہ اس بات پر غصہ سے ول پیلے ہو رہے ہیں کہ میں نے — ذرا خیال
رہے کہ ایک انگریز نے — ایک ایشیائی کے پیروں کو کیوں چھوا۔ جب میں انہیں یاد
دلاتا ہوں کہ مسیح اور مقدس پولوس اور مقدس یوحنا سب ایشیائی تھے تو وہ بے قابو
ہو کر کہتے ہیں کہ اُس زمانہ میں حالات بالکل مختلف تھے۔ اگر میں بازار سے اپنے
ہندوستانی دوستوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا گزرتا ہوں تو ان میں سے ہر ایک رُک جاتا
ہے اور مجھے حیرت سے تکتا ہے اور بعد میں مجھے کوئی نہ کوئی بات کرتے کرتے روک
لیتا ہے اور کہتا ہے: "ادھر دیکھو، تم جانتے ہو! یہاں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ ہم
اس ملک میں ایسی باتیں نہیں کرتے!" اور جب میں نہایت شائستگی سے کہتا ہوں کہ
"مجھے افسوس ہے تاہم میں تو ایسی باتیں ضرور کرونگا" تو وہ کہتے ہیں: "لیکن مگر ذرا
اس کا خیال ہے کہ اس ملک کے دیسی باشندوں پر ان باتوں کا کتنا برا اثر پڑیگا!"[1]
آخری فقرہ میں جو تبصرہ کیا گیا ہے وہ اشارہ ہے اس بات کا کہ ہندوستانی
مسئلہ جنوبی افریقہ میں دوسرے نسلی مسائل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ شروع شروع
میں ہندوستانی مزدوروں کے لئے اینڈریوز کی ہمدردی اور ان کے اس احساس نے
کہ وہ خود ہندوستان کے بہت سے دوستوں اور حمایتیوں کے نمائندہ کی حیثیت سے
آئے ہیں، یہ اہم سوال اُن کی نظروں سے اوجھل رکھا۔ لیکن ڈربن پہنچنے کے بعد جب
پہلی اتوار کی صبح کو انہیں "خوش آمدید" کہنے کے لئے ہندوستانیوں کا بڑا جلسہ منعقد ہوا
اس وقت انہوں نے کوشش کی کہ "مادر وطن کی محبت کا پیغام اُس اجنبی ساحل پر اسکے
دور افتادہ بچوں تک پہنچایا جائے"۔ فینکس میں ایک واقعہ رونما ہوا جسے بیان کرنا

---

[1] مکتوب بنام رابندرناتھ ٹیگور، ۶ جنوری ۱۹۱۴

وہ بہت پسند کرتے تھے اور وہ بھی اس لئے کہ اس سے ہندوستان کی اسپرٹ کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ وہ اسے زیادہ صحت کے ساتھ انسانی بھائی چارے کی اسپرٹ کے مظاہرہ کی حیثیت سے بیان کرتے تھے جس کی ہر ملک میں ضرورت ہے:

غربا میں دن بھر مسلسل خدمت کرنے سے جو تکان ہوگئی تھی وہ اب جاتی رہی ہے۔ شفق کی مابعد کی سنسان روشنی میں مہاتما گاندھی کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے ہوئے ایک بیمار بچہ کی، ایک چھوٹے مسلمان لڑکے کی اپنی گود میں بٹھا کر تیمارداری کر رہے تھے اور اس کے پاس ایک عیسائی نو لڑکی تھی جو پہاڑی کے قریبی مشن سے آئی تھی۔ انہوں نے خدا کی محبت کے متعلق چند گجراتی اشعار پڑھے اور ان کا مفہوم انگریزی میں سمجھایا۔ اس کے بعد ان گجراتی گیتوں کو بچوں نے گا کر سنایا۔ انہوں نے مجھ سے 'لیڈ کائنڈلی لائٹ' والا نغمہ گانے کے لئے کہا جوں جوں تاریکی گہری ہوتی گئی اور اس خاموشی میں جو اسکے ختم ہونے کے بعد رونما ہوئی، میں نے اس نغمہ کا آخری شعر پڑھا:

اور صبح کی آمد کے ساتھ وہ فرشتوں کے سے چہرے مسکراتے ہیں۔
جن سے میں مدت دراز سے محبت کرتا رہا ہوں اور جو ابھی اوجھل ہوگئے ہیں۔

ایک نوجوان ہندو نے مجھ سے شوق بھری نگاہوں سے کہا: "ہندوستان کس چیز کی مانند ہے؟" میں نے جواب دیا: "ہندوستان بالکل اس جیسا ہے۔ ہم سب آج کی رات ہندوستان ہی میں ہیں۔" [1]

ہندوستان کے ایک یورپین حمایتی بھی تھے جنہوں نے انہیں سکھایا تھا کہ وہ زمانۂ حال اور زمانۂ مستقبل کی حقیقتوں کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کریں۔ ہاؤس آف اسمبلی کے اسپیکر کی بہن مس مالٹینو تھیں اور ڈربن کے خوش آمد کے جلسہ میں انہوں نے تقریر بھی کی تھی۔ انہوں نے اپنے ہندوستانی سامعین سے کہا: "جب آپ افریقہ کو اپنی مادرِ وطن کہنا سیکھ لینگے اس وقت آپ اس مقدس سرزمین کے قابلِ فخر فرزند بن سکینگے!" انہوں نے

---

[1] ماڈرن ریویو، خیالاتِ مہاتما گاندھی وغیرہ کا خلاصہ۔

کہا؛ "اگر آپ غیر ملکی ساحل پر اجنبیوں کی طرح الگ تھلگ رہینگے تو اس صورت میں آپ کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔" اینڈریوز نے فوراً ان کے استدلال کی قوت کو تسلیم کرلیا۔ اسی سہ پہر کو انہوں نے ہندوستانی مشن کے گرجا میں مقدس پولوس کے نغمۂ محبت پر تقریر کی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہیں۔ تقریر کے بعد مس مالٹینو چمکتی ہوئی آنکھوں سے ان کے پاس آئیں اور کہا: "جب آپ تقریر کر رہے تھے اس وقت متحدہ افریقہ کا خواب مجھے اس قدر قریب معلوم ہوا کہ میں محسوس کرنے لگی کہ میں اسے اپنے ہاتھ سے چھو سکتی ہوں۔ آپ کو وہ پیغام لیکر آگے بڑھنا چاہیئے ۔۔۔ وہ سب (بوئر اور انگریز اور رنگین باشندے یکساں طور پر) اس کے لئے تڑپ رہے ہیں ۔۔۔ اور ایک نہ ایک دن محبت سب مشکلات کو فتح کرلیگی۔"

اینڈریوز آگے بڑھے حالانکہ یہ کام آسان نہ تھا اور جو باتیں وہ اپنے ارد گرد دیکھتے تھے ان کے پیش نظر بسا اوقات ان کے لئے غصہ کا دبانا مشکل ہوجاتا تھا۔ تاہم انہوں نے بدیہی طور پر محسوس کرلیا کہ محض برا بھلا کہنے سے اختلافات اور بڑھ جائینگے اور خود اُن میں اور ان لوگوں میں جس کے سامنے وہ تقریریں کرتے ہیں، مخالفت کی ایک دیوار حائل ہوجائے گی۔ "گیتا نجلی" اور "ہلال" نامی کتابوں نے جو تمام یونین میں ہر تعلیم یافتہ بوئر اور انگریز کے گھر میں دیکھی جاتی تھیں، ہر جگہ رکاوٹوں کو ڈھا دیا ہے۔ انہوں نے ہر قسم کے اجتماع میں۔ گرجاؤں اور یونیورسٹیوں میں، گورنر جنرل اور کیپ ٹاؤن کے چیدہ اور ممتاز شہریوں کے سامنے ملکی باشندوں کے غریبانہ گرجاؤں کے پلیٹ فارموں سے، سینما گھروں میں، تنگ و تاریک اور گندے علاقوں کے کھلے مقامات پر۔۔ الغرض ہر جگہ ٹیگور کی شخصیت اور شاعری پر، ہندوستانی قوم کے مطمع نظر پر، کانگڑی کے گروکل اور اس کے فیاض دل لیڈر پر اور کلچر کے زندہ ورثہ پر جس سے یہ چیزیں پیدا ہوئی ہیں، تقریریں کیں۔ گاندھی نے ایک دن ان سے ہنستے ہوئے کہا "سوشیل رُدرا، منشی رام اور رابندرناتھ ٹیگور آپ کی حقیقی تثلیث کے اجزا ہیں۔ خود انہوں نے بھی محسوس کرلیا کہ کیپ ٹاؤن کے سٹی ہال میں جو لکچر انہوں نے ٹیگور پر دیا تھا جس میں انہوں نے شملہ والے لکچر کی بہت سی باتیں دہرادی تھیں، اسی نے رائے عامہ کے دھارے کو ہندوستانیوں

کے حق میں موڑ دیا ہے۔

انہوں نے انگریزی خاتون ایمل ہاٹ ہاؤس سے ملاقات کی۔ یہ وہ خاتون ہیں جنہوں نے قیدی بوئر عورتوں اور بچوں کے مصائب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی اور انکی وجہ سے وہ جنگ بوئر کی ایک ہیروئن بن گئی تھیں۔ ہندوستانیوں سے انہوں نے جس ہمدردی کا اظہار کیا وہ بہت کارآمد ثابت ہوئی اس لئے کہ بوئر لیڈروں پر ان کا بہت اثر تھا اور انہوں نے مصالحت کے لئے بہت بڑی حد تک راستہ صاف بھی کر دیا تھا۔ انہوں نے اینڈریوز کو آمادہ کیا کہ وہ بوئروں کے معاملات سے دلچسپی لیں جو زبردست مذہبی معتقدات رکھتے ہیں اور جنہیں اپنے گھربار اور ملک سے گہری محبت ہے۔ اس خاتون سے ملاقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جنوبی افریقہ کے مسئلہ کے بارے میں اینڈریوز کے سارے نظریہ پر گہرا اثر پڑا لیکن اس سے گہرا اثر اس واقعہ کا پڑا کہ ڈربن میں ایک رات کو زولوؤں کی ایک چھوٹی سی جماعت ایک جلسہ سے اٹھکر ان کے ساتھ ان کے ہندوستانی میزبان کے گھر گئی اور وہاں اس جماعت کے افراد نے پوچھا: "ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آپ ہندوستانیوں کی خاطر مرنے کے لئے تیار ہیں۔ کیا آپ ہمارے لئے بھی مرنے کو تیار ہونگے؟"

جوں جوں دن گزرتے گئے، انہوں نے پہلے سے زیادہ یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ صرف نئی قسم کی مذہبی بصیرت ہی پرانی نسلی منافرت کو دلوں سے محو کر سکتی ہے اور انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ وہ کونسی عملی راہیں ہیں جن میں نئی اسپرٹ کا اظہار کیا جا سکتا ہے بطور ابتدائی کارروائی کے انہوں نے اپنے عیسائی رفیقوں سے اس تجربہ کا ذکر کیا جسے ان کے دوست ریورینڈ ٹی۔ ایچ۔ ڈکسن اس سے قبل کے سال میں دہلی میں آزما چکے تھے۔ یعنی یہ کہ مہینہ میں ایک اتوار کو شہر کے تمام عیسائی خواہ وہ کسی نسل یا کلیسا سے متعلق ہوں ایک ساتھ نماز پڑھیں اور اس دن دوسرے تمام گرجا بند رکھے جائیں۔

جس اندرونی سکون کی بدولت ان میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ صلح کرانے والے شخص کی حیثیت اختیار کریں، وہ نتیجہ تھا اس خاموش عبادت کا جس سے وہ اپنے بھرپور دن کا آغاز کرتے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ۱/۲ ۳ بجے اٹھتے اور ۶ بجے تک مصروف عبادت

رہتے اور تاروں بھرے آسمان اور طلوع فجر کے نظارہ میں معرفت کردگار کا جلوہ دیکھتے۔
ایک شام کا ذکر ہے کہ پریٹوریا میں جب وہ اپنے چھوٹے سے کمرے کے باہر دن بھر کام کرنے کے بعد تاروں بھرے آسمان کے نیچے لیٹے ہوئے سستا رہے تھے مگر تھے بیدار، کہ ان کی زندگی کے اندرونی مسئلہ نے ان کی آنکھوں کے سامنے مرئی شکل اختیار کرلی۔ تنگی دیوار کی بجائے انہوں نے اپنے سامنے ایک تشبیہی ریتیلا میدان دیکھا جو پھیلتے پھیلتے افق تک چلا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چھوٹی چھوٹی انسانی شکلیں غیر معمولی عجلت سے کام کر رہی تھیں اور اتنی مصروف تھیں کہ مشکل ہی سے سر اونچا کرتی تھیں گویا وہ چیونٹیوں کے گھروندوں کے اوپر کسی عظیم الشان مٹی کے مخروطی ڈھیر پر ہوں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی شہر تعمیر کر رہی ہیں لیکن جس تیزی سے وہ تعمیر کرتی تھیں۔ اسی تیزی سے وہ پھر گر پڑتا تھا۔ وہ محویت کے عالم میں اس کا مشاہدہ کرتے رہے اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس کام کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکتے ہیں۔
اس کے بعد انہوں نے اوپر کی طرف نظر کی اور دیکھا کہ رات ارغوانی ہے اور تارے چمک رہے ہیں۔ اور جب وہ یہ مشاہدہ کر رہے تھے آسمان ایک پُرسکون اور حلیم چہرہ میں تبدیل ہو گیا جو نیچے انسانی شکلوں کی غیر معمولی جد وجہد کو رحم کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد دوسرے چہرے بھی نمایاں ہوئے، جن میں اسی چہرہ کی چمک تھی مگر ان کی آنکھیں ستاروں کی وساطت سے ان کی حالت دیکھ رہی تھیں ۔۔ یہ اُن ہندوستانیوں کے چہرے تھے جن سے انہیں محبت تھی۔ اس کے بعد واضح چمک کے ساتھ ٹیگور کے چہرے نے سارے عالم منظر کا احاطہ کرلیا اور بڑی محبت سے ان سے کہا کہ خوش رہیں۔
جب انہوں نے اس تجربہ کا حال ٹیگور سے بیان کیا تو ان کا اپنا تبصرہ یہ تھا: "میں ابھی تک وہی بے چین اور مضطرب انگریز ہوں۔ اس رویا میں بھی میں نے یہی تجربہ کیا کہ مجھ میں حالات کو بہتر بنانے کی شدید خواہش موجود ہے۔ لیکن کیا 'کرنے' کی بجائے یہ زیادہ اچھا نہیں کہ کچھ 'بنا' جائے؟"[1] چنانچہ ان کی زندگی کے آئندہ ۱۰ سالوں میں اس سوال کی گونج

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۲۸ جنوری ۱۹۱۴

بار بار پیدا ہوئی۔

گوکھلے نے کہا تھا، "جنوبی افریقہ آپ کی عیسائیت کے لئے دکھ کا باعث ہوگا،" اور اینڈریوز نے اس ریمارک کو حقیقت پر مبنی پایا۔ ڈربن میں پہلی اتوار کی شام کو گاندھی ویلی پیئرسن کی معیت میں ان کا وعظ سننے کے لئے گئے لیکن گرجا میں داخل ہونے سے انہیں اس بنا پر روک دیا گیا کہ وہ ایشیائی ہیں۔ سات ہفتے کے بعد جب جہاز "برمنگھم" بندرگاہ کیپ ٹاؤن سے باہر نکلا، اس وقت مسٹر اور مسز گاندھی انہیں الوداع کہنے کے لئے پشتے کے آخری سرے پر کھڑے تھے۔ جب اینڈریوز نے ان کی بتدریج مدھم پڑنے والی صورتوں کو دیکھا تو انہوں نے گزشتہ چند ہفتوں کی سب سے نمایاں حقیقت پر غور کیا — اس حقیقت پر کہ جن نئے دوستوں کو نسلی امتیاز رکھنے والے گرجاؤں میں داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا، انہی کی وجہ سے انہیں ازسرنو مسیح کی موجودگی کا احساس ہوا۔ انہوں نے مسز گاندھی کی مادرانہ شفقت میں جس کا اظہار ان کے ذاتی سوگ میں کیا گیا تھا اور گاندھی کی قربانی کے بے پناہ جذبہ میں جو وہ کمزوروں اور مظلوموں کے لئے رکھتے تھے، مسیح کی موجودگی کو پا لیا تھا۔ انہوں نے لکھا: "عیسائی ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مذہب کے ظاہری ارکان کی پابندی کی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ باطن میں ویسی زندگی بسر کی جائے۔"[1] ان باتوں پر غور کرنے، ٹیگور کی "سادھنا" کا مطالعہ کرنے اور تمام مذاہب کے منبع اور گھر یعنی ہندوستان کی پوتر سرزمین کے بارے میں منشی رام کے شاندار الفاظ کا اعادہ کرنے سے انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان ہی سے مسیح کی خوبصورتی کا چشمہ بہنا چاہیئے۔ جہازی سفر کے دوران میں انہوں نے اپنے خیالات کو یوں قلمبند کیا:

"تاریخ کے مطالعہ سے میں نے یہ سمجھنا شروع کیا ہے کہ عیسائیت محض ایک آزاد سامی بالیدگی کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس کے علاوہ وہ ہندوؤں کے مذہبی فکر اور زندگی کی بڑھتی ہوئی شکل بھی ہے۔ .... مسیح مجھے ایک ایسے عجیب، نادر، خوبصورت پھول کی طرح معلوم ہوتے

---

[1] "کرائسٹ اینڈ لیبر" (مسیح اور مزدور) مصنفہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز

جس سے بچے نے پرواز کر کے جزوا کسی غیر ملکی سرزمین میں اپنا گھر بنا لیا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے اور بہت سی دوسری حیثیتوں کے اعتبار سے ہندوستان دنیا کی تاریخ میں عظیم المرتبت ماں کا درجہ رکھتا ہے۔ مسیح یعنی یہودی کسان اہمسا کے اس غیر یہودی مطمحِ نظر کے مطابق جو ہندو مت سے اس قدر مشابہ ہے، فطری اور وجدانی طور پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان میں ہمہ گیر رحم تھا، ان میں ہمہ گیر نیکی تھی جس کا اظہار پھانسی پانے کی کرب و بلا میں گیلیلی کی منور پہاڑیوں پر ہوا۔

اس مرکزی پوزیشن کا اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم دنیا کے اعلیٰ مذاہب کو ایک ہی نظامِ سے تعلق رکھنے والا درخت پائینگے جس کی شاخیں پھوٹ کر ادھر اُدھر پھیل رہی ہوں۔ ...... اس کے معنی یہ ہونگے کہ میں اکیلا ہی اس میدان میں گام فرسائی کروں کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ عیسائیت کی پوزیشن کے تمام دعاوی سے دست برداری کر لی جائے جس کے لئے مغرب کا کوئی شخص بھی جسے میں جانتا ہوں یا جس سے مجھے محبت ہے، تیار نہ ہوگا۔"

اکیلے پن کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔ اینڈریوز نے اس دستاویز کو کئی سال تک شایع نہ کیا لیکن ان کی ایمانداری متقاضی تھی کہ وہ اپنے شکوک کے بارے میں بھی خاموش نہ رہیں۔ چنانچہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ کلیسائی عقائد کے خلاف ہیں لیکن جیسا کہ خود مکتوب سے ظاہر ہے وہ ذاتی طور پر مسیح ابن آدم کی عقیدتمندی سے کبھی منحرف نہیں ہوئے۔

"لندن کے تقریباً تمام ہندوستانی" مسز جینی نائیڈو کی رہنمائی میں واٹرلو اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کرنے اور انہیں ہار پہنانے کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے انگلستان میں صرف تین ہفتے بسر کئے، مگر وہ اپنے ساتھ دو قیمتی یادیں لائے۔ ایک یاد وہ گفتگو تھی جو لندن میں اس کمرہ میں ہوئی جہاں گوکھلے بیمار پڑے ہوئے تھے۔ اس موقع پر گوکھلے نے ان سے بحث کہا کہ وہ اپنی سیاسیات کو مذہب میں مدغم کر دیں اور "ہونے" اور "کرنے" میں کسی قسم کا فرق پیدا نہ ہونے دیں۔ دوسری یاد وہ گفتگو تھی جو اُن سے

دلی صفت باپ سے ہوئی جو بڑھاپے کی وجہ سے اس قدر نحیف و نزار ہو چکے تھے کہ اب محض اپنے مذہبی خیالات پر بحث کرنے کا ذوق و شوق باقی نہ رہا تھا، بلکہ چارلی کی زبان سے گاندھی کی کہانیاں سنکر انہوں نے صرف اتنا کہا: "خدا محبت ہے۔ وہ ان سب آدمیوں کو قبول کر لیتا ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں۔"

۱۷ اپریل کو اس ارادہ و عزم کے ساتھ وہ ساحلِ ہندوستان پر اُترے کہ "اب وہ پھر کبھی اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔"[1]

---

[1] مکتوب بنام مہاتما منشی رام، ۵ اپریل ۱۹۱۴

باب ۷

شانتی نکیتن اور فجی

(۱۹۱۴ سے ۱۹۱۶ تک)

(۱)

"مغرب کے دانش کدہ سے تم ہمارے لئے امرت لاتے ہو
اے دوست، ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔
مشرق نے تمہیں اپنی محبت کا ہار پیش کیا ہے۔
اے دوست، اسے قبول کرو اور اس کی پذیرائی کرو۔
تمہاری محبت نے ہمارے دل کا دروازہ وا کر دیا ہے۔
اے دوست، اس میں داخل ہو جاؤ اور اس کی پذیرائی کرو۔
تم ہمارے پاس خدا کے تحفے کے طور پر آئے ہو۔
اے دوست! ہم سب اس کے آگے جھکتے ہیں۔"

یہ ہے وہ نغمہ تہنیت جو اینڈریوز کے ہے گُھر شانتی نکیتن میں داخل ہونے وقت

اپریل ۱۹۱۴ کی ایک صبح کو ان کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک وہاں قیام کرنے کے لئے آزاد نہ تھے۔ ابھی پنجاب یونیورسٹی کے امتحان کے پرچے دیکھنے باقی تھے۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کے فرائض منصبی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا اور اسمٹس و گاندھی کے معاہدہ کے سلسلہ میں شملہ میں سرکاری عمال سے ملاقات کرنا باقی تھا۔

شملہ کی حالت جنوبی افریقہ سے کہیں بدتر تھی۔ اور اینڈریوز نے اپنے آپ کو طوفان سے گھرا ہوا پایا۔ لارڈ ہارڈنگ اور چند اور عمالِ حکومت بدستور ان کے دوست رہے۔ لیکن سرکاری اور عیسائی حلقوں میں ان کے متعلق بہت سی جارحانہ باتیں کہی جا رہی تھیں۔ ان کے خلاف یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ بدعتی ہیں اور کلیسا کے مسلمہ عقائد کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں اور اس لئے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ "وہ پہلے اپنے عیسائی ہونے کا اعلان کریں"۔ پھر ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ بعض ہندوستانی عیسائی بھی جن کے لئے نسلی مساوات حاصل کرنے کے لیے انہوں نے بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں، ان طعن آمیزیوں میں شریکِ مخالفین ہو گئے تھے۔ وہ بالکل خاموش رہے۔ انہوں نے لکھا: "اگر میرے اعمال مسیحی نہیں تو میرے الفاظ مجھے ایسا نہ بنا سکیں گے"۔ یہ افواہ بھی دور دور پھیلا دی گئی تھی کہ مقدمۂ سازش دہلی سے بھی ان کا تعلق ہے اس لئے کہ انہوں نے ایک مرتبہ اس مقدمہ کے ملزمین میں سے ایک ملزم کی مدد کی تھی اور اس لئے کہ سوامی رام تیرتھ کے مجموعۂ مضامین میں جس کا دیباچہ اینڈریوز نے لکھا تھا، سی۔آئی۔ڈی۔ نے "باغیانہ خیالات" دریافت کئے تھے۔ جب وہ لاہور گئے اور یونیورسٹی کی فیلوشپ سے استعفا دیدیا تو سنڈیکیٹ میں ان کے رفقائے کار میں بہت کم افراد ایسے تھے جنہوں نے ان کی خدمات کا شکریہ ادا کیا ہو یا ان کے جانے پر اظہارِ افسوس کیا ہو اور لاہور کے ہندو حلقوں میں یہ خبر اڑ گئی تھی کہ وہ سرکاری جاسوس ہیں۔

اینڈریوز نے اپنے نہایت معتمد دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں صرف انہی سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس مہینہ میں انہیں کس قدر اذیت پہنچی، لیکن ساتھ ہی ان خطوط میں مسرت کا بار بار اظہار کیا گیا ہے اور جب وہ واپس دہلی لوٹے تو سو شیل رُودرا گھر سے طور پر ساتھ تھے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ان کے چہرے میں ایسی بشاشت اور چمک نظر آتی تھی جس کا اظہار الفاظ میں نہیں سما سکتا۔

یہ یقینی ہے کہ ان کا انحصار ان چیزوں پر ہے جو محسوس کی جانے والی روحانی طاقت سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں وہ جاتے ہیں وہ لوگوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے"۔ [1]

اس کے باوجود وہ وہی قدیم بلند حوصلہ اینڈریوز تھے۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کے بارے میں سینٹ اسٹیفنز کالج کے طلبا کے سامنے تند و تیز تقریر کی۔ ایک رفیق کار نے کہا "آپ نے یورپینوں کے متعلق قدرے بے انصافی سے کام لیا ہے"۔ اس پر اینڈریوز نے مشتعل ہو کر جواب دیا "میں انصاف پسند ہونا بھی نہیں چاہتا"۔ یہ جواب ان کی فطرت کے عین مطابق تھا مگر یہ بات بھی ان کی فطرت کے مطابق تھی کہ اپنی دوسری تقریر میں انہوں نے فیاضانہ طور پر پہلے ریمارک کی تلافی کر دی تھی

دہلی میں اپنے محبوب دوستوں میں دوبارہ آجانے سے انہیں بے حد راحت ملی "کیمبرج برادرہڈ" کے ممبران مذہبی معاملات میں ان کے ہم خیال نہ تھے لیکن کالج کے کام سے استعفا دینے کے باوجود ان کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اس لئے کہ انہوں نے بہت عرصہ پہلے سے محسوس کر لیا تھا کہ وہ "پیغامبر" ہیں اور یہ کہ "برادرہڈ" ان کا حقیقی میدان نہیں ہے۔ آلنٹ نے لکھا: "ہمیں دلیرانہ ہمتوں اور تجربوں کی ضرورت ہے۔ وہ دن دور نہیں جبکہ ہمیں اس کام کے لئے جسے اینڈریوز جیسے آدمی تبلیغی جد و جہد کے نئے دور میں پیش رو کی حیثیت سے انجام دینے کے قابل ہوئے ہیں، شکر گزار ہونا پڑے گا"۔ [2]

"پیش رو" کا لفظ اس زمانہ میں ایسا تھا جسے اینڈریوز اپنے نام کے ساتھ ہرگز وابستہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ عزلت اور سکون کے متمنی تھے۔ ٹیگور کے ساتھ رام گڑھ میں دس دن تک آرام

---

[1] مکتوب بنام جے۔ اے۔ اینڈریوز، ۲۱ مئی ۱۹۱۴

[2] کیمبرج مشن دہلی کی رپورٹ، ۱۹۱۴

کرنے کے بعد ۱۵؍ جون کو شانتی نکیتن پہنچ گئے۔ ولی پیرسن پہلے سے وہیں تھے ـــ وہ جنوبی
افریقہ سے براہ راست وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ شاعر کی قیام گاہ کے قریب کونے والے کمرے
میں ایک ساتھ رہتے تھے، اور ایک چھوٹی سی "کوٹھری" میں جو چھت پر تھی، اور جس میں فرنیچر نام
کو نہ تھا، کام کیا کرتے تھے۔ وہ دیہات کے سے سکون کا وقفہ تھا۔ ولی پیرسن لڑکوں میں بے حد
مقبول تھے اور ان میں رہ کر ان کی فطری قابلیتیں پورے طور پر اجاگر ہو جاتی تھیں۔ وہ اور اینڈریوز
نہ صرف انہیں درس دیا کرتے تھے بلکہ چاندنی راتوں میں ان کے ساتھ آیرلینڈ کے بچوں کا کھیل
"بادشاہ" بھی کھیلا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اینڈریوز بالآخر اس چیز کو حاصل کر چکے ہیں جس
کے وہ اس درجہ متمنی تھے ـــ کرنے کی اہم تلاطم خیزیوں سے نجات [illegible] اور رو بہ ہونے کی بالیدگی کا
زمانہ، طوفان کے بعد ٹھہراؤ آنے کا سکون۔

اس کے بعد اگست میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے انہیں زبردست جذباتی دھچکا پہنچا۔
جنگ بوئر سے اینڈریوز بہت کم متاثر ہوئے تھے اس مرتبہ ان کا دماغ مسیح اور ان کے خیالات
سے بسا ہوا تھا اور وہ مجبور تھے کہ ایک عیسائی کی حیثیت سے اس سوال کو حل کریں۔ اور بالآخر
وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس حیثیت سے وہ جنگ نہیں کر سکتے[1]

لیکن یہ سوال ایک اور اہم صورتِ حالات کی وجہ سے جو اسی زمانہ میں رونما ہو گئی تھی،
کلیتہً دب گیا۔ جب وہ شانتی نکیتن پہنچے انہوں نے بشپ لیفرائے کو اس غرض سے اپنی رضاکارانہ
خدمات پیش کیں تاکہ وہ قریب ہی بردوان کے گرجا میں کبھی کبھی وعظ کہہ کر ان کی امداد کریں۔
انہیں اس گرجا سے اس لئے محبت تھی کہ سوشیل رودرا اپنے بچپن میں اسی گرجا میں نماز پڑھنے
جایا کرتے تھے اور وہیں ان کے والد پادری کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ اگست کی ابتدا میں جب

---

[1] اس وقت ان کی عمر ۴۴ سال تھی اور وہ پادریانہ سلسلہ میں منسلک تھے۔ لہذا یہ سمجھنا آسان
نہیں ہے کہ ان کے لئے فوجی خدمت ایک عملی چیز کیسے بن سکتی تھی جیسا کہ وہ [illegible] آئی [illegible] کرافٹ"
میں کہتے ہیں کہ بھی ان کے بے شمار خطوط میں جو اس زمانہ میں لکھے گئے تھے یا جنگ کی یادداشتوں میں
اس کے متعلق ذرا سا بھی حوالہ نہیں ملتا اور اس لئے یہ مسئلہ تاریکی ہی میں رہے گا۔

وہ دوسری مرتبہ یہاں آئے تو انہوں نے اس کے باوجود کہ جنگ برپا تھی "مقدس پولوس کے تمثیل محبت" پر وعظ کہا لیکن دورانِ نماز میں جب وہ ان فقروں پہنچے جن کے متعلق انہیں بذہنی طور پر اختلاف تھا ("میں یسوع مسیح پر عقیدہ رکھتا ہوں۔۔۔۔ جو کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے ——— میں جسمانی طور پر ان کے جی اٹھنے پر ایمان رکھتا ہوں") تو انہیں اپنی پوزیشن کا ابہام ناقابلِ برداشت نظر آیا اور عرصۂ دراز کی غیر یقینی حالت ختم ہوگئی ——— وہ اب زیادہ عرصہ تک الفاظ کے معنی کے ساتھ مذاق ——— یا اپنی ذہنی دیانتداری کے ساتھ مصالحت نہیں کر سکتے تھے!

بشپ لیفرائے انگلستان میں تھے۔ اینڈریوز نے انہیں لکھا کہ وہ ایمانداری کے ساتھ پادری کے فرائض ادا نہیں کر سکتے اور خواہش ظاہر کی کہ وہ پادریانہ سلسلہ ترک کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دوستوں[1] کو بھی آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی اخبارات کے نام بھی ایک بیان جاری کر دیا تاکہ یہ غلط خیال پھیلنے نہ پائے کہ وہ سرے سے عیسائیت ہی سے دست بردار ہو گئے ہیں"۔

ان کی اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی تکالیف میں اضافہ ہو گیا اور ان کی تنہائی بڑھ گئی جس سے سوشیل رُدرا کو بھی سخت کوفت ہوئی اگرچہ ان کی دوستی بدستورِ سابق قائم رہی۔ ذہنی کوفت اور کشمکش کے جس دور سے اینڈریوز گزر رہے تھے اس کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو گئی اور وہ "نروس ڈِس پیپسیا" (اعصابی ضعف) کا شکار ہو کر کلکتہ کے نرسنگ ہوم میں داخل ہو گئے اور جیسے ہی وہ سفر کرنے کے قابل ہوئے تو وہ شملہ کے ہسپتال میں چلے گئے۔ انہیں اپنی ناکامی کا شدید احساس تھا لیکن وہ نہایت عاجزی سے یہ دعا مانگتے رہے کہ وہ "بدلہ نہ لیں، غصہ میں مبتلا نہ ہوں اور سنگ دلانہ رویہ کا طرزِ عمل اختیار نہ کریں"۔ جب وہ چند ہفتے کے بعد واپس دہلی آئے تو انہوں نے اپنے پرانے کالج کے عیسائی طلباء سے ملاقات کی۔ ایک بزرگ[2] نے جو وہاں موجود تھے اس منظر کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

---

[1] ان دوستوں میں مولانا محمد علی مرحوم بھی تھے۔ ان کے نام جو خط بھیجا گیا تھا اس کا ترجمہ ضمیمہ میں دیدیا گیا ہے۔ مترجم

[2] فادر جی۔ وائی۔ مارشل۔

"میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا کہ کس قدر صبر اور انکساری کے ساتھ انہوں نے ہمارے سوالات اور نکتہ چینیوں کو سنا اور کس قدر محبت کے ساتھ انہوں نے ان کا جواب دیا انہوں نے نہیں بتایا کہ کس عظیم الشان کشمکش اور ضمیر کی خلش سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنی پادریت سے مستعفی ہو جانے کی جرأت کی ہے ۔۔ اور مسیح اب ان کے دل میں پہلے سے زیادہ روشنی کے ساتھ چمک رہے ہیں کیونکہ ان کے لئے کلیساؤں کے مقررہ عقیدوں اور اصولوں کی بندشیں نہیں رہی ہیں .... انہوں نے ہم سے بمنت درخواست کی کہ ہم بدستور ان سے محبت و اخلاص رکھیں اور ان کے عیسائی ہونے کی شہادت میں ان کی تائید کریں۔"

اپنی انتہائی ذہنی کشمکش کے عالم میں اینڈریوز اپنے غیر عیسائی دوستوں کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور انہوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ گاندھی نے اینڈریوز کے والد کو ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۴ کو لکھا:۔

"چارلی مجھے خطوط بھیجتے رہے ہیں ۔۔۔ ممکن ہے آپ کو اس بات سے رنج پہنچے کہ انہوں نے پادریانہ لباس اُتار دیا ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ یہ صورت حال دیرپا نہیں ہے اور نہ ان کا طرز عمل کسی تبدیلی کا مظہر ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک قسم کی توسیع ہے وہ اپنی زندگی کے ذریعہ تبلیغ کرتے ہیں جسے بہت کم لوگ کر سکتے ہیں ۔ وہ خالص ترین محبت کا پرچار کرتے ہیں .... بظاہر چارلی اپنے سامنے ایک مشن رکھتے ہیں جس کی وسعت کا وہ لوگ بھی تصور کرنے سے قاصر ہیں جو اُن کے قریب رہتے ہیں۔ کیا میں آپ سے پُرزور درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ ان کے تمام کاموں میں اپنی دعاؤں سے دریغ نہ کریں؟ ان کے لئے یہ جاننا بیحد سکون کا باعث ہوگا کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے۔ اس سے آپ کو کوئی دکھ نہیں پہنچا۔"

ان ایام میں اینڈریوز اپنی والہانہ عقیدت مندی کے ساتھ ٹیگور سے وابستہ رہے، اور جب کبھی وہ ان سے جدا ہوتے ان کی صحت اور سلامتی کے متعلق انہیں تکلیف دہ اور عجیب سی تشویش رہتی ٹیگور ان کی ضروریات کو حقیقی دوستی کی بصیرت کے ساتھ پورا کرتے تھے۔ وہ بڑے اخلاص کے ساتھ انہیں یاد دلاتے کہ ایسی انسانی محبت سے جو بے لوث نہ ہو، ہر قیمت

پہ پہنچا چاہتے، انہوں نے دیکھا کہ ان کا دوست اسی پراگندگی دماغ اور بے پروائی کی طرف بڑھ رہا ہے جس کی دو سال قبل وہ پرزور الفاظ میں مذمت کر چکے تھے اور انہوں نے قدرے سخت الفاظ میں انہیں ترغیب دی تھی کہ وہ اپنے خدا کی طرف رجوع ہوں اور اپنی عیسائی مذہبی زندگی کے بیش قیمت ورثہ پر ثابت قدم رہیں۔

شد حیر ثدورا فرانس کے میدان جنگ میں روانی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ساتھ کام کرنے کے لئے جانے سے پیشتر شانتی نکیتن میں الوداع کہنے کے لئے آئے۔ انہوں نے کہا: "جناب! آپ اپنی عشائے ربانی کو ناغہ نہ کیجئے گا" اینڈریوز نے ان چھوٹے بچوں کی طرف جو قریب ہی کھیل رہے تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ بچے ہی میرے لئے عشائے ربانی ہیں"۔ ان الفاظ سے ایک نہایت حقیقی تجربہ کا اظہار مقصود تھا اور فلینڈرز (فرانس) میں نوجوان شد حیر نے شکر گزاری کے ساتھ ان الفاظ کو یاد رکھا۔ معمولی زندگی کے متعلق اینڈریوز جو بھی رائے رکھتے تھے لیکن بہ اعتبار بصیرت ٹیگور صحیح راستہ پہ تھے، اور انہی کے اثر نے اینڈریوز کو اپنی گزشتہ پادریانہ روایات سے مزید قطع تعلق کرنے سے باز رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ لیفرائے نے اینڈریوز کے عجلت پسندانہ استعفے کو منظور نہیں کیا۔ وہ اس امر سے متفق تھے کہ آج کی ذہنی اور اخلاقی مشکلات کے پیش نظر ان کے لئے یہ امر مناسب ہوگا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے اپنے کلیسائی عہدہ کے فرائض کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہیں، لیکن انہوں نے دیدہ و دانستہ دروازہ کھلا رکھا تاکہ جب کبھی اینڈریوز پادریوں کی جماعت میں شامل ہونا چاہیں تو وہ بغیر کسی دشواری کے ایسا کر سکیں۔

(۲)

اکیلے پن کے اس احساس میں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوگیا جس کا برداشت کرنا اینڈریوز کی محبت بھری فطرت کے لئے بہت مشکل ہوگیا۔ انہوں نے اس امر کا احساس واضح طور پر نہیں کیا تھا کہ جاسوس ہونے کی بدگمانی شانتی نکیتن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ وہ اور پیرسن پہلے غیر بنگالی تھے جو اساتذہ کے عملہ میں رکھے گئے اور ان کے رفقائے کار میں سے

بعض ایسے تھے جنہیں شروع شروع میں ان کی بے لوثی کا یقین نہیں آیا۔ جب گاندھی فروری ۱۹۱۵ء میں شانتی نکیتن آئے اس وقت اُن کی امداد و اعانت سے اینڈریوز اس قابل ہو سکے کہ ان بدگمانیوں پر قابو پائیں۔ وہ گاندھی ہی تھے جنہوں نے انہیں بتایا کہ یہی وقت ہے جب انہیں ان لوگوں کے متعلق جو ان سے بدگمانیاں رکھتے ہیں، زیادہ کیانفی اور صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ ساتھ ہی گاندھی نے وہاں کے نوجوان ہندوستانی اساتذہ کو یقین دلایا کہ اینڈریوز اس قابل ہیں کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔ چنانچہ ٹرم کے ختم ہونے سے پہلے ہی ان کی مشفقانہ انکساری نے ان کے دلوں کو پورے طور پر موہ لیا تھا۔

ہمدردی کی فراوانی کے ساتھ ساتھ شانتی نکیتن کی زندگی میں دلچسپی اور دل دہی کے بہت سے سامان پیدا ہو گئے۔ آشرم والے سادی چیزوں کے متعلق اینڈریوز کے طرزِ عمل کو دیکھکر ہنسا کرتے تھے جس میں خود ان کی اور دوسروں کی چیزیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ انہیں دہلی کے سفر کے لئے کمبل کی ضرورت تھی اور چونکہ انہوں نے اپنا کمبل ایک غریب عورت کو دیا تھا جو بخار میں مبتلا تھی، اس لئے انہوں نے ایک نو عمر ٹیچر سدھاکانت رائے چودھری سے عاریتاً کمبل مانگ لیا۔ واپسی پر ان کا نوکر ایک کمبل لیکر سدھاکانت کے مکان پر پہنچا۔ یہ بہت ہی اعلیٰ قسم کا تھا اور اس پر ایس۔کے۔ رودرا کو نے پرمدح تھا۔ جب یہ بات اینڈریوز کو بتائی گئی تو انہوں نے کہا:۔ "بہر حال یہ ہے تو کمبل ہی"۔ رابندرا ناتھ نے ایک مرتبہ شوخی کے لہجہ میں کہا: "اینڈریوز تو دریا کی طرح ہیں۔ وہ ایک کنارے کو نقصان پہنچا کر دوسرے کنارے کو مالدار بنا دیتے ہیں۔ اگر تم کو کوئی چیز کھونا ہو تو بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اینڈریوز کے حوالہ کر دو"۔

ان کا شام کا وقت زیادہ تر دو یجندرا ناتھ ٹیگور کی صحبت میں گزرتا تھا جنہیں ہر شخص محبت سے "بڑا دادا" (بڑے بھائی) کہکر پکارتا تھا۔ وہ دونوں بہت جلد گہرے دوست ہو گئے اس لئے کہ بڑے میاں سر والٹر اسکاٹ کے بے حد مداح تھے اور جہاں تک اینڈریوز کا تعلق ہے اسکاٹ ہی پہلا مصنف ہے جس سے انہیں سب سے پہلے گہری ادبی محبت ہوئی۔ بڑے میاں جس طریقہ سے "حال" کا مذاق اڑاتے تھے اینڈریوز اس سے بیحد لطف اندوز ہوتے تھے، بالخصوص ان کی بے اختیارانہ ہنسی سے اور ان کے دلچسپ

بطیبوں[1] سے سب سے زیادہ وہ جس چیز سے متاثر تھے وہ ان کی انکسار آمیز دانشمندی اور دل کی پاکیزگی تھی اور بعض اوقات معتز فلاسفران سے اپنشد ، بھگوت گیتا اور پہاڑی کے وعظ پر بھی تبادلۂ خیال کرتے تھے اس لئے کہ ان میں ان کی ضروریات کی تسکین کا پورا پورا سامان موجود ہوتا تھا۔

ہر ہفتہ "مندر" میں اپنی مذہبی تقریر کے بعد رابندرا ناتھ ٹیگور اپنے لکچر کے متعلق اینڈریوز سے تبادلۂ خیال کرتے۔ ہندو فلسفہ کی عظیم الشان روایات پر بحث کرتے اور اپنشد کی تشریح و تفسیر بیان کرتے۔ کبھی کبھی اینڈریوز رابندرناتھ ٹیگور کے ساتھ ان کے نظموں اور غنائیہ ڈراموں پر کئی گھنٹے صرف کرتے۔ ایسے بھی لمحات گزرے ہیں جبکہ وہ ان کے حسن سے متاثر ہو کر مست ہو جایا کرتے تھے ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی اور وہ آشرم کی بڑی کھلی جگہ میں اچھلتے کودتے پھرتے تھے اور تاروں بھری رات کی تنہائی میں چلتے چلتے زور زور سے انہیں گایا کرتے تھے۔ یہ شاعری ان کے لئے دنیا کی روشنی اور رنگ کو یکسر تبدیل کر دے گی۔ لیکن یہ الفاظ کا جادو نہ تھا جس نے ان کے دل کو اسقدر والہ و شیدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ خیالات کی بلند پرواز عظمت تھی۔ رابندرا ناتھ کے نغمے اور اپنشد کی پرعظمت آیتیں ان کے دل و دماغ میں عیسائی مذہب کے مشہور عام جملوں میں گھل مل جاتی تھیں اور وہ وسیع میدانوں میں اپنی تنہائی کی چہل قدمیوں میں ان تجربات کو تشکیل دیتے تھے جو ان کی مابعد کی مذہبی کتابوں کی بنیاد بنے — "مسیح عام روشنی میں"، "مسیح اور دعا"۔

شانتی نکیتن میں گاندھی کی آمد سے ان کی دوستی دوسری منزل میں داخل ہوئی۔ جب گاندھی ۱۵-۱۹۱۴ کے موسم سرما میں ہندوستان لوٹے ہیں اس وقت انہوں نے گوکھلے سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک سال تک ہندوستانی سیاست میں حصہ نہ لیں گے اور چنانچہ احمد آباد کے قریب سابرمتی کے مقام پر وہ قومی خدمات کا ایک نیا آشرم انہی اصولوں پر تعمیر کرنے میں مصروف ہو گئے جن اصولوں پر جنوبی افریقہ میں "ٹالسٹائی فارم" اور "فینکس"

---

[1] وشوا بھارتی کوارٹرلی ۱۹۴۰ء میں ان کی بہت سی دلچسپ باتیں درج ہیں۔

بناتے گئے تھے۔ جب وہ شانتی نکیتن پہنچے تو وہاں انہوں نے لڑکوں کو اور اساتذہ دونوں کو نصیحت کی کہ وہ نوکروں کے بغیر گزارہ کریں اور خود اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا کریں اور برتن صاف کیا کریں۔ اینڈریوز نے خوشی اور مسرت کے ساتھ اس تجربہ کو عملی جامہ پہنایا لیکن وہ اس امر کی دانشمندی کے بارے میں مشتبہ تھے کہ آیا حلف کے ذریعہ اس کام کو مستحکم کرانا چاہیئے یا نہیں کیونکہ بحیثیت مجموعی جن لوگوں نے قسمیں کھائی تھیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں جنہوں نے قسمیں نہیں کھائی تھیں، کم کامیاب نکلے۔

گاندھی نے اینڈریوز کو بھی اپنے آشرم کے قواعد بھیجے۔ اینڈریوز نے اس کا بالتفصیل جواب دیا۔ انہیں عام حلف ناموں کے متعلق کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ اس امر پر اعتراض تھا کہ تجرد کی زندگی کے حلف کو بھی قواعد میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ "ہندو مت کا مرکزی ہمہ گیر تخیل یہ ہے کہ صرف وہی شخص جو زندگی کا بھرپور تجربہ رکھتا ہے، جس کی زندگی مردانگی سے معرا یا ضعیف نہیں رہی، صحیح معنوں میں سنیاسی کی زندگی بسر کر سکتا ہے" "جیلہ" "مردانگی سے معرا" براہ راست ٹیگور سے لیا گیا ہے جن کی تعلیمات سے دیسٹ کوٹ کی مقدس گھریلو زندگی بسر کرنے کے سوشل تخیل کو بیحد تقویت ہوئی۔ جب اینڈریوز سال کے آخر میں سابرمتی گئے وہ قریب ترین، مسکین ترین اور گمراہ اشخاص کے بارے میں اس کی خدمت کے تخیل کو دیکھکر معاً اس کے گرویدہ ہو گئے، لیکن انہوں نے گاندھی سے ان کے اخلاقی ظلم کی نسبت پرجوش انداز میں بحث کی (انہوں نے ایک مرتبہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: "میں مسٹر گاندھی سے اختلاف کرنے سے نہیں ڈرتا۔ اس کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ محبت کر سکتے ہیں")۔

اس زمانہ میں وہ ازدواجی زندگی کی فضیلت کے سوال پر اس قدر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے کہ انہوں نے ٹیگور سے مشورہ کیا کہ آیا انہیں اپنے دوست اسٹوکس کی تقلید میں شادی کر لینی چاہیئے+ انہوں نے لکھا کہ ان کے پیش نظر اس وقت کوئی خاص خاتون نہیں ہے اور ساتھ ہی وہ اپنی خراب صحت اور مالی حالت کے باعث اس ذمہ داری کو اٹھانے سے ہچکچاتے بھی ہیں—— لیکن ٹیگور کا کیا خیال تھا؟ ٹیگور نے ازراہ شرارت انہیں مشورہ دیا کہ کسی

بیمار عورت سے شادی کرلینی چاہئے۔"

(۴)

اینڈریوز ۸ رمئی ۱۹۱۵ کو رابندرناتھ کی تقریب سالگرہ میں شامل ہونے کے لئے کلکتہ آگئے اور اسی شام تن تنہا بولپور واپس آگئے۔ ۴۸ گھنٹے بعد انہیں ہیضہ ہوگیا۔ اس وقت لڑکے اور اساتذہ تقریباً سب کے سب گرمی کی تعطیلات کی وجہ سے جاچکے تھے۔ ان کے مسلمان باورچی جوہری نے پہلی خوفناک رات میں ایسے انہماک سے ان کی تیمارداری کی کہ ڈاکٹر کے آتے آتے وہ غریب خود موت کے اسقدر قریب جاپہنچا تھا کہ اس کی قبر کے لئے جگہ کا انتخاب بھی کرلیا گیا تھا۔ ٹیگور یہ خبر سنتے ہی ان کے پاس آگئے، اس علم نے کہ وہ آرہے ہیں اور بالآخر ان کے چہرہ کو دیکھکر ان میں زندہ رہنے کی خواہش از سرنو پیدا ہوگئی۔

اس کے بعد وہ شملہ چلے گئے اور وہاں بہت عرصہ تک رہے تاکہ اس کی آب وہوا میں رہکر اپنی کھوئی ہوئی صحت کو بحال کریں۔ رُدر ابھی ان کے ساتھ تھے اور وہ ان کی روح کے حیرت انگیز سکون کو دیکھکر متعجب تھے جس نے پرانے سیماب صفت چارلی کو بالکل بدل دیا تھا۔ جب اینڈریوز میں "موسم بہار کی فوری آمد کی طرح" طاقت آچلی تو اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ وہ موت کی وادی میں سے گزر کر مسیح کی زیادہ گہری محبت اور معرفت تک جا پہنچے ہیں جس میں مسرت بھی تھی اور سکون بھی۔ لیکن عیسائی تجربہ اور تاریخ میں مسیح کے مقام کے متعلق ان کی تشریحات ٹیگور کی گفتگوؤں سے بہت متاثر ہوئیں بعینہٖ جس طرح سے اس سے قبل کے سال میں منشی رام اور گاندھی کی گفتگوؤں سے متاثر ہوئی تھیں۔ وہ رقمطراز ہیں:-

خدائی اوتار کی سچائی کو مجھے ساری انسانی زندگی پر محیط کرنا چاہئے، ایسی انسانی زندگی جس کے اندر خدا رہتا ہے ــــ اس کی مرئی صورت اور اس کا کلام ــــ ...... کفارہ کو بھی مسیح کے ایک واحد فعل سے ماورا کر کے پھیلانا چاہئے خواہ وہ بنفسہٖ کتنا نمایندہ فعل ہو ...... مجھے اب یقین ہوگیا ہے کہ ٹینی سَن نے موت کے بعد انفرادی رابطہ اور پہچان کی جس تمنا کا اظہار کیا ہے وہ افسردہ کُن اور غلط ہے۔ سچی محبت ان بندھنوں کو توڑ دیتی ہے۔ اس کو

بدیہہ پہلے کہ وہ کلیتہً اپنی خودی سے چھٹکارا پالے"۔[1]

مگر آخری جملہ میں انہوں نے انسانی محبت کی جو قدر معین کی ہے، وہ ان کے نظریہ سے کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے نے پھر پیچھے کی طرف پلٹا کھایا۔

"زمانۂ مستقبل میں موت کے بعد کیا خود ہیچ سمندر اور زیادہ عمیق گہرائیوں کا حامل نہ بن جائے گا — شعور کا فقدان نہیں بلکہ ایک ہموار زیادہ وسیع زندگی"۔[2]

سب سے زیادہ ٹیگور ایسے "تصور کرنے" کے مسائل پر غور و خوض کرتے رہتے تھے — خدا کی ابدی نہ بدلنے والی حالت پر اور اس کی تخلیق، دکھ اٹھانے والی محبت پر۔

معلوم ہوتا ہے کہ محبت نہ صرف ایک واتھی حقیقت ہے جو مکان، شکل اور زمان سے بالاتر ہے بلکہ وہ ایسی چیز ہے جو حرکت کی وجہ سے رقصاں اور مجسم ہے۔ کیا تخلیق ذات نہ بدلنے والی فطرت کی طرح ابدی ہے؟ مغرب میں حیوانی جذبہ نے محبت کے مقام بلند کو غصب کر لیا ہے اور ہندوستان میں خاموش کریم النفسی نے۔ یہ سب باتیں خدا کے بارے میں ہمارے تخیل ہی کی تائید کرتی ہیں۔ ست کیا چیز ہے؟ ایک ہی شے میں بیک وقت حرکت اور سکون ہی کا تضاد مجھے اطمینان بخشتا ہے۔

جوں جوں ان میں زیادہ طاقت آتی گئی ابدی تضاد کے متعلق ان کے خیالات میں عمل کے نئے بلاووں کی وجہ سے اور تیزی آگئی؛۔

شملہ ہندوستان بھر کے جملہ کروڑوں باشندوں کے جملہ ظلموں، ناانصافیوں اور زیادتیوں کا شکم ہے۔ جارحانہ زیادتی کے دباؤ سے مجھے وقتی سکون صرف عمل ہی میں مل سکتا ہے.... باوجود اس کے یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ دکھ کے لامحدود سمندر کے ساحل سے ریت کے ذرات کو ایک ایک کر کے ادھر اُدھر سے جمع کرنا ہے"۔[3]

---

[1] مختلف مکتوبات بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، جون تا اکتوبر ۱۹۱۵

[2] مختلف مکتوبات بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، جون تا اکتوبر ۱۹۱۵

[3] آئی-آر-ٹی-کے نام، جولائی ۱۹۱۵

اسی زمانہ میں انہوں نے "ترکمہ کے لامحدود سمندری ساحل" پہ پابندِ معاہدہ مزدوری کے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں جی۔ کے گوکھلے نے مرکزی مجلس وضعِ قوانین میں پرزور طریقہ پر اور اپنی فصیح تقریر کے ذریعہ پابندِ معاہدہ مزدوری کے رسوا کن نظام کی خصوصی کا مطالبہ کیا تھا اور اینڈریوز نے ان کے کام کو انتہائی دلچسپی سے دیکھا تھا مگر جنوبی افریقہ میں خود انہیں اس قسم کے براہ راست کام کے لئے کم موقع ملا، اگرچہ بھگوڑے قلی کی قابلِ رحم صورت جس نے ان کے زمانہ قیام میں "فینکس" میں پناہ لی تھی، اس نظام کی نشانی کے طور پر ہمیشہ ان کے دماغ میں گھومتی رہی۔ اب شملہ میں انہیں ایک ایسی غیر معمولی کتاب ملی جس کا نام تھا "فجی آف ٹوڈے" (آج کا فجی)[1] جس میں نہ صرف بحر الکاہل میں فجی کی جنگی اہمیت اور وہاں ہندوستانیوں کے داخلہ کی اہمیت کی جانب بلکہ ہندوستانی مزدوروں کی پابندِ معاہدہ حالتِ زار کی جانب بھی توجہ دلائی گئی تھی۔ مزید شہادت بھی مل گئی۔ سرکاری اعداد سے ظاہر ہو گیا کہ فجی کے پابندِ معاہدہ مزدوروں میں خودکشی کی شرح ہر دس لاکھ میں ۹۲۶ کے خوفناک اعداد تک پہنچ گئی ہے ـــ مدراس کے اعداد سے بھی بدرجہا زیادہ۔ ہندی کی کتاب "فجی میں میرے ۲۱ سال" میں تو تی رام سنادھیا نے جسے لڑکپن ہی میں بنارس سے سبز باغ دکھا کر پابندِ معاہدہ مزدور کی حیثیت سے بھرتی کیا گیا تھا، اپنے تجربات بتائے تھے۔ اس کا بھی اینڈریوز نے مطالعہ کیا۔ اس اثنا میں انہوں نے اخبارات میں پڑھا کہ کولونیل شوگر ریفائننگ کمپنی نے جو آسٹریلیا والوں کی تھی اور جو فجی کی تقریباً تمام صنعت شکر سازی کی مالک تھی، ہندوستان میں اپنا وفد بھیجا ہے تاکہ پابندِ معاہدہ مزدوری کے خلاف گوکھلے نے جو جد و جہد جاری کر رکھی ہے اس کا توڑ کرے، مبادا ان کی تمام تجارت تباہ و برباد ہو جائے۔

گوکھلے اپنی مسلسل جد و جہد کی وجہ سے خستہ ہو کر انتقال کر چکے تھے اور اینڈریوز نے ان کے نامکمل کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ خدمت انہیں مسیح کے حکم سے تفویض کی گئی ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

---

[1] مصنفہ برنارڈ ریڈ۔ ولیم ہیمن مطبوعہ ۱۹۱۲ء

"ایک دن تقریباً دوپہر کے وقت جبکہ میں ورانڈے میں ایک کرسی پر لیٹا ہوا ان چیزوں پر غور کر رہا تھا میں نے اپنے سامنے عالم رویا میں ایک شخص کا چہرہ دیکھا۔ میں سو نہیں رہا تھا، میری آنکھیں بالکل کھلی ہوئی تھیں۔ یہ اُس بچارے بھاگے ہوئے قلی کا چہرہ تھا جسے میں نے نیتال میں دیکھا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے وہ چہرہ بالکل بدل گیا اور ہو بہو مسیح کے چہرہ کی طرح ہوگیا۔ وہ چہرہ بہت دیر تک میری طرف دیکھتا رہا اور اس کے بعد غائب ہوگیا۔"[1]

وہ ابھی تک بہت کمزور تھے لیکن اس کے باوجود انتہائی محنت سے کام کرتے رہے انہیں مدد دینے والا کوئی بھی نہ تھا۔ انہوں نے اپنے ہی ہاتھ سے طویل یادداشت وائسرائے کے نام لکھی اور اسے ہر صوبائی گورنر کے نام بھیجدیا جس سے وہ شناسا تھے، بالخصوص اپنے دوست سر جیمز میسٹن کے نام جن کے صوبے سے فجی جانے والے مزدوروں کی بیشتر تعداد بالعموم بھرتی ہوا کرتی تھی۔ لارڈ ہارڈنگ کو کامیابی کی توقع نہ تھی لیکن انہوں نے اینڈریوز سے درخواست کی کہ وہ اس مراسلہ کی تیاری میں محکمہ تجارت کو پوری امداد دیں جو وزیر ہند کی خدمت میں بھیجا جانے والا تھا۔ یہی وہ مشہور و معروف مراسلہ نمبر ۱۴ (ترکِ وطن) ہے اور اس میں ذیل کا فقرہ بھی تھا:۔

"اس ملک میں عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے اور اس کے لئے سنجیدہ وجوہ بھی موجود ہیں کہ ترکِ وطن کرنے والی عورتیں بالعموم بدکاری کی زندگی بسر کرتی ہیں جس میں ان کے جسم کلیتہً ان کے رفیق تارکانِ وطن نیز ماتحت انتظامی عملہ کے افراد کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔"[2]

اینڈریوز پر یہ چیز بتدریج واضح ہوتی گئی کہ کامیابی کا دارو مدار اس پر ہے کہ پابند معاہدہ مزدوروں کی ازسرِ نو آزادانہ تحقیقات موقع پر کی جائے اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے

---

[1] - غیر مطبوعہ یادداشتیں۔

[2] - مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ "گورنمنٹ آف انڈیا گزٹ" مورخہ ۸ جنوری ۱۹۱۶ میں بطور ضمیمہ کے چھپ چکا ہے۔

اس کام کو کرنے کے لئے مامور کئے گئے ہیں ۔ پیئرسن ان کے ساتھ جانے پر فوراً رضامند ہو گئے اور مصارف کچھ تو کلکتہ کی اینٹی انڈنچر ڈلیبر لیگ نے اور کچھ بمبئی کی امپیریل انڈین سٹیزن شپ ایسوسی ایشن نے برداشت کئے۔

ہندوستان چھوڑنے سے پہلے اینڈریوز نے اصالتاً تارکین وطن کے وہ تمام مرکز دیکھے جو الہ آباد اور کلکتہ کے درمیان واقع تھے اور ان طریقوں کی چھان بین کی جو پیشہ ور بھرتی کرانے والے استعمال کیا کرتے تھے ۔ ۱۹۱۵ میں وہ طریقے اپنی انتہائی خرابی کو پہنچ چکے تھے شمالی ہندوستان میں غیر باہر مزدوروں کی مزدوری میں اضافہ ہو چکا تھا اور اسی لئے فجی میں ۱۲ آنے یومیہ کے وعدے لوگوں کے لئے جاذب توجہ نہیں رہتے تھے اس لئے کہ انہیں نیو دہلی کی بنیادوں کے لئے مٹی ڈھونے سے اتنی ہی رقم مل سکتی ہے۔ اس لئے پیشہ ور بھرتی کرانے والے فریب کاری اور بعض اوقات ہپنوٹزم سے کام لینے لگے تھے۔ تعلیم یافتہ لڑکوں کو یہ کہکر لالچ دیا جاتا تھا کہ انہیں کلرکوں اور ٹیچروں کی جگہ دی جائے گی ۔ نوکری کے متلاشی سکھ نوجوانوں سے پولیس میں نوکری کے وعدے کئے جاتے تھے اور یہ حقیقت سیدھے سادے بھرتی ہونے والے دیہاتیوں کو کبھی نہیں بتائی جاتی تھی کہ فجی کے بارہ آنے ہندوستان کے چار آنے کے برابر بھی نہیں ہوتے۔ رنگروٹ عورتیں جنہیں بھرتی کرانے کے لئے پیشہ ور دلالوں کو زیادہ اونچی شرح دی جاتی تھی ۔ بھگا کر اور خوف زدہ کر کے حاصل کی جاتی تھیں ۔ اینڈریوز کے اندازہ کے مطابق کم سے کم ۸۰ فیصدی عورتوں کی بھرتی میں کسی نہ کسی قسم کی فریبکاری کو ضرور دخل تھا اور فجی میں جو شہادت انہیں بہم پہنچی اس سے ان کے اندازہ کی تصدیق ہو گئی

(۴)

دلی پیئرسن بہت ہی جوشیلے ساتھی تھے اور ان کا جوش متعدی ۔ تھا جو دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہتا تھا ، اور ان کی صحبت میں رہ کر اینڈریوز کا وہ قدیم مزاح پھر عود کر آیا جس کی وجہ سے سینٹ اسٹیفنز کالج کے کرکٹ کے دورے زیادہ دلچسپ اور زندگی بخش بن جاتے تھے ۔ سمندری بیماری کو بھی مذاق سے زیادہ وقعت نہ دی جاتی تھی اور یہ دونوں ٹیگور

کے ذیل کے ظریفانہ اشعار پڑھکر اپنا دل بہلا لیا کرتے تھے:۔

خواہ کچھ ہی ہو، اے میرے دل، سچائی کو بغیر کسی تصنع کے اختیار کرو۔

خواہ کچھ آدمی ایسے ہوں جو تم سے محبت کرتے ہوں پھر بھی ایسے اشخاص ضرور ہوں گے

جو کبھی ایسا نہیں کر سکتے!

خواہ حالات تمہارے لئے سازگار ہوں یا نہ ہوں، واقعات تم سے اجازت لئے بغیر

وقوع پذیر ہوتے رہیں گے۔

لہذا اگر تم سکون چاہتے ہو، اے میرے دل، تم تو سچائی کو بغیر کسی تصنع کے اختیار کرو۔

ان کے رفقائے سفر جو آسٹریلیا کے رہنے والے تھے ان کے غیر رسمی لباس سے اور اس سے بڑھکر ان کے غیر رسمی ریمارکوں سے بجد برہم ہوتے تھے، اور وہ ان کی اس برہمی سے لطف اٹھایا کرتے تھے۔

"ڈی نے تجویز پیش کی کہ (آسٹریلیا کا) شمالی حصہ جوکہ قوں آباد کاری کی غرض سے ہندوستان کو دے دینا چاہئے۔ یہ ایک بے سروپا اور مجنونانہ بڑ تھی — ایسی ہی جیسے کسی انگریز سے کہا جائے کہ وہ مصر چھوڑ کر چلا جائے [1] — اور یہ ریمارک تمام جہاز پر گشت کرتا رہا۔"

ادھر آسٹریلیا کے مسافر اس فکر میں رہتے تھے کہ ان دونوں کو یقین دلائیں کہ آسٹریلیا ہی دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جو رہنے کے قابل ہے — ایک نوخیز ملک جو وقت اور تبدیلی پر اپنی انگلیوں کے نشان ثبت کر سکتا ہے اور وہ ان کے اس اضطراب سے لطف اٹھاتے تھے۔ ایک پرجوش مسافر نے کہا:۔

"تاریخ، تاریخ ہے کیا بلا؟ ہم آسٹریلیا والے تاریخ کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتے۔ ہم کوئی تاریخ وارتخ نہیں رکھتے۔ آپ ذرا آپ اپنے ویسٹ منسٹر ایبے کو

---

[1] ۱۹۱۵ میں انگریز کا مصر سے نکل جانا بلاشبہ خلاف توقع تھا لیکن ۱۹۵۲ میں پورے لیسٹر سمیت اس کا وہاں سے نکلنا اتنا خلاف توقع نہیں رہا۔ مترجم

لیجئے جو لندن میں ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بہت ہی خوبصورت عمارت ہے؟ کیا میں ٹھیک نہیں کہتا؟ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس کے اندر جانے کی زحمت کروں گا؟ ہرگز نہیں!! ہمیں آپ کے ملک کی تاریخ کی مطلق ضرورت نہیں ہے ہمارا نو عمر ملک نوخیز ہے! اور لڈگیٹ سرکس پر ٹامس کک کے دفتر کے پاس جو دوسرا گرجا ہے ــــ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اس کے اندر گیا تھا؟ ہرگز نہیں! میں اس طرف ضرور گیا تھا اور باہر کبوتروں کو دانہ چگتے دیکھا تھا، لیکن میں کبھی اندر نہیں گیا۔"

"...... تاہم میں آپ سے ایک بات کہوں گا جس سے آپ متعجب ہوں گے ــــ آپ کو سیر کی جائے میلبورن میں لندن کے مقابلہ میں اچھی ملے گی! اور آپ کو میلبورن میں وسکی اور سوڈا بھی سستا ملے گا۔ میلبورن بڑا اچھا شہر ہے ــــ سڈنی؟ لیکن سڈنی اس کا پاسنگ بھی نہیں۔ میلبورن ایک نہ ایک دن دنیا کا خوبصورت ترین شہر بن جائے گا۔ میں خود میلبورن کا رہنے والا ہوں اور میں اس سے اچھی طرح سے واقف ہوں۔"

سورج اس وقت غروب ہو رہا تھا اور سنہری عقاب کی طرح اپنے پروں کو پھیلا رہا تھا میں نے کہا:- "یہ غروب آفتاب کا منظر بھی کس قدر حیرت انگیز ہے!" اس نے کہا: "اوہ، یہ نظارہ میلبورن کے نظارہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔"

میلبورن اور سڈنی میں انہیں بہت زیادہ دوستانہ فضا نظر آئی اور جنوبی افریقہ کی طرح آسٹریلیا کے تعلیم یافتہ گھرانوں میں بھی ٹیگور کی تصانیف ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان کے ساتھ تپاک آمیز برتاؤ کیا گیا۔ صرف کولونیل شوگر ریفائننگ کمپنی کے افسروں میں نسلی تفاخر اور بدگمانی پائی جاتی تھی۔

"آپ کے استاد رہنما سی کیا ہیں؟ ہندوستانی باشندے؟[۱] وہ تو غلام قوم ہیں اور آزادانہ عمل نہیں کر سکتے آپ تو ایک شر پسند انسان ہیں فجی کی حکومت آپ کو بہت جلد ٹھیک کر دیگی۔"

پانچ گھنٹے اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد میں ایک دن شہر میں گیا اور وہاں

---

[۱] اینڈریوز انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔

گلاب کے پھولوں اور دوسرے بنفشئی رنگ کے پھولوں کو دیکھتا رہا یہاں تک کہ میرے مزاج کی فطری شگفتگی لوٹ آئی ـــ لیکن بعد میں رات کے بڑے حصہ تک میں جاگتا رہا۔"

ابتدائے نومبر کی ایک صبح کو جب کہ آسمان کا رنگ سیسہ کی طرح ہو رہا تھا اور جس پر سنہری روشنی کی کرنوں کی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں، فجی کے پہاڑ شمالی افق کے برابر بڑا دور سے نظر آئے۔ جوں جوں جہاز نزدیک ہوتا گیا اس سرزمین کی خوبصورتی جلوہ گر ہوتی گئی۔ پتھریلے ساحلوں پر بڑی بڑی لہروں کا ٹکراؤ، ساحلی جھیلوں کا سبز رنگ کا پانی جس میں مونگے کے تحت البحر جزیرے عجیب منظر پیش کر رہے تھے اور کنارے کنارے ناریل کے درختوں کی سفید قطار۔ اینڈریوز نے بہت جلد معلوم کرلیا کہ تباہ حال ہندوستانی مزدور بھی اس کے حسن کو دیکھنے کے لئے آنکھیں رکھتے ہیں۔ چند دن بعد ایک نوعمر مزدور نے ان سے کہا "یہاں فجی میں خدا کی بنائی ہوئی ہر چیز حسین ہے، صرف آدمی بُرا ہے۔"

وہ فجی میں صرف پانچ ہفتے رہے اور دوران قیام میں مختلف مقامات میں کام کرتے رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ علاقہ دیکھ سکیں۔ ۱۱ دسمبر کو جب ان کی سیاحت تقریباً ختم ہوگئی تو اینڈریوز نے پلانٹرز ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ کے افراد سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنے تجربات کے نتائج پیش کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ اگر اس کے خلاف کوئی شہادت پیش کی جائے گی تو وہ اس پر بھی پوری توجہ کے ساتھ غور کریں گے۔ انہوں نے کمپنی کی تعریف کی کہ اس نے ایسے مزدوروں کے لئے جن کے معاہدہ کی مدت ختم ہوگئی ہے اور جو فجی میں رہ پڑے ہیں، آبادکاری کی بہتر اسکیمیں تیار کی ہیں اور ساتھ ہی حکومت کی بھی جس نے ہندوستانیوں کے لئے شراب کی آزادانہ فروخت کی ممانعت کردی ہے جس پر سختی سے عملدرآمد ہو رہا ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ ایسے بہت سے کارخانے ہیں جن کا انتظام بھی شریفانہ ہے اور مالک بھی شریف ہیں اور جہاں پابند معاہدہ مزدور قانع اور شاکر رہتے ہیں لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ پابند معاہدہ مزدوری کے نظام کا خاتمہ ہونا ہی بہتر ہے۔ انہوں نے ایسوسی ایشن کے ارکان سے کہا کہ "میری دلی تمنا ہے کہ ہندوستانی فجی آئیں لیکن شرائط ہندوستان کے وقار کے مطابق ہونی چاہئیں۔"

جو شرائط انہوں نے اس وقت پیش کیں وہ ابتدائی نقطۂ نظر تھا ان کے جملہ کام کا جو انہوں نے بیرونی ممالک کے مقیم ہندوستانی مزدوروں کے لئے انجام دیا۔ مابعد کے سالوں میں کوئی ایسا معاہدہ نہ ہونا چاہئے جو آزاد اور شائستہ معاہدہ نہ ہو، کوئی بھرتی نہ کی جانی چاہئے تاوقتیکہ مزدوروں کی بیویاں بھی اس میں شامل نہ ہوں۔

ان گندی اور غلیظ لائنوں کی بجائے جہاں مرد عورت بھیڑوں کی طرح ایک ساتھ رکھے جاتے ہیں اور جن میں گھریلو زندگی کی مقدس محرکات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ مکانات تعمیر کرنے چاہئیں اور ان میں مناسب پردہ داری کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ "قلیوں کے ذلیل جہازوں" کی بجائے ایک اچھی پبلک جہازی سروس قائم ہونی چاہئے تاکہ فجی اور ہندوستان کے درمیان صحت بخش رابطہ قائم ہو جائے۔ اینڈریوز نے شادی کے رسوا کن طریقوں کا بڑے جوش سے ذکر کیا اور کہا:-

"تم نے ان کے مذہب کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا ہے کہ گویا وہ کوئی بد حقیقت شے ہے۔ تم ان سے ۵ شلنگ لے لیتے ہو اور ان کے ناموں کی رجسٹری کر لیتے ہو اور اس طرح ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ ان کی شادی کب ہوئی تھی اور یہ حالت گزشتہ ۳۰ سال سے چلی آ رہی ہے! میں شکر گزار ہوں کہ نوآبادی اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے رہی ہے اور شادی کے مقدس پہلو کو تسلیم کر رہی ہے۔"

جس شہادت پر یہ سفارشات مبنی تھیں، اسے مطلق جھٹلایا نہیں گیا۔ اگرچہ انہیں کمپنی کے غیر ہمدرد حکام کے سامنے پیش کرنا کوئی خوشگوار کام نہ تھا۔ لیکن جب لارڈ ہارڈنگ نے انہیں دیکھا تو انہوں نے فی الفور پنڈت مدن موہن مالوی کی اس تحریک کو منظور کر لیا کہ پابند معاہدہ مزدوری کا خاتمہ کر دیا جائے اور ۲۰ مارچ ۱۹۱۶ کو انہوں نے امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں اعلان کر دیا:-

"میں نے ملک معظم کی حکومت سے وعدہ لے لیا ہے کہ وقت آنے پر اس نظام کا خاتمہ کر دیا جائے گا — یعنی ایسی معقول مدت کے اندر جس میں متبادل انتظامات کا نفاذ کیا جا سکے۔"

اینڈریوز نے مسٹر ایف۔ بی۔ مٹر کو ۲ مارچ ۱۹۱۶ کو لکھا: "ہم آج محسوس کرتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے ہمیں اپنی بخشش سے نوازا ہے اور ہمیں اس کی توفیق دی ہے کہ ہم اس بڑے کام میں حصہ دار بنیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی سرزمین سے ایک اور لعنت دور ہوگئی ہے۔" پیئرسن نے لکھا: "کل جب یہ خبر ہم تک پہنچی، ہمارے آشرم میں تعطیل کر دی گئی تھی اور تمام لڑکے ہمارے ساتھ اس خوشی میں شریک تھے۔ میں بیحد خوش ہوں اور جے جے جے کہکر مسرت کے نعرے بلند کرتا ہوں"۔

مشترکہ رپورٹ ۱۹ رفروری ۱۹۱۶ کو شایع ہوگئی اور اسے جی۔ کے۔ گھوکھلے کے نام نامی سے منسوب کیا گیا۔ اس کے اعتدال پسند مگر درد انگیز صفحات سے مصنف کے غم وغصہ کا پورا پورا اظہار ہوجاتا ہے، نہ صرف زندگی کے ناگفتنی اخلاقی تنزل کے بارے میں جس میں بدترین آدمی نہیں بلکہ بہترین آدمی قتل کے مرتکب ہوتے تھے، بلکہ ان ہتھکنڈوں کی انتہائی کمینگی کے بارے میں جنہیں بھرتی کرانے والے کام میں لاتے تھے اور مزدوروں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے جب معاہدہ کے صراحت کردہ زراعتی کام میں بھری ہوئی شکر کی گاڑیوں کا چلانا بھی شامل ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ مالک اپنے زیادہ تجربہ کار قلیوں سے ماہرانہ کام لے رہا ہے مگر معاوضہ میں بازاری شرح مزدوری کی محض ایک قلیل مقدار اسے دے رہا ہے اور اگر حادثہ میں اسے کوئی گزند پہنچ جائے تو وہ اس کی تلافی کرنے کی ذمہ داری بھی قبول نہیں کرتا۔ اینڈریوز کی انصاف پسند طبیعت نے اس ظلم کے خلاف بیزاری کا اعلان اسی شدومد سے کیا جس بہادری سے انہوں نے عورتوں کو ناقابل برداشت ظلم سے نجات دلانے کی کوشش کی تھی۔

لیکن ایسے بچوں کا خیال انہیں سب سے زیادہ بےچین رکھتا تھا جو شیرخوارگی سے بیماری اور موروثی بیماریوں کا شکار تھے۔ نمایاں تضاد کے طور پر انہیں ان میں مسرت بخش دنوں کی یاد آجاتی ہے جو انہوں نے نیوزیلینڈ میں کرائسٹ چرچ کے مقام پر اپنی چھوٹی بہن ہیٹی کے گھر میں بسر کئے گئے تھے۔ جب چارلی نے انہیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں میں گھرا دیکھا تو ان پہ رقت طاری ہوگئی اس لئے کہ اس کی ہر نظر اور اشارہ سے معلوم ہوتا

تھا کہ ان کی اپنی مری ہوئی ماں دوبارہ زندگی ہو گئی ہے۔ بچے ماموں ماموں کہکر چارلی سے لپٹ گئے اور بڑی مسرت سے ان کہانیوں کو سنا جو انہوں نے ہندوستان کے متعلق بیان کی تھیں انہیں مسرت اور صحت کے پیدائشی حقوق حاصل تھے لیکن "لائنوں" میں رہنے والے قلیوں کے بچوں کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ حتی کہ بچپن کی معصومیت کا بھی ان میں فقدان تھا۔ اینڈریوز کے سامنے ابن آدم کی تصویر پھر گئی جن کی آنکھوں سے انتہائی غصہ کا اظہار ہو رہا تھا اور ان کے وہ سخت الفاظ بھی ان کے کانوں میں گونجنے لگے جن میں انہوں نے چھوٹے بچوں کو خفا کرنے سے منع کیا ہے۔ "اس کے مقابلہ میں یہ کہیں بہتر ہے کہ اس کی گردن میں چکی کا پاٹ ہو۔ اور اسے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔" یہی حالات تھے جنہوں نے انہیں ۱۹۱۷ء میں پھر واپس فجی بھیجدیا۔

باب ۸

پابندِ معاہدہ مزدوری کا خاتمہ

(۱۹۱۶ سے ۱۹۱۸ تک) (عمر ۴۵ تا ۴۷)

(۱)

۱۹۱۶ میں اینڈریوز کو خاموشی اور مسرت کا ایک اور وقفہ مل گیا۔ وہ اور پیئرسن شانتی نکیتن میں ایک ساتھ رہتے تھے، پیئرسن اپنے طلبا کے لئے وقف تھے اور اینڈریوز ٹیگور کے ساتھ ان کے تراجم میں معروف تھے۔ جس کمرہ میں وہ کام کرتے تھے وہاں سے مسلسل ہنسی اور قہقہوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اینڈریوز رابندرا ناتھ ٹیگور کی اُن یادگار جماعتوں میں بھی شریک ہوتے تھے جن میں ٹیلے پر سبق دئے جاتے تھے۔ وہ ان کی بنگالی تشریحات کو بڑے غور سے سنتے اور "رونیڈن کلاسیز" اور انگریزی مضمون نگاری کی جماعتوں کو بھی دیکھتے تھے۔

اینڈریوز ولی پیئرسن کی طرح لڑکوں میں لڑکے نہیں بن سکتے تھے تاہم وہ اُن کی انتھک طاقت کو دیکھکر بے حد محظوظ ہوتے تھے اور اپنی غیر حاضریوں کے بعد کھلونوں اور طرح طرح کے کھیلوں کا سامان لیکر آشرم میں واپس آتے تھے۔ لیکن وہ بہت جلد اُن کی مسلسل صحبت سے کون جاتے تھے مگر بیمار لڑکے کی خدمت

وہ ہمہ تن توجہ سے کرتے۔ ایک موقع پر جب چند بے قابو لڑکے اسکول سے نکالے جانے والے تھے اس وقت اینڈریوز ہی تھے جنہوں نے ان کی طرف سے سفارش کی کہ انہیں ایک اور موقع دیا جائے، اور اس کے بعد ان کے زیرِ اثر رہ کر وہ لڑکے بہت اچھے بن گئے۔ مگر عام طور پر وہ بڑی عمر کے لڑکوں اور ٹیچروں کے ساتھ زیادہ بے تکلفی سے گھل مل جاتے تھے۔

ان میں ایک لڑکا غیر معمولی طور پر ان کا گہرا ساتھی بن گیا تھا۔ اس کا نام "مولو" پرشاد چیٹرجی تھا۔ اسے مظلوموں کے ساتھ جو عملی ہمدردی تھی اس کے پیشِ نظر اینڈریوز نے محسوس کیا کہ وہ اس سے جنوبی افریقہ اور فجی کے متعلق اسی آزادی کے ساتھ جس سے وہاں سے ڈگی عمر کے آدمیوں سے گفتگو کرتے تھے، بات چیت کریں۔ مولو اپنا شام کا وقت دیہات میں گزارتا تھا جہاں وہ سنتھال اور ڈوم کے بچوں کو پڑھاتا تھا اور ان کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اینڈریوز کی پشت پناہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سوشل سروس کے کاموں میں شانتی نکیتن کے اولین کارکنوں میں سے ایک بن گیا۔

مئی ۱۹۱۶ء میں رابندرناتھ جاپان گئے جہاں کی سیاحت کا پروگرام انہوں نے بہت عرصہ پہلے سے بنا رکھا تھا۔ اینڈریوز، پیئرسن اور آرٹسٹ مُوکل ڈے ان کے ہم سفر تھے۔ وہاں ان کا حیرت انگیز استقبال کیا گیا، اور اینڈریوز نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ وہ ان ہزارہا رپورٹروں اور لوگوں سے جو شاعر کے گرد و پیش جمع ہو جاتے تھے، شاعر کی حفاظت کریں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہم اس کا ظریفانہ پہلو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بھائی کو بلا تفریح سمجھ رہے ہیں۔ ویلی اور ان کے رفیق مُوکل دونوں نئی چیزوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور اپنا تمام وقت اس میں صرف کرتے ہیں۔ میں ان سب باتوں کی طرف اس طرح سے دھیان نہیں دے سکتا جس طرح سے وہ دے سکتے ہیں اس لئے کہ میں اندرونی مسائل اور خیالات میں ضرورت سے زیادہ مصروف ہوں۔"[۱] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جن مسائل نے ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر رکھا تھا وہ جاپان کی قومی زندگی سے متعلق تھے۔ مثلاً یہ کہ قدیم تخیل کو بھونڈی تجارت پرستی کی بدولت کہاں تک خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہ عفت و پاکیزگی، سادگی اور سچائی کا بہادرانہ سمورائی تخیل کس حد تک جنگ کی بت پرستی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ ٹیگور کی سیاحت کے دو واقعات نے اُن پر اپنا بہت گہرا اثر ڈالا۔ ٹیگور سے کہا گیا تھا کہ وہ اُن دو ہر دلعزیز بہادروں کی یاد میں جنہوں نے کسی نجی جھگڑے کے سلسلہ میں لڑتے لڑتے جان دیدی تھی، ایک شعر لکھکر دیں۔ انہوں نے خاموشی اور دکھ کے ساتھ یہ درخواست سنی، اور کچھ دیر بعد خاموشی کے ساتھ انہوں نے یہ دو مصرعے لکھکر دیدئے جو ایک لحاظ سے ان کی درخواست کا جواب تھے:

" انہوں نے نفرت میں ایک دوسرے کو قتل کر دیا اور لوگوں نے
اُن کے اِس فعل کی تعریف کی،
لیکن خدا نے شرم سے اس واقعہ کی یاد کو سبز گھاس اُگا کر جلدی
سے چھپا دیا۔"

تنگ نظر قومیت کے بارے میں ٹیگور کی بے لاگ تنقید کی وجہ سے لوگوں نے انہیں طعنہ دیا کہ وہ تو " ایک شکست خوردہ قوم کے شاعر" ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے وہ خوبصورت گیت لکھا جس کا عنوان ہے " شکست خوردہ کا گیت"[1] ان کی حسّاس انسانیت کو اس جارحانہ جنگجوئی سے جو صدمہ پہنچا، اس کی یاد نے اینڈریوز کے مابعد کے تمام کاموں پر جو انہوں نے ہندوستانی قوم پرستوں کے ملئے انجام دئے، اپنی رنگ آمیزی کر دی۔

سیاحتِ جاپان نے اینڈریوز کے تخیل پر ایک اور مستقل اثر چھوڑا۔ بہ حیثیت ایک زندہ مذہبی قوت کے بدھ مت کے ساتھ یہ ان کا پہلا تعارف تھا۔ جاپان

---

[1] مکتوب بنام گوگوِیندرا ناتھ ٹیگور۔

کے بدھ مت کی روایات نے ان کے تخیل میں جان ڈال دی اور انہوں نے ماضی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کے مسرور ترین لمحات میں سے ایک لمحہ وہ تھا جب ایک چھوٹے سے لب راہ اسٹیشن پر گاڑی رُکی تاکہ شاعر بدھ مت کے بھکشوؤں کی جماعت کا سلام قبول کریں۔ ان کے ذہن میں اُن بہادر بدھ مبلّغین کی تصویر کھنچ گئی جو بنگال سے جاپان تقریباً اسی راستہ سے پہنچے تھے جس راستہ سے وہ خود گئے تھے۔ جون میں پیئرسن ٹیگور کی معیت میں ریاستہائے متحدہ گئے، لیکن اینڈریوز اور مُوکل ڈے واپس ہندوستان آ گئے اور واپسی میں وہ ایک ہفتہ کے لئے جاوا میں رک گئے تاکہ بورو بدور کے مقام پر بدھ مذہب کے ماننے والوں کی تہذیب و شائستگی کے عظیم الشان آثار کا مشاہدہ کریں۔ ان دنوں چاند پورا تھا اور اینڈریوز کئی راتوں تک عظیم الشان گیلریوں میں تن تنہا پھرتے رہے جہاں وہ ہر کونہ پر بدھ کے خاموش حجری مجسمہ سے دو چار ہوتے تھے۔ رات کی خاموش گھڑیوں میں ان کے دل میں ایشیائی تاریخ کی اس عظیم المرتبت شخصیت کی اہمیت کے متعلق ایک نئی بصیرت پیدا ہوئی:

"اس وقت میرے دل میں انسانیت کا ایک نیا جلوہ اس کے دکھ اور رنج، اس کی قربانی، اس کی خدمت اور اس کی محبت میں نظر آیا جو خود بدھ کی اعلیٰ شخصیت سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ .... اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا مہاتما بدھ بنی نوع انسان کے ادنیٰ ترین طبقوں کے سامنے وعظ کہہ رہے ہیں ـــ نہیں بلکہ جس طرح سے مقدس فرانسس پرندوں اور جانوروں اور درختوں اور پھولوں کے سامنے وعظ کہتے تھے، اسی طرح وہ بھی ان سب کو محبت کا ہمہ گیر پیغام سنا رہے ہیں۔"

اس تجربہ سے ان کی زندگی کے دھارے میں کوئی ظاہرا ڈرامائی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، بلکہ اس نے جنوبی افریقہ اور شانتی نکیتن کے تجربوں پر مزید مہر توثیق ثبت کر دی جن کی بدولت بنی نوع انسان کی مذہبی کاوشوں کے متعلق

ان کا نقطۂ نظر اس قدر گہرے طور پر متاثر ہوا تھا۔ یورپین زاویۂ نگاہ بہرحال اب قطعی طور پر پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

(۲)

ہندوستان میں اینڈریوز کی واپسی کی وجہ کچھ تو ان کی خرابیٔ صحت تھی اور کچھ یہ کہ فجی سے پریشان کن اطلاعات آ رہی تھیں۔ یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ وزیرِ ہند کے دفتر اور دفترِ نوآبادیات میں سمجھوتہ ہو گیا ہے کہ پابندِ معاہدہ مزدوروں کی بھرتی کو مزید پانچ سال کے لئے جاری رکھا جائے۔ وائسرائے کی حیثیت سے لارڈ ہارڈنگ کی میعادِ عہدہ ختم ہو گئی تھی اور ان کی بجائے لارڈ چیمسفورڈ آ گئے تھے۔ اینڈریوز نے اطلاع حاصل کرنے کے لئے انہیں لکھا اور دریافت کیا کہ اس افواہ میں کہاں تک صداقت ہے لیکن ۱۹۱۶ کے آخر تک انہیں کوئی اطمینان بخش جواب موصول نہیں ہوا۔ اس لئے مجبوراً انہوں نے اخبارات کے ذریعہ حکومت کو چیلنج دیا اور جب دفترِ نوآبادیات کے ساتھ سمجھوتہ کی تصدیق ہو گئی تو سارے ملک میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اور اینڈریوز شانتی نکیتن سے روانہ ہو گئے تاکہ بھرتی کی فوری روک تھام کے لئے سارے ملک میں جو مہم جاری کی گئی تھی اس میں حصہ لیں۔

اس تحریک کے لیڈر بلاچون و چرا گاندھی قرار پائے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ "اگر اس نظام کو ۳۱ مئی تک ختم نہ کیا گیا تو ہم قلیوں کے جہازوں پر پہرہ دینگے" انہوں نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا، پولک نے جو پابندِ معاہدہ مزدوری کی خرابیوں کو پبلک کے سامنے لانے کے سلسلہ میں بہت کچھ کام کر چکے تھے، ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لکچر دئے۔ خود اینڈریوز نے بھی اپنی جسمانی قوت برداشت سے بے پروا ہو کر مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ الہ آباد میں پھر اُن پر ہیضہ کا شدید حملہ ہو گیا جس کا ۱۹۱۵ کے بعد سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا

مگر کمزوری اور درد کے باوجود انہوں نے سپرو کے مکان سے لیٹے لیٹے خطوط اور اپیلیں لکھوائیں۔ جونہی پُرخلوص تیمار داری کی بدولت وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گئے وہ پھر مدراس ۔ پونا ۔ بمبئی ۔ اور دہلی کے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں اُن پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ "دوران جنگ میں نفرت کی آگ بھڑکاتے پھرتے ہیں "

ان کے پاس اس الزام کا جواب تیار تھا۔ انہوں نے اسی بدنام کنندہ مراسلہ نمبر ۱۴ کا حوالہ دیا جسے ان کی کوششوں کی بدولت حکومتِ ہند کی سرکاری رائے کے طور پر اختیار کر لیا گیا تھا اور جو صرف چند ماہ پیشتر شایع بھی ہو گیا تھا انہوں نے بتایا کہ "حکومتِ ہند یہ نہیں کر سکتی کہ ایک طرف اس مراسلہ کو لکھے اور دوسری طرف ہندوستانی عورتوں کو مزید پانچ سال کے لئے ایسی زندگی بسر کرنے کے لئے بھیجنے پر رضا مند ہو جائے۔" ان کی تقریروں کا بنیادی خیال اپنی عورتوں کی عزت کا سوال تھا جس کے لئے انہوں نے مردوں سے زیادہ عورتوں سے اپیل کی۔ پبلک پالیسی کے سوال پر عورتوں کی رائے کو متحد کرنے کی کوشش نئی سی چیز تھی مگر اس میں خلافِ توقع بیحد کامیابی ہوئی۔ ہندوستانی عورتوں سے جو اپیل اینڈریوز نے ان کی بہنوں مقیم فجی کی طرف سے کی تھی وہ متعدد ہندوستانی زبانوں میں شایع کی گئی اور الہ آباد کے عظیم الشان سالانہ میلہ (ماگھ میلہ) میں لاکھوں کی تعداد میں تقسیم بھی کی گئی۔ چند ہی دنوں میں سارے صوبجاتِ متحدہ میں اسی کا چرچا تھا۔ ہندوستانی خواتین کے ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کی۔ لارڈ چیمسفورڈ نے اس کی معروضات کو توجہ سے سنا۔ انہوں نے گاندھی سے بھی ملاقات کی۔ ۱۲ اپریل کو انہوں نے اعلان کر دیا کہ "ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت خاص جنگی کارروائی کی حیثیت سے ہر قسم کی بھرتی بند کی جاتی ہے۔"

مگر اس کا امکان تھا کہ کہیں جنگ ختم ہوتے ہی اس مسئلہ کو کہیں دوبارہ

نہ چھیڑ دیا جائے۔اس لئے اینڈریوز فجی واپس گئے تاکہ مسئلہ کے ہر پہلو کا تفصیلی طور پر مطالعہ کریں اور اپنے ساتھ دلی پیئرسن جیسے ہنس مکھ رفیق کو لیجانے کی بجائے وہ ٹیگور کے شادان اور جانبازانہ نغموں کی کتاب "سائیکل آف اسپرنگ" (موسم بہار کا چکّر) لے گئے جو نئی نئی شایع ہوئی تھی۔۲۵ مئی کو جبکہ وہ آسٹریلیا میں اپنی ماں کی سالگرہ منارہے تھے، انگلستان سے یہ دل خوش کن خبر موصول ہوگئی کہ مسٹر چیمبرلین نے دار العوام میں اعلان کردیا ہے کہ پابندِ معاہدہ مزدوری کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا۔

اس مبارک حسنِ اتفاق کے باوجود فجی کے حالات پہلے کے مقابلہ میں بہت خراب ہو گئے۔ جنگ کے اثرات محسوس کئے جارہے تھے۔زندگی کے مصارف بیحد بڑھ گئے تھے اور پابندِ معاہدہ مزدور فاقہ کشی کررہے تھے۔ایک شخص نے جس پر خودکشی کے اقدام کے سلسلہ میں مقدمہ چل رہا تھا، اقرار کیا کہ اس کے لئے یہ امر ناقابل برداشت ہوگیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو روٹی کے لئے تڑپتا ہوا دیکھے۔ جو مزدور اپنے معاہدہ کے اختتام پر ہندوستان واپس جانا چاہتے تھے، ان کے لئے سفرِ واپسی کا انتظام کرنے کی ذمہ داری کو یہ کہکر ٹالدیا جاتا تھا کہ "جہاز نہیں ملتے" حالانکہ شووا کے ہندوستانی لیڈر برابر یہ شکایت کرتے رہتے تھے کہ "شکر کی بوریاں بھیجنے کے لئے تمہارے پاس کافی جہاز ہیں۔" ایک مزدور جس کی چھوٹی بچی ہندوستان میں رہ گئی تھی، ایک جگہ سے دوسری جگہ اینڈریوز کے پیچھے پیچھے جاتا تھا ایک ہی ناقابلِ جواب سوال پوچھنے کے لئے کہ اسے جہاز کب ملے گا؟ اینڈریوز کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور انہوں نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے اُسے صبر کی تلقین کی اگرچہ ان کا دل غصہ سے بھرا ہوا تھا۔

اس انسانی مصیبت سے دوچار ہونے کے بعد انہوں نے اپنے سامنے تین مقاصد رکھے۔اول یہ کہ پابند معاہدہ مزدوروں کی اجرت میں اضافہ ہو۔ مسلسل جد و جہد کے بعد انہوں نے اگست ۱۹۱۷ سے روزانہ اجرت میں ۲۵ فیصدی

یعنی ۳ آنے یومیہ کا اضافہ منظور کرا لیا۔ گو مصارف کے مقابلہ میں یہ اضافہ بہت ہی کم تھا، لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ان کا دوسرا مقصد اس شادی شدہ بیوی کی حفاظت کرنا تھا جس کی میعادِ معاہدہ اس کے شوہر کی میعاد کے بعد ختم ہوتی تھی۔ انہوں نے شمالی علاقہ کے پلانٹروں کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ شوہر کی میعاد ختم ہوتے ہی اس کی بیوی کی میعادِ ملازمت کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔ اس تجویز کو گورنر کی کمیٹی نے مسترد کر دیا جو پلانٹروں حکومت کے افسروں اور فجی کی لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں کی نمائندہ تھی۔ کمیٹی نے اس تجویز کے مقابلہ میں یہ تجویز پیش کی کہ خاوند اور بیوی دونوں عورت کی میعاد کی باقی ماندہ مدت کو مشترکہ طور پر مکمل کر کے پورا کریں۔ اس تجویز پر اینڈریوز کا تبصرہ یہ تھا:۔

"اس کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کی انتہائی خطرہ کی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے اور مالک کو اس طرح سے فائدہ پہنچایا جائے کہ وہ عورت سے کام لینے کی بجائے مرد سے کام لے۔ بعض پبلک افعال ایسے ہوتے ہیں جن سے کسی چھوٹی سی جماعت کی رائے عامہ کی سطح کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے اور یہ بھی ایسے ہی افعال میں سے ایک ہے[1]

تیسرا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ تمام باقی ماندہ معاہدوں کو پہلی جنوری ۱۹۲۰ تک منسوخ قرار دیدیا جائے۔ اسے بھی شمالی علاقہ کے پلانٹروں نے منظور کر لیا، مگر گورنر کی کمیٹی نے یہ کہکر نامنظور کر دیا کہ "آزاد ترکِ وطن کی نئی اسکیم پہلے عمل میں آجائے۔

اس کے باوجود اینڈریوز مایوس نہیں ہوئے۔ گورنر کی کمیٹی سے بھی اونچی ایک عدالتِ مرافعہ تھی اور ہر متعلقہ "بلو بک" کے گہرے مطالعہ اور اعداد

---

[1] ماڈرن ریویو، ستمبر ۱۹۱۸

نے انہیں ایسی تصدیقی شہادت بہم پہنچادی تھی جو انتہائی تحقیق ثابت ہوئی۔ جب وہ مارچ ۱۹۱۸ کے شروع میں ہندوستان واپس آئے تو وزیرِ ہند مسٹر مانٹیگو وائسرائے کے ساتھ دہلی میں ملے۔ اینڈریوز نے ان کے سامنے حکومتِ فجی کی شایع کردہ سرکاری طبّی رپورٹ رکھدی۔ اس میں یہ بدنام کنندہ اقرار موجود تھا کہ جب ایک پابند معاہدہ ہندوستانی عورت کو تین پابندِ معاہدہ مردوں کی نیز متعدد بیرونی اشخاص کی خدمت کرنی پڑتی ہے تو ایسی صورت میں آتشک اور سوزاک کے متعلق نتیجہ کے بارے میں شک وشبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

مانٹیگو نے کہا: "اس چیز نے مسئلہ کا فیصلہ کردیا ہے۔ اب آپ جو کچھ چاہتے ہیں، اسے طلب کریجئے۔"

یکم جنوری ۱۹۲۰ کو آخری پابندِ معاہدہ مزدور کو آزادی مل گئی۔

(۳)

بہت سے اشخاص اس قسم کی کامیابی سے مطمئن ہو سکتے تھے۔ لیکن اینڈریوز ایسے شخص نہ تھے۔ ۱۹۱۷ میں وہ فجی میں چار مہینے تک رہے جہاں انہوں نے اپنے وقت کا زیادہ حصّہ اس کوشش میں گزارا کہ ہندوستانیوں کے لئے آزاد اور صحت بخش زندگی کا ماحول پیدا کریں۔ انہوں نے ایک ایسے ملک میں جو خوش قسمتی سے رنگ کے تعصّبات سے پاک تھا، ہر ایسی صورتِ حالات کا مطالعہ کیا جس میں انہیں نسلی امتیاز کا ذرا سا بھی شائبہ نظر آیا۔ ان میں سے ایک قبائلی اراضی کے کرایہ دار کی حیثیت سے ہندوستانی کی پوزیشن تھی، اور دوسری، سفید "سرمایہ داروں" کے خلاف ہندوستانی "مزدوروں" کی شکایات۔ انہوں نے صحت اور تعلیم کے لئے عملی منصوبے تیار کئے، مثلاً انہوں نے شادی کی عمر بڑھانے اور برباد شدہ خانگی زندگی کی بحالی کے لئے

انتھک کوششیں کیں۔ انہوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندوستانی آباد ہو گئے تھے طویل دورے کئے اور اس دوران میں کبھی کسی دوستانہ جذبات رکھنے والے پلانٹروں کے یہاں سوتے اور کبھی ہندوستانی گھروں میں۔ ایک پلانٹر جس نے انہیں "گھر اور سونے کے لئے بستر" کی پیشکش کی تھی، ایک شام کو دیر سے گھر پہنچا اور وہاں پہنچنے پر اس نے اینڈریوز کو اپنے گھر میں بستر پر سوتا ہوا پایا، اور اس کا ہندوستانی باورچی انتہائی خوش تھا کہ اسے بالآخر موقع ملا کہ وہ اینڈریوز کی خدمت کرے۔ جب دوسرے دن میزبان تجرِدم اٹھا تو اس نے دیکھا کہ مہمان پانچ میل دور ایک پہاڑی پر مصروفِ عبادت ہے۔ پلانٹر کی پھر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی اس لئے کہ وہ دوسری چھوٹی ہندوستانی نوآبادی میں چلے گئے تھے تاکہ وہاں کے رہنے والوں کو سیکڑوں مرتبہ ہدایت کرنے کے بعد ایک بار پھر صفائی، تعلیم اور تیمارداری کی تلقین کریں۔

حکومتِ نوآبادیات کے ساتھ گفت وشنید کرتے وقت اینڈریوز نے تاریخی واقعات پر اپنے غیر معمولی عبور کا ثبوت کچھ اس طرح سے دیا کہ وہ حیران رہ گئی۔ لارڈ سیلسبری نے ۱۸۷۶ میں جب پہلی مرتبہ پابندِ معاہدہ مزدوروں کی بھرتی ہوئی تھی، یہ اعلان کیا تھا: "سب سے بڑھکر ہمیں اعتماد کے ساتھ مجوزہ انتظامات کی ایک لازمی شرط کے طور پر یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ نوآبادیات کے قوانین اور ان کا نظم ونسق ایسا ہوگا جس کی وجہ سے وہ تمام ہندوستانی آبادکار اپنی مدتِ ملازمت ختم کرنے کے بعد جملہ امور میں آزاد انسان متصور ہونگے۔ اور ان کے حقوق ہر حیثیت کی دوسری مقیم نوآبادیات رعایا کے حقوق سے کسی نوع کم نہ ہونگے۔" اینڈریوز نے فجی کے عمّالِ حکومت کی توجہ اُس وعدہ کے عملی پہلو کی طرف مبذول کرائی نہ صرف سیاسی حقِ رائے کے معاملہ میں بلکہ تعلیم اور صحت کے امور میں بھی۔

آہستہ آہستہ ترقی ہوتی گئی۔ تھکا دینے والی خط وکتابت کے بعد بالآخر محکمۂ تعلیم نے یہ اصول قبول کر لیا کہ جو دیہاتی اسکول ہندی میں چل رہے ہیں

انہیں بھی سرکاری گرانٹ دیجائے اور ایک روشن خیال پلانٹر مسٹر آر ۔ اے ۔ بارکلے نے مجلس واضعانِ قوانین سے مزدوری قانون بھی منظور کرالیا ۔ اساتذہ مہیا کر لئے گئے اور کچھ مدارس فی الواقع جاری بھی کر دیئے گئے ۔ چھوٹی شکرساز کمپنیوں نے بھی وعدہ کرلیا کہ اپنے اضلاع کے ہسپتالوں میں کام کرنے کے لئے وہ عورتوں کو میٹرن کے طور پر ملازم رکھ لیں گی بشرطیکہ سند یافتہ عورتیں دستیاب ہوگئیں ۔ یہ کام بڑا مشکل تھا جس میں انہیں تنِ تنہا لڑنا پڑا جو سرکاری عمّال کی سرد مہری اور مالدار کمپنی کی مخالفت کی وجہ سے اور بھی زیادہ مشکل ہوگیا ۔ اینڈریوز نے ان کے منافع کی رقوم پر اعتراض کیا ۔ کمپنی کی رپورٹ بابت ۱۸-۱۹۱۷ میں اینڈریوز پر یہ الزام لگایا گیا کہ " وہ بغاوت کے مشہور و معروف لیڈروں کے ساتھ ساز باز رکھتے ہیں جن کا مقصد سلطنتِ برطانیہ کا تختہ الٹ دینا ہے " ہندوستانیوں میں بھی ایک کٹر آریا سماجی مشنری تھا جس کے ساتھ انہوں نے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کی تھی مگر اس نے بھی ان پر " دوغلے پن " کا الزام لگایا جس سے انہیں سخت روحانی کوفت ہوئی ۔ مگر روح و تن کی خستگی کے باوجود وہ اپنا کام کرتے رہے ، اور اگر کبھی کبھار انہوں نے تحقیق کئے بغیر ظلم اور زیادتی کی داستانوں کا یقین کرلیا یا ایسی تلخی سے بات چیت کی جو نیک دل پلانٹروں کو جو محض ناواقفیت کی بنا پر غلطی کر بیٹھتے تھے ، نامناسب معلوم ہوتی تھی تو اس کی وجہ محض محبت بھری فطرت کی کوتاہیاں تھیں جس پر نا قابلِ برداشت بوجھ پڑا ہوا تھا ۔ فجی کے ہندوستانی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں انہیں " دین بندھو " (غریبوں کا دوست) کے خطاب سے نوازا تھا ۔

جب اینڈریوز کا جہاز ساحلِ سووا سے ہٹا اور انہوں نے فاقہ زدہ اور وطن کی لگن میں افسردہ لوگوں کو گھاٹ پر کھڑے دیکھا جو چلّا چلّا کر یہ کہہ رہے تھے ، " ہمارے لئے جہاز بھیجئے ، ہمیں ہندوستان واپس جانے کی اجازت دیجئے " ، تو انہیں دانتے کا لافانی مصرع یاد آگیا جس سے ایسی ہی شدید خواہش کا اظہار ہوتا ہے :

"اور ساحلِ بعید کے لئے مضطرب تمناؤں کے ساتھ اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے"
فجی کے زمانۂ قیام میں انہوں نے فجی کے عیسائیوں سے بہت قریبی تعلقات رکھے۔ آسٹریلیا پہنچنے پر انہوں نے کلیساؤں کو اس خوفناک خطرہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ کہیں قلیوں کے غلیظ مکانات کی ہوائیں فجی کی آبادی کو بھی مسموم نہ کردیں۔ انہوں نے آسٹریلیا کے عیسائیوں کو مسیح کے قدرے سخت الفاظ یاد دلائے جو ایسے لوگوں کے لئے استعمال کئے گئے تھے "جو چھوٹے بچوں کو دکھ دیتے ہیں"۔ انہوں نے مطالبہ کیا:

"خدا کرے کہ عیسائی آسٹریلیا میں جہاں ملک کی مالدار ترین کمپنی اسی پابندِ معاہدہ مزدوری کی بدولت (جس کے نتائج اس قدر بھیانک نکلے ہیں) مالدار اور خوشحال ہوگئی ہے، ایسی کوئی بات نہ ہونے پائے جس کے لئے اُسے بعد کو پچھتانا پڑے!"[1]

انہوں نے آسٹریلیا کی عورتوں کو بتایا کہ کس طرح سے روپے کی خاطر عورتوں کی تذلیل روا رکھی جاتی ہے۔ کمپنی نے اپنی ساری دولت اور اثر سے ان کا مقابلہ کیا۔

اینڈریوز وسیع برِ اعظم میں سے منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے جانبِ غرب روانہ ہوگئے۔ ان کی صحت پہلے ہی سے خراب تھی اور اب انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ جو ذمہ داری انہوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا رکھی ہے، اس کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا ہے۔ اور جب آخرکار وہ فری مینٹل پہنچے تو ان کے دل کو رہ رہ کر ہندوستان کی یاد تڑپانے لگی۔ قریب تھا کہ وہ جہاز پر سوار ہوجائیں کہ اتنے میں ضمیر کی آواز نے انہیں پھر آسٹریلیا میں رُکے رہنے پر مجبور کردیا۔ انہوں نے دوسری مرتبہ تمام ملک کا دورہ کیا اور اس دفعہ ان کی محنتوں کا معاوضہ انہیں مل گیا۔ ہندوستان کا تجربہ رکھنے والی دو خواتین نے ہندوستانی عورتوں میں کام کرنے کے لئے رضاکارانہ

---

[1] تقریر جو آسٹریلیا کے عیسائی طلبا کے روبرو مئی ۱۹۱۸ء میں کی گئی۔

خدمات پیش کردیں۔ایک سند یافتہ نرس نے بھی اپنی خدمات پیش کیں اور وہ ملبورن ٹرسٹ کے ڈسٹرکٹ ہاسپٹل میں مقرر کردی گئی۔ آسٹریلیا کی انجمنِ خواتین نے فجی میں بطور خود تحقیقات کرنے کا ارادہ کیا — اس تحقیقاتی رپورٹ نے ہر معاملہ میں ان کی تصدیق کی۔ عورتوں نے دوسرے کام بھی سکھے — انہوں نے ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرکے ان کی حمایتوں اور رومالوں کی کمی کو بھی پورا کردیا۔ لیکن وہ اپنے کام میں اس قدر منہمک تھے کہ انہوں نے اس فرق کو کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔

(۴)

۱۹۲۰ کے بعد سے فجی کی ہندوستانی زندگی میں جو حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا، اس کے متعدد اسباب تھے۔ اینڈریوز نے اس سلسلہ میں جو کام کیا اس کی عظمت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انہوں نے ایک ایسے نظام کو جس نے ساری ترقی کو ناممکن بنادیا تھا، نہ صرف منسوخ کرادیا بلکہ اُن صریحی شرائط کا بھی مطالعہ کیا جو قوم کی ترقی کے لئے ضروری تھیں اور انہوں نے ابتدا ہی سے ان کے حصول کی انتہائی کوشش کی۔ اپنے دل و دماغ کی جن صفات کے ذریعہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے انہیں مختصر طور پر ان کی وفات کے بعد ٹی۔ جی۔ اسپئیر نے خراجِ عقیدت کی صورت میں یوں پیش کیا ہے:

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جذبات سے مغلوب ہوجانے والا یہ شریف شخص سخت مزاج ماہرینِ صنعت اور مادیت پرست حکام کے ساتھ معاملہ فہمی نہ کرسکے گا، لیکن جب وہ آپس میں ملے تو یہ کھدر پوش پیغامبر ہی دنیاداروں پر سبقت لیجانے کے قابل سمجھا گیا۔ ان کی فہم و فراست میں ان کے کیمبرج کے ایام کی سی ذہانت تھی، ان کی یادداشت واقعات کا خزانہ تھی اور انہوں نے ان دونوں چیزوں میں اپنے ہمہ گیر اخلاقی اصولوں

کے شدید احساس کو بھی شامل کر دیا۔ یعنی فاختہ کی معصومیت میں انہوں نے سانپ کی دانشمندی کو آمیز کر دیا تھا اور اس غیر متوقع امتزاج کی وجہ سے بسا اوقات حیرت انگیز نتائج پیدا ہوئے تھے۔"

ان صفات میں ہم ایک اور تیسری صفت کا اضافہ کرتے ہیں — غریب اور گمنام اشخاص سے لامحدود و فیاضانہ دوستی اور یہی وہ صفت ہے جس نے انہیں بیشمار آدمیوں کی نظر میں اس قدر عزیز بنا دیا تھا۔ یہ کام اینڈریوز ہی کا تھا کہ وہ اس وقت نیوزیلینڈ کا سفر اختیار کریں جبکہ وہ اپنی بہن کے یہاں آرام کر رہے تھے تاکہ گجراتی لکڑہاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو اپنی رفاقت سے چند گھنٹے کے لئے مسرور کر سکیں۔ یہ اینڈریوز ہی کا کام تھا کہ انہوں نے فجی میں اپنے قیام کی آخری صبح ایک ایسے قاتل کے لئے جسے موت کی سزا دی جا چکی تھی، رحم کی درخواست دینے میں گزاری محض اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کے ساتھ ظلم کیا گیا ہے۔[1]
ایک ممتاز سول سرونٹ[2] نے جو اینڈریوز سے کیمبرج کے زمانہ سے واقف تھے، ایک گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ "پابندِ معاہدہ مزدوری کے نظام کی منسوخی ہی سب سے بڑی واحد خدمت ہے جو انہوں نے ہندوستانی باشندوں کے لئے انجام دی۔"

عبارتِ مزید

ہندوستان میں پابندِ معاہدہ مزدوری کا وجود نہ تھا لیکن جو لوگ حالات سے مجبور ہو کر دیہات سے بڑے شہروں کی ملوں میں کام کرنے کے لئے جاتے تھے

---

[1] انہیں نیوزیلینڈ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی رحم کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔
[2] سرجافرے ڈی مانٹ مورنسی جو دہلی میں نائب چیف کمشنر تھے اور پھر کچھ عرصہ بعد پنجاب کے لفٹننٹ گورنر بن گئے تھے۔ ان کا شمار شریف انگریزوں میں ہوتا تھا۔ مترجم۔

اکثر اوقات انہیں اسی قسم کے خراب مکانوں میں سکونت اختیار کرنی پڑتی تھی، اسی طرح انہیں اپنے صحت بخش گھریلو زندگی سے الگ تھلگ رہنا پڑتا تھا، اسی طرح ان سے ضرورت سے زیادہ محنت لی جاتی تھی جس طرح فجی کے شکر سازی کے کارخانوں میں اور نیشکر کے کھیتوں میں۔اگرچہ وہ فاصلہ اور سمندر کے حائلِ راہ ہونے کے سبب اپنی گھریلو زندگی سے اس مایوسانہ طریقہ سے الگ تھلگ رکھے جاتے تھے تاہم بسا اوقات وہ اپنے کام اور دوسرے حالات میں پابندِ معاہدہ مزدوروں سے بدتر زندگی گزارتے تھے۔ وہ نیشکر کے کھیتوں کو کارخانہ کی دم گھونٹنے والی گرمی اور گندگی پر ترجیح دیتے تھے اور ہندوستانی گندے اور تاریک مکانوں کے ماحول کے مقابلہ میں وہ ذلیل اور رسوا کن "قلی لائنز" کو زیادہ صاف اور زیادہ اچھا پاتے تھے۔اس پر بھی اینڈریوز کے دوستوں تبصرہ کیا کرتے تھے:۔
"ہمیں جنوبی افریقہ یا فجی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔اسی قسم کی خرابیاں خود ہمارے صنعتی شہروں میں بھی موجود ہیں"

۱۹۱۸ کے آخر میں اینڈریوز کو موقع ملا کہ اُس بیان کی صداقت کو جانچیں۔ فجی اکیلا ملک نہ تھا جہاں جنگ کی وجہ سے مصارفِ زندگی میں اضافہ ہوا ہو، بلکہ ہندوستان کے صنعتی کارخانوں کے مزدوروں نے بھی مزدوری میں اضافہ کرانے کے لئے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کردیا تھا۔گاندھی احمد آباد میں ایسی جنگ کی رہنمائی کر چکے تھے اور اسی سال کے آخر میں نئی قائم شدہ مدراس لیبر یونین کا بکنگھم اور کرناٹک ملوں کے منتظمین کے ساتھ تنازعہ ہوگیا۔موخرالذکر نے ملیں بند کردیں اور یونین کی نمائندہ حیثیت تسلیم کرنے یا اس کے ساتھ نام و پیام کرنے سے انکار کردیا۔یہی متنازعہ فیہ مسئلہ تھا جس کے سلسلہ میں یونین کے ایک آرگنائزر مسٹر بی۔پی۔واڈیا نے اینڈریوز کو مدراس آنے اور ان کی امداد کرنے کے لئے طلب کیا۔

اینڈریوز لیبر یونین کے ہیڈ کوارٹرز میں رہتے تھے جس کے چاروں

طرف مزدوروں کے اپنے مکانات تھے۔ ان کی مداخلت سے اتنا ہوا کہ ملیں کھل گئیں اور منتظمین نے یونین کو تسلیم کرنے کا بھی وعدہ کر لیا۔ تنازعہ ختم ہو جانے کے بعد اینڈریوز وہاں ٹھہرے رہے تاکہ ملوں کے طریقۂ کار کا مطالعہ کریں۔ اگرچہ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے وہ ملک کی بہترین ملیں تھیں تاہم بعض امور میں وہاں کے حالات فجی جیسے تھے۔ باعزت مزدور پانچ چھ میل دور دیہات میں رہتے تھے اور وہ روزانہ اپنے گھروں سے ملوں کو آتے تھے حالانکہ انہیں اس زمانہ کے رواج کے مطابق بارہ گھنٹہ کام کرنا پڑتا تھا "اس لئے کہ وہ ملوں کے قریب رہنے والے لوگوں کی عادات کو ناپسند کرتے تھے"۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ "قلیوں کے مکانات" میں مردوں اور عورتوں کا تناسب تین اور ایک کا تھا۔ شراب نوشی اور بدکاری زوروں پر تھی اور مزدور "مل کے دستور" کا ذکر بالکل اسی طرح سے کرتے تھے جس طرح سے فجی میں "فجی کے دستور" کا ذکر کیا جاتا تھا۔

ایک سمجھدار مزدور نے اینڈریوز سے کہا: "ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک طاقتور اور قابلِ اعتماد لیبر یونین ہے۔" اینڈریوز جانتے تھے کہ جب تک ملوں کے افسر راشی اور بدکار رہیں گے اس وقت تک اعتماد کی فضا بے لوث سوشل کارکنوں کے ذریعہ ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ اس قومی تعمیری کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔ پابند معاہدہ مزدوروں کے لئے جو کام انہوں نے انجام دیا بعد میں اس کا ایک براہِ راست نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے ہندوستان کے صنعتی مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کام کیا۔

باب ۹

جنگ کا تتمہ

امرتسر

۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء تک — عمر ۴۷ - ۴۸

(۱)

اگست ۱۹۱۴ء میں جب جنگ چھڑی تو اس وقت انگلستان کو ہندوستان کی پوری حمایت حاصل تھی، اور کامل وثوق کے ساتھ اس امر کی توقع کی جاتی تھی۔ کہ جب جنگ ختم ہو جائے گی تو اس وقت ہندوستانی ایک بڑی سلطنت کے آزاد اور مساوی شہری بن جائیں گے۔ لیکن آیندہ دو سالوں کے اندر ابتدائی خیر سگالی کے جذبات میں بہت کچھ کمی آگئی۔ مسلمانوں کو اس خیال سے ہیشہ دقت ہوئی کہ "ہمارے خلیفۃ المسلمین کی حکومت ہمارے ملک معظم کی حکومت سے برسرِ جنگ ہو" ذرا ذرا سے شبہات پر نظر بندیوں نے نظام سلطنت کو غیر ہر دلعزیز بنا دیا۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے حکومت خود اختیاری کے لئے ایک متفقہ اسکیم مرتب کی جو "لکھنؤ پیکٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۱۷ء کی ابتدا میں مسز بیسنٹ بی۔ پی واڈیا، اور جی ایس ایرنڈیل اس لئے نظر بند کر دئے گئے کہ وہ ہندوستان کے لئے فوری ہوم رول کا مطالبہ کر رہے تھے، اگرچہ ان کی نظر بندی کا زمانہ بہت طویل نہ تھا۔

۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے برطانوی پالیسی کے متعلق دار العوام میں اپنا ایک

تاریخی بیان دیا کہ "ہندوستان میں ذمہ دارانہ سلیف گورنمنٹ کا تاریخی حصول برطانوی سلطنت کا لازمی جزو ہے" آنے والے موسم سرما میں اس نے وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لئے ہندوستان کی سیاحت کی اور مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ جو سیاسی اصلاحات پر مشتمل تھی، ۱۲ جولائی ۱۹۱۸ء کو شایع کردی گئی۔

بدقسمتی سے راؤلیٹ کمیشن کی رپورٹ جو انقلاب انگیز دہشت پسندی کے اسباب اور تدارک سے متعلق تھی، اس کے فوراً بعد ہی شایع کردی گئی۔ کمیشن کی تجاویز میں انقلاب پسند مشتبہ اشخاص کے مقدمہ کے سلسلہ میں چند دفعات تھیں۔ اور شہادت کی اشاعت پر جو پابندیاں عائد کی گئیں اُن سے۔

"یہ مفہوم لیا گیا کہ اس شخص کو اس حق سے محروم کیا جارہا ہے۔ کہ اس پر کھلی عدالت میں ہم ملکیوں کے ذریعہ مقدمہ چلایا جائے ۔۔۔۔۔"

چونکہ یہ دونوں رپورٹیں ایک ساتھ پڑھی گئی تھیں اس لیے جن نتائج پر تعلیم یافتہ ہندوستانی پہنچے، ان کے متعلق ان پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔۔۔۔ انہیں پوری توقع تھی کہ ان کے مرتبہ میں مکمل تبدیلی عمل میں آجائے گی۔ لیکن انہوں نے دیکھا تو یہ دیکھا کہ حکومتِ ہند جبر و تعدی کرنے کے لئے نت نئے اختیارات حاصل کررہی ہے۔ اور مجوزہ اصلاحات میں غیر ہمدرد عمال اور مخالف پارلیمنٹ کے ذریعہ کتر بیونت کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔[1]

دوسرے امور نے جن میں خراب فصلیں اور بڑھی ہوئی قیمتیں قابلِ ذکر ہیں۔ عام بے چینی میں مزید اضافہ کردیا۔ اور ہندوستانی سپاہی جنہیں بہت جلد ملازمت سے سبکدوش کردیا گیا تھا، اور جو مواعید ان کے ساتھ کئے گئے تھے، انہیں پورا نہیں کیا گیا تھا، اپنے اپنے دیہات میں مایوس اور غیر مطمئن حالت میں واپس لوٹ گئے۔ لیکن اس وسیع ناراضگی کی تہ میں جو التوائے جنگ کے بعد رونما ہوئی یہ جذبہ کارفرما تھا کہ انگریز ایسی مستقل کوشش کررہے ہیں واگرچہ اس کا کھلم کھلا اظہار نہیں کیا گیا تھا) کہ جنگ سے قبل کے حالات پھر لوٹ آئیں۔

---

[1] دی رائز اینڈ فل فل منٹ آف برٹش رول اِن انڈیا مصنفہ ٹامسن و گیرٹ صفحہ ۶۰۲

دسمبر میں ۱۹۱۸ میں دہلی میں کانگریس کا جو اجلاس ہوا، اس نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے بتایا کہ "راؤلیٹ بلز" ہندوستانی باشندوں کے بنیادی حقوق میں مداخلت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مسودات قانون جنوری ۱۹۱۹ میں شایع کر دئے گئے اور مجلس قانون ساز نے مارچ کے تیسرے ہفتہ میں انہیں قانونی شکل بھی دیدی؛ اگرچہ ایک بھی غیر سرکاری ہندوستانی ممبر نے اس کی تائید نہیں کی تھی۔ ساتھ ہی گاندھی نے سول نافرمانی کے بارے میں "راؤلیٹ عہد" شایع کر دیا۔ جن اشخاص نے یہ عہد لیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ نئے قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہر اس ملکی قانون کو توڑیں گے۔ جس کا انتخاب رہنمائی کرنے والی کمیٹی کریگی۔ ۳۰ مارچ کو دہلی میں سوگ کا دن ہڑتال کی شکل میں منایا گیا۔ ہندو اور مسلمان متحد تھے۔ اور جامع مسجد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ہندو (سوامی شردھانند) کو بلایا گیا تا کہ وہ وہاں آکر مسلمانوں سے خطاب کرے۔

۶ اپریل کو اتوار کے دن سارے ہندوستان میں ہڑتال منائی گئی۔ اور گاندھی اور سروجنی نائیڈو نے بمبئی کی مساجد میں تقریریں کیں۔ اب تک یہ تمام مظاہرات پُر امن تھے، سوائے دہلی کے فساد کے جہاں پولیس نے گولیاں چلائی تھیں۔ لیکن آنے والے ہفتہ میں پنجاب میں ہر دلعزیز لیڈروں کی گرفتاری کی وجہ سے شدید اور وسیع ہنگامے برپا ہوئے، اور سرکاری عمارات میں آگ لگائی گئی، اور چند یورپین باشندوں کو قتل بھی کیا گیا۔ ۱۳ اپریل کو ہندوؤں کے سال کا پہلا دن تھا اور اس لئے اس دن عام تعطیل تھی۔ اسی دن امرتسر کے ایک احاطہ میں جو جلیانوالہ باغ کے نام سے مشہور ہے، عام جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا گیا اور وہاں بڑا مجمع جمع ہو گیا۔ اس مجمع پر جنرل ڈائر کے حکم سے گولیاں چلائی گئیں۔ جن سے بہت بڑی تعداد میں لوگ مقتول و مجروح ہوئے۔ دوسرے دن گوجرانوالہ میں شدید قسم کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ جس کی سزا یوں دی گئی کہ ہوائی جہازوں سے باشندوں پر بم برسائے گئے اور مشین گنیں استعمال کی گئیں۔ پنجاب کے وسیع علاقوں میں مارشل لا کا نفاذ کر دیا گیا۔ گاندھی نے اپنی تحریک واپس لے لی۔ انہوں نے کہا کہ یہ بہت "بڑی غلطی" تھی کہ لوگوں کو تیار کئے بغیر غیر متشددانہ بغاوت کے لئے ابھارا جائے؛ جس زمانہ میں "راؤلیٹ بلز" پر بحث ہو رہی تھی، اینڈریوز اور رابندرناتھ ٹیگور دونوں جنوبی ہندوستان

کے دورے پڑ گئے ہوئے تھے۔ اینڈریوز نے گاندھی کو لکھا کہ ان کے خیال میں ان قوانین کے خلاف صرف ستیہ گرہ ہی موثر ثابت ہوگی۔ لیکن اس معاملہ میں کسی کمیٹی کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے اخلاقی پہلو کے بارے میں انہیں شبہ تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے ان واقعات میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا، جب تک کہ شانتی نکیتن میں پنجاب کے ہنگاموں کی رپورٹیں نہ پہنچ گئیں۔ اس کے بعد سے ان کے لئے علیحدہ رہنا ناممکن ہوگیا۔ چنانچہ ۱۷ اپریل کو وہ دہلی پہنچے اس ارادہ سے کہ سیدھے پنجاب جائیں۔

سوشیل رُدرا، سوامی شردھانند اور دوسرے دوستوں نے ایک آواز ہو کر ان پر زور ڈالا کہ وہ دہلی میں ٹھہریں اور مارشل لا کی دھمکی کو عملی جامہ نہ پہننے دیں۔ یوروپین آبادی کے بڑے طبقوں پر ۱۹۰۷ کی سی بدحواسی چھائی ہوئی تھی۔ اور اینگلو انڈین اخبارات مقامی حکام کو انتہائی شدت کے ساتھ سختی کی پالیسی پر گامزن ہونے کے لئے اکسا رہے تھے اور سنسر ہر خبر کو اشتعال انگیز سمجھ کر دبا رہا تھا۔ اینڈریوز کے علم میں کم سے کم ایک ایسا واقعہ آگیا۔ جس سے انہیں معلوم ہوگیا کہ لوگوں کو کس طرح سے اشتعال دلایا جاتا ہے۔ دہلی شہر میں ایک شخص چاندنی چوک میں چلا چلا کر یہ کہتا ہوا جا رہا تھا۔ کہ سوامی شردھانند گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ حسن اتفاق سے سوامی جی کا بیٹا وہاں سے گذر رہا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ لوگ جوش میں بھرے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ تو اس نے چلا کر لوگوں سے کہا "یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میرے والد گھر میں آرام سے بیٹھے ہیں"۔ لیکن شرارت پھیلانے والا بھاگ نکلا اور غائب ہوگیا، اور اس طرح ایک بڑا ہنگامہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

کئی دن تک اینڈریوز رات گئے تک کام کرتے رہے۔ اور جہاں جہاں ہنگامے ہوئے وہاں کی ہڑتال کے متعلق تمام ممکن واقعات جمع کرتے رہے، اور ضلع کے کمشنر اور پولیس کے سب سے بڑے افسر کے ساتھ قریب ترین رابطہ قائم رکھا۔ بالآخر اعتماد بحال ہوگیا اور مارشل لا کا اعلان نہیں کیا گیا۔

اس اثنا میں دہلی میں اس قسم کی دہشتناک خبریں پہنچ رہی تھیں کہ امرتسر میں "امن قائم کرنے" کے لئے کیا کیا طریقے استعمال کئے گئے ہیں۔ وہاں لوگوں کو پبلک کے سامنے بید مارے گئے۔ ایک گلی میں جہاں ایک انگریز عورت پر حملہ کیا گیا تھا، تمام گزرنے والے ہندوستانیوں

کو "رینگنے" پر مجبور کیا گیا، حالانکہ اسی گلی کے رہنے والوں نے مجمع کے ہاتھ سے اس عورت کو بچایا تھا۔ اینڈریوز صرف اس امر کا اطمینان کرنے کے لئے رُکے رہے کہ ان کے گواہ سچ بول رہے ہیں۔ اور اس کے بعد اس حالت میں کہ مظلوم اور آبرو برباد اشخاص کے مندرجۂ ذیل الفاظ ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ شملہ گئے: "اپنی ملعون اصلاحات کو واپس لے لو! ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہم انہیں لینا بھی نہیں چاہتے۔ ہمیں اس کا جواب دیجئے کہ کیا ہمارے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤ کیا جائے گا؟" [1]

بڑی کوشش کے بعد انہیں سماعت کا موقع دیا گیا، اور یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ بید زنی بند کر دی جائے گی۔ عمالِ حکومت نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اپنا کام کر چکی ہے، اس نے حکومت کے "اخلاقی وقار" کو بحال کر دیا ہے۔ اینڈریوز نے اپنے غصہ کو بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ وہ محض رسمی صدائے احتجاج لے کر ساتھ نہیں لائے تھے۔ بلکہ صلح و آشتی کا ایک ٹھوس پروگرام مرتب کر کے لے گئے تھے جس میں انہوں نے زور دیا تھا کہ کسی صوبہ میں راؤلیٹ ایکٹوں کو نافذ کرنے سے پہلے وہاں کی مجالس قوانین کی رضامندی لے لی جائے مدراس ایکٹ پر غیر جانبدارانہ طریقہ سے عمل درآمد کیا جائے، مسلم لیڈروں (محمد علی اور شوکت علی) [2] کو نظر بندی سے رہائی دی جائے اور سر اڈورڈ میکلیگن کو (وہ شریف آدمی جس سے سب محبت کرتے تھے) جلد سے جلد پنجاب کا گورنر مقرر کیا جائے۔ عمالِ حکومت نے ان سب باتوں کو سرد مہری سے سنا اور اینڈریوز نے پریشان اور شکست خوردہ حالت میں محسوس کیا کہ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔

اس اثنا میں لاہور کے ایک ذمہ دار قومی اخبار "ٹربیون" کو ایک ہفتہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ اور اس کے ایڈیٹر کالی ناتھ رائے پر بعض مضامین کے سلسلہ میں جو اپریل کے پہلے دو ہفتوں میں شایع ہوئے تھے۔ بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ شہر کے دوسرے ہندوستانی اخبارات کے ایڈیٹروں نے اینڈریوز سے امداد اور مشورہ طلب کرتے ہوئے مداخلت کی درخواست کی۔

---

[1] مکتوب بنام رابندر ناتھ ٹیگور۔ اپریل ۱۹۱۹۔ [2] انہیں جنوری ۱۹۱۵ میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت نظر بند کیا گیا تھا۔

چنانچہ وہ فوراً ہو روانہ ہو گئے لیکن جب ۱۲ مئی کی صبح کو اُن کی گاڑی امرتسر پہنچی تو انہوں نے اپنے آپ کو فوجی حراست میں پایا۔ ان سے کہا گیا کہ "پبلک کا مفاد متقاضی ہے" کہ آپ پنجاب میں داخل نہ ہوں۔ سہ پہر کو ان کا بیان لیا گیا اور انہیں واپس دہلی بھیج دیا گیا۔ بیان لینے والا کمشنر پیمبروک مین ان کا ساتھی رہ چکا تھا۔

"ٹربیون" کے معاملہ نے ان کے جذبات کو بری طرح مجروح کیا۔ محض یہ بات نہ تھی کہ وہ مقدمہ کی ساری کارروائی کو سرے سے حق بجانب نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ حکومت پنجاب نے کلکتہ کے بیرسٹر مسٹر ارڈلی نارٹن کو جنہیں کالی ناتھ رائے نے اپنی صفائی کے لئے مقرر کیا تھا۔ مارشل لاء والے علاقہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اینڈریوز نے اسے "برطانوی انصاف پسندی کی صریح خلاف ورزی" خیال کیا۔ لیکن اس حکم کو منسوخ کرانے کے سلسلہ میں ان کی سب کوششیں بیکار گئیں۔ وہ واپس ٹیگور کے پاس چلے گئے۔ اور کلکتہ میں آخر مئی تک ان کے ساتھ رہے۔ اسی زمانہ میں شاعر بنگال نے اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا۔ موجودہ واقعات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا یہ نہایت موثر طریقہ تھا جسے انہوں نے اختیار کیا۔

(۲)

برطانوی بین الاقوامی ڈپلومیسی کا جو ریکارڈ ۱۹۔ ۱۹۱۸ میں پیش کیا گیا، اینڈریوز کی نظر میں وہ ہندوستان کے واقعات کی طرح نہایت پریشان کن تھا۔ مئی ۱۹۱۸ میں لارڈ چیمسفورڈ نے گاندھی کو دہلی میں امپیریل وار کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے طلب کیا۔ اور گاندھی نے اینڈریوز سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ راستہ میں اینڈریوز نے "نیو اسٹیٹسمین" میں ان سفاکانہ "خفیہ معاہدوں" کو پڑھا جنہیں انقلاب پسندوں نے روسی وزارتِ خارجہ سے برآمد کیا تھا۔ برطانیہ نے بھی ان صلحناموں پر دستخط کئے تھے، حالانکہ وہ اپنے بیانات میں صاف صاف اعلان کر چکا تھا کہ آزادی کی جنگ میں وہ کسی ذاتی فائدہ کو مدِ نظر نہیں رکھتا۔ اینڈریوز نے اخبارات گاندھی کے سامنے ڈال دئے اور پوچھا "آپ کسی ایسی جنگی کانفرنس میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں جبکہ اس قسم کی دوغلی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے"؟ گاندھی کا خیال تھا کہ مقدمہ "ثابت نہیں ہوا" اور انہوں نے

برطانیہ کو شبہ کا فائدہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنے وعدہ کے مطابق بھرتی کی مہم پر چلے گئے۔ مگر اینڈریوز نے خط و کتابت میں زور شور سے بحث جاری رکھی اور پھر دلائل کا رخ بدل کر امن پسندی اور اہنسا کی طرف لوٹ آئے۔

"میں گونگے آدمی کی تمثیل نہیں سمجھ سکا۔ جس کا ذکر آپ نے اپنے مکتوب میں کیا ہے۔ یہ تو قریب قریب ایسی دلیل ہے۔ کہ ہندوستانی جو خونریزی کو بالکل بھول چکا ہے لے پھر سے آمادہ کیا جائے کہ وہ پہلے تو اسے سیکھے اور پھر اپنی مرضی سے اس سے اپنی برأت کا اظہار کرے۔ . . . . ساتھ ہی میں کلیتہً آپ سے متفق ہوں کہ صرف آزاد ہندوستان ہی اپنی راہ خود منتخب کر سکتا ہے اور دنیا کے سامنے اہنسا کی بلند ترین مثال پیش کر سکتا ہے نہ کہ آج کا ماتحت اور غلام ہندوستان لیکن اس پر بھی کیا آپ یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ آزادی صرف اخلاقی قوت کے ذریعہ جیتی جائے نہ کہ مستقل فوج کے قیام کے ذریعہ۔ اور یہی اخلاقی قوت قابض فوج کا مقابلہ کرے گی۔"[1]

دسمبر ۱۹۱۸ میں نیشنل کانگریس نے اپنے دہلی کے اجلاس میں مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو صلح کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے اپنے نمایندوں کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ مگر یہ تجویز نظر انداز کر دی گئی۔ اور ہندوستان کے نمایندے گورنمنٹ کی جانب سے نامزد کئے گئے۔ صلح کانفرنس کی تاریخ نے اینڈریوز کے شبہات کی تصدیق کر دی۔ کہ فی الحقیقت دوغلی پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ اور جب وائسرائے نے قومی شکرانہ ادا کرنے کی درخواست کی "اس فاتحانہ صلح کے لئے جو خدا نے از راہِ احسان ہمیں بخشی ہے"۔ تو اینڈریوز نے دو ٹوک ہو کر اپیل کو خلاف مذہب قرار دے دیا۔ اور صلح نامہ کو غیر منصفانہ اور شرمناک کہہ کر اس کی مذمت کی۔[2]

ان کے خیال میں نسلی مساوات کے اصول کے بارے میں جو سمجھوتے جمعیت اقوام کی دستور سازی کے وقت "ضروری" سمجھے گئے تھے۔ وہ اپنے اندر ایک مزید منحوس پہلو رکھتے تھے۔ جونہی جنگ ختم ہوگئی بیرونی مصائب جنوبی افریقہ میں پھر سے عود کر آئیں۔ اور اینڈریوز کا خیال تھا کہ

---

[1] مکتوب بنام ایم۔ کے گاندھی۔ ۲۳ جون ۱۹۱۸۔ [2] اخبارات کے نام بیان ۹ جولائی ۱۹۱۹۔ نیز ماڈرن ریویو ۔ اگست ۱۹۱۹۔

متنازعہ فیہ مسائل کی نوعیت ٹرانسوال اور پنجاب میں لازماً یکساں ہے۔ انہوں نے کہا۔
"حقوق کا اعلان ہی ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے لئے ضروری چیز ہے۔ اور اس وقت تک وہ اصلاحات بالکل بیکار اور غیر ضروری رہیں گی جب تک کہ بنیادی انسانی حقوق غیر محفوظ حالت میں ہیں" [1]

جب گورنمنٹ کے نامزد مندوبین ورسیلز سے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دوسرے ڈومینیوں کے نمایندوں کی طرح ان کے ساتھ بھی مساوی احترام کا برتاؤ کیا گیا تھا تو اس وقت اینڈریوز نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"جب جمعیت اقوام کی تمہید میں نسلی مساوات کے اصول کی تجدید کے متعلق ایک مختصر سا بیان شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اس وقت اس تجویز کو اس بنا پر رد کر دیا گیا تھا کہ اس سے ساری کانفرنس تباہ اور برباد ہو جائے گی۔ جنوبی افریقہ اور کناڈا اس مخالفت میں سب سے پیش پیش تھے۔

"جاپان نے سب سے پہلے یہ تجویز پیش کی تھی۔ مگر اس کے پندار کو دوسرے طریقوں سے مطمئن کر دیا گیا۔ اسے چین کے وسیع صوبہ شانتنگ میں مفروضہ جرمن پٹرلیویل حقوق دیئے گئے، لیٹروں اور غاصبوں کے حقوق ملنے اجازت دی گئی کہ وہ کوریا سے ایک مفتوحہ ملک کی طرح سلوک کرے جس کے اندرونی معاملات سے جمعیت اقوام کو کوئی علاقہ نہ ہوگا۔

صرف چین ایسا ملک تھا جس نے صلحنامہ سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا اور اس طرح اپنی تباہی اور تقسیم پر رضامند ہونے سے انکار کر دیا۔ . . . . کیا وہ عرصۂ دراز تک مقابلہ پر جما رہے گا؟

"اس تمام عرصہ میں ہندوستان کہاں تھا؟ وزیر ہند کی رہنمائی میں ہندوستانی نمایندوں نے بیکس کوریا والوں یا لٹتے ہوئے چینیوں کی طرف سے نہ تو کوئی صدائے احتجاج بلند کی اور نہ انسان کی قائم کردہ پارلمینٹ کے اندر تمام نسلوں کی مساوات پر زور دیا۔ ہندوستان

---

[1] بمبئی کرانیکل ۱۳ اگست ۱۹۱۹

کے کسی نمایندے نے صلح نامہ پر دستخط کرنے سے انکار نہیں کیا۔

"یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے۔ کہ جس دن مہاراجہ بیکانیر سلطنت کے اندر ہندوستان کے مرتبہ کے روز افزوں اعتراف پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے، عین اسی دن ہندوستان کے مختلف حصوں میں پبلک جلسے منعقد کئے جا رہے تھے۔ تاکہ سلطنت کے اندر بڑا السنوال میں ہندوستانیوں کے ساتھ جو تازہ بدسلوکیاں روا رکھی جارہی ہیں، ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے"

(۳)

۱۹۱۹ کے موسم گرما میں اینڈریوز کے پاس مزدوروں کے مختلف قسم کے مسائل میں امداد دینے کے لئے بہت سی درخواستیں آئیں۔ جس ایک درخواست کا ان کے دل پر بے حد اثر ہوا، وہ ملایا کے کاشتکاروں کی طرف سے آئی تھی جن کے ساتھ انہوں نے فجی سے واپس ہوتے وقت تین ہفتے بسر کئے تھے تاکہ ان کی رہنمائی کے لئے مزدوری کی شرائط پر سفارشات پیش کریں۔ لیکن اس خیال سے کہ شاید ان کی ضرورت پنجاب میں ہو وہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ کام نہ کرسکے۔ انہوں نے اگست کا مہینہ زیادہ تر سیلون میں مزدوروں کے حالات کی تحقیقات میں گزارا۔ جب وہ وہاں سے واپس ہوئے اس وقت پنجاب میں ان کے داخلہ پر سے پابندی ہٹ چکی تھی۔ اور سر ایڈورڈ میکلیگن نے گورنر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا تھا۔ سب سے پہلا کام جو نئے گورنر نے کیا یہ تھا کہ لاہور کے مقدمۂ سازش کے مجرمین کی سزاؤں میں بہت بڑی حد تک تخفیف کردی۔ اور ٹربیون کے ایڈیٹر کالی ناتھ رائے کی رہائی کا حکم دیدیا۔

۴ دسمبر کو وائسرائے نے ہنٹر کمیشن کا تقرر کیا۔ تاکہ وہ پنجاب کے واقعات کی تحقیقات کرے۔ پنڈت مدن موہن مالوی اس کانگریس کمیٹی کے صدر تھے جو شہادت فراہم کرنے کے کام پر مامور تھی۔ اس کمیٹی میں اینڈریوز کو بھی لے لیا گیا۔ مگر یہ امر شروع ہی سے مشتبہ تھا کہ آیا وہ اصالتاً گواہی دینے کے لئے اس وقت ہندوستان میں موجود ہوں گے۔ اور اس لئے ان کے سامنے بڑا مقصد یہ رہا کہ خوف زدہ اور مرعوب باشندوں کے جذبۂ خودداری پر جو چرکے لگے تھے،

ان کو مندمل کریں اور دوسروں کے لئے راستہ صاف کردیں۔ تاکہ وہ پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی سے خوف کھائے بغیر شہادت دے سکیں۔"

انہوں نے سب سے پہلے گوردیال ملک کو کراچی سے تار دیکر بلایا۔ گوردیال ممبئی میں سرا یم۔ این چندا ورکر کے طالب علم تھے جبکہ اینڈریوز جنوری ۱۹۱۶ میں ممبئی سے واپس آئے تھے۔ لیکچر پر اپنے مہمان کو جماعت میں لے آئے۔ اور اس وقت گوردیال نے ان سے کہا:- "جناب والا ہندوستان آپ کا شکرگزار ہے۔" اینڈریوز نے جو جواب دیا وہ اس سے زیادہ متاثر کرنے والا تھا "میرے لڑکے، مجھے ہندوستان کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس نے مجھے وہ بنا دیا جو میں ہوں۔" جب گوردیال کی پڑھائی ختم ہوئی تو وہ شانتی نکیتن چلے گئے۔ جہاں اینڈریوز نے ان کی دستگیری کی۔ اب وہ بڑے شوق سے مدد دینے کے لئے آگئے۔

لاہور اور امرتسر میں اینڈریوز کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ لوگ ان کے مکان پر صبح سے شام تک آ آکر اپنی کہانیاں بیان کرتے۔ لاہور میں بہت سے معاملات میں انہوں نے ایک مصالحت کنندہ کی حیثیت سے دخل دیا۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس اور کمیٹی کے صدر دفتر واقع فیروز پور روڈ میں ہر وقت آتے جاتے تھے۔ مشکلات کی تشریح کرتے اور تجاویز پیش کرتے۔ ان کے ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر بار بار آتے جاتے رہنے کی وجہ سے ان کے رفقائے کار نے انہیں شٹل کاک "ڈ اُنڈتی چڑیا" کا خطاب دیدیا تھا۔ وہ مصالحت کی کسی تجویز پر رات گئے تک غور کرتے اور پھر بائیسکل پر بیٹھ کر گورنمنٹ ہاؤس جاتے ایسی حالت میں کہ ان کا لباس معمولی حیثیت کا ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات اسی بنا پر انہیں داخلہ کی اجازت ملنے میں دقتیں پیش آتی تھیں انہوں نے سیاسی اہمیت کی بہت سی بیش قیمت مراعات حاصل کرلیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی کہ اُس جعفر بیری ٹیکس کے حسابات اور تخمینہ جات کی باقاعدہ سرکاری چھان بین کی جائے جو فساد زدہ علاقوں کے رہنے والوں پر لگایا گیا تھا اور یہاں ہی کی وکالت کا نتیجہ تھا کہ چند ہفتے بعد جزائر انڈمان کی تعزیری نوآبادی سے پنجاب کے محب وطن بھائی پرمانند کی رہائی عمل میں آئی۔

پھر گوردیال ملک کی معیت میں انہوں نے دیہات کے دورے کئے۔ کہا جاتا تھا کہ رام نگر میں ملک معظم کے پتلے کو نذر آتش کیا گیا ہے۔ لوگ سب خوفزدہ تھے، اور ان سے یہی کہانی بیان کرنے

کے لئے جتنی مرتبہ کوششیں کی گئیں، وہ سب بیکار گئیں۔ آخری رات آگئی۔ اینڈریوز رات بھر نہیں سوئے، اس لئے کہ پیچش کی وجہ سے انہیں سخت تکلیف تھی۔ انہوں نے یہ وقت عبادت میں اور دعاؤں میں گزارا۔ پھر دونوں ایک ساتھ گوردوارہ نامی گاؤں میں پہنچے جہاں صبح کے وقت عورتیں اور مرد پوجا پاٹ کے لئے جمع تھے۔ جب بھجن ختم ہو گیا تو اینڈریوز نے آگے بڑھ کر ان لوگوں سے دست بستہ اور نہایت ہمدردانہ درخواست کی کہ وہ نہایت سچائی سے تمام واقعات بیان کر دیں۔ اور دیکھو کہ وہی پجاری جس نے اتنے عرصہ تک لب کشائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اور تمام کہانی الف سے لے کر ی تک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ بیان کر دی۔"

سانگلہ میں ایک شخص اینڈریوز کے کمرے میں آدھی رات کو چوری چھپے آیا، اور کاغذوں کی ایک گڈی ڈال کر چلا گیا۔ جب اینڈریوز لاہور واپس آگئے تو انہوں نے لارڈ ہنٹر کے لئے اپنی پرائیویٹ رپورٹ ترتیب دینا شروع کی اور ان کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس میں فوجیوں کے طرزِ عمل کے متعلق آنکھوں دیکھا حال درج تھا۔ لیکن انہیں یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ ان میں سچے واقعات درج نہ تھے۔ جب وہ نہایت بے صبری سے ان کا مطالعہ کر رہے تھے اس وقت سانگلہ کا ایک مسلمان درزی دروازہ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا: "صاحب یہ رپورٹ صحیح نہیں ہے۔ ہم سے وہ لکھوائی گئی ہے تاکہ آپ کی آنکھوں میں دُھول ڈالی جائے۔ لیکن آپ کے جانے کے بعد میرے ضمیر نے برداشت نہ کیا۔ اس لئے کہ آپ کے چہرے میں میں ایسی بات دیکھتا ہوں جو انسان کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

گوجرانوالہ کے زمانۂ قیام میں انہیں ایک نمبردار کا حال معلوم ہوا جس کا گھر لاہور سے تقریباً ۲۰ میل پرے ریلوے لائن پر تھا۔ تار کاٹ ڈالے گئے تھے، اور نمبردار کو جس نے فوج میں بہادری اور نیک نامی سے خدمت کی تھی، شبہ پر گرفتار کر لیا گیا تھا اور عوام کے سامنے اسے کوڑے مارے گئے تھے، حالانکہ وہ بالکل بے قصور تھا۔ اس بے عزتی کا اس کے دماغ پر اتنا برا اثر ہوا تھا کہ لوگوں کو شبہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔ اینڈریوز نے تلاش کر کے اس کا پتہ لگا ہی لیا۔ نمبردار نے بدتمیزی کے لہجے میں کہا: "چلے جائیں مجھے کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

مجھے انگریزوں کا کافی تجربہ ہو چکا ہے۔"

اینڈریوز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن وہ بدستور مصر رہے۔ وہ اس بوڑھے سپاہی سے بغل گیر ہوئے اور اس سے منت سماجت کر کے اس کی جتا پوچھی۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر نمبردار حیران ہو گیا۔ اس کا دل پسیج گیا اور اس نے قمیض اتار کر اپنی پیٹھ دکھائی۔ کچھ دیر تک اینڈریوز کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ پھر انہوں نے کہا۔ "گورو نانک جی نے گرنتھ میں ہمیں معاف کر دینے کا حکم دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں۔ یہ گناہ میرا ہے اس لئے کہ اس کا ارتکاب میرے ہم ملکیوں نے کیا ہے۔" انہوں نے جھک کر پھر اس کے پاؤں چھو لئے۔ سپاہی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "نہیں، نہیں، آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔" یہ کہتے ہی اس کا جی بھر آیا اور وہ بہت دیر تک سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ جب اس کا جی ہلکا ہوا تو اس نے کہا۔ "صاحب۔ یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے پچھلے چھ مہینوں میں اس طرح سے تسکین دی گئی ہو۔ اب مجھے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بالکل خوش ہوں۔ اور بلاشبہ وہ اب بالکل مختلف آدمی معلوم ہوتا تھا۔

گوردیال ملک یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں الہامی خیال آیا "سی۔ ایف۔ اے" یعنی کرائسٹس فیتھفل اپاسل" (مسیح کا وفادار حواری) ہر شخص جو سی۔ ایف۔ اے سے ذرا سا بھی واقف تھا، جانتا تھا کہ ان کا نام غلط نہیں رکھا گیا ہے۔

گاندھی وسط اکتوبر میں پنجاب پہنچے۔ ان کا آنا جیسا کہ ان کے دوست نے بیان کیا، ایک بہت بڑے اخلاقی زلزلہ کی آمد کے مترادف تھا۔ ان کی زبردست شخصیت اور پنڈت مالوی کی شفقت آمیز محبت کے مابین تقابل انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اینڈریوز کی یہ ایک زبردست خدمت تھی کہ انہوں نے ان دونوں کو پنجاب میں لا کر یکجا کر دیا کیونکہ وہ دونوں کو سمجھتے تھے اور ایک کی اخلاقی حرارت اور دوسرے کی مندمل کرنے والی ہمدردی سے محبت کرتے تھے۔

لیکن جنوبی افریقہ میں ان کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ ۵ نومبر کو انہوں نے بریڈلا ہال لاہور کے ایک زبردست اجتماع میں پنجاب کو الوداع کہا۔ دوران

تب میں انہوں نے جرائم کو گھٹانے اور کسی کی جانبداری کئے بغیر درندگی کے ان بزدلانہ افعال کی مذمت کی جو برطانوی اور ہندوستانی نامۂ اعمال کو مسخ کر چکے تھے۔ ان کے الفاظ دور دور پہنچے، اتنی دور کہ انہیں ان کے وہاں تک پہنچنے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ لاہور سے سیکڑوں میل دور ایک نوجوان نے ان کے الفاظ کو مندر کے سامنے والے حصہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اخبار سے ان کا بیان زور زور سے پڑھکر سنایا۔ ایک شخص نے کہا: "وہ الفاف پسند آدمی ہیں۔ بہرحال تمام انگریز برے نہیں ہوتے۔"

لاہور میں زبردست غیر عیسائی مجمع نے جس میں ہندوستان کے چوٹی کے قومی لیڈر بھی موجود تھے، نہایت احترام کے ساتھ اینڈریوز کے الفاظ کو سنا جن میں پنجاب کی صورتحال پر مسیح کے الفاظ کا اطلاق کیا گیا تھا۔ انہوں نے فرمایا:

"میں لاہور میں اپنے زمانۂ قیام کے دوران میں ہر صبح منٹگمری باغ میں جاتا رہا ہوں۔ اور صبح سے پہلے اس کے تاروں بھرے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا رہا ہوں۔ میں نے یوکے لپٹس کے قد آور درختوں پر سے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا ہے اور فطرت کے وسیع سکوت میں میرے آقا مسیح کے یہ الفاظ میرے دل پر خود بخود منکشف ہو جاتے ہیں:

اپنے دشمنوں سے محبت کرو، انہیں دعا دو جو تمہیں بددعا دیتے ہیں، تاکہ تم آسمانی باپ کے بچے بن جاؤ کیونکہ وہ نیکوں اور بدوں دونوں پر اپنا سورج روشن رکھتا ہے۔ لہٰذا تم بالکل ایسے ہی مکمل بن جاؤ جیسا تمہارا آسمانی باپ مکمل ہے۔

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ انتقام کے جذبہ پر زور نہ دیں۔ بلکہ آپ معافی کا جذبہ اپنے پیش نظر رکھیں۔ آپ نفرت کی تاریک رات میں بھٹکتے نہ پھریں، بلکہ خدائی محبت کی شاندار روشنی میں آجائیں۔"[1]

کچھ عرصہ پیشتر انہیں ایک عیسائی گرجا میں جو چند میل کے فاصلہ پر تھا داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ اس موقع پر ان سے کہا گیا تھا کہ "اللہ کا یہ گھر باغیوں کے لئے نہیں ہے۔"

---

[1] ٹریبیون ۱۹ نومبر ۱۹۱۹

باب ۱۰

جنگ کا تتمہ

افریقہ

۱۹۱۲ سے ۱۹۲۰ تک عمر ۴۱-۴۹

فجی سے واپس لوٹنے کے بعد سے "دین بندھو" کو نسلی یا اقتصادی آویزشوں کے بہت سے مواقع پر امداد کے لئے طلب کیا گیا۔ اس سال اور ما بعد کے سالوں میں جو خود فراموشانہ خدمات انہوں نے انجام دیں، ان کے متعلق اشارات بھی نہیں ملتے۔ بکھری ہوئی جھلکیوں سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ کبھی یہاں کبھی وہاں طاقتور کے سامنے غریبوں اور کمزوروں کی وکالت کرتے رہے ہیں۔ لیکن وہ ایسے بلاووں کو رکاوٹوں سے تعبیر کرتے تھے خواہ وہ ضروری اور خدا کے مقرر کردہ کیوں نہ ہوں، تاہم وہ اپنی زندگی کے حقیقی کام میں انہیں رکاوٹ ہی سمجھتے تھے۔ ہمدردی کی اِن مہمات سے وہ یہ ارادہ کرکے شانتی نکیتن واپس آتے تھے کہ "میں اب ایک جگہ مستقل طور پر رہونگا۔ میں کل سے جماعتوں کو تاریخ پڑھانا شروع کردونگا" مگر ٹیگور انہیں بہتر طریقہ سے جانتے تھے

اس لئے وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتے: "جناب چارلس صاحب! میں اس کا خیال رکھوں گا کہ ریلوے کا ٹنڈگی تازہ ترین کاپی رہا کرے تاکہ آپ کو ہر وقت پر ل جایا کرے" انہوں نے سوامی شردھا نند کو ۱۳ نومبر ۱۹۱۹ کو لکھا: "اینڈریوز کو جو ذاتی محبت مجھ سے ہے، اس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کام یہاں پر ہے، اور اس طرح سے وہ خود اپنی ذات سے ناانصافی برتتے ہیں کیونکہ ان کے کام کا دائرۂ عمل ساری دنیا ہے" یہ تبصرہ اینڈریوز کے ایک خط پر کیا گیا تھا جسے انہوں نے پنجاب سے بھیجا تھا:

"مجھے جنوبی افریقہ جانا ہے، لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ میں اپنے دل و دماغ کی مکمل تربیت کے ساتھ آشرم ہی واپس لوٹوں گا تاکہ میں اپنی زندگی کے حقیقی کام کو جو یہاں ہے اور کہیں نہیں ہے انجام دے سکوں۔"

تاریخ کی ستم ظریف دیوی یقیناً اس پر مسکرائی ہوگی۔ آئندہ تین چار مہینوں میں کوئی ڈرامائی واقعہ یا کارنامہ رونما نہیں ہوا۔ لیکن وہ پیچیدہ مسائل جن سے اینڈریوز مشرقی اور جنوبی افریقہ میں نبرد آزما رہتے تھے اکثر اعتبار سے "اُن کی زندگی کے حقیقی کام" کی نمائندگی کرتے تھے بمقابلہ کسی اور چیز کے جسے وہ اس سے قبل انجام دے چکے تھے۔

اینڈریوز مشرقی افریقہ اور یوگنڈا گئے تاکہ ان شکایات کی غیرجانبدلاًنہ تحقیقات کریں جو اگرچہ ۱۹۱۳ ہی میں کافی سنگین تھیں، تاہم جنگ کی وجہ سے ان میں مزید شدت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ تمام علاقہ صدیوں سے ہندوستانی تجارتی مہمات کا میدان بنا ہوا تھا اور جب برطانیہ نے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں شاہانہ اقتدار کا دعویٰ کیا تو اس کا بڑا ہی مقصد یہی تھا کہ وہاں وہ اپنی ہندوستانی رعایا کا تحفظ کرے۔ یورپین زیادہ تعداد میں وہاں صرف اُس وقت آئے جبکہ یوگنڈا ریلوے بن چکی تھی، خصوصیت کے ساتھ جنگ سے

قبل کے چھ سالوں میں۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان میں سے بہت سے با اثر لوگ وہ تھے جو جنوبی افریقہ سے آئے تھے، اور اپنے ساتھ وہ طرزِ عمل بھی لائے تھے جو ہندوستانی اور افریقی باشندوں کے بارے میں جنوبی افریقہ کے نہایت مغرورانہ "سفید فام باشندوں" کی طرف سے برتا جاتا تھا۔ اس کے بعد جنگ برپا ہو گئی، اور قریب ہی ٹانگا نیکا کے جرمن علاقہ کی جانب سے حملہ کے خطرہ نے وہاں فوجی حکومت قائم کرادی جس نے ہندوستانی مشتبہ اشخاص کو ایسے وجوہ پر گرفتار کرکے جلاوطن کردیا جنکی نسبت عام طور پر یہ خیال تھا کہ وہ کلیتہً ناکافی ہیں اگرچہ بعض صورتوں میں بالکل فرضی تھے۔ تاہم حکام کی تائید میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ کم سے کم ایک ہندوستانی انتہا پسند انقلابی اُن دنوں کینیا میں رہتا تھا لیکن جلا وطنیوں کی وجہ سے بے حد تلخی پیدا ہو گئی۔ جہاں تک یورپین باشندوں کا تعلق ہے ان میں سر تھیوڈور ماریسن کی اس نیک نہاد مگر احمقانہ تجویز سے کہ برطانیہ کی بجائے ہندوستان کو صلحنامہ میں ٹانگانیکا کا انتداب دیدیا جائے، غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

ہندوستانیوں کی بڑی بڑی شکایات یہ تھیں کہ انہیں کینیا کی زرخیز کوہستانی زمینوں کی ملکیت سے محروم رکھا جا رہا ہے، ان کے داخلۂ ملک پر پابندیاں عائد کی جارہی ہیں اور شہروں میں علیحدہ تجارتی اور سکونتی علاقے مقرر کرنے کی مسلسل دھمکیاں دیجارہی ہیں اور کینیا کی مجلسِ قانونساز میں ان کی نمایندگی غیر منصفانہ طریقہ پر کی جارہی ہے۔ اس وقت یورپین سیاست دان جس طریقہ سے جنگ کے بعد حکومتِ خود اختیاری کے لئے پُرزور مطالبات کر رہے تھے اُس سے ظاہر ہو گیا تھا کہ ان کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ نوآبادی کے مقامی امور کی نگرانی سفید فام آبادی کے ہاتھ میں رہے جس کی تعداد گنی چُنی دس ہزار تھی اور یہ کہ اس کے ۲۴ ہزار ہندوستانی

باشندوں اور لکھوکھا افریقیوں کو اس کی پالیسی میں کسی قسم کی موثر آواز بلند کرنے کا موقع دل سکے اینڈریوز کے پہنچنے سے کچھ عرصہ قبل سرکاری اقتصادی کمیشن جس میں یورپین باشندوں کی نمایندگی بہت زیادہ تھی، اپنی تنقیحات شایع کرچکا تھا اور ہندوستانیوں کی شہادت لئے بغیر اس نے کینیا کی اقتصادی مشکلات کا سارا الزام ہندوستانی آبادی پر تھوپ دیا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کا ادعا بھی کیا تھا کہ "ہندوستانی مقابلہ کی وجہ سے افریقی باشندے زندگی کی امنگ اور ترقی کے مواقع سے محروم ہو گئے ہیں۔"

اس فقرہ کا اینڈریوز پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے افریقی آبادی کی حالت کا اور افریقیوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلقات کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا۔ یورپین نوآبادکاروں کی جماعت اُن کی جنوبی افریقہ کی شہرت سے واقف تھی اور اس لئے شدّت سے مخالف تھی اور اس نے انہیں "حرامی انگریز" کی قسم کی گالیاں دینے کا کوئی موقع فروگذاشت نہیں کیا بلکہ ان سے اچھوتوں کا سا برتاؤ کیا۔ لیکن — جنوبی افریقہ کی طرح — وہاں بھی ان کے انگریز دوست موجود تھے۔ گورنمنٹ سروس اور ریلوے سروس کے بہت سے نوجوان انگریز ایسے تھے جو اُن قابل اور تجربہ کار ہندوستانیوں سے شکر گزاری اور احترام کے جذبات کے ساتھ پیش آتے تھے جنہوں نے انہیں کام کرنا سکھایا تھا اور اس لئے وہ ایسے نظام کو شرمندگی کی نظر سے دیکھتے تھے جس کی وجہ سے ہندوستانی اپنے جائز مرتبہ اور تنخواہ پر فائز نہ ہو سکتے تھے۔ ان نوجوانوں میں سے کچھ تو ماحول کے اثرات کا شکار ہو گئے لیکن بقیہ نے ایسا نہیں کیا اور یہ جرأت بجائے خود اُن کی عزت بڑھانے والی چیز تھی۔ فریقِ مخالف میں سے آگے مسٹر میک گریگر راس[1] (ڈائرکٹر محکمۂ رفاہِ عامہ) پیش پیش تھے جن کے

---

[1] ان کی کتاب "کینیا اندر سے" بہت دلچسپ ہے اور اینڈریوز کی سیاحتوں کے زمانہ کی صورتِ حالات کے بارے میں اس سے بہت سی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

گھر میں اینڈریوز اور ان کے ہندوستانی دوستوں کا خیر مقدم کیا گیا۔ اینڈریوز نے ان سے افریقیوں کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کیں، مثلاً اُن کی آبائی زمینوں میں ان کے حقِ کاشت کا غیر محفوظ ہونا، صنعتی پالیسی جس میں "پابندِ معاہدہ مزدوری" کے نظام کی جھلک پائی جاتی تھی، اور جس کی وجہ سے خاندانی اور قبائلی زندگی درہم برہم ہوگئی تھی اور جو نوآبادی کی اقتصادی مشکلات کا حقیقی سبب تھی، رسواکُن مردم آزاری اور مجرمانہ تشدّد کے بارے میں جن کا پیدا ہوجانا یقینی ہے جہاں کہیں لوگوں کو ماتحت اقوام پر سیاسی اقتدار اور ان کی خدمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہوجاتا ہے۔"

اینڈریوز نے کینیا اور یوگنڈا میں کئی ہفتے سفر میں صرف کئے۔ رومان اور عیسائی بہادری کی یہ سرزمین جس کی خدمت کرنے کے لئے انہوں نے ایک زمانہ میں اپنی زندگی وقف کردینے کی خواہش کی تھی۔ اور اس کی ایک ایک تفصیل سے آگاہی حاصل کی۔ اس کے بعد سے سیاسی اور تاریخی حقائق پر انہیں غیر معمولی عبور حاصل ہوگیا اور وہ غیر معمولی وضاحت اور قوت سے عند الضرورت انہیں پیش کرسکتے تھے۔ انہوں نے اقتصادی کمیشن کے الزامات کی تردید میں ہر جگہ سے شہادت جمع کی اور ان سے بھی زیادہ اس ظالمانہ الزام کی تردید میں کہ بہ حیثیتِ قوم ہندوستانیوں کے جنسی اخلاق کا معیار بہت پست ہے۔ انہوں نے مشنری ڈاکٹروں سے بھی تحریری بیانات حاصل کئے جو بلا امتیاز سب قوموں کی خدمت کرتے تھے، انہوں نے لیوگیکو میں یگنڈا کی ملکی پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقات کی اور ایک خط حاصل کیا جس پر وزیر اعظم اور چیف جسٹس کے دستخط ثبت تھے۔ اس میں درج تھا: "ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستانی ہمارے ملک میں رہیں اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے یہاں رہنے سے ہمارے ملک کی حالت بہتر ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ہم اُنہیں ہر حالت میں نیک چلن پاتے ہیں۔" انہوں نے دیکھا کہ افریقی باشندے ہندوستانی اسٹوروں میں اطمینان کیساتھ گھومتے

پھرتے ہیں، اور ہندوستانی کاریگر اپنے افریقی شاگردوں کے ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں، اسی طرح ہندوستانی کھیتوں میں بھی افریقی مزدور ہنسی خوشی کام کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت سے افریقی خطابیہ جملوں کو یاد کر لیا تھا اور وہ ان کا استعمال بھی کرتے تھے جس کی وجہ ان کے دل کو بدیہی سچائی کے ساتھ یہ یقین ہو گیا تھا کہ "ہندوستانی اور مشنری ہمارے بہترین دوست ہیں"۔

ان کے تجربہ نے انہیں یقین دلا دیا کہ کینیا کے ہندوستانی باشندوں کا مقدمہ ٹھوس دلائل اور انصاف پر مبنی ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی یقین تھا کہ خالصتہً سیاسی "حقوق" کے لئے یا مادّی دولت کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہنا ایک "بیکار سی بات" ہے۔ کیونکہ ان میں سے ایک جتھا بندی کی طرف لیجاتی ہے اور دوسری افریقی باشندوں کو لوٹنے میں "برطانوی شیر کے ساتھ گیدڑ کا طرز عمل اختیار کرنے پر" مائل کرتی ہے۔ ایک ہمدرد انگریز نے لکھا کہ "ہندوستانی نو آبادی اپنے ہی معاملات میں اس قدر منہمک کیوں رہتی ہے اور وہ افریقی تحریکات آزادی سے الگ تھلگ کیوں رہتی ہے؟" اینڈریوز جانتے تھے کہ اس نکتہ چینی میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور موجود ہے۔ انہوں نے ایک جلسہ میں پوچھا "میرے دوستو! کیا آپ کے دل میں یہ لالچ پیدا نہیں ہوتا کہ روپیہ کمانے میں بہت زیادہ وقت صرف کیا کریں؟ مادّی چیزوں میں اس انہماک کا نظارہ میرے لئے دکھ، خوف اور رنج کا باعث ہوا ہے جو اس شدید ظاہری دکھ سے کہیں زیادہ ہے، جو باہر والوں کی طرف سے آپ کو پہنچا ہو۔" اسی تقریر میں انہوں نے کہا کہ صرف سیاسیات تک اپنی دلچسپی کو مرکوز کر دینا "ایک صحت بخش دماغ کے لئے اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے جتنا نشہ ایک تندرست جسم کے لئے خطرناک ہوتا ہے"۔

اس لئے جہاں کہیں وہ گئے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں سیاسیات سے ہٹ کر خدا کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ سکھ گوردوارہ، مسلم

انجمن، آریہ سماج مندر، عیسائی گرجا سب ان کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے تھے، انہوں نے ان سب میں جاکر زیادہ گہری مذہبی زندگی بسر کرنے پر زور دیا جس کا مقصد بے معنی بحث و مباحث میں پڑنا نہ ہونا چاہیئے بلکہ اندرونی سکون اور ہر نسل کے غریب اور مظلوم لوگوں کی خدمت ہونا چاہیئے۔ انہوں نے موثر الفاظ میں مشرقی افریقہ کے کسی جنگل میں ایک ایسے آشرم کے امکانات کا ذکر کیا جس میں ہر مذہب و ملت کے آدمیوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے پر خوش آمدید کہا جائیگا جو دنیاوی معاملات سے بالکل الگ گیان دھیان اور سنیاس کے قدیم ہندوستانی تخیل کی نمایندہ ہوگی۔ لیکن سب سے زیادہ انہوں نے افریقیوں کی ایسی بے غرض خدمت پر زور دیا جس کی بنیاد مذہب ہو۔ انہوں نے کئی مرتبہ یہ بات بیان کی کہ جن ہندوستانی تاجروں کے ساتھ انہوں نے یوگنڈا میں سفر کیا اور اُن میں ہندو، مسلمان اور پارسی سبھی شامل تھے ان سب نے ہمیشہ ایک دور دراز مقام پر جانے کے لئے زور دیا جہاں آئرلینڈ کے رومن کیتھولک مشنری رہا کرتے تھے۔ ان کی سیدھی سادھی زندگی اور زہد نے ہندوستانیوں کے دلوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا انہوں نے مجھ سے کہا:

"مسٹر اینڈریوز، ہم سب یہاں یوگنڈا میں روپیہ پیدا کرتے ہیں لیکن ہم خود افریقی باشندوں کے لئے کیا کر رہے ہیں؟ ہم اس کے مقابلہ میں اپنی قوم کی ساکھ کے لئے کیا دکھا سکتے ہیں؟"

اینڈریوز نے اس سوال کو اٹھالیا اور اسے نہ صرف افریقہ میں بلکہ ہندوستان میں بھی دہرایا:

"اب تک ہندوستان نے مشرقی افریقہ کو کونسا روحانی فائدہ پہنچایا ہے؟ .... دورِ جدید کے ایسے روحانی قسمت آزما لوگ کہاں ہیں جو ہندوستان کے ساحلوں سے تجارتی منفعت کی خاطر نہیں بلکہ لوجہ اللہ بنی نوع انسان کی محبت کے لئے سفر کرتے ہیں؟" [1]

---

[1] ینگ مین آف انڈیا، اپریل ۱۹۲۳

جیسے ہی وہ ۱۹۲۰ میں ہندوستان واپس آئے۔ انہوں نے ہندوستانی عیسائی طلبا کے روبرو اس بات کو عملی چیلنج کے طور پر پیش کیا اور یوگنڈا کے بشپ سے خط وکتابت کی تاکہ وہ انہیں خدمت کے مواقع دے۔ مگر یہ اسکیم عملی جامہ نہ پہن سکی، تاہم اینڈریوز کی یہ ایک امتیازی صفت تھی کہ انہوں نے اپنی عیسائی جماعت میں اپنے اصول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوشش کی اور یہ بھی ان کی امتیازی صفت تھی کہ افریقہ میں عیسائی خدمت کا جو تصور انہوں نے قائم کیا تھا اس میں ایک اہم چیز یہ بھی شامل تھی کہ افریقہ کے باشندوں کے لئے انصاف کے حصول کی خاطر جدوجہد کی جائے ——— ایسی جدوجہد جس میں جملہ مذاہب کے خیر سگالی رکھنے والے اشخاص بھی اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ انہوں نے لکھا:

"اُن صاحبِ فکر اور سنجیدہ اشخاص کو جو ہندوستانی مقاصد کی حمایت میں لڑتے ہیں، چاہیئے کہ وہ اپنا سارا زور اُس خوفناک لُوٹ مار کی روک تھام میں صرف کر دیں جو روز بروز افریقی آبادی کو ہلاک کر رہی ہے۔ اگر ہندوستانیوں کی طرف سے ان ظالمانہ خرابیوں کے تدارک کی کوئی کوشش نہ کی گئی، اگر بیگار کیخلاف کوئی موثر آواز کبھی بلند نہ کی گئی جس کی وجہ سے ملکی باشندوں کی ہندوستانی آبادی میں گزشتہ دس سال کے اندر ۲۱ فیصدی کی کمی ہو گئی ہے، تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ بنیادی طور پر کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہے۔"

۱۹۱۹ میں جب پہلی مرتبہ اینڈریوز نے کیکویو اور مسائی باشندوں کی "خوفناک لوٹ کھسوٹ" اور "جارحانہ مظالم" پر غور کرنا شروع کیا، ان کے خیالات خاص محبت اور اشتیاق کے ساتھ شانتی نکیتن کے اُس نوعمر لڑکے کی طرف منعطف ہو گئے جو جنوبی افریقہ اور فجی میں ظلم وتعدی کے

بارے میں ان کی داستانوں کو غیر معمولی ذہانت اور ہمدردی سے سنا کرتا تھا۔ "مولو" مر چکا تھا، اور اسے مرے ہوئے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا، کہ ایک دن جبکہ وہاں کے باشندوں کے دکھوں کے تصور سے اینڈریوز کی روح بہت زیادہ متاثر ہو رہی تھی، اُس وقت انہیں غیر مرئی لیکن حقیقی طور پر یہ احساس ہوا کہ مولو ان کے برابر کھڑا ہے اور رفاقت کے بلند کرنے والے احساس کے ساتھ ان کے مجروح دل کو ڈھارس دے رہا ہے یہ امر کہ اس قسم کا روحانی تجربہ اس صورت میں ان کے سامنے آتے ان کے پرخلوص اور حساس دل کے طبعی رجحان کا ثبوت ہے۔

(۲)

اتفاق کی بات ہے کہ جنوبی افریقہ جانے کے لئے اینڈریوز نے جو وقت مقرر کیا تھا وہ حکومتِ ہند کے نمایندوں کے وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہوگیا۔ جو ایشیاٹک انکوائیری کمیشن (۱۹۲۰) میں ہندوستانی مقدمہ کی نگرانی کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب مسٹر جی۔ ایل۔ کاربیٹ کے ساتھ انہیں بہت گہری محبت تھی اور انہوں نے مقامی ہندوستانی لیڈروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرانے میں وفد کی بیحد امداد کی، جو ابتداً ایں کمیشن کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کے متعلق نہ صرف مایوس تھے بلکہ اُسے مشکوک نگاہوں سے بھی دیکھ رہے تھے۔ جس قسم کی شہادت اس کے سامنے گزری اس سے یقیناً اس امر کا پہلے سے علم ہوگیا کہ آگے چل کر بہت سخت مشکلات پیدا ہونگی، لیکن کمشنروں کی تجاویز اگرچہ وہ ہندوستانی نقطۂ نظر سے اپنے اندر اہم نقائص رکھتی تھیں، تاہم وہ اس سلسلہ میں بہت مفید ثابت ہوئیں کہ مابعد کے سالوں میں جداگانہ سکونتی علاقوں کی تجویز کی اس میں شدت سے مخالفت کی گئی تھی اور اس سے اشتراکِ عمل کی پالیسی

حق بجانب ثابت ہوگی۔

اینڈریوز کو سب سے زیادہ دلچسپی سوشل اور اقتصادی حالات سے تھی، اور انہوں نے دیکھا کہ نیٹال کی ہندوستانی جماعت کے غریب طبقے نہایت ذلیل حالت میں ہیں۔ ہندوستانی آبادی کا ۹۰ فیصدی حصہ گنّوں کے کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں پر مشتمل تھا اور اگرچہ ابتدائی پابندِ معاہدہ مزدوروں کا آخری دور ۱۹۱۶ میں ختم ہوچکا تھا، تاہم بہت سے لوگ اب بھی ایسے شدید افلاس میں مبتلا تھے کہ انہوں نے پھر سے اپنے آپ کو اسی قسم کے پابندِ معاہدہ مزدوری کے ماتحت رکھنا قبول کر لیا۔ انہیں اکثر حالات میں شراب کے نشہ میں ایسا کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ ان کی مصیبت میں حکومتِ ہند کی پابندیوں کی وجہ سے اور اضافہ ہوگیا تھا جو اس نے جنگ کے بعد چاول کی برآمد پر عائد کردی تھیں، اور ڈربن کے مالدار ہندوستانی تاجروں نے صرف اس لالچ میں ذخیرہ اندوزی میں کچھ پس وپیش نہیں کیا اس غرض سے کہ وہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کے نتیجہ کے طور پر اور زیادہ منافع کما سکیں گے۔ اینڈریوز نے پبلک طور پر ان خرابیوں کا پردہ فاش نہیں کیا بلکہ انہوں نے تاجروں کو نجی میٹنگ میں فرداً فرداً بلایا اور وہاں ان سے صاف صاف گفتگو کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن ایک تاجر نے اپنا تمام ذخیرہ "کنٹرول" کی قیمتوں پر فروخت کرنے کے لئے باہر نکال لیا۔ اینڈریوز نے برآمد کی پالیسی کی خود غرضانہ قوم پرستی کے بارے میں ہندوستانی اخبارات میں صدائے احتجاج بلند کی اس لئے کہ اسی کی وجہ سے نیٹال کے قلاش مزدور اپنی اہم اور ضروری خوراک سے محروم ہوگئے تھے۔

اسی ایک مثال سے اُن جداگانہ طبقاتی مفاد کا اندازہ ہوسکتا ہے جو جنوبی افریقہ میں ہندوستانی جماعت کے اندر پیدا ہوگئے تھے، جنہیں اینڈریوز نے اپنے مستقبل کے کام میں کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ دوسری چیز

جن کا انہیں شدت سے احساس تھا، شراب نوشی تھی جس کی تباہ کاری غربا میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہاں بھی کی طرح کوئی ایسا قانون نہ تھا جس کی رو سے ہندوستانیوں کے ہاتھ منشی اشیا کی فروخت پر کنٹرول ہو، بلکہ ہندوستانی سیاسی لیڈر ہر ایسی تجویز کے اس بنا پر مخالف تھے کہ وہ یورپینوں کے سے "حقوق" چاہتے تھے۔ یہ بھی آئندہ پیش آنے والے مسائل میں سے ایک تھا جن میں "خودداری" کے دعاوی کی انسانیت کے دعاوی کے ساتھ بظاہر آویزش ہو رہی تھی۔

ان دنوں اینڈریوز بہت خستہ اور بیمار تھے اور جو گندگی اور افلاس وہ اپنے گرد و پیش دیکھتے تھے، وہ دن رات ان کے خیالات پر مستولی رہتا تھا۔ ان کے خیال میں "اس ناقابلِ برداشت ناانصافی سے بچنے کا واحد راستہ یہ تھا" کہ مزدوروں کو ان کے وطن ہندوستان میں واپس بھیج دیا جائے۔ گاندھی اسمٹس معاہدہ (۱۹۱۴) کی ایک دفعہ یہ تھی کہ جو لوگ واپس جانا چاہیں وہ اس شرط پر یونین گورنمنٹ کے مصارف سے واپس جا سکتے ہیں کہ وہ جنوبی افریقہ کے حقِ سکونت سے دست بردار ہو جائیں۔ جنگ کے دوران میں اس دفعہ کو معطل رکھا گیا، لیکن اینڈریوز نے صرف انسانی ضرورت نہ کہ اسکے سیاسی اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور ہندوستانی لیڈروں کے مشورہ سے اب حکومت کو ترغیب دی کہ وہ اس دفعہ کو عملی جامہ پہنا دے اور ساتھ ہی وطن جانے والے ہر ہندوستانی کو تھوڑی سی رقم بھی دے تاکہ ہندوستان میں از سر نو آباد ہو جانے کے کام میں آسانی ہو۔

یہ تجویز بھڑوں کا چھتہ ثابت ہوئی۔ مصیبت زدہ "قلی" پھر سیاسی بساط کے مہرے بنائے گئے۔ ایشیا کے انتہا پسند دشمنوں نے اس اسکیم کو اس طرح سے پیش کیا جس کی وجہ سے ابتدا ہی سے اس کی رضاکارانہ نوعیت خطرہ میں پڑ گئی اور انہوں نے یورپین باشندوں کو بتایا کہ اسے

کس طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے تاکہ ملک مفلوک الحال مزدور اور مالدار تاجر سے بیک وقت چھٹکارا پالے۔

جو تلخیاں اس کے بعد پیدا ہوئیں ان کے دوران میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں نے حقارت آمیز طریقہ سے اس امر کا ذکر کیا کہ اینڈریوز کو بڑی آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ خود غرض اشخاص نے قلیوں کو اس لئے آگے بڑھایا ہے کہ وہ خیالی مصائب کی شکایت کریں اور اینڈریوز کو دشمنوں کے ہاتھوں میں نچائیں۔ لیکن اگر انہوں نے دھوکا کھایا تو وہ دھوکا اس سلسلہ میں نہ تھا کہ انہیں قلیوں کی قابلِ رحم حالت کا صحیح اندازہ نہ تھا، نہیں، بلکہ انہوں نے ان کی مصیبت کی جو تشخیص کی تھی وہ ضرورت سے زیادہ صحیح نکلی۔ ان کی غلطی اُن کے تجویز کردہ علاج میں مضمر تھی۔ انسانی جماعتوں کو اپنی مرضی سے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نہیں بسایا جا سکتا ......

.... جب ایک مرتبہ انہیں نیٹال کی سرزمین میں بسا دیا گیا تو اس کے بعد سے ان کی واحد تمنا یہ ہونی چاہیئے تھی کہ وہ اس سرزمین میں اپنی جڑیں قائم کرلیں اور وہیں پھولیں پھلیں، اور جنوبی افریقہ کو (مس مال ٹینو کے الفاظ میں) ہی اپنی مادرِ وطن بنالیں۔ اس اعتبار سے جدید سرزمین پر سے ان کی غیر مستقل گرفت کو ہٹا لینا دراصل مصیبت اور ابتلا کو دعوت دینا تھا۔

اینڈریوز نے مس مال ٹینو کے زیر اثر اس کا اندازہ کر لیا تھا کہ کینیا میں جو پالیسی انہوں نے اختیار کی وہ اس اصول کے ہم آہنگ تھی کہ ہر مسئلہ کو افریقی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ لیکن نیٹال کے "قلیوں" کے ساتھ جس رحمدلی کا اظہار انہوں نے کیا اس نے ان کی قوتِ فیصلہ کو درہم برہم کر دیا اور ہندوستان کے بارے میں ان کی واقفیت ایک اہم معاملہ میں بالکل نامکمل رہی۔ وہ عظیم الشان کلچر کی روایات کو جانتے تھے، وہ شہر کے گندے

رقتوں سے بھی واقف تھے، لیکن وہ ٹامل نیڈ یا صوبجاتِ متحدہ کی ذات پات سے جکڑی ہوئی دیہی سوسائیٹی سے کماحقہٗ واقف نہ تھے، اور اس لئے انہیں احساس نہ ہو سکا کہ ایک ایسا شخص جو ایک ناقابلِ قبول ذات کی بیوی کے ساتھ ایسے حلقہ میں اپنے وطن کو واپس آئے گا جہاں اسکی روانگی سے پیدا ہونے والا خلا مدت ہوئی بھر چکا ہے، تو وہ کتنی مشکلات سے دوچار ہوگا۔ مادرِ ہند کی خیالی تصویر جس کا نقشہ انہوں نے ایک مرتبہ کھینچا تھا، اس حقیقت سے بالکل مختلف تھی جس کا مشاہدہ واپس شدہ تارکِ وطن اپنے گھر پہنچنے پر کریگا۔

ہرچند کہ سیاسی اعتبار سے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا۔ اور صرف تھوڑے سے مزدوروں نے اس پیشکش سے فائدہ اٹھایا اور غیر منصفانہ ترغیبات کے خلاف حکومتِ ہند کے پُرزور احتجاجوں نے جس میں نیٹال کے نیشکر کی کاشت کرنے والوں کا خودغرضانہ غصّہ بھی شامل تھا، اور جنہیں اندیشہ تھا کہ ان کے جانے سے مزدور نہ مل سکینگے، بہت جلد اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ اینڈریوز سے جو کچھ بن پڑا، انہوں نے اپنی غلطی کی تلافی کرنے کے لئے کیا اور نہایت انکساری سے تمام الزام اپنے سر لے لیا، اور پھر بطور عذر کے صرف یہ کہا کہ ان کا واحد مقصد صرف یہ تھا کہ انسانی مصائب کو ہلکا کیا جائے۔ ہندوستان کو واپس جانے والے تارکان کی بہبودی کے لئے جس ذمہ داری کا بوجھ انہوں نے اٹھایا اور جو دوسرا سال گزرنے سے پہلے پہلے ان پر پڑنے والا تھا، اس کے ذریعہ انہوں نے اس غلط اقدام کی جس کے لئے اس کے جنوبی افریقہ کے مشیرِ کار بھی یکساں طور پر موردِ الزام ہیں، کافی سے زیادہ تلافی کر دی۔

باب ۱۱

وشوا بھارتی

۱۹۲۰ سے ۱۹۲۱ تک عمر ۴۹۔ ۵۰

(۱)

دسمبر ۱۹۱۹ میں حکومتِ ہند نے مانٹیگو چیمسفورڈ کی تجاویز کو قانونی شکل دیدی پنجاب کے واقعات کے بعد ان تجاویز کو سرد مہری کی نظر سے دیکھا گیا۔ مگر اس کے باوجود گاندھی کا اثر اس قدر غالب تھا کہ امرتسر کی کانگریس کو انہوں نے ترغیب دیکر اس امر پر آمادہ کر لیا کہ اصلاح شدہ دستور کو وہ عملی جامہ پہنائے گی۔

اس کے بعد ہی نئی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو مسٹر لائڈ جارج کے ایک سرکاری بیان کی بنیاد پر جو جنوری ۱۹۱۸ میں دیا گیا تھا جنگ کی تائید کرنے پر آمادہ کیا گیا جسے وہ اس نوعیت کا ایک وعدہ سمجھتے تھے کہ جنگ کے بعد کے تصفیہ میں خلیفۃ المسلمین سلطان ٹرکی کے روحانی اور دنیوی اقتدار کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ ۱۹۱۹ کے آخر میں یہ شبہ ترقی پا گیا کہ اس "وعدہ" کی تکمیل نہیں کی جائے گی، اور ٹرکی کی شرائطِ صلح نے جو مئی ۱۹۲۰ میں شائع ہو گئیں۔ ان خدشات کی تصدیق کر دی۔ محمد علی اور شوکت علی نے جنہیں ۱۹۱۹ کی شاہی معافی کے بعد نظر بندی سے رہائی ملی تھی، ملک کے طول و عرض میں ایجی ٹیشن کی ابتدا کر دی، جس کی تائید گاندھی نے بھی کی۔ جولائی ۱۹۲۰ میں ٹرکی کو بالجبر

معاہدۂ سیورے پر دستخط کرلئے گئے۔ ۳۱ اگست کا دن ہندوستان میں "خلافت ڈے" کے طور پر منایا گیا۔ اور ابتدائے ستمبر میں انڈین نیشنل کانگریس کے ایک خاص اجلاس میں حکومت سے ترکِ تعاون کا ریزولیوشن منظور کیا گیا جس میں ۷ نکات تھے۔ گاندھی اور علی برادران نے سارے ملک کا دورہ کیا، ایسی حالت میں کہ ہر طرف مجنونانہ جوش پھیلا ہوا تھا، عظیم الشان جلسے منعقد کئے گئے، طلبا کی ہڑتالیں ہوئیں، "قومی" اسکول اور کالج قائم کئے گئے، اور یہ سب کچھ یکے بعد دیگرے جذباتی ہیجان کی حالت میں عمل پذیر ہوتا رہا۔ کانگریس کا جو باقاعدہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۰ میں ناگپور میں منعقد ہوا اس میں طے کیا گیا کہ اس کا مقصد "جملہ جائز اور پر امن ذرائع سے حصولِ سوراج ہے"۔ لفظ "آئینی" حذف کردیا گیا تھا جسے کانگریس اب تک استعمال کرتی رہی تھی۔ چرخہ کاتنے اور اچھوتوں کی اصلاح و ترقی نے اس کے پروگرام میں نمایاں جگہ حاصل کرلی۔

مئی ۱۹۲۰ سے جولائی ۱۹۲۱ تک ٹیگور یورپ اور امریکہ میں تھے۔ تنگ نظر اور جنگجویانہ قومیت نے جو دوران جنگ کی پیداوار تھی، ان کے دل میں نفرت و کراہیت کا جذبہ پیدا کردیا اور انہوں نے تمام ممالک کے فاضلوں اور مفکروں کو دعوت دی کہ وہ متحد ہوکر اس کا مقابلہ کریں۔ انہوں نے اپنے تعلیمی کام کو وسیع کرنے اور خود شانتی نکیتن میں بین الاقوامی کلچر کا ایک مرکز قایم کرنے کا بھی خاکہ سوچا جس کا نام انہوں نے وشوابھارتی رکھا۔ مغرب میں ان کی طویل سیاحت کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی اس نئی مہم کے لئے امداد و اعانت حاصل کریں۔

ٹیگور کی غیر حاضری میں اینڈریوز شانتی نکیتن میں اپنے فرنیچر سے معرا کمرے میں رہا کرتے تھے، اسکول کی بہبودی کی ہر تفصیل پر نظر رکھتے تھے، اور ملنے والوں کا ہجوم روزانہ ان سے ملنے کے لئے آتا تھا تاکہ ملکی اور سمندر پار ممالک کے مسائل کے متعلق ان کے بے مثل تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ جتنا کام وہ کرتے تھے، اس کی مقدار کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ صبح سے لے کر بسا اوقات رات کے بارہ بجے تک وہ میز پر بیٹھ کر کام کرتے، خطوط کا جواب دیتے، مضامین لکھتے، اور یادداشتیں مرتب کرتے، انہیں وہاں "دفتری سہولتیں"

میسر تھیں۔ متعدد مرتبہ انہوں نے اہم مضامین کی آٹھ آٹھ نقلیں اپنے ہاتھ سے کی ہیں، اور پھر خود ہی چلچلاتی دھوپ میں جا کر انہیں سپرد ڈاک کیا ہے۔ "پاگل کتے اور انگریز دوپہر کی دھوپ میں باہر نکلا کرتے ہیں"۔ ایک ہر دلعزیز گیت تھا۔ جس میں وہ خصوصیت کے ساتھ مسرت محسوس کرتے تھے"۔)

لیکن ان کے دو نوجوان اور پُرجوش مددگار بھی تھے۔ گردیال ملک نے شانتی نکیتن کے عملہ میں شمولیت کر لی تھی۔ بنارسی داس چترویدی سمندر پار کے ہندوستانیوں کے بارے میں ان سے پانچ سال سے خط و کتابت کر رہے تھے، اور ۱۹۱۸ میں اور پھر جون ۱۹۲۰ میں وہ شانتی نکیتن آئے تھے۔ "اپنے والد سے کہدینا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے"۔ اینڈریوز نے ان سے دوسرے موقع پر کہا۔ اور جولائی میں انہوں نے چیفس کالج اندور میں اپنے عہدہ سے استعفےٰ دیدیا۔ اور آگئے۔ اس کے باوجود اینڈریوز پر ذمہ داریوں کا بہت بڑا بوجھ تھا۔ جنوری ۱۹۲۱ میں وہ آشرم میں واپس آگئے۔ اس وقت وہ انفلوئنزا میں شدت سے مبتلا تھے۔ وہ فجی سے آئے ہوئے تارکانِ وطن سے پہلی مرتبہ مٹیا برج میں کلکتہ کی گودیوں کے قریب ملنے کے لئے گئے۔ وہ صاحبِ فراش تھے، لیکن لیٹے لیٹے انہوں نے ایک دن میں ۳۵ خطوط، تار اور مضامین لکھوائے۔ جن میں سے بعض بہت طویل اور اہم تھے!

فرصت کے لمحوں میں جو بہت شاذ ہوتے تھے، بنارسی داس نے اینڈریوز کو ترغیب دی کہ وہ اپنی زندگی کے غیر رسمی واقعات کو لکھوا دیا کریں اور اجازت دیں تاکہ انہیں ہندی زبان میں سوانح حیات کے طور پر استعمال کر لیا جائے۔ اینڈریوز نے بہت پس و پیش کا اظہار کیا۔ لیکن اس دلیل کے سامنے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ کہ ان کی زندگی کی کہانی اس نفرت کو دور کرنے میں مدد دے گی۔ جو عوام میں جملہ انگریزوں کے خلاف پائی

سلہ اس لفظ کا ترجمہ ہے "ورلڈ کلچر" یعنی دنیا کا کلچر۔
سلہ جو جو باتیں اس کتاب میں شایع ہو رہی ہیں۔ وہ اب تک غیر مطبوعہ تھیں "دینو بندھو اینڈریوز" کے نام سے ہندی میں ان کی سوانح عمری ۱۹۲۱ میں شایع ہوئی تھی۔

جاتی ہے۔ اور ایک حد تک ان دو ممالک کے مابین بہتر تعلقات پیدا کرنے کا سبب بن سکے گی۔

(۲)

اس ڈرامائی سال میں اینڈریوز کی شخصیت اور کام کا بہترین عکس ان کی ان چٹھیوں اور تقریروں میں ملتا ہے، جو باقی رہ گئی ہیں۔ وہ سب سے پہلے خود شانتی نکیتن اسکول کی واضح تصویر پیش کرتی ہیں۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۱۱راگست ۱۹۴۰

یہاں شانتی نکیتن میں ہم اپنی طاقت ہی سے اپنی تعمیر کر رہے ہیں اور کسی بیرونی امداد پر بالکل بھروسہ نہیں رکھتے۔ یہاں جو آزادی اور خود مختاری نظر آتی ہے وہ سارے ہندوستان میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔ یہاں چند وزیٹر آئے تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس چیز کو تاڑ لیا تھا۔ کاش وہ اس ادبی سبھا کا اجلاس دیکھ پاتے جو گذشتہ شب کو منعقد ہوا تھا! کل آپ آشرم کے اس کونے میں یہ محسوس کرتے کہ اس شام کے جلسہ کو ترتیب دینے میں ساری دنیا کا انحصار تھا! ہر ایک چیز کو لڑکوں نے اپنے ہاتھ سے کیا۔ وہ گجردم چار بجے سے اٹھ بیٹھے تاکہ کنول کے پھولوں اور کیلے کے پتّوں اور دوسرے آرائشی سامان کا انتظام کریں۔ کس قدر جوش تھا! طاقت کا کس قدر شاندار مظاہرہ تھا! کیسے حیرت انگیز نتائج نکلے! اور یہ سب کچھ صرف چند گھنٹوں میں! اسٹیج بھی بنا لیا گیا تھا، کمرے میں پردے آویزاں کئے گئے تھے، اور جاپانی لال ٹینوں سے اسے روشن کیا گیا تھا۔ ایک غلام گردش بھی تعمیر کی گئی تھی۔ اسٹیج کے سامنے کے فرش کو چاک کے خوبصورت ڈیزائنوں سے مرصع کیا گیا تھا۔ مغنیوں کو بجلی کی تیز روشنی میں بٹھایا گیا تھا جو ململ کے پردوں میں سے چھن چھن کر نکل رہی تھی۔ یہ سب چیزیں علاءالدین کے عجیب وغریب محل کی طرح عدم سے وجود میں آئی تھیں اور دوسری صبح کو عدم میں غائب ہو گئیں ....

آج جبکہ میں یہ خط لکھ رہا ہوں، بدھ کی تعطیل ہے۔ آشرم میں شہد کی مکھیوں

کے جتنے کی طرح دن بھر بھنبھناہٹ دچہل پہل رہی۔ اور یہ چھوٹے لڑکے میرے برآمدہ کے گرد و پیش اور میرے کمرے کے اندر باہر یا ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں، اور فٹ بال کے میدان میں جا رہے ہیں۔ ہم یہاں اپنی زندگی نہایت پُرجوش طریقہ پر بسر کر رہے ہیں۔ ایسی طاقت درحقیقت زائل نہیں ہوتی، بلکہ نشوونما کا جذبۂ صادق بن جاتی ہے یہ باہر کی تھکی ہوئی سیاسی زندگی کے بناوٹی جوش سے کلیتاً مختلف ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۱۳ اگست ۱۹۲۰

کاش آپ کل رات ہمارے ساتھ ہوتے اور والمیکی پرتی بھا[1] کی ایکٹنگ اور موسیقی سے لطف اندوز ہوتے! ہم نے سوامی شردھانند کی آمد کے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے انجام دیا تھا اور لڑکوں اور لڑکیوں دونوں نے اپنی بساط سے زیادہ اچھا کام کیا۔۔۔۔ سوامی جی بے حد محظوظ ہوئے اور وہ آرٹ اور موسیقی کے کمرے سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔ سارا آشرم بہترین منظر پیش کر رہا تھا۔ اس دن طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کا نظارہ بھی بہت حسین تھا اور گرمی بھی زیادہ نہیں تھی۔ ڈرامے کے بعد جب مجمع منتشر ہوا اس وقت شانتی نکیتن والی نظم گا رہا تھا۔ چودھویں رات کا چاند بے حد خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ سوامی جی نے مجھ سے بات چیت کرتے وقت فرمایا کہ جس چیز نے سب سے زیادہ ان کے دل کو متاثر کیا ہے وہ بچوں کی آزادی اور مسرت ہے۔

بعض دوسرے خطوط میں عملی امور سے مثلاً آشرم کی مالی حالت، باورچی خانوں کی صفائی، کھانے پینے کے معاملات، ذات پات کے خلاف کش مکش اور صوبجاتی تعصبات سے بحث کی گئی ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۶ اگست ۱۹۲۰

کچھ عرصہ تک مجھے اس بارے میں دقت محسوس ہوئی کہ میں مصارف اور آمدنی کو کیسے متوازن کر سکوں گا۔ لیکن اب میرے پاس تمام ہنگامی ضروریات کی تکمیل کے

---

[1] رابندرناتھ ٹیگور کا لکھا ہوا ایک غنائیہ۔

لئے روپیہ آگیا ہے۔ مشرقی افریقہ کے تاجران مقیم بمبئی بہت اچھے لوگ ہیں اور انہوں نے فیاضانہ طریقے سے روپیہ دیا ہے۔

مشرقی افریقہ سے وشوا بھارتی میں شرکت کے لئے ایک مسلمان طالب علم آیا ہے اور وہ یہاں بے حد خوش ہے۔ لڑکے باورچی خانے میں اسے اپنے ساتھ شوق سے کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ نظارہ بہت دل خوش کُن ہے اور جس ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ہر جگہ بات چیت ہو رہی ہے۔ وہ یہاں اچھی طرح نمایاں ہے۔ جہاں تک عام مطبخ کا تعلق ہے، کوئی دشواری نظر نہیں آتی۔ اصل دشواری گجراتی باورچی خانہ کی ہے، اور میں اسے بھی حل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش خاموشی سے کر رہا ہوں میں دونوں باورچی خانوں کے درمیان کا دروازہ کھلوا دینا چاہتا ہوں اور ملا کر ایک کرہ کر دینا چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ وقت پر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ لیکن فی الحال ہر چیز غلط ہو رہی ہے۔ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں اور وہ اپنی اپنی مخصوص ذات کے مطابق چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بیٹھتے ہیں۔ اسے خاموشی کے ساتھ دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور صبر اور سلیقہ مندی کے ساتھ ہم اسے توڑ کر رہیں گے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے نام ۱۶ ستمبر ۱۹۲۰

ہمیں بعض والدین کے ساتھ کچھ وقت کے لئے سخت مشکل پیش آئی جو آتے تھے اور تمام انتظامات میں مداخلت کرتے تھے اور لڑکوں سے کہتے تھے کہ وہ ذات پات کے اختلافات کو قائم و برقرار رکھیں، اپنی الگ ٹکڑیاں بنائے رکھیں اور اسی کے مطابق وہ باورچیوں سے کھانے پکانے کی فرمائش کرتے تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت شائستگی برتی اور ان کو ہموار کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن انجام کار معلوم ہوا کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے اور چند طلبا کو وہ اپنے ساتھ واپس لے بھی گئے۔ میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا اب جبکہ تمام گڑبڑ ختم ہو گئی ہے مجھے کس قدر سکون ملا ہے!

رابندرناتھ ٹیگور کے نام یکم ستمبر

جب سے تنگ خیال قسم کے کٹر سرپرست اپنے بچوں کو لے گئے ہیں، ہم اپنے آپ کو بہت ہی مسرور پاتے ہیں، اس لئے کہ ہم نے واضح طور پر محسوس کر لیا ہے کہ آشرم کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اور وہ کونسی چیز ہے جسے ہم کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ سب سے بہتر بات یہ ہے کہ ہم میں کے لوگ جو قدرتی طور پر کٹر واقع ہوئے ہیں، کلیتاً ہمارے حامی ہو گئے ہیں۔ اسکول کے دونوں شعبوں کے مابین یعنی گجراتی اور بنگالی شعبوں میں اب زیادہ ارتباط ہے۔

آنے جانے والے مسافروں سے یہ اطلاعیں کہ امریکہ سے انہیں ۵۰ لاکھ ڈالر ملنے کی توقع ہے اور یہ کہ شاعر پانچ ملین ڈالر کو اپنے منتر کے طور پر اختیار کر رہے ہیں، پریشان حال اینڈریوز سے جو روپیہ کے لئے پھر ہراساں ہو رہے تھے، یہ الفاظ کہلوا دیتے کہ "بنک میں پانچ ہزار روپے جھاڑی میں ۵۰ لاکھ ڈالروں کے برابر ہیں" کچھ عرصہ بعد وہ اس موضوع پر پھر لوٹتے ہیں۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۳ و ۵ر اکتوبر

"ہم پوجا کے موقع پر پندرہ دن کی چھٹیاں دینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دہلی، حیدرآباد (سندھ) کراچی، احمد آباد اور بمبئی جانا چاہتا ہوں تاکہ ان بھاری مصارف کی ادائیگی کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کروں۔

...... کو آپریٹو اسٹورز کے اسکول اور ورکشاپ پر تقریباً ۵ ہزار روپے نکلتے ہیں، اور یہ رقم فی الفور ادا ہونی ہے۔ لہٰذا جس طرح سے بھوک کی تکلیف جنگل کے جانوروں کو کھیتوں میں نکل آنے پر مجبور کرتی ہے، اسی طرح ... کو آپریٹو اسٹورز کی تکلیف مجھے نہایت ہی مکروہ اور نہایت ہی ناپسندیدہ کام پر بھیج رہی ہے۔ میں اس اثنا میں راستہ میں ہر جگہ "۵ ہزار روپے" کی معمولی رقم کا منتر جپتا رہوں گا؟"

ایسی پریشانیوں کے حالات زیادہ تر گھریلو معاملات کی قلمی تصویروں سے مل جل

گئے ہیں۔ مثلاً ذیل کا خط ان کے جان نثار ملازم جوہری اور شاعر کے ملازم سادھو کے حالات سے متعلق ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے نام ۲۲ نومبر

سادھو اپنی زندگی کے دن مزے سے گزار رہا ہے۔ جب کوئی مہمان آجاتا ہے وہ پورے طور پر اس پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اور اس کی خدمت نہایت شاندار طریقہ سے کرتا ہے، اور جب کبھی کوئی مہمان نہیں ہوتا، تو وہ آپ کے کمروں کی گرد کو صبح سے شام تک صاف کرتا رہتا ہے۔ وہ میرے قریب تک نہیں پھٹکتا اور ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ چونکہ وہ اور جوہری آپس میں لڑتے ہیں، اور اگر سادھو نہیں آتا تو جوہری کو بڑبڑانے کا موقع ملتا ہے کہ تمام کام اس کو کرنا پڑجاتا ہے۔ اور یہ بڑبڑاہٹ جوہری کے دماغ کو ٹھیک رکھتی ہے۔ اور اس طرح ہر ایک اس سے خوش رہتا ہے۔ میں آپ سے بیان نہیں کرسکتا کہ میرے لئے یہ امر کس قدر سکون دینے والا ہے کہ سادھو نے صبح کے وقت میرے کمرے کو صاف کرنا بند کر دیا ہے۔ جوہری سارا کام ۵ منٹ میں انجام دے لیتا ہے اور سادھو کی حالت یہ ہے کہ وہ گھنٹوں میں بھی یہ سب کام نہیں کر پاتا۔ . . . . جوہری مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میرے ساتھ لاڈلے بچہ کی طرح پیش آتا ہے۔ اگر کبھی میں مناسب غذا نہیں کھاتا۔ تو وہ مجھے بہت جھڑکتا ہے۔

(۲۳)

سارے سال انہوں نے جو خطوط لکھے۔ ان سے اس ٹکراؤ کا حال معلوم ہوسکتا ہے جس کا اثر خود اینڈریوز اور شانتی نکیتن پر سیاسی کش مکش کی بدولت پڑا۔ ابتدائی خطوط میں مشرقی افریقہ کی نازک صورتِ حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

بنارسی داس چترویدی کے نام یکم جولائی ۱۹۲۰

مجھ پر کام کا دباؤ بے حد زیادہ ہے۔ میں آپ کے تار کے جواب میں جس سے مجھے مسرت ہوئی، تار بھیجنا چاہتا تھا مگر مجھے اب ایک ایک پیسہ بچانا ہے، اور اس لئے تار

بھیجنے کی مقدرت مجھ میں نہیں ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں میں پھر بیمار ہو گیا ہوں۔ اور کام کی کثرت کا میری صحت پر برا اثر پڑا ہے۔ میں آپ سے نہیں کہہ سکتا کہ جب آپ یہاں آ جائیں گے تو مجھے کس قدر سکون ملے گا۔

مرسلۂ ذیل بہتان[1] اسی ڈاک سے مشرقی افریقہ سے آیا ہے اور میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ اس سے مجھے کس قدر تکلیف پہنچی ہے۔ . . . . نہ صرف یہ کہ میں نے کبھی ایک پیسہ بھی نہیں لیا، بلکہ میں نے فجی میں اسکولوں اور نرسوں کی خدمات کو قائم و برقرار رکھنے کی خاطر روپیہ بھیجنے میں اپنے آپ کو کلیتاً برباد کر لیا ہے۔ جب کبھی میں ان کے لئے امداد حاصل نہیں کر سکا۔ میں نے ان پر اپنا ایک ایک پیسہ خرچ کر دیا ہے۔ . . یہ نہایت مہلک قسم کا بہتان ہے۔ کیونکہ اگر اس کا اثر باقی رہ گیا تو سارا کیا کرایا کام تباہ ہو جائیگا میرا خیال ہے آپ کو چاہئے کہ ہندی اخبارات کو فوراً یہ لکھ دیں کہ یہ الزام سخت ظالمانہ ہے اور ساتھ ہی صحیح واقعات بھی لکھ دیں۔ فجی میں بھی یہی ہوا تھا۔ اور اب مشرقی افریقہ میں یہ افترا پردازی شروع کی گئی ہے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام ۱۱ اگست

میں نے مشرقی افریقہ میں جو کام کرنے کی کوشش کی تھی، وہ سارے کا سارا لارڈ ملنر کے تازہ ترین اعلان کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ جس میں ہندوستان کے خلاف ہر تلخ شورش کے سامنے ہتھیار ڈال دئے گئے ہیں۔ میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ اس کے سامنے سارا معاملہ ایسی وضاحت سے پیش کر دیا گیا تھا جو ممکن ہو سکتا تھا۔ میں نے پولک[2] کو تمام کاغذات اور واقعات بتا دئے تھے جو نہایت زبردست تھے، اور جن میں ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں نے ہی پیش رو کی حیثیت سے سارا کام کیا ہے۔

---

[1] ایک انگریزی اخبار کا ایک تراشہ جس میں اُن کے متعلق یہ لکھا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کے تنخواہ دار ایجنٹ کی حیثیت سے پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔ [2] ایچ۔ ایس۔ ایل۔ پولک جو افریقہ میں ۱۹۱۴ء تک ان کے رفیقِ کار تھے، اور بعد کو لندن میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

ملک کا دروازہ غیروں کے لئے کھولا ہے۔ اور لوگنڈا ریلوے تعمیر کی ہے، وغیرہ وغیرہ
پولک نے ان سب امور کو نہایت ہی قابلیت سے پیش کیا ہے۔ کوئی بات ایسی نہیں جو
رہ گئی ہو اور اگر خود میں انگلستان جاتا تو اس سے زیادہ نہ کر سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مانٹیگو نے
میرے تمام کاغذات دیکھے اور وہ پورے طور پر اور کامل جوش کے ساتھ ہماری طرف تھے۔
ان سب کاموں کی تکمیل کی وجہ سے مجھ سے لوگ خوفزدہ اور متنفر ہو گئے تھے۔ یہاں تک
کہ مشرقی افریقہ کے اخبارات نے میرے متعلق بہتان تراشی شروع کر دی۔ کہ مجھے ــــ
ہندوستانیوں کی طرف سے اچھا خاصہ معاوضہ ملتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس مزید
بہتان تراشی کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ لارڈ ملنر اس تمام عرصہ میں ان کی طرف تھے اور
ان کے اس آخری اعلان کا سوائے غلامی کے اور کچھ مفہوم نہیں ہو سکتا۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۷۔ ستمبر

جب کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مسٹر گاندھی ناکام رہے ہیں، تو اس وقت ہوتا ہے جب
وہ مختلف امور کو اس سے زیادہ اضافی اہمیت دیدیتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔
وہ خلافت میں اس درجہ منہمک ہیں کہ انہیں مشرقی افریقہ کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں رہی
اور اس کے باوجود اسی قسم کے سوال پر ہندوستان تمام ایشیا کا نمونہ ہے۔ مشرقی افریقہ
درحقیقت برطانیہ عظمیٰ کے لئے ایسا سوال ہے۔ جسے "آزمائشی مسئلہ" کہتے ہیں۔ اگر ہندوستانیوں
کے ساتھ دنیا کے ایک خالی یا تقریباً خالی حصہ میں برابری کا سلوک نہیں کیا جا سکتا جہاں
وہ پیش رو کی حیثیت سے تمام کام کر چکے ہیں، اور جہاں کی زمینوں پر سب سے پہلے انہوں نے
ہی قبضہ کیا تھا۔ دنیا کا وہ حصہ جو خط استوا پر واقع ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ برطانوی
سلطنت کی نام نہاد آزادی دھوکہ اور سراب ہے۔ آزمائشی سوال سے میری مراد یہی ہے اور
برطانوی کامن ویلتھ اس سوال کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ ۔ ۔ ۔ اسی وجہ سے میں محسوس
کرتا ہوں کہ مسٹر گاندھی عدم تعاون کی پالیسی میں مسئلہ خلافت پر کہیں زیادہ صحیح راستہ پر
ہیں۔ لیکن شاید وہ یہ کہنے میں سیاسی طور پر دانشمندی کا اظہار کر رہے ہیں کہ صرف مذہبی
مسئلہ ہی آج بھی ہندوستان کے عوام کو متاثر کر سکے گا۔

مسئلۂ خلافت پر ان خطوط میں بہت شدومد سے بحث کی گئی ہے جو خود گاندھی کے نام لکھے گئے تھے:

ایم۔ کے۔ گاندھی کے نام ۲۴ ستمبر

میں ترکی سلطنت کے اصول خلافت کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہوں جو اس قدر مقدس تھی کہ اس پر بحث بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اور جس میں کسی دوسری نسل (کے افراد) کو آزادی بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس پر مجھے جو اعتراض تھا، وہ اب بھی موجود ہے۔ اور جب تک آپ محمد علی اور شوکت علی سے اس مسئلہ پر صفائی کے ساتھ نہ کہ مبہم طریقہ سے خیالات ظاہر کرنے کے لئے نہیں کہیں گے، اس وقت تک آپ مجھ سے توقع نہیں کر سکتے کہ میں خلوص دل سے اس کی تائید کروں گا۔ آپ نے اپنا مفہوم واضح نہیں کیا ہے، اور میرے سوال میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ الف۔ ب۔ ت کی طرح سادہ ہے۔ کیا آپ ان ممالک میں عربوں، آرمینیوں اور شامیوں کی آزادی کو تسلیم کریں گے یا نہیں۔ جو بدیہی طور پر ان کے ہیں نہ کہ ترکوں کے؟

ساتھ ہی اینڈریوز محض ناقدانہ یا منفی طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے اخبارات کو ذیل کا مختصر سا مراسلہ بھیجا:

"انڈین ڈیلی نیوز" کے مدیر کے نام ۱۹ ستمبر

جناب عالی۔ چونکہ میں خود اپنی آنکھوں سے ہندوستانیوں کی ذلت کا نظارہ دیکھ چکا ہوں، اس لئے میں خودداری کی امکانی بحالی کا اس وقت تک تصور نہیں کر سکتا جب تک کہ میں ان کے لئے برطانوی غلبہ سے آزادی کا مطالبہ نہ کروں۔ بعینہٖ جس طرح سے میں مصر کے لئے آزادی کا طلبگار ہوں، اس کی تکمیل کے لئے اخلاقی مقصد کی قطعی وحدت کی ضرورت ہے نہ کہ سمجھوتہ یا رعایت کی۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ ایسے نازک موقع پر میں ہندوستانیوں کی ذلت میں ایک اور صدمہ کا اضافہ کر رہا ہوں، میں نے جنوبی افریقہ میں کمزوری دکھا کر واپسی وطن کے اصول کو برداشت کر لیا ہے۔

بالآخر آزادی کا مطالبہ کھلم کھلا کر دیا گیا۔ اس خط نے اور اس موضوع پر اینڈریوز

کے مضامین سے جو ایک پمفلٹ کی شکل میں "خود مختاری : اس کی فوری ضرورت" کے عنوان سے شائع کئے گئے تھے ، ہندوستان میں بہت نمایاں اثر پیدا کیا اور اس نے جواہر لال نہرو جیسے بہت سے مستعد نوجوانوں پر بھی کچھ کم اثر نہیں ڈالا[1] اینڈریوز نے اپنے وجوہ وضاحت کے ساتھ رابندر ناتھ ٹیگور کو بتا دئے تھے ۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے نام ۲۲ و ۲۳ ستمبر

میں نے شدت سے محسوس کیا تھا کہ میں مسٹر گاندھی کی تحریک خلافت میں عملی طور پر شامل نہیں ہو سکتا۔ میں سرے سے "سلطنت" کے تخیل کے خلاف ہوں اور مطالبہ خلافت (سلطنت عثمانیہ) پر اظہارِ رضامندی کرنا یقیناً ہندوستان کے مطالبۂ خودمختاری کے خلاف رہے گا ...... لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایسے موقع پر جبکہ جذبات اس قدر بھڑک چکے ہوں، خاموش رہنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔ اور اگر مجھے کچھ کہنے دیا گیا تو جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس سے کم ہرگز نہ کہوں گا۔

میرا خیال ہے کہ فی الحال اس مسئلہ پر بحث نہیں کی جاسکے گی۔ ایک لحاظ سے یہ قبل از وقت ہے لیکن غلط مقصد کو سامنے رکھنا بالکل مایوس کن چیز ہے۔ اور میں اپنی پوری فراخدلی سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صرف خود مختاری ہی خودداری کو دوبارہ واپس لاسکتی ہے دوسرے خطوط میں بھی مساوی طریقہ سے بے صبری کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور چھوت چھات میں جو "قومی امپیریلزم" مضمر ہے۔ اس کے بارے میں اور سرمایہ داروں کی متعلقہ لُوٹ کھسوٹ کے بارے میں انہوں نے خیالات صفائی سے ادا کر دئے ہیں۔

ایم۔ کے۔ گاندھی کے نام ۹ ستمبر

بالشویک لوگ جو سرمایہ داری کی تمام شکلوں کے خلاف کش مکش کر رہے ہیں، ہم اسے کہاں تک قبول کر سکتے ہیں ؟ کیا ہم ہندوستان میں کلی طور پر سرمایہ داری کے خلاف ہیں ؟ یا ہم صرف کلی طور پر امپیریلزم ہی کے خلاف ہیں ؟ جہاں تک میری ذات کا

---

[1] دیکھو پنڈت نہرو کی خود نوشت سوانح عمری صفحہ ۶۹

تعلق ہے۔ میں تو روز بروز اس خیال پر آرہا ہوں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، یہ کہ سرمایہ داری ہی اس سارے شہنشاہانہ حملہ کو آگے بڑھانے والی دوسری طاقت ہے۔ ....

ہمیں چاہیئے کہ ہم ایمانداری، سچائی اور انصاف سے غیر برہمنیت کی تحریک کو اور ہر اس چیز کو جس کا اظہار وہ کرتی ہو، دیکھیں۔ میں نے چھن دوگیا اپنشد میں ذیل کی عبارت دیکھی ہے "جن لوگوں کا چال چلن اچھا ہے۔ وہ بہت جلد برہمن یا شتری یا ویش کا دل خوش کن جنم لے لیں گے۔ لیکن جن کا چال چلن قابلِ نفرت ہے۔ وہ بہت جلد کتے یا سور، یا اچھوت کا جنم لے لیں گے"۔ مجھے تو اس قسم کی بات سفید نسل کے مذہب کی طرح جس کا اعلان آج افریقہ میں کیا جا رہا ہے، خراب معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک میں واقف ہوں، کانگریس ابھی تک اعلیٰ ذات کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کی خصوصیت کو ختم کر دیا جائے؟

کلکتہ کی اسپیشل کانگریس کے بعد شانتی نکیتن میں گاندھی کی آمد اور ایوجا کی چھٹیوں کے بعد گجرات میں اینڈریوز کی آمد نے ان دونوں دوستوں کو اس امر کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ مل کر آپس میں بحث و مباحثہ کرلیں۔ گاندھی کی چھٹی میں ان بحثوں کے نتائج کا خلاصہ درج ہے۔

ایم۔ کے۔ گاندھی بنام سی۔ ایف اینڈریوز ۲۳ نومبر

موجودہ حالات میں انگریزی تعلق قابلِ نفرت ہے، لیکن میں ابھی تک یقین کیساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اسے ہر صورت میں ختم کر دینا چاہئے ...... یہ تعلق ممکن ترین واضح ثبوت مل جانے پر کہ انگریز مذہب کا اوّلین اصول یعنی بنی نوع انسان کی اخوت کو پورے طور پر سمجھنے میں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ ختم کر دینا ہوگا۔

... میں پست اقوام کو یا حقیقی طور پر کسی اور جماعت کو نقصان پہنچا کر سوراج حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ بائیکاٹ کئے جانے کی دھمکی میرے لئے بے حد مسرت کا باعث ہے۔ حکومت کے ساتھ لڑتے وقت رفقائے کار کے جذبات ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں، لیکن چھوت چھات کے دیو کا مقابلہ کرتے وقت مجھے محض چیدہ اشخاص کی معیت حاصل ہو

(۴)

کلکتہ کی اسپیشل کانگریس کے بعد ایک ایسا موضوع نظر آتا ہے جو سارے موسم سرما میں بار بار زیر بحث آتا ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے نام

۲۷ ستمبر و ۲۸ نومبر

میرے پاس ایک ایسا منتر ہے جو ”بجری کے دودھ“ یا ۵ ملین ڈالر سے زیادہ طاقتور ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی تکمیل ان سے کم ناممکن نہیں ہے۔ وہ یہ ہے کہ مزید ”زیٹرز“ کو نہ آنے دیا جائے۔ میری سمجھ میں اب آیا ہے کہ آپ کا کیا مطلب تھا۔ جبکہ آپ نے پچھلے سال کرسمس کے ایام میں میرے چلے جانے پر مجھے برا بھلا کہا تھا۔ اس گذشتہ پندرھواڑہ میں مصیبت اور برداشت کا پیمانہ اس قدر بھر گیا ہے کہ اب وہ چھلکنے لگا ہے۔ ”اقدم تا ئیں بلند نہیں بلکہ گہری“ رات اور دن کے اکثر و بیشتر حصے میں میرے دماغ میں اور میرے لبوں پر رہی ہیں! کانگریس کے اجلاس سے لے کر اب تک وزیٹروں کا اوسط بارہ سے سولہ یومیہ رہا ہے! میں نے دیوکی نی پارٹی کے متعلق کہدیا ہے کہ میں تو ہڑتال کر رہا ہوں۔ عدم تعاون، ستیاگرہ اور مقاومت مجہول یہ سب چیزیں ایک ساتھ — اور یہ کہ میں کسی بنگالی خواتین کی خبرگیری نہیں کروں گا!

...... مہمان، مہمان، مہمان، اور مہمان اور اور زیادہ مہمان! میرا سارا وقت مجبوراً یہ دیکھنے میں صرف ہو جاتا ہے کہ بیل گاڑی اسٹیشن جائے۔ اور اس امر کا انتظام کرنے میں کہ چار، پانچ یا چھ آدمیوں کے لئے کھانا محفوظ رکھا جائے اور چوہری کا مزاج درست رکھنے میں اور یہ معلوم کرنے میں کہ صبح کے وقت روانگی کے لئے کون کونسی گاڑیاں ہیں۔ لہٰذا اگر میں آپ کو ویسی بددعائیں نہ دوں جیسی بددعائیں آپ نے مجھے دی تھیں تو اس کی سیدھی سادی وجہ یہ ہے کہ علت و معلول کا سلسلہ نہ ٹوٹنے پائے۔ اور سبب اور تاثیر کا چکر گردش کرنے سے نہ رک جائے۔

ان وزیٹروں میں کچھ تو راجپوتانہ سے آئے تھے جن سے اینڈریوز نے ملاقات

کرلی تھی تاکہ گاندھی پر مزید بار نہ پڑے۔ انہوں نے بتایا کہ راجپوتانہ کی ریاستوں میں بیگار نے مستقل مصیبت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ انہوں نے ٹیگور کو لکھا کہ "میں بہت رات گئے تک ان کی داستان سنتا رہا۔ اور اس کے بعد میں مطلق نہ سو سکا۔ بلکہ جو جو مناظر انہوں نے بتائے تھے ان کو عالم خیال میں دیکھتا رہا" اس کے کچھ عرصہ بعد اسٹوکس کے پاس سے خط آیا جس میں بتایا گیا تھا کہ شملہ کی پہاڑیوں میں حکومتِ ہند بھی اسی قسم کی زیادتیوں کا اعادہ کررہی ہے۔ چنانچہ پوجا کی تعطیلات میں اینڈریوز نے اپنے ذمہ یہ کام بھی لے لیا کہ وہ ظلم کی اس صورت حال کے بارے میں بھی تحقیقات کریں گے۔ مابعد کی چٹھیوں میں انہوں نے اپنے اس سفر کے حالات قلم بند کئے ہیں۔

جگدانند رائے[1] کے نام ۱۶ر اکتوبر

میں جانتا ہوں کہ آپ یہ سنکر کس قدر مسرور ہوں گے کہ بہار کے طلباء کی جو کانفرنس ڈالٹن گنج میں منعقد ہوئی تھی۔ وہ بخیر و خوبی ختم ہوگئی۔۔۔۔۔۔ میں نے سدیشی دھوتی اور کپڑا پہنا تھا۔ اور ڈالٹن گنج کے زمانۂ قیام میں اور واپسی کے سفر کے دوران میں بھی میں نے یہی لباس پہنا۔ طلباء نے اس کی بے حد قدر کی۔ اور بہت سوں نے مجھ سے اس کے بارے میں بات چیت بھی کی۔ نیز مجھے ہندوستانی میں تین طویل تقریریں کرنی پڑیں۔ اور اگر طلباء نے انہیں بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو خیر وہ خود مجھے پسند نہ تھیں۔ اس لئے کہ میں ان تقریروں کے دوران میں کانپ رہا تھا اور میں خود کو ان بچوں کی طرح سمجھ رہا تھا جو بعد میں پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر مقابلہ میں انگریزی میں تقریر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں سے دو تقریریں ان کی گرامر میں نامکمل رہ گئیں اور میں بھی تقریباً ان کی طرح پریشان تھا۔

دریائے سون کے مشرقی کنارے سے لے کر جہاں جہاں ہم گئے ہماری ریلوے لائن پر اور ہر اسٹیشن پر ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ سارے دیہاتی علاقہ سے لوگ آئے

---

[1] شانتی نکیتن اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام۔

تھے یہ دیکھنا دنیا کا ایک نہایت عجیب و غریب نظارہ ہے کہ تمام دنیا کس طرح سے بیدار ہو رہی ہے۔ بہت سے اسٹیشن اس قدر چھوٹے تھے۔ کہ وہاں پلیٹ فارم تک نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں مجمع ہمارا منتظر تھا۔ اور اسٹیشن ماسٹر اور اور عملہ کے آدمی ایک قطار میں کھڑے تھے تاکہ ٹرین کا خیر مقدم کریں۔ جگدانند بابو، میں آپ سے کہتا ہوں۔ کہ آج بالکل نیا ہندوستان نظر آ رہا ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ لوگ شہری نہیں تھے بلکہ دور دراز دیہات کے رہنے والے تھے، اور وہ اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر صرف اپنی مادرِ وطن کی محبت کی خاطر آئے تھے۔

نرسنگھ بھائی پٹیل کے نام متیانہ، شملہ ۱۹۲۸ء نومبر

میں آپ کو اور کیکو بھائی اور دوسرے اشخاص کو بتانا چاہتا ہوں کہ گجرات میں میرا وقت کیسے بسر ہوا۔۔۔۔۔۔ چاند گرہن والے میلے کے موقع میں ڈاکر میں تھا وہاں دیہات والوں کا زبردست اجتماع تھا اندازہ ہے کہ وہاں کم سے کم ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کا اجتماع ہوگا۔ اور شام کے جلسے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمیوں کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ جب جلسہ شروع ہوا، تمام چاند میں۔۔۔۔۔۔۔۔ گرہن لگ چکا تھا اور کناروں سے زرد رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔ جلتے ہوئے گیس کے لیمپوں سے خاموش مجمع نظر آ رہا تھا جو ہزاروں گز لمبی چوڑی زمین پر بکھرا ہوا تھا، اور جس کے بیچ میں ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم تھا۔ ہمیں اس زبردست اجتماع میں سے گزر کر تقریباً سو گز تک چلنا پڑا اس سے پہلے کہ ہم پلیٹ فارم تک پہنچیں۔ جلسہ میں پورا نظم و نسق تھا جب گاندھی جی آگے بڑھے تو ایک آدمی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اور ہزاروں آدمیوں کے گلے سے "بھارت ماتا کی جے! ہندو مسلمان کی جے!" کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوار بھاٹے کی ایک بہت بڑی لہر کنارے تک آئی اور پھر ٹکرا کر جھاگ میں تبدیل ہو گئی۔ پلیٹ فارم کے پیچھے ایک طرف عورتوں کا جم غفیر تھا جو قطاروں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہندوستان میں اس سے پہلے کسی جلسہ میں اتنی عورتوں کو نہیں دیکھا۔ میں نے لوگوں کے چہروں کو دیکھا اور مجھے ایسا

معلوم ہوا کہ کوئی بھی گرہن کو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اور جب تک جلسہ ہوتا رہا سب کی توجہ جلسہ پر اور مقررین پر لگی ہوئی تھی۔ ایک کی نظر بھی چاند کی طرف نہ تھی۔ جب مہاتما گاندھی بولنے کے لئے کھڑے ہوئے تو "مہاتما گاندھی کی جے!" کے نعرے اس طرح سے بلند ہو رہے تھے گویا گرج کی زبردست آوازیں ہیں۔ یہ حالت چند منٹ تک قائم رہی۔ یہ آوازیں بالکل بے ساختہ اور دل سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے اب اپنے خط کو ختم کر دینا چاہیئے۔ پو پھٹ رہی ہے اور صبح سویرے کی ابتدائی روشنی آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی ہے۔ ہم اوّلین وقت پر روانہ ہو رہے ہیں اس لئے کہ ہمیں غروبِ آفتاب سے پہلے تیس میل چلنا ہے پھر کہیں جا کر ہم کوٹ گڑھ پہنچیں گے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے نام کوٹ گڑھ (تاریخ درج نہیں ہے)

میں کوٹ گڑھ سے دو دن میں روانہ ہو رہا ہوں تاکہ جلد سے جلد شانتی نکیتن پہنچ جاؤں۔ میں بے انتہا خوش ہوں کہ میں یہاں آیا۔ بیگار کے حالات یہ ہیں کہ دیہاتی ان کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے ہیں۔ اور بالکل غلامی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اب اپنی آنکھوں سے حالات کا مشاہدہ کر لیا ہے۔ اور اسٹوکس نے مجھے موقع پر تمام تفصیلات سمجھا دی ہیں۔

..... اب وقت آگیا ہے کہ اس کی جڑ پر ضرب کاری لگائی جائے اور ان غریبوں کو ان کی ظالمانہ غلامی سے نجات دلائی جائے۔ وہ یہاں آکر جمع ہو گئے ہیں اور مجھے بتا رہے ہیں کہ بیگار نے ان کی کیا درگت بنا رکھی ہے۔ اب ان میں نئی جرأت پیدا ہو گئی ہے۔ اور وہ ایک ساتھ عمل کریں گے

ڈبلیو ڈبلیو پیرسن کے نام ۱۴ نومبر

اسٹوکس اور میں ایک ساتھ روانہ ہوئے اور دو دن کے عرصہ میں مسافت طے کرتے ہوئے کوٹ گڑھ پہنچے۔ اور وہاں تقریباً ۵ گھنٹے تک کمشنر ضلع سے گفتگو کی۔ (جو حالات کا بچشم خود مطالعہ کرنے کی غرض سے آیا تھا) اس نے صورت حال پر اپنی

مندانہ طریقے سے نظر ڈالی۔ اور میں نے اس پر زور دیا کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ فوری کارروائی کی جائے۔ کسان بھی اس کے لئے تیار تھے۔ کہ وہ آیندہ بیگار دینے سے قطعی طور پر انکار کردیں۔ وہ اس واقعہ سے بے حد متاثر ہوا کہ میں خصوصیت کے ساتھ اس کام کے لئے اتنی لمبی مسافت طے کر کے آیا ہوں۔ اور مصالحت کے لئے تیار ہوں۔ انجام کار وہ اس امر پر راضی ہو گیا کہ ڈاک پہنچانے کے لئے جو بیگار لی جاتی ہے۔ اسے فی الفور ختم کر دیا جائے۔ کام کی ابتدا کرنے کے لئے یہ بہت ہی اہم چیز تھی۔ گذشتہ زمانہ میں یہ دیہاتی بیگار کرتے کرتے فی الحقیقت برف میں دب کر اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ اور ڈاک کی بیگار سے کسی اور چیز کے مقابلہ میں سب سے زیادہ خائف ہیں۔ اس کے بعد ہم نے رضا مندی دیدی کہ پہلی مارچ تک محکمۂ جنگلات اور محکمۂ رفاہِ عامہ کے افسران اپنے ذاتی کاموں کے لئے بیگار لے سکتے ہیں۔ مگر اس مدت میں تمام نظام یکسر بدل دینا چاہیئے۔ عملاً یہ سمجھوتہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ یہ حکام جاڑے میں بہت کم سفر کرتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے وعدہ کیا ہے کہ پہلی مارچ تک وہ بیگار کے تمام نظام کو یکسر بدل دے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو وہ رضا مند ہے کہ مقاومتِ مجہول اختیار کی جائے۔ پھر تو شملے کے تماشہ بین فی الفور ہر قسم کی بیگار لینے سے معذور ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آزاد مزدوری کی شرح بڑھ جائے گی، اور پھر گاؤں والوں کو بوجھ لے جانے میں جب کبھی وہ ایسا کرنا چاہیں اور جب کبھی انہیں فرصت ہو، اتنی مزدوری مل سکے گی کہ وہ اپنی گذر بسر کر لیں[1] مجھ سے بسا اوقات یہ بات کہی گئی ہے۔ کہ آپ فجی جا کر معاہدہ کرنے والے مزدوروں کو کام کرنے سے کیوں روکتے ہیں جبکہ خود ہندوستان میں غلامی موجود ہے! مجھے اس قول کی سچائی کا اس وقت تک احساس نہیں ہوا جب تک کہ میں نے خود پہاڑی علاقوں میں جا کر اس ملعون بیگاری نظام کا مطالعہ نہ کر لیا۔

---

[1] یہ دلی خوشی کی توقع حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

جب اینڈریوز شانتی نکیتن واپس پہنچے ہیں تو انہیں وہاں رابندرناتھ کے خطوط ملے۔ جن میں اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے وقتی سیاسی جوش میں انہماک رکھنے کا یہ نتیجہ نکلے۔ کہ آشرم کے خالص تعمیری کام کو نقصان پہنچ جائے۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۱۵ نومبر

جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے۔ آپ نے معلوم کر لیا ہے کہ مجھ میں کیا نقص تھا۔ اور آپ نے اسے ٹھیک کر دیا ہے۔ میں خود بھی اپنے زمانہ کی ہیجان انگیز فضا سے متاثر ہو کر دُور جا پڑا ہوں۔ اور اس نے روحانی تصورات کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ [اس وقت بھی جبکہ میں دُور تھا] میں سیاسی رَو میں بہت گہرے طور پر داخل ہو گیا تھا۔ ہر جگہ میں نے اس کے خلاف بھی تقریر کی جہاں تک وہ غصہ اور سفلی جذبہ سے اپیل کرتی ہے۔ لیکن میرے ذہن میں وہ الفاظ ہمیشہ گونجتے رہے ہیں جو عیسیٰ کے متعلق استعمال کئے گئے ہیں، "وہ جلتے ہوئے موم کو نہیں بجھائے گا" اور مجھے اس امر سے خدشہ ہی رہا کہ میں ایسے ماحول میں بے مہر اور بے پروا سا ہو چلا جیسا کہ فی الحال وہ ہے۔۔۔۔۔ لیکن جہاں میں یہ بات اپنے طرزِ عمل کو جزوی طور پر حق بجانب ٹھہرانے کے لئے پیش کرتا ہوں وہاں میں آپ کی اس تنبیہ کی سچائی کو پوری طرح سے سمجھتا ہوں۔ اور میں نے اسے اپنے دل میں جگہ دیدی ہے خدا کرے کہ آشرم کو میری ان جوشیلی حرکتوں سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے!

اگرچہ اینڈریوز کو اتفاق تھا کہ شانتی نکیتن روز بروز کی سیاسی کشمکش سے متاثر ہوئے بغیر ترقی کرتا رہے، تاہم انہوں نے بھی محسوس کر لیا ــــــ کہ آزادی کی جس خواہش کو انہوں نے پیش کیا تھا، وہ اپنے اندر تعلیمی اہمیت رکھتی ہے۔ جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ اور بہت سے خطوط میں جو انہوں نے ۲۱-۱۹۲۰ کے موسم سرما میں تحریر کئے تھے، اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ان خیالات کو اسکول کی زندگی میں عملی رنگ دینا چاہئے۔ ایک فوری عملی

مسئلہ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان میٹرکولیشن کا تھا جس کے لئے شانتی نکیتن کے لڑکے "پرائیویٹ امیدواروں" کی حیثیت سے تیار کر رہے تھے۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۲۲ ستمبر

ہم سب کو اس ڈیکلریشن پر دستخط کرتے وقت چبھن سی محسوس ہوئی ہے۔ کہ لڑکوں نے امتحان سے پہلے کے بارہ مہینوں میں "کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی ہے" حالانکہ وہ ہمارے ہی اسکول میں تمام سال پڑھتے رہے ہیں۔ ہم توڑ موڑ کر ان الفاظ کی تشریح کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب جبکہ سارا ملک آزادی کی طرف بڑھ رہا ہے، ہمیں بھی آزاد اور خود مختار ہو جانا چاہئے۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۸ دسمبر

آپ کے اس فیصلہ پر کہ میٹرکولیشن کے امتحان کو ترک کر دیا جائے، عام طور پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اب مطبخ میں برہمنوں کی قطاریں نہیں ہوتیں کیونکہ اب کوئی بھی اس بات کی پروا نہیں کرتا۔ اور اسکول میں اب میٹرکولیشن نہیں ہے، اس لئے کہ ہمارے اساتذہ میں سے کوئی بھی اس کی پروا نہیں کرتا۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۸ ردسمبر

ہم سب اس قدر خوش ہیں کہ میٹرکولیشن کو اب قطعی طور پر ترک کیا جا سکتا ہے۔ اب پرانے پیریڈ والے طلبا اپنے والدین سے مل کر اپنے متعلق فیصلہ کرلیں گے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ یقینی طور سے وشوا بھارتی میں داخل ہو جائیں گے، اور اس طرح جتنے بچوں کی ہمیں ضرورت ہوگی، وہ ہمیں مل جائیں گے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ دوسرے صوبوں سے وہ زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارا انتہائے نظر یہ ہونا چاہئے۔ کہ ہم ۱۰۰ سے زیادہ لڑکوں کو نہ لیں۔ یہ ایک اعتبار سے ہمارا بس منظر ہے۔ اور پھر ہمارے اساتذہ بھی ہوں گے جو خود ریسرچ اسکالر رہ چکے ہیں۔ اور ہم سب مل کر ایک خاندان بن جائیں گے۔ آل سولز کالج (آکسفورڈ) کے خیال سے مجھے ہمیشہ دل چسپی رہی ہے، جو خالصتاً تحقیقاتی کام کا ایک کالج ہے اور جہاں رسمی طالب علم کی جو ڈگریاں لینے کا خواہشمند ہو، ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ لیکن شاید میں بہت آگے کا خیال کر رہا ہوں۔ صرف گورودیو کے ساتھ اور ان کے کام میں زندگی بسر کرتا مستقبل کا خیال رکھنے کے لئے اور وقت

ہے، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایسا کرتا ہوا دیکھوں گا۔

ایک چیز کے بارے میں تو مجھے روز بروز زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہمیں سادگی اور غربت کو علمی نظر کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھنا چاہیئے، جس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے جائیں اور ذلیل حالت میں رہا جائے۔ میں ذرا فکرمند ہو جاتا ہوں جب میں سنتا ہوں کہ امریکہ سے بہت بڑی رقم کی آمد کا امکان ہے۔ خدا ہی کو علم ہے کہ آیا ہمیں اس کی ضرورت ہے؛ لیکن میں فضول خرچ بننے کی بجائے کنجوس بننا پسند کروں گا۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام ۲۰ دسمبر

یونا روانہ ہونے سے پہلے ہمیں میٹرکولیشن کے بارے میں طے کرنا تھا۔ اور اس مقام پر میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہماری کمزوری کیا ہے۔ میں نے آپ کی وہ چٹھی پڑھ کر سنائی جس میں آپ نے ہمیں پوری اجازت دیدی ہے کہ ہم اسے ختم کردیں۔ لیکن جب حقیقی آزمایش کا وقت آیا، اس وقت بہت سے اس خیال کے حامی تھے کہ معاملہ کو آپ کی آمد تک تعویق میں ڈال دیا جائے...... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب رائے شماری کی گئی تو اس وقت فوری طور پر ختم کر دینے کی تجویز کو صرف صدر کے کاسٹنگ ووٹ کے ذریعہ منظور کیا گیا۔ میں نے بہت سختی سے یہ بات محسوس کی کہ یہ چیز کافی نہیں ہے، اور یہ کہ ایسا زبردست انقلاب دو تہائی کی اکثریت کے بغیر عمل میں نہیں آنا چاہیئے۔...... یہ نہایت درجہ مایوس کن بات ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ اس سے متفق ہوں گے کہ یہ بہتر ہے کہ ہم اپنی کمزوری کا اقرار کرلیں بجائے اس کے کہ ہم آگے بڑھیں اس حالت میں کہ خود ہمارے گھر میں نا اتفاقی ہو اور ہماری طاقت حقیقی نہ ہو۔ ایک بہت ہی متاثر کرنے والی چیز یہ تھی کہ لڑکے اسے منسوخ کرنے پر متردد نہ تھے کیونکہ جیسا کہ انہوں نے مجھ سے کہا، ممکن ہے ان کے والدین انہیں وہاں سے اٹھالیں، مگر دنیا میں آشرم سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے۔

پھر جنوری میں کلکتہ کے طلبا نے ہڑتال کر دی اور مطالبہ کیا کہ ان کے کالجوں کو قومی بنا دیا جائے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام ۱۲ جنوری ۱۹۲۱

جو کچھ کلکتہ میں ہوا ہے اس کے بعد سے ہم کہہ رہے ہیں کہ ہماری عزت اس امر کی متقاضی ہے کہ اب ہم میٹرکولیشن کا نام بھی نہ لیں! شاستری مہاشے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ذلت ہے کہ نتائج کے بزدلانہ خدشات ہمیں فیصلہ کرنے سے باز رکھیں۔ مجھے صبر کی تلقین کرنے میں سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ میں نے تو اس تمام بحث کے دوران میں صرف ایک اصول پر عمل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں ایک خاندان کے افراد کی حیثیت سے ایک ساتھ عمل کرنا چاہیئے، تاکہ کسی قسم کی تلخی ہمارے دلوں میں پیدا نہ ہونے پائے۔ یہ بڑی مشکلات کا دور رہا ہے کیونکہ جذبات بہت ہیجان میں ہیں۔ لیکن ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا گیا جس سے صدمہ ہوا ور ہم سب نے منظور کر لیا ہے کہ ہم ایک ساتھ مل کر عمل کریں گے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام ۳۱ جنوری

آخر کار ہر ایک چیز کا تصفیہ مصالحت اور اتفاق رائے کے ساتھ ہو گیا، اور ہم نے میٹرکولیشن کو فی الفور ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، اور اس کا بھی کہ ہم اپنا نصاب خود بنائیں گے۔ یہ کام بروقت ہوا ہے اور اس میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ اب اسکول کی سب سے اعلیٰ جماعت وشوابھارتی کلاس کہلائے گی اور وہ براہِ راست وشوابھارتی تک لے جائے گی۔

وشوابھارتی کے ادبی اور فنی کام کی ترقی سے اینڈریوز کو خاص مسرت ہوئی۔ اس خط میں اس پارٹی کے کام کی وضاحت کی گئی ہے جسے ریاست گوالیار کے غاروں کی تصویروں کی نقل کرنے کے کام پر مامور کیا گیا تھا۔

ہمارے آرٹسٹوں نے گوالیار سے دیواروں اور چھت کی واقعی تصاویر بنا کر بھیجی ہیں جن کو دیکھ کر ہمارے دل مسرت سے لبریز ہو گئے ہیں۔ اپنے کام میں جس جوش اور خوشی کا وہ اظہار کر رہے ہیں، وہ بہت شاندار ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں مسٹر گاندھی سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ سوراج ملتے ہی وہ ان سب کو موقوف کر دیں گے لیکن میں موقوف نہیں کروں گا، میں موقوف نہیں کروں گا۔

رکھیتی موہن بابو کاٹھیاواڑ جا رہے ہیں تاکہ وہاں کے عوامی گیت اور روایتی گانے

جمع کریں۔ اس سے پہلے کہ وہ ناپید ہو جائیں۔

طلبا باہر نکل آئے ہیں۔ اب وہ لیڈروں سے کہہ رہے ہیں "ہمیں کام دو۔ ہم دیہات میں جاکر اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔" میں جانتا ہوں کہ آپ کی یہ خواہش ہوگی کہ ہم بھی اس میں پورا حصہ لیں۔ ہم نے پورے طور پر طے کر لیا ہے کہ، سرول کو ٹریننگ سینٹر کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔

آج شام کو ایک چھوٹا سا واقعہ ہو گیا ہے۔ جس سے مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ کو معلوم ہے کہ میں نے ابھی تک گجراتی مطبخ میں قدم تک نہیں دھرا، اس لئے کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی طرح بھی کسی کے جذبات کو ٹھیس لگاؤں۔ لیکن آج شب کو گجراتی لڑکے خود آئے ہیں، اور انہوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ یہ مستقبل کی جانب بہت بڑا قدم ہے۔ اور وہاں تک پہنچنے میں جو وقت اور تکلیف ہم نے اٹھائی ہے۔ اس کا بدل ہمیں مل گیا ہے۔

دیہات میں ٹریننگ سینٹر کا آغاز کر دیا گیا، اور ہمیں طلبا نے سرول میں نیپال چندر رائے کے ساتھ کام کرنا بھی شروع کر دیا۔ لیکن اینڈریوز کو بہ حیثیتِ مجموعی طلبا کی تحریک کی کمزوری کے بارے میں جو شبہات تھے، ان کا اظہار انہوں نے گاندھی کے نام ایک خط میں کر دیا۔

ایم۔ کے۔ گاندھی کے نام ۱۹ فروری

مجھے اندیشہ ہے کہ طلبا کی ایک بہت بڑی تعداد واپس چلی جائے گی، کیونکہ ابھی تک ایک کالج کو بھی قومی نہیں بنایا گیا۔ بہت کم طلبا نے سرگرمی سے مکمل طور پر دیہات کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ میں تو کافی پریشان ہوں۔ میں ابھی تک پاکیزگی نفس کے خیال کا حامی ہوں، لیکن جس پاکیزگی کا میں خیال کر رہا ہوں وہ وہ ہے جسے چند طلبا نیپال بابو کی معیت میں عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ وہ دیہات میں اپنی پکائی ہوئی خوراک پر زندگی گذارتے ہیں بسا اوقات بغیر بستر کے زمین پر سوتے ہیں، اپنے دیہاتی مدارس میں دوسروں کے ساتھ ساتھ اچھوتوں کے بچوں کو بھی داخل کرتے ہیں (ساتھ ہی منجملہ دیگر امور کے) چرخہ کاتنا بھی سکھاتے

ہیں لیکن کلکتہ میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلبا اپنا بہت سا وقت بیکاری میں گزار رہے ہیں، جس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ڈھاکہ کے اسکول کا ایک طالب علم جس کا بڑا بھائی میرا شاگرد تھا، مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ وہ کہتا تھا کہ میں غریبوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تمام تحریک اسی افسوسناک نتیجہ پر ختم ہوتی نظر آتی ہے، جس پر اور تحریکیں ختم ہوئی ہیں۔ اور میں اس معاملہ میں بہت بے خبر واقع ہوا ہوں۔"

اینڈریوز دسمبر ۱۹۲۰ میں پونا گئے جہاں کل ہند عیسائی طلبا کا جلسہ تھا۔ ان کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی کہ ہندوستان کے عیسائی حلقوں میں پھر ان کی پذیرائی کی جائے، اگرچہ کچھ طلبا جو جلسہ میں موجود تھے، ابھی تک ان کے "آنسنادٹ" کے بارے میں مشتبہ تھے۔ انہوں نے شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ کیا آپ ابھی تک عیسائی ہیں؟ اینڈریوز نے رنج اور افسوس کے ساتھ کہا۔ "اگر یہ لڑکے میرے چہرے سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ میں عیسائی ہوں تو پھر انہیں یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ میں عیسائی ہوں۔" لیکن ایسے طلبا اقلیت میں تھے۔ اکثریت نے ان کی تقریر کو بڑے ادب سے سنا۔ "اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ قربانی کی تلقین کرنے سے پہلے قربانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

پونا کی مسرتوں میں ایک مسرت یہ بھی تھی کہ وہاں دو عیسائی آشرموں کی بنیاد ڈالنے کے منصوبے سوچے گئے، ایک ترو پتور مدراس اور دوسرا پونا میں۔ "برادرہڈ آف دی امی ٹیشن آف جیزس" (اتباع مسیح کی برادری) کے خیالات برگ و بار لا رہے تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اینڈریوز نے نو عمر پیش روؤں کو نصیحت کی کہ وہ گرجا کی عیسائی رفاقت کے اندر رہ کر پورے امکانی طریقہ پر کام کریں۔ انہوں نے کہا کہ جو شہادت انہوں نے ۱۹۱۴ء میں طلب کیا تھا اور جس کی بہت زیادہ قیمت انہیں ادا کرنی پڑی، اب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ساتھ ہی انہوں نے ہر موقع پر ہندوستانی عیسائیوں کو نصیحت کی کہ وہ کلچر کے اس قومی ورثہ کو جس کی نمایندگی شانتی نکیتن کر رہا ہے، اپنائیں۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام ۱۵ جنوری

جہاں تک انسانی پہلو کا تعلق ہے بشرطیکہ میں یہ نام دے سکوں، میرا خیال نہیں ہے کہ آشرم اس سے زیادہ کبھی طاقتور رہا ہے۔ گہری انسانی محبتیں نازک پودوں کی طرح جڑ

رہی ہیں۔ اور یہی سچی بنیادیں ہیں۔ نہ کہ عمارتیں اور چونا۔ ۔ ۔ ۔ مزید برآں دو اور ترقیاں ہوئی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ بمبئی کی پارسی قوم ہم سے واقف ہوگئی ہے۔ اور ہمارا آغاز اچھا ہو گیا ہے۔ ثانیاً ہم نے بالآخر ہندوستانی عیسائی قوم کی علیحدگی کی دیوار کو ڈھا دیا ہے۔ اور اب ہمارے یہاں مدراس کے عیسائیوں کے ایک نہایت ذہین الطبع اور با اثر شخص کا بیٹا پڑھنے کے لئے آ گیا ہے۔ یہ میری حیثیت ہونا کے فوری نتائج میں سے ایک ہے، جہاں میں ہندوستانی عیسائیوں کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے گیا تھا۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام　　۱۳ مارچ ۱۹۲۱

ایک بات جو ہمیشہ میرے دل کے بالکل قریب رہی ہے یہ ہے کہ میں ہندوستانی عیسائیوں کو ہندوستانی زندگی کی شاندار اور مکمل دھارا میں واپس لے آؤں۔ جو انقلاب حال ہی میں رونما ہوا ہے وہ بہت ہی عجیب و غریب ہے۔ یعنی مجھے حرام سمجھنے کی بجائے میں دیکھتا ہوں کہ وہ ہر طرف سے میرے پاس آ رہے ہیں۔ اور ان کے خطوط کے جواب میں جو خط میں ان کے نام بھیجتا ہوں، ان پر وہ مسرت اور شکریہ کے ساتھ لبیک کہہ رہے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ وہ بہت بڑی تعداد میں شانتی نکیتن میں مختصر قیام کے لئے آ رہے ہیں۔

انہوں نے اس بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بھی جو پارسیوں کی قوم کو آشرم سے ہو گئی تھی کچھ کم جوش کے ساتھ پرورش نہیں کیا۔ اس کے بعض افراد نے اس کے کچھ عرصہ بعد ہی یہ تجویز پیش کی کہ وشوابھارتی میں ایک زرتشتی انسٹی ٹیوٹ کی بھی بنیاد ڈالی جائے۔ اس تجویز پر اینڈریوز کے تبصرہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ انہیں ان بڑے اصولوں کا کس قدر خیال تھا جو اس تجویز کی تہ میں مضمر تھے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کے نام

ایک زرتشتی انسٹی ٹیوٹ کے قیام سے میں اپنے دل میں بالکل خوش ہوں، بعینہٖ جس طرح سے میں ایک اسلامی انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کروں گا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری عبادت کی سیدھی سادی مرکزی جگہ اپنے سفید مرمریں فرش کے ساتھ جس میں تمام نقش و نگار اور ظاہری علامات کا فقدان ہے، سوائے ان خالصتہً سفید

پھولوں کے جنہیں بچے مذہبی عبادت کے وقت اپنے ساتھ لے آتے ہیں، عقیدہ کی ہماری انفرادی آزادی اور خدائے واحد کی ہماری مشترکہ عبادت کا بہترین مظہر ہے۔ ہم میں سے ہر ایک مجاز ہے کہ جو رنگ وہ پسند کرے، اس خالص سفیدی میں شامل کردے۔ لیکن اگر ہم اپنی علیحدہ مساجد اور گرجے اور آتش کدے تعمیر کریں گے، تو خطرہ ہے کہ اس صورت میں ہم دنیا کے مذہبی اختلافات کو از سر نو دہرانے لگ جائیں گے۔

اس باب کو اس خوبصورت شہادت پر ختم کیا جاتا ہے۔ جو اینڈریوز نے اپنی ۵۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ٹیگور کو لکھ کر بھیجی تھی۔

رابندرناتھ ٹیگور کے نام ۱۲ فروری ۱۹۲۱

آج میں مغربی حساب کے مطابق ۵۰ سال کا ہو گیا ہوں اور مشرقی حساب کے مطابق جو زیادہ صحیح ہے، میری عمر اکیاون سال کی ہو گئی ہے۔ یہ سال کتنی تیزی سے گزر گئے ہیں! یہ بھرپور زندگی رہی ہے۔ جو واقعات اور تبدیلیوں سے لبریز ہے اور باوجود اس کے اس تمام مدت میں میری زندگی کا اندرونی مرکزی سکون گہرا ہوتا گیا ہے اور مذہبی شکوک اور خدشات کے طوفان برپا ہونے بند ہو گئے ہیں، جیسا کہ ابتدائی ایام میں وہ برپا ہوا کرتے تھے، جبکہ میری اور آپ کی ملاقات کی ابتدا ہوئی۔ عہد عتیق میں نجات کے بارے میں ایک بہت ہی خوبصورت نغمہ ہے اور آج صبح سے مجھے بار بار اس کی یاد آ رہی ہے۔ اس میں ذیل کا ٹکڑا ایسا ہے جس سے لفظی مفہوم کے علاوہ دوسرا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے:

"وہ جو جہازوں میں سمندروں میں جاتے ہیں، جو گہرے اور وسیع سمندروں میں کاروبار کرتے ہیں، یہ لوگ خدا کے کاموں کا اور اس کے عجائبات کا سمندر کی گہرائیوں میں مطالعہ کرتے ہیں۔

کیونکہ وہ حکم دیتا ہے اور اس کی آواز پر طوفانی ہوائیں بلند ہوتی ہیں۔ وہ آسمان تک بلند ہوتی ہیں اور پھر گہرائیوں میں چلی جاتی ہیں۔ ان کی روح اس تکلیف سے پگھل جاتی ہے۔

پھر وہ خدا سے بہ آواز بلند دعائیں مانگتے ہیں اور وہ انہیں مصیبت سے نجات دیتا ہے۔ وہ طوفان کو سکون بخشتا ہے۔

پھر وہ خوش ہوتے ہیں، کیونکہ وہ پُرسکون حالات میں آجاتے ہیں۔ اس طرح سے وہ انہیں ان کی جائے پناہ میں لے آتا ہے، جہاں وہ رہنا چاہتے ہیں۔

کاش لوگ اس بنا پر خدا کی اس کے اچھے کاموں کے سبب حمد کرتے؟

شانتی نکیتن میں مجھے وہ جائے پناہ مل گئی ہے جہاں میں رہنا چاہتا ہوں۔ اور طوفان میں سے مجھے سکون حاصل ہو گیا ہے۔ . . . . آج بستر میں ان تمام باتوں پر غور کر تا رہا ہوں۔ جب میں نے سکونِ زندگی اور ذاتِ واحد کی عبادت میں اپنے سر کو جھکایا، ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی دوستی نے جو ہمیشہ دن دن بھر میرے کمرے میں رہتے ہیں، اور میرے برانڈے میں کھیلتے رہتے ہیں، مجھے اس امر کے احساس سے دور رکھا ہے کہ میں سال بہ سال بوڑھا ہو رہا ہوں۔ اور خود آشرم بھی آپ کے پھل گنی ماں کے خواب کی طرح بہار کا ایک چکر ہے۔ جو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ اور جب مجھے ایک ہی ہفتہ میں جادوگر، سپیرا، اور سرکس یہ سب چیزیں دیکھنے کو مل جائیں اور لڑکے دوڑتے ہوئے مجھ سے یہ کہنے کے لئے میرے کمرے میں آئیں۔ کہ کس طرح وہ شخص سرپٹ دوڑنے کی حالت میں سفید گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا اور آتشیں حلقوں میں سے کود کر نکل گیا۔ اور کس طرح سے گھوڑا اپنی پچھلی ٹانگوں کے بل کھڑا ہو گیا اور کس طرح اس نے اپنی اگلی ٹانگوں کو سرکس کے مینیجر کی گردن میں ڈال دیا، اور اسی قسم کی دوسری ہزارہا باتیں۔ جب یہ سب کچھ ایک شخص کو اس کی ۵۱ ویں سالگرہ کے موقع پر میسر آجائیں تو اس وقت جاڑے کا لبادہ بلاشبہ بہت سرعت کے ساتھ اُتر پڑتا ہے، اور انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ تو مجسم بہار ہے!

؎ یہ اشارہ ہے ٹیگور کے ڈرامہ کی طرف جس کا نام ہے "بہار کا چکر"۔

باب ۱۲

غربا پر ظلم

۱۹۲۰ عمر ۵۱-۵۰

گجرات میں اکتوبر ۱۹۲۰ء میں چاند گرہن کے موقع پر اینڈریوز نے ایک عظیم الشان جلسہ میں ایک ایسے گرو کے لئے عوام کی ذاتی عقیدت مندی کا مشاہدہ کیا تھا جو "خاص مطلع نظر کے لئے اپنے آپ کو قربان کر رہا ہے" یہ قومی بیداری شہروں یا تعلیم یافتہ جماعتوں تک محدود نہ تھی جس کا خواب انہوں نے پندرہ سال پیشتر دیکھا تھا۔ گاندھی ہر جگہ قومی احیا کے پانچ نکات والے پروگرام کا اعلان کر رہے تھے: اچھوتوں کی نجات، ہندو مسلم اتحاد، عورتوں کا احترام شراب نوشی اور دوسری منشیات سے پرہیز اور سودیشی پر عمل۔ جس طرح ایک کلائی سے پانچ انگلیاں پھوٹتی ہیں، اسی طرح وہ اپنے ہاتھ کو بلند کر کے کہتے کہ اہمسا کی متحد کرنے والی اسپرٹ کے ذریعہ ان پانچوں مقاصد پر کنٹرول رکھا جائے گا۔

اینڈریوز نے دل و جان سے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ سیاست دان کی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی آدمی کی حیثیت سے یہ یقین رکھتے ہوئے کہ اس کی تہ میں اہم مذہبی اصول کار فرما ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ "ہندوستان کے لئے خود مختاری مکمل اور سالم خود مختاری میرے لئے ایک مذہبی اصول کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ میں عیسائی ہوں۔ لیکن خود مختاری اس وقت تک حاصل نہیں کی جاسکتی، جب تک کہ کروڑوں اچھوت غلامی کی حالت میں رہیں گے۔

انگلستان میرے لئے وہ انگلستان نہیں ہو سکتا جس انگلستان سے میں محبت کرتا ہوں، اگر وہ آئرلینڈ اور ہندوستان کو فوجی طاقت کے ذریعہ اپنے قبضہ میں رکھتا ہے، اور ہندوستان آپ کے لئے وہ ہندوستان نہیں ہو سکتا جس ہندوستان کا خواب آپ اور میں دونوں دیکھ رہے ہیں، اگر وہ اپنے پس ماندہ فرقوں کو سوراج نہیں دیتا۔[1] ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف خواہ وہ کوئی ہوں وہ مظلوم غربا کی حمایت کرتے تھے۔ ہر قسم کے ظلم و ستم اور مردم آزاری کے خلاف وہ قوم کے سامنے عدم تشدد اور سچائی کا مطمحِ نظر پیش کرتے تھے۔

(۱)

مارچ ۱۹۲۱ میں اہم اور وسیع پیمانہ پر ریلوے کی ہڑتالیں ہوئیں، جن سے کلکتہ کے مضافات میں ہاوڑہ، لیلوآہ اور کیچرا پارا کے عظیم الشان کارخانوں اور لکھنو اور دوسرے مقامات کے ورکشاپوں کے بہت سے ملازمین متاثر ہوئے۔ بعض حلقوں میں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ تمام صنعتی شورش کو خواہ وہ ریلوے میں ہو یا دوسری صنعتوں میں، یہ کہہ کر ٹال دیا جائے کہ وہ سیاسی شورش کرنے والوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ زندگی کے مصارف بے حد بڑھ گئے تھے، تنخواہوں میں عام اضافوں کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی، اور بسا اوقات مزدوروں کو رہنے کے لئے نہایت ہی خراب قسم کے مکان دیئے جاتے تھے، باوجود اس کے کہ بہت سی فرموں نے دورانِ جنگ میں بے انتہا منافع کمایا تھا۔ ۱۹۲۰ کے شروع میں ریلوے ملازمین کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا کہ ان کی شکایات پر غور کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے گی۔ جب بالآخر انہوں نے مارچ ۱۹۲۱ء میں کام چھوڑ دیا، تو اس وقت وہ وعدہ ایفائی کے انتظار میں ایک سال سے زیادہ عرصہ تک ہڑتال سے رکے رہے۔

اینڈریوز ان مزدوروں سے ملنے کے لئے گئے۔ اپنی آنکھوں سے ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو دیکھا، اور طویل اور صبر آزما بحثوں اور گفتگوؤں کے بعد ان کی شکایات

---

[1] طلبائے کلکتہ کے سامنے ۱۹ر جنوری ۱۹۲۱ کو کی گئی تھی اور خط طلبا کے نام) صفحہ ۲۴۴ پر درج ہے۔

اور مطالبات کی اچھی طرح سے جانچ پڑتال کی۔ آخر میں انھوں نے مزدوروں کو راضی کرلیا کہ وہ ایسے مطالبات کو واپس لے لیں جو انہیں غیر معقول اور مبالغہ آمیز معلوم ہوتے تھے۔ اور خود اس بات کی ذمہ داری لی کہ وہ کلکتہ میں ریلوے کمپنیوں کے ایجنٹوں کے سامنے اور دہلی میں ریلوے بورڈ کے روبرو اصلاح کی اہم ضرورت کا مسئلہ پیش کریں گے۔

مگر بجلی مچا دینے والے واقعات کے بغیر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

"ایک اتوار کی شام کو ہاوڑہ میں مغرب کے بعد میں بڑے بڑے مستریوں اور دوسرے مزدوروں کو جمع کر رہا تھا تاکہ ہڑتال کے متعلق اہم جلسہ منعقد کیا جائے۔ ہم تقریباً نصف میل طے کرکے ایک میدان میں پہنچے۔ جب ہم ایک گلی میں سے گزر رہے تھے۔ تو میں نے دیکھا کہ وہاں ایک بہت بڑا مجمع پہلے سے موجود ہے۔ اور ہر شخص لاٹھی سے مسلح ہے۔ بعض لاٹھیاں بہت بڑی تھیں کم سے کم ۵۰۰ آدمی وہاں ہونگے۔ ایک آدمی بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور کہا یہ مجمع گورکھوں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے جنہوں نے اُس سہ پہر کو اُن پر ظلم کیا تھا۔

"میں فوراً مجمع میں گھس گیا۔ وہاں بہت شور ہو رہا تھا کچھ لمحوں کے لئے تو مجھے یہ معلوم ہو سکا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس مجمع نے اس سے پہلے مجھے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں کون ہوں۔ میں ایک چھوٹی سی کرسی پر کھڑا ہو گیا اور چند منٹ تک مجمع خاموش نہ ہو سکا۔ وہ اپنی لاٹھیوں کو گھما رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ گورکھوں نے ان کی بے عزتی کی ہے اور وہ اس کا بدلہ لیں گے۔ مجھے کچھ دیر تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ آیا وہ قابو میں لائے جا سکیں گے اور جو لوگ میرے ساتھ تھے وہ بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ آخر کار جب لوگوں نے میری تقریر سننی شروع کر دی تو میں نے انہیں بتایا کہ میں کون ہوں۔ اور وہ میری آواز سنتے ہی بالکل خاموش ہو گئے پھر میں نے انہیں مسٹر گاندھی کے حالات سنائے اور بتایا کہ میں جنوبی افریقہ میں اُن کے ساتھ تھا اور انہیں ترغیب دی کہ وہ اپنی لاٹھیاں نیچے رکھ دیں۔ اس پر ہر ایک نے (چند ایک نے قدرے بد دلی کے ساتھ) اپنی اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی۔

"اس کے بعد میں نے اُن سے کہا کہ اگر گورکھوں نے ان پر ظلم کیا ہے، تو میں اس واقعہ کی اطلاع متعلقہ افسران کو کر دوں گا۔ لیکن انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ وہ خود کس حد تک

مورد الزام ہیں، اس لئے کہ وہ خود اتوار کی صبح کو اسٹیشن کے احاطہ میں گھس کر تشددانہ حرکتوں کا ارتکاب کرچکے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں خود پورے تین گھنٹے تک لائن کے گرد و پیش گھومتا رہا ہوں، اس مجمع کا پتہ لگانے کے لئے جس نے عمارتوں کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے، اور دو آدمیوں کو ملامار کر آدھ مرا بنا دیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ انہیں یہ بات نہ بھولنی چاہئے اور انہیں دوبارہ یہ حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اگر انہوں نے پھر ایسا کیا تو میں ان کی امداد کرنے سے قطعاً انکار کردوں گا۔"

انہوں نے بلاشبہ اس تقریر کو بہت خاموشی سے سنا اور میں نے پھر ان سے کہا۔

"کیا آپ لوگ وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کوئی تشدد نہیں کریں گے؟ اور ان سب نے چلا کر کہا کہ ہاں ہم وعدہ کرتے ہیں پھر میں نے "مہاتما گاندھی کی جے" پکاری اور ان سب نے جواب میں "مہاتما گاندھی کی جے!" کے نعرے لگائے، اور اس کے بعد جلسہ بغیر کسی مزید تقریر کے ختم ہوگیا۔ وہ سب ہنس رہے تھے اور میرے ساتھ واپس چلنے کو تیار تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مجمع بے حد مسرور نظر آرہا تھا۔ یہ نمایاں مثال ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے یہ غریب لوگ بچوں سے کس قدر مشابہ ہیں۔ اس کے بعد میں نے سب سے بڑے افسر سے سنا کہ اگر وہ اس رات گورکھوں پر حملہ کرنے چلے جاتے تو حکم دیدیا گیا تھا کہ ان پر فوراً گولی چلادی جائے، اس لئے کہ اس صبح کو وہ ایک گورکھا گارڈ کو مغلوب کرچکے تھے۔"[1]

یہ باتیں اس زمانہ میں انجام دی گئیں جب ان پر مسلسل بیماری کے حملے ہو رہے تھے۔

لیلوآہ میں مجھے ہسپتال سے لایا گیا تاکہ میں ہڑتالیوں کے ایک جلسہ میں شرکت کرسکوں۔ ان رعایتوں کے پیش نظر جو کلکتہ میں ان کے ساتھ کی گئی تھیں، وہ اپنے کام پر جانے کے لئے رضامند ہوگئے اور میں ایک وفد لے کر ریلوے بورڈ کے پاس گیا، ان امور کے بارے میں جنہیں کلکتہ کے حکام طے کرنے سے معذور رہتے۔ جلسہ بالکل متحد الخیال تھا۔ اور ان سب نے "اینڈریوز صاحب کی جے" کے نعرے لگائے۔"[2]

اینڈریوز کا مقصد یہ تھا کہ خود مزدوروں کی خاطر فوری اور باعزت تصفیہ عمل میں لایا جائے جن کے پاس ہڑتال کے دوران میں کوئی فنڈ موجود نہ تھا۔ جس کا وہ سہارا لے سکیں۔ ان کے کام

---

[1] و [2] غیر مطبوعہ یادداشتیں۔

بکوان شورش پسندوں نے اور زیادہ مشکل بنا دیا جو مزدوروں کے مسائل سے بالکل ناواقف تھے
اور بعض اوقات مشکوک طریقے استعمال کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی سیدھے سادے اور ضعیف الاعتقاد
مزدوروں پر بڑا اثر رکھتے تھے، کیونکہ وہ سادھوؤں کا سا گیروا لباس پہنتے تھے۔

مدکنچرا پارا میں ایک سوامی نے ایک سخت قسم کی متشددانہ تقریر میں مجھ پر حملے کئے اور ہندی میں کہا: "تم ان انگریز صاحبوں میں سے ہو جو عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہندوستان کو غربا کی تکالیف سے فائدہ اٹھا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ کیا یہ میرے متعلق دلچسپ بیان نہیں ہے؟"

اینڈریوز نے ریلوے بورڈ کے لئے ہڑتالوں کے اسباب اور ان کے علاج کے بارے میں ایک جامع یادداشت مرتب کی۔ مزدوروں کے منصفانہ اور معقول مطالبات کے تجزیہ اور اظہار سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں کس قدر عملی کاروباری قابلیت تھی۔ لیکن جس اصول پر انہوں نے سب سے زیادہ زور دیا، وہ یہ تھا کہ مینیجروں اور مزدوروں کے مابین براہ راست انسانی رابطہ اور ذاتی دوستانہ کی سخت ضرورت ہے، اور ضمنی نتیجہ کی حیثیت سے انہوں نے مطالبہ کیا کہ ناگوار نسلی امتیازات کا خاتمہ ہو جانا چاہیئے جن کے لئے ریلوے اس قدر بدنام ہے۔ انہوں نے ماحول بدلنے اور منتظمین کے رویّہ میں تبدیلی پیدا کرنے پر زور دیا، اس لئے کہ صرف اسی صورت میں مزدوروں کے لئے یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ سمجھیں کہ وہ باہمی امداد کے عظیم الشان کام میں رفقائے کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ریلوے کے مزدور غلطی پر ہوں کیونکہ بسا اوقات وہ غلطی پر ہوتے تھے، جہاں تک ہڑتال کے فوری بہانہ کی تلاش کا تعلق ہے۔ لیکن جب تک ملازمت کے استقلال اور پراویڈنٹ فنڈ کی سہولتوں کی معقول طریقہ سے ضمانت نہیں مل جاتی، جب تک ان کے رہنے کے مکانات میں شریفانہ گھریلو زندگی کا امکان پیدا نہیں ہو جاتا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ہندوستانی اور "اینگلو انڈین" کے روح فرسا امتیاز کا خاتمہ نہیں ہو جاتا، اس وقت تک بے انصافی کا احساس جس کی وجہ سے وہ غیر ذمہ دار شورش پسندوں کے ہاتھ میں آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ دور نہیں ہو سکے گا۔ اینڈریوز نے بحث کرتے ہوئے کہا: یقیناً مطمئن مزدور ریلوے کے لئے...... اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ مستقل پٹریوں کا استحکام! جتنی توجہ تم موخر الذکر پر دیتے ہو، اتنی ہی توجہ اول الذکر پر کیوں نہیں دیتے؟ تاہم وہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ سیاسی پہلو کی طرح انسانیت کا پہلو بھی زیر غور آنا چاہیئے۔

انڈیا کہ جب تک ہندوستانیوں کی سیاسی بداعتمادی قائم رہے گی، اس وقت تک انہیں ایسٹ انڈیا ریلوے جیسے اہم ادارہ کے نظم و نسق میں کوئی حقیقی حصہ نہیں مل سکتا۔

(۲)

ابھی اینڈریوز کیچرا پاڑا ہی میں تھے کہ ان کے پاس دوسری مصائب کی اطلاعیں آنی شروع ہوگئیں۔ ۱۹۱۹ میں بہت زیادہ اشخاص نے آسام کے چائے کے باغات میں ملازمت حاصل کرلی تھی جہاں مزدوروں کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی اس کے بعد یک لخت سرد بازاری ہوگئی جس کی وجہ سے شدید بیکاری پھیل گئی، اور فاقہ زدہ مزدور باغات کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ ریل اور سڑک دونوں راستوں سے وہ چاندپور میں داخل ہوئے جو مشرقی بنگال میں ایک چھوٹا سا شہر ہے وہاں سے گوالندو کی طرف چلے جہاں سے کلکتہ اور مغربی سمت کی طرف ریلیں چھوٹتی ہیں اور جو دریا کی راہ سے ۹۰ میل کا سفر ہے۔

چاندپور کے حکام نے جو شہر میں وبا کے خطرہ سے آگاہ تھے فی الفور عملی کارروائی کی، اور پناہ گزینوں کو ممکن عجلت کے ساتھ گوالندو بھیج دیا۔ لیکن چائے کے باغبانوں کو اپنے مزدوروں کے غائب ہوجانے سے سخت اندیشہ پیدا ہوا اور ان کے معروضات کی وجہ سے چاندپور اور دار جلنگ دونوں مقامات پر دباؤ پڑا تاکہ ان کے خروج کی روک تھام کی جاسکے۔ بنگال کی حکومت نے اعلان کردیا کہ گوالندو تک مفت سفر کے طریقہ کو بند کردیا جائے گا۔ جب اس کی سب کو خبر ہوگئی تو تین سو سے اوپر اشخاص ایک جہاز پر چڑھ دوڑے، اور حکام میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ انہیں اُتار دیتے۔ جو لوگ جہاز پر نہ چڑھ سکے وہ بندر کے قریب کے ریلوے اسٹیشن میں پناہ گزین ہوگئے۔ عین اس وقت ایک سخت مصیبت کی ابتدا ہوئی۔ جہاز تک پہنچنے کی کشمکش میں باغبانوں کے نمائندہ کے ساتھ ذرا ہاتھا پائی ہوگئی۔ اور رات کو گورکھا سپاہیوں کا ایک دستہ بھیجا گیا۔ جس نے ان بدبخت پناہ گزینوں کو ریلوے کے احاطہ سے نکال کر فٹ بال کے میدان میں چلے جانے پر مجبور کردیا، جہاں پناہ کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ان میں مقابلہ کرنے کی نہ تو ہمت ہی تھی اور نہ ارادہ اور جس وحشیانہ پن کا ان کے ساتھ برتاؤ کیا گیا، اس کی وجہ سے عوام میں ناراضگی

کا زبردست طوفان پھیل گیا۔

یہ ۱۹؍مئی کی رات کا واقعہ ہے۔ ۲۰؍مئی کی شام کو اینڈریوز چاندپور پہنچ گئے۔ دوسرے دن پو پھٹتے ہی وہ بچشم خود واقعات کا مشاہدہ کرنے اور مزدوروں، شہریوں اور حکومت کے افسروں سے بات چیت کرنے باہر نکلے۔ دن بھر انہوں نے افسروں کو ترغیب دیکر آمادہ کرلیا کہ وہ متفقہ طور پر حکومت سے سفارش کریں گے کہ ان واماندہ اشخاص کے لئے کرایہ کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے پانچ ہزار روپے دیئے جائیں، اور باقی رقم پرائیویٹ چندہ سے پوری کرلی جائے گی، ان کی آمد سے تین دن کے اندر ہی حکومت کے جواب کا انتظار کئے بغیر اتنا روپیہ جمع ہو گیا جس سے پوری شرح کرایہ پر پانچ سو تندرست آدمیوں کو گوالندو بھیج دیا گیا۔ مگر اب بھی چار ہزار بے خانماں اشخاص باقی رہتے تھے۔ حکومت کے پاس سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اور ہیضہ کی جس خوفناک وبا کا خطرہ تھا، اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ اینڈریوز خود دارجلینگ گئے تاکہ معلوم کریں کہ کیا ہو سکتا ہے، اور جانے سے پہلے بیماروں اور بھوکوں کو امداد پہنچانے کے لئے انہوں نے ایک مضبوط مقامی کمیٹی بنادی۔

وہ چند دن بعد واپس لوٹے ایسی حالت میں کہ وہ دلی طور پر بے حد پریشان تھے۔ بصورت حال ان کے خیال میں ایسی تھی کہ وزارت صحت کو اسے اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے تھا۔ مگر بجائے اس کے ہوم ڈیپارٹمنٹ من مانی طریقہ سے اس کے بارے میں کارروائی کر رہا تھا۔ البتہ ایک نکتہ حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ یعنی انہیں یقین دلایا گیا کہ معمولی رعایتی شرح کے ٹکٹ پر سفر کرنے کی ممانعت کا کوئی ارادہ نہیں ہے، اگرچہ حکم قطعی الفاظ پر مشتمل تھا۔ اور جہاز کے افسروں نے اس کا وہی مطلب لیا جو ان کا مفہوم تھا۔ رعایتی شرح پر امدادی رقم ضرورت کے لئے کافی تھی جب اینڈریوز واپس پر کلکتہ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ یقین دلانے میں کافی تاخیر سے کام لیا گیا ہے۔

گورکھوں کے ظلم کے خلاف عوام کے غم و غصہ نے قدرتی طور پر ہڑتال کی صورت اختیار کرلی۔ بنگال کے انتہاپسندوں نے تمام دوسرے امور سے بے نیاز ہو کر ریلوے اور جہازوں کے ملازمین کو ترغیب دی کہ وہ طویل ہڑتال کریں۔ ایسی جس کے لئے کوئی صنعتی جواز نہیں تھا اور جس کا مقصد بھی خالص سیاسی تھا۔ ہڑتال کا جو تباہ کن اثر ان بے خانماں افراد پر پڑنے والا تھا، اسے کوئی اہمیت نہیں

دی گئی۔ اینڈریوز کلکتہ کے ایک جلسہ میں موجود تھے۔ جہاں نہایت سنجیدگی سے یہ دلیل پیش کی گئی کہ ہیضہ کے کیمپ میں چند ہزار قلیوں کو قربان کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان کے بتیس کروڑ باشندوں کو سوراج مل سکے" جب ان کے بولنے کی باری آئی اس وقت انہوں نے کمزور قلیوں اور ریلوے کے مزدوروں کو اس طریقہ سے مفروضہ قومی مقصد کے لئے استعمال کئے جانے کے خلاف ہر ممکن دلیل پیش کی۔

"میں نے کبھی نہیں کہا اور نہ کہہ سکتا تھا کہ سب ہڑتالیں غلط ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں عدم تعاون کی تحریک بذاتِ خود ناانصافی کے خلاف ایک قومی ہڑتال کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن میں خود اپنی آنکھوں سے بھوک کی شدید تکلیف میں مزدوروں کے تشدد کو دیکھ چکا ہوں۔ قومی تحریک کا غیر متشددانہ پہلو ہر لحظہ خطرہ میں ہے، جب تک کہ چاندپور اور گولوآہ کی ہڑتال جاری ہے یہ بیکار اور بے معنی ہڑتالیں ہرگز ہرگز نہیں دہرائی جانی چاہئیں۔ ہم لوگوں کو جو تعلیم یافتہ ہیں، تکلیف برداشت کرنی چاہئے۔ ہمیں نہیں چاہئے کہ غریبوں کو ظلم کا نشانہ بنائیں۔"

ان کی وکالت بیکار گئی۔ ان کے چاندپور پہنچنے تک ہڑتال شروع ہو چکی تھی۔ ہزار ہا اشخاص جنہیں سرٹیفکٹ دیدیا گیا تھا کہ وہ بیماری کے اثرات سے محفوظ ہیں گھر جانے کے لئے جہاز پر چڑھنے کا بیتابی سے انتظار کر رہے تھے۔ اینڈریوز اور ان کے رضاکاروں کا دل شکن کام یہ تھا کہ وہ انہیں واپس ان کی کمپنیوں میں بھیجیں، ایسی حالت میں کہ وہ مایوسیوں کی وجہ سے آنسو بہا رہے تھے۔ چند دن کے بعد وہ جہاز پر سوار ہو گئے۔ مگر عملہ یوریشین تھا اور وہی عملہ جہاز میں کوئلہ جھونکنے کے کام پر مامور تھا اور مختلف فرائض انجام دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ذلت کا پیالہ بھر گیا ہے۔

مشرقی بنگال میں واپس آجانے کے بعد اینڈریوز اپنے ہی مخصوص کام میں پورے طور پر معروف ہو گئے، مصالحت اور ہیلپسی کا کام جسے انہوں نے نہایت اعلیٰ طریقہ سے انجام دیا تھا۔ تاکہ خود ہیضہ والے کیمپ میں زیادہ سے زیادہ ذاتی امداد کا کام کریں۔ لیکن ان کی بے پناہ ہمدردی ایسی زبردست امداد تھی جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اعتماد اور ان کی قدردانی کی گرم جوشی اور ان کی شریفانہ خوش طبعی نے نہایت متضاد عناصر کو حاجت مندوں کی

فیاضانہ خدمت کے کام پر نہایت نمایاں طور پر اکٹھا کر دیا تھا۔ ایک دن آسام کے بشپ رائٹ ریورینڈ ایچ پاکینہم والش مع اپنی بیوی کے چاند پور آنکلے۔ اور اجازت طلب کی کہ انہیں بھی خدمت کا موقع دیا جائے۔ یہ کوئی مبارک موقع نہ تھا کیونکہ حکومت کی ایجنسیوں کے ساتھ امدادی کام میں اشتراکِ عمل کی کوشش اینڈریوز کی جملہ مساعی کے باوجود ٹوٹ چکی تھی، اور قوم پرست رضا کار ایسے عجیب یورپین جوڑے کو بُری نظر سے دیکھ رہے تھے، اس لئے کہ وہ ہاتھ کے کتے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے نہ تھے۔ ان کے نزدیک سرکاری افسر اور بشپ میں فرق کرنا دشوار تھا۔ مگر اینڈریوز کی حاضر دماغی موقع کے مطابق ثابت ہوئی۔ انہوں نے ندامت محسوس کرتے ہوئے بیان کیا کہ "تم دیکھتے ہو یہ انگریز نہیں ہیں۔ یہ آیرلینڈ کی آزاد مملکت کے باشندے ہیں! انہیں خدمت کا موقع تو دو۔ چنانچہ تجویز منظور کر لی گئی۔ اینڈریوز بڑے سلیقے سے پیچھے ہٹ گئے اور نئے رنگروٹوں کو کام کرنے کا پورا پورا موقع دے دیا۔ جب اینڈریوز واپس لوٹے اس وقت تک وہ اچھی طرح کام شروع کر چکے تھے۔ جس نہ تھکنے والی خوش دلی کے ساتھ بشپ ہیضہ کی بالٹیاں پاخانہ میں لے جاتے تھے اور جس مہارت کے ساتھ بشپ کی بیوی یتیم شیر خوار بچوں کی نگہداشت کرتی تھی، اس نے ان سب کا احترام حاصل کر لیا۔ اس موقع پر ایک پُر مذاق آیرش پادری کے ریمارک کی یاد آ جاتی ہے۔ جس نے سینٹ اسٹیفنز کا معائنہ کرنے کے بعد کہا تھا: "مجھے یہ محسوس کرتے ہوئے دقت محسوس ہوتی ہے کہ رُودرا انگریز نہیں ہیں اور اینڈریوز آیرلینڈ کے رہنے والے نہیں ہیں۔"

لیکن سب سے زیادہ دیرپا اثر جو اینڈریوز نے اپنے رفقائے کار کے دل و دماغ پر ڈالا وہ یہ نہیں تھا کہ وہ حیرت انگیز ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور بالکل نڈر ہو کر خدمتِ خلق میں منہمک رہتے تھے۔ (اگرچہ یہ صفات بجائے خود عظیم الشان ہیں) بلکہ وہ طوفان کی موجودگی میں کامل سکون کا مظاہرہ تھا۔ وہ سکون اور اطمینان کا پیکرِ مجسم تھے۔ اس ہیجان انگیز اور ہنگامہ پرور فضا میں ان کی موجودگی مرہم کا کام دیتی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ سکون اور بشاشت کی روح تھے، ایسی روح جو دوسروں کو ہلچل سے نکال کر سکون کی طرف لے جاتی تھی۔[1] وہ ایسے ماحول کے حامل تھے جو مقدس، الگ تھلگ

---

[1] بشپ اور مسز پیکنہم والش کا مکتوب بنام مصنفین۔

اور غیر مرئی تھا اور وہ بہتر طریقے سے نبرد آزما ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ان کی روح "لڑائی" سے بلند تھی۔
ان کی اپنی شخصیت کی گرم جوشی اور ضیا باری کا کچھ کچھ احساس اُس بیان سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ایک چھوٹے سے لڑکے کے متعلق لکھا ہے۔ جس نے ہیضہ سے نجات پائی تھی اور جو ..... پناہ گزینوں کی آخری کھیپ کے ساتھ جہاز کے ڈیک پر لیٹا ہوا تھا۔ اور جس کے ساتھ اینڈریوز ..... بھی بدقسمت چاندپور سے روانہ ہو کر جا رہے تھے۔

"جہاز ساحل کے بالکل قریب دریا کے موڑ کے گرد آ گیا۔ بشاش تنومند بچے دریا کے کنارے کنارے دوڑ رہے تھے۔ اور "گاندھی مہاراج کی جے! گاندھی مہاراج کی جے!" کے نعرے لگا رہے تھے۔

"میں عرشہ پر علیل بچے کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ کھلبلی سے تمتما اٹھا۔ اور اس نے بہ دقت تمام اپنا سر اٹھایا۔ پھر اس نے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑنے والے بچوں کو دیکھ کر اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایسی آواز سے جو درد انگیز اور کمزور تھی: "گاندھی مہاراج کی جے" پکاری۔ جب میں اسے ڈیک پر لیٹے ہوئے اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اس وقت میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرے دل میں یہ خیال بجلی کی چمک کی طرح آیا کہ اس بچے کے ایمان میں خود خدا جلوہ گر ہے۔ اس تمام تکلیف اور کرب و اضطراب میں بھی "خدا لازوال مسرت کی اشکال میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے"[۱]

ابھی دو کام اور کرنے باقی تھے۔ پہلا یہ تھا کہ جو مزدور دور دراز آسام سے گورکھپور ضلع میں واپس آ رہے تھے، ان کا اپنے ہی دیہات میں بائیکاٹ نہ ہو جیسا کہ قبل کے سال میں فجی سے لوٹنے والے بعض مزدوروں کا ہوا تھا۔ وہ لوگوں سے یہ کہنے کے لئے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں گئے کہ "وہ انہیں اپنے دلوں میں جگہ دیں، بعینہ جس طرح سے چاندپور کے لوگوں نے انہیں اپنے دل میں جگہ دی تھی" اس کام میں انہیں بہت زیادہ کامیابی ہوئی، اگرچہ ایک سادھو نے جسے خود فجی سے شورش پسند ہونے کی وجہ سے خارج البلد کر دیا گیا تھا، ہر جگہ ان کا پیچھا کیا اور ان کو

---

[۱] ماڈرن ریویو، اگست ۱۹۲۱۔ یہ جملہ اپنشد سے لیا گیا ہے

بہت کچھ روحانی تکلیف پہنچائی۔ یہ شخص عام شاہراہ پر اینڈریوز کو برا بھلا کہتا تھا اس لئے کہ انہوں نے فجی میں پیدا ہونے والے بدقسمت ہندوستانیوں کو جو کلکتہ کی گودیوں میں بے یار و مددگار بیٹھے ہوئے سٹے اپنے وطن جانے سے نہیں روکا تھا۔ دوسرا کام مخالفانہ سیاسی قوتوں یعنی انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کو مشرقی بنگال کی خطرناک صورت حالات سے آگاہ کرنا تھا۔ انہوں نے گاندھی کو خط لکھا اور ان سے درخواست کی کہ وہ بنفسِ نفیس وہاں جائیں۔

"مشرقی بنگال تشدد کی سرحد پر کھڑا ہے۔۔۔۔۔ یہ نہایت درجہ جذباتی، تندمزاج، آتشیں اور مغلوب الغضب ہے۔ ایسے آتش گیر مادے میں یہ ہڑتالیں گھاس میں دیا سلائی لگانے کے مترادف ہوں گی۔ اور مجھے ہر لحہ یہ فکر ہے کہ کہیں یہ مادہ پھوٹ نہ پڑے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ صرف آپ ہی درحقیقت اہنسا کا پرچار کر سکتے ہیں۔ میں اپنی سی پوری کوشش کر چکا ہوں اور ان کے بدلے میں انہوں نے مجھے محبت کے خزانے دیئے ہیں۔ وقتاً فوقتاً جب بھی میں نے آپ کے بارے میں ذکر کیا ہے، ان کا جوش کم ہو گیا ہے۔ وہ اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ میری موجودگی میں ایک لفظ بھی تشدد کا منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔ لیکن میں نے یہ بات بسا اوقات سنی ہے کہ جب میں ان کے جلسوں میں نہیں ہوتا یا تقریر کرنے کے بعد وہاں سے چلا آتا ہوں، تو پھر پہلی سی ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

جہاز اور ریلوے کمپنیوں نے جو تنزلہ پیش کی ہیں۔ وہ باعزت ہیں۔ لیکن۔۔۔۔۔ اس وقت ہڑتال کا جنون سوار ہے۔ جو جلسہ میں نے (کلکتہ میں) چاندپور کے بارے میں کیا تھا، سارا جلسہ میرے خلاف تھا، سوائے تین چار اشخاص کے جو کرشنا کمار مترا اور ایک دو مارواڑیوں جیسے رفیقوں پر مشتمل تھے۔ مارواڑی کہتے ہیں کہ وہ پریشان حال مزدوروں کی امداد کے لئے روپے کی بڑی سے بڑی رقم میرے ہاتھوں میں دینے کے لئے تیار ہیں لیکن وہ کمیٹی پر بھروسہ نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ ہڑتال کو ترقی دینے میں صرف کر دی جائے گی۔"[1]

---

[1] مکتوب بنام ایم۔ کے گاندھی، ۲۱ جون ۱۹۲۱ء پریشان حال مزدور جن کی مصائب کو اینڈریوز نے تن تنہا کم کرنے کی کوشش کی تھی، نہ صرف چائے کے باغات کے قلی تھے، بلکہ ریلوے ملازمین بھی تھے (دیاتی انگے صفحہ)

اینڈریوز نے چاند پور کے واقعات کے متعلق سرکاری طرزِ عمل کی بالکل کھلا مذمت کی۔ بعینہٖ جس طرح سے انہوں نے ان قوم پرستوں کے طرزِ عمل کی مذمت کی تھی جو صورتِ حالات کو اپنے مقاصد کے لیئے استعمال کر رہے تھے۔

"حکومت اپنے عمل کے ذریعہ غریبوں اور مظلوموں کے مقابلہ میں مستقل حقوق رکھنے والوں، سرمایہ داروں۔ اور طاقت رکھنے والوں کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دے رہی ہے۔ یہ ایک خوفناک الزام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غریب لوگ اپنی مصیبت کے زمانہ میں مہاتما گاندھی کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔ جو اپنے لوگوں کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔

......۱۹۲۱...... اہم امور میں ۱۹۱۹ سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ مفروضہ دوعملی پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ وہ قدیم استبداد کی ایک شکل ہے۔ میں اس معیار کو پرکھ رہا ہوں جس کا ذکر نے وائسرائے نے کیا ہے۔ اور میں اس کی جانچ الفاظ کی بجائے عمل سے کر رہا ہوں۔۔۔ وار مبلنگ میں مشورہ کے لیئے مجھے کسی ہندوستانی ممبر سے نہیں ملایا گیا۔ میں سر ہنری وہیلر اور لارڈ رونالڈشے پر الزام نہیں لگاتا کہ انہوں نے جان بوجھ کر اپنے ہندوستانی رفقائے کار کی ہتک کی ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ دار جلنگ میں استبدادیت کی ذہنیت میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا اور یہ کہ ریفارمز ایکٹ کے ذریعہ جس ذمہ دارانہ حکومت کا وعدہ کیا گیا تھا اور جس کے معنی ہندوستانی رائے اور ہندوستانی کا احترام ہونا چاہیئے تھا، ابھی تک کلیتہً غائب ہے۔"

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ دارالعوام میں ایک ممبر نے مطالبہ کیا کہ "اس نام نہاد شریف آدمی کو انگلستان بھیج دینا چاہیئے تاکہ بغاوت کے الزام میں اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ بنگال کے مقامی سرکاری عمال زیادہ واقف تھے۔ اور اس لیئے انہوں نے اس قسم کی تباہ کن کارروائی

(بقیہ نوٹ) جب ہڑتال سیاسی حربے کے طور پر ناکام ہو گئی تو انتہا پسند جنہوں نے وہ ہڑتال کرائی تھی ان ہڑتالیوں کو چھوڑ کر چلے گئے جنہیں وہ اب تک اپنے اغراض کے لیے استعمال کر رہے تھے صرف اینڈریوز نے جو شروع سے ہڑتال کے خلاف تھے ان کا ساتھ دیا اور ان کی وکالت کی۔

نہیں کی۔ ان میں سے ایک نے کہا "تم تو جانتے ہو کہ ہم نہیں جانتے کہ ایسے آدمی کا کیا کریں۔ اگر ہم اسے قید خانے میں ڈال دیتے ہیں تو اسے کوئی پروانہ ہوگی اور پھر ایک مصیبت برپا ہو جائے گی! اگر آج وائسرائے یہ کہہ دے کہ "یہ کرو" اور اینڈریوز یہ کہہ دیں کہ "نہ کرو" تو اس صورت میں ۹۹ فی صد ہندوستانی وائسرائے کا کہنا ماننے کی بجائے اینڈریوز کا حکم مانیں گے"[1]

مانٹیگو نے بھی اپنی آنکھوں سے اینڈریوز کا کچھ کچھ اثر دیکھ لیا تھا اور ان کا یہ جملہ جو انہوں نے اینڈریوز کے متعلق استعمال کیا تھا کہ "وہ اللہ میاں کے حمقاؤں میں سے ہیں" ایک وسیع حد تک اس شخص کی فطرت پر روشنی ڈالتا ہے جس سے انہیں سابقہ پڑا تھا۔

مگر اینڈریوز "احمق" نہیں تھے اور اگر تھے تو وہ اس قسم کے تھے جن کا ذکر شیکسپیئر کے ڈراموں میں صحیح الرائے اور بے لاگ "حمقا" کے طور پر کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں مزدوروں کے مسئلہ پر جو رائل کمیشن بیٹھا تھا اس نے ۱۹۲۱ کی بے چینی کے بنیادی وجوہ کے بارے میں ان کے اندازہ کی حرف بہ حرف تصدیق کی ہے۔ اس نے ان کی طرح مالکان اور مزدوروں کے باہمی اختلافات کی خلیج کا ذکر کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ "جو اسباب صنعت سے غیر متعلق ہیں وہ ہڑتالوں میں اس سے کہیں کم حصہ لیتے ہیں جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے" اور یہ کہ آسام کے چائے کے باغات سے مزدوروں کا چل چلاؤ کسی شورش کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ اس کی وجہ وہ ناکافی شرح مزدوری تھی جس سے مصارف زندگی قطعی طور پر پورے نہیں ہوتے تھے۔ چاند پور کے ڈرامہ کا آخری حصہ اینڈریوز کے پرانے دوست سر تیج بہادر سپرو کی قیام گاہ پر جون میں بمقام شملہ ادا کیا گیا۔ سپرو بیان کرتے ہیں:۔

"میں شملہ میں حکومتِ ہند کے ممبر قانون کی حیثیت سے مقیم تھا کہ ایک دن چارلی اپنی عادت کے مطابق اطلاع دئے بغیر آگئے اور کہا کہ "میں آپ کے یہاں قیام کروں گا۔" جب ..... اس شام کو ہم کھانے پر اکیلے رہ گئے۔ تو وہ مجھ پر برس ہی پڑے۔ اس لئے کہ میں "اس شیطانی حکومت" کی ملازمت کرنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق

---

[1] یہ قصہ ریورینڈ اے۔ سی۔ ڈی ویک کا بیان کردہ ہے جن سے یہ بات کہی گئی تھی۔

ان کے اعتراضات کے جواب دئے۔ میں نے کہا کہ "آپ کو جا کر وائسرائے سے ملنا چاہئے۔" "میں وائسرائے سے ملوں؟ یہ ہرگز نہ ہوگا!" میں نے زور دیکر کہا: "آپ کو جانا ہوگا۔ اور آپ جائیں گے۔" "نہیں۔" بہر حال میں نے لارڈ ریڈنگ کو لکھ بھیجا اور دوسرے دن صبح کو وائسرائے کا ایک خط آگیا جس میں چارلی سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ آئیں اور ان کے ساتھ چائے نوشی کریں۔ چارلی وہ خط ہلاتے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور ایسے لہجے میں جس سے برہمی اور مزاج کا اظہار ہوتا تھا، انہوں نے چلّا کر کہا: "تم درحقیقت شیطان ہو!" میں نے کہا "تو: کیا آپ جا رہے ہیں؟" "نہیں، بالکل نہیں، میں ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گا۔" میں نے جواب میں کہا: "بلاشبہ آپ جائیں گے۔" اور ٹیلیفون اٹھا کر وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری سے کہہ دیا کہ وہ آ رہے ہیں۔ اس کے بعد ان کی صد لئے احتجاج کے باوجود انہیں کپڑے بدلوا کر بھیج دیا گیا۔ (ان کے پاس بدلنے کے لئے دوسری قمیض نہ تھی) وہ مسحور اور خوش خوش واپس آئے۔ انہوں نے کہا: "بلاشبہ آپ ٹھیک راستہ پر تھے۔ اور میں غلطی پر تھا۔ وہ اچھے آدمی ہیں! میں خوش ہوں کہ میں گیا۔ وہ معمولی وائسرائے کی طرح نہیں ہیں!"[1]

(۳۳)

جولائی ۱۹۲۱ میں رابندر ناتھ ٹیگور یورپ سے واپس آگئے۔ کئی مہینہ تک تحریکِ عدم تعاون جس کی روحِ رواں گاندھی جی کی ذات تھی، منجملہ دیگر امور کے اینڈریوز کے ساتھ خط و کتابت کا موضوعِ بحث بنی رہی۔ ٹیگور لفظ "عدم تعاون" کی منفی مہک کو ناپسند کرتے تھے۔ آرٹسٹ اور مستقبل کے پیامبر کی حیثیت سے ان کی فطرت اپنے سامنے ایسی دنیا کا تخیل رکھتی تھی، جو باہمی اشتراک عمل پر کاربند ہو تاکہ اس کے حسن اور اس کی نیکی کے تمام ذرائع سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اینڈریوز کا جمالیاتی پہلو ٹیگور کے شکوک کا موید تھا۔ مگر ساتھ ہی ان کی مجاہدانہ روح گاندھی کے بہادرانہ عزائم کی طرف دار..... تھی۔ انہوں نے جنوری میں

---

[1] یہ دلچسپ کہانی سر سپرو نے بنارسی داس چترویدی سے خود بیان کی تھی۔

ٹیگور کو لکھا:۔

"میں مہاتما گاندھی کی کلکتہ والی تقریر کا تراشہ بھیج رہا ہوں۔ درحقیقت یہ بہت ہی عظیم الشان تقریر تھی۔ یہ تقریر سادگی، کفایت شعاری اور ایثار و قربانی کی دعوت دیتی ہے اور اسی وجہ سے ان کی بلند اپیل اس قدر طاقتور اور موثر بن گئی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریک جنگ کی طرح لوگوں کو ابتدائی وحشیانہ دور کی طرف لے جا رہی ہے اور اس لطیف زرخیزی سے متمتع نہیں ہونے دینا چاہتی۔ جو مستقبل میں بنی نوع انسان کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ اس میں وہ سب کچھ نہیں ہے جو آرٹ کا مفہوم ہے، جو موسیقی کا مفہوم ہے جو گیت کا مفہوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مہاتما جی کہیں گے: "بالکل ایسا ہی ہے۔ لیکن کیا ہم جنگ نہیں کر رہے ہیں؟" میں جانتا ہوں کہ اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے اور ہمیں اس کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ ہم کبھی نہ کبھی زندگی کو عریاں کر کے دکھا دیں۔ لیکن بالکل عریاں؟... نہیں!"[1]

ٹیگور کی واپسی کے بعد کے مہینوں میں اینڈریوز کا دل و دماغ اس اختلاف سے متاثر ہو گیا تھا جو ان کے دو بڑے دوستوں کے مزاج اور طرزِ عمل سے رونما تھا۔ جو گہری عقیدت انہیں گرو کی حیثیت سے ٹیگور کی ذات سے تھی۔ وہ اس بات میں مانع تھی کہ وہ اختلافات کے بارے میں ان سے اسی آزادی اور شدت سے بحث کریں جس آزادی اور شدت سے وہ گاندھی سے بحث کر سکتے تھے جن کے دلائل ٹیگور کے سامنے لا کر بحث کے لئے پیش کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ ان پر نئے سرے سے بحث ہو۔ وہ ان دونوں میں باہمی اشتراکِ عمل کا راستہ ڈھونڈنے کے اس قدر متمنی تھے۔ کہ بڑے دادا جن کی اپنی آرا گاندھی کی موافقت میں تھیں، انہیں مذاقاً "نشانِ الحاق" (ٹیگور۔گاندھی) کہا کرتے تھے۔

گاندھی نے اینڈریوز کی درخواست پر مشرقی بنگال اور آسام کا دورہ کیا اور جب وہ کلکتہ سے گزرے تو ان میں اور ٹیگور میں طویل گفتگوئیں ہوئیں جن میں اینڈریوز بھی شریک تھے۔

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء

روحانی جذبہ کے رجحان میں بہت سی پریشان کُن باتیں نظر آئیں۔ بعض نوجوانوں نے بھی جنہیں اینڈریوز نے سرول کے دیہات میں تربیت دینے کے کام کے لیے لے لیا تھا۔ قومی اسکول میں تعلیم دینے کے سخت کام کے مقابلہ میں سیاسی جدوجہد کے ہیجان کو ترجیح دی تھی۔

رابندرناتھ ٹیگور کہتے تھے کہ عوام کا طرزِ عمل گہرے اخلاقی یقین کی بجائے وحشیانہ جوش و خروش کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک قابلِ ذکر فقرے کے ذریعہ اس کا اظہار کیا، اس میں چیخ ہی چیخ ہے۔ اور گیت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ وہ دبے ہوئے احساسات کا اظہار ہے۔ جس کا نتیجہ متحمل روحانی قوت کی مسلسل طاقت میں جلوہ گر ہونے کی بجائے تقریرِ عمل کے تشدد میں ظاہر ہو رہا ہے ..... مزید اختلاف یہ تھا کہ شاعر کھدر کی تحریک میں کوئی حصہ لینے کی تائید میں نہ تھے جو بظاہر ہندوستان کی غربت کے عالمگیر حل کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا حالانکہ اس کے متعلق خود ان کی رائے تھی کہ وہ امداد کرنے کا محض ایک ضمنی طریقہ ہے۔

گاندھی نے متعصبانہ یا محدود قومیت کے خلاف ٹیگور کی تنبیہوں کو تسلیم کر لیا اور انہیں "قابلِ احترام سنتری" کے شریفانہ لقب سے یاد کیا۔ لیکن انہوں نے اپنے اس عقیدہ کو دہرایا کہ انہوں نے گھر کے کتے ہوئے سوتی کپڑے کی تیاری اور استعمال کو اپنے پروگرام میں جو نمایاں جگہ دی ہے وہ ہندوستان کی شدید غربت کو دور کرنے کا عملی اور فوری طریقہ ہے۔

"ہمارا عدم تعاون نہ انگریزوں سے ہے اور نہ مغرب سے ہے۔ یہ تو مادی تہذیب اور اس کے متعلقات لالچ اور کمزوروں کی لوٹ کھسوٹ سے ہے ..... کروڑوں بھوکے انسان صرف ایک نظم کے متمنی ہیں، یعنی طاقت دینے والی خوراک کے۔"[1]

اینڈریوز اور ٹیگور کی تمام تر ہمدردی غمزدہ دل کی چیخ سے وابستہ تھی لیکن جب

---

[1] مزید حوالہ کیلئے خیالاتِ مہاتما گاندھی پڑھئے۔

گاندھی نے غیر ملکی کپڑوں کی ڈرامائی ہولی کے ذریعہ سودیشی کا سبق لوگوں کے دلوں تک پہنچانے کی کوشش کی، اس وقت اینڈریوز نے انہیں بہت سے دل سوز خطوط بھیجے۔

"میں جانتا ہوں کہ غیر ملکی کپڑے کی ہولی غربا کی امداد کے لئے کھیلی جا رہی ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ غلط راستہ پہ گامزن ہیں۔ اس لفظ "غیر ملکی" میں قومی جذبہ تنگ اسرائد طریقہ سے اپیل کی گئی ہے۔ جس کی روزبروز روک تھام کی ضرورت ہے نہ کہ اس امر کی کہ اسے مزید تقویت دی جائے۔ خوبصورت اور نازک کپڑوں کے اس عظیم الشان ڈھیر کو آپ کے آگ لگانے کی تصویر نے مجھے بہت صدمہ پہنچایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس عظیم الشان بیرونی دنیا کو نظرانداز کر رہے ہیں جس سے ہمارا تعلق ہے اور خود غرضی کے ساتھ اپنے آپ کو صرف ہندوستان پر مرکوز کر رہے ہیں، اور مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اقدام ہمیں اسی پرانی اور مکروہ خود غرضانہ قومیت کی طرف لے جائے گا۔

..... میں بے انتہا خوش تھا جب آپ شراب نوشی، افیم، چرس، بھنگ خوری اور چھوت چھات، قومی تفاخر۔ وغیرہ جیسی بنیادی اخلاقی برائیوں پر ضرب کاری لگا رہے تھے اور جب آپ ایسی حیرت انگیز اور خوبصورت رقیق القلبی کے ساتھ عصمت فروشی کی خوفناک برائی کو دور کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن ..... خود اپنے ہم جنس مردوں اور عورتوں، غیر ملکی بھائیوں اور بہنوں کی شریفانہ دستکاریوں کو یہ کہکر نذر آتش کر ڈالنا کہ ان کا استعمال روحوں کو ناپاک کر دے گا، میں آپ سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ تمام باتیں کس قدر مختلف معلوم ہوتی ہیں! کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اب اس کھدر کو پہنتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے جو آپ نے مجھے دیا ہے، مبادا مجھ میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں ایک منافق کی طرح دوسرے آدمیوں کے اعمال کا جائزہ لے رہا ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ "میں تجھ سے زیادہ مقدس ہوں۔" اس قسم کا احساس میرے دل میں اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔

"آپ جانتے ہیں کہ جب آپ کے کسی کام سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔ تو میں چلا آتا ہوا آپ کے پاس آ جاتا ہوں اور اس واقعہ نے مجھے بے حد تکلیف پہنچائی ہے۔"[1]

---

[1] "خیالات مہاتما گاندھی"

اِس حقیقت نے کہ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی بنگال کے ضلع کھلنا میں قحط کے دوران میں منائی گئی، جس کے سردی سے کپکپانے والے ننگے دیہاتیوں کی تصویر ہمیشہ ان کے دماغ میں رہی، اسے اور بھی زیادہ ناقابلِ برداشت بنا دیا، مگر گاندھی نے انہیں محبت اور تفصیل سے جواب دیا[1]۔

"مجھے یہ چیز حد درجہ ذلت آمیز معلوم ہوتی ہے کہ میں غربا کو وہ غیر ملکی کپڑا دوں محض اس لئے کہ ہم اسے کسی مصرف میں نہیں لاسکتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر زور تمام غیر ملکی اشیا پر ہوتا تو بیشک یہ معاملہ نسلی، مقامی اور شرانگیز ہوتا۔ زور فقط ہر قسم کے غیر ملکی کپڑے پر ہے۔ آج ہندوستان نسلی جذبہ سے سرشار ہے۔ لوگوں کے دل بغض و عناد سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں اس عناد کو آدمیوں کی بجائے چیزوں کی طرف منتقل کر رہا ہوں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلاشبہ میری رائے میں کپڑوں کا جلانا تحریک کے لئے لازمی چیز نہیں ہے ایک شخص تحریک کے اندر رہ سکتا ہے خواہ وہ ہولی کو ناپسند ہی کیوں نہ کرے۔ مہادیو[2] کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ آپ نے ساری تحریک کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے آپ کو لکھا تھا کہ اگر آپ نے ایسا کیا ہے تو بھی آپ کے ساتھ میری محبت غیر متاثر رہیگی۔ لیکن قدرتی طور پر مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوگا کہ اس تحریک پر پہلے کی طرح آپ پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔"

ابھی ان تکلیف دہ خیالات کا باہمی تبادلہ ہو ہی رہا تھا کہ اینڈریوز کو پھر ایک مرتبہ کینیا طلب کر لیا گیا۔ وہاں روانہ ہونے سے پہلے "موپلا بغاوت" جنوب میں پھوٹ پڑی تھی۔ جب وہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہندوستان واپس لوٹے ہیں۔ تو یہاں تشدد کے واقعات شروع ہو چکے تھے۔ نومبر میں پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر بمبئی میں فتنہ و فساد شروع ہو گیا جسے پانچ دن تک گاندھی اور ان کے رفقائے کار قابو میں لانے سے قاصر رہے۔

---

[1] مکاتیب مورخہ ۱۳ اگست ۱۴ اور ۲۵ ستمبر ۱۹۲۱ء۔
[2] گاندھی کے سیکریٹری مہادیو دیسائی آنجہانی۔

گاندھی نے تحریک عدم تعاون کو واپس نہیں لیا۔ لیکن انہوں نے اپنے لئے پانچ دن کا برت تجویز کیا تاکہ وہ اس کا معاوضہ اپنی جسمانی ریاضت سے دیں۔ انہوں نے اینڈریوز سے درخواست کی کہ وہ کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد کے لئے کوئی مذہبی پیغام دیں۔ اینڈریوز اس کے لئے رضامند ہو گئے، مگر متضاد جذبات کے ساتھ انہوں نے ٹیگور کو لکھا :

"یہ کرسمس کا دن ہے۔ اور میں کانگریس میں شریک ہونے کے لئے جا رہا ہوں۔ اور راستہ بھر جنگ وجدل کا شور وغوغا مجھے دکھائی دیتا رہا ہے۔ اس تمام عرصہ میں سول نافرمانی تشدد کے کنارے کنارے چلتی رہی ہے۔ مگر اس کے باوجود بہت سی باتیں ایسی ہیں جو صحیح معنوں میں بہادرانہ ہیں ـــــ ایک نئی اسپرٹ جو ماضی کی غلامانہ اسپرٹ سے بالکل ہی الگ ہے۔

"خود میرا دل زخمی ہے۔ مجھے احمد آباد میں تقریر کرنی ہے۔ لیکن یہ جاننا بلاشبہ بہت ہی مشکل ہے کہ کیا کہا جائے۔ میں ضرور تشدد کے ان بیہودہ مظاہروں کے خلاف کچھ نہ کچھ کہوں گا، یہ دھمکیاں، معاشرتی بائیکاٹ، کپڑوں کا جلانا - - - -

"مجھے اروبندو گھوش کا یہ قول یاد آ رہا ہے: کچھ کہنا بالکل بیکار ہے، لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ کیا ایسی حالت میں جبکہ انسان تھکا ہوا ہو، اور جبکہ انسان کا اعتقاد دھندلا ہو چکا ہو خاموشی بہترین چیز نہیں ہے؟

کانگریس کے اجلاس کے پہلے دن اینڈریوز احمد آباد کے زبردست مجمع کے سامنے بدیشی کپڑے کے یورپین سوٹ میں نمودار ہوئے، اور انہوں نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ وہ کیوں اپنے معمولی گھر کے کتے ہوئے ہندوستانی لباس میں نہیں آئے۔ مجمع نے کم نہ ہونے والی محبت اور ادب سے ان کی تقریر سنی۔ بمبئی کے ایک قوم پرست اخبار "جنم بھومی" نے تو در حقیقت نہایت زوردار الفاظ میں اس کی تائید کی تھی کہ اینڈریوز کو خود کانگریس کا صدر نامزد کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ بدیشی کپڑے کی ہولی کے خلاف جو اختلاف انہیں ہے، اسے انتخاب کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے، اور یہ کہ وہ "پاکیزگی نفس" کی تحریک کے روح رواں ہیں۔ یہ تجویز منظور نہیں ہوئی۔ لیکن جب ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کا ریزولیوشن جلسہ

کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت اینڈریوز کے خیالات کا اثر نمایاں تھا۔ گاندھی نے جب ان کی تقریر سنی تو ہنسی کی جھلک کے ساتھ کہا: "چارلی، یہ سب آپ کی شرارت ہے"۔

(۴)

اینڈریوز نے ۱۹۲۱ کے غبار آلود سیاسی دنگل میں اپنے فرائضِ منصبی کے پیشِ نظر اپنا پارٹ ادا کیا۔ لیکن اُس سال کے آخری ایام میں وہ کرخت مباحث اور لسانی جنگ و جدل سے بہت کچھ اکتا گئے تھے۔ وہ اس امر سے جس کا علم انہیں عرصے سے تھا اور زیادہ اچھی طرح سے آگاہ ہو گئے تھے کہ کوئی نسبتی یا دنیوی اچھائی، حتیٰ کہ انصاف اور نیکی کے لئے شریف ترین کش مکش بذاتِ خود مکمل طور پر انسانی اسپرٹ کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

تمام معیاری اور مثالی معاشرتی نظاموں میں سنیاسیوں کے لئے کوئی نہ کوئی جگہ ضرور ہونی چاہئے۔ سرزمین پر خدائی سلطنت کے بھی اپنے راستے اور خیاباں ہونے چاہئیں تاکہ کم تعلیم یافتہ آدمی ان سے مستفید ہو سکیں، ورنہ انسانی زندگی خواہ کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو، اپنی حد بندی محسوس کئے بغیر نہ رہیگی۔

۱۹۲۲ کے ابتدائی مہینوں میں انہیں وہ سکونِ خاطر حاصل ہو گیا جس کی انہیں ضرورت تھی۔ مگر سنیاسیوں کی راہبانہ زندگی میں نہیں بلکہ کمزوروں اور محتاجوں کی رفاقت میں، جہاں بحث و مباحثہ خاموش ہو جاتا ہے اور صرف محبت ہی کی زبان استعمال میں آتی ہے۔ چھ ہفتہ تک وہ جنوبی ہند میں ملبار، کوچین اور ٹراونکور کے ان علاقوں میں رہے جہاں موپلا آباد تھے اور جہاں انہوں نے "ہندو مسلم اتحاد کو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ کس طرح سے چھوت چھات کی آگ کو جھلس رہی ہے"[۱] صورتِ حالات کے متعلق جو مضامین انہوں نے لکھے، ان سے ہندوؤں کے بعض طبقے سخت ناراض ہو گئے، اس لئے کہ انہوں نے سالِ گزشتہ کی شورش کا سارا الزام حقارت زدہ اور مظلوم مسلم موپلوں پر نہیں ڈالا تھا۔ انہیں یقین

---

[۱] مکتوب بنام رابندرناتھ ٹیگور، ۲۷ جنوری ۱۹۲۲۔

تھا کہ مصیبت کی حقیقی جڑ چھوت چھات تھی جس کا بڑا اثر ادنیٰ ذاتوں کے ہندوؤں اور موپلاؤں پر یکساں طور سے پڑا تھا۔ اس کے بعد کے ایک خوفناک منظر کا اثر تو ساری زندگی ان کے دل و دماغ پر رہا۔ ملیبار کے اچھوتوں کے ایک نہایت گندے جھونپڑے میں ایک غریب عورت کو دیکھا جو اپنے شیر خوار بچے اور دو نو عمر بچوں کے ساتھ رہتی تھی، اور وہ بچوں کو پیار کرنے اور ان سے اظہار ہمدردی کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ ماں نے ایک خوفناک چیخ ماری اور سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بچے اس سے چمٹے ہوئے رو رہے تھے۔ "اس نے دراصل یہ خیال کیا تھا کہ میں اسے مارنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہوں۔ انسانی مصیبت کی کتنی صدیاں اس واقعہ کی پشت پر ہیں!"

اچھوتوں کے ادنیٰ ترین طبقوں میں "گاندھی کے بھائی" کی آمد کی خبر اڑ گئی۔ ان کے بڑے بڑے اجتماع ہوئے، اور اینڈریوز اپنے پرجوش ترجمانوں کی معیت میں جن میں نوجوان قوم پرست عیسائی اور ہندو دونوں شامل تھے، ان میں گھومتے پھرے۔ وہ زبان درازی اور بیہودگی کے کچھ ایسے عادی تھے کہ اینڈریوز کو ان کے غلامانہ خوف پر غالب آنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کچھ عرصہ لگا۔ لیکن سب سے تکلیف دہ یہ انکشاف تھا کہ ٹراونکور کے شاہی گرجا ان کے ہم مذہب تھے جو عملی طور پر "اونچی ذات" شمار ہوتے تھے۔ اور چھوت چھات کے پابند تھے، اگرچہ بعض نو عمر اس کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ کوٹائیم میں ان کے میزبان مسٹر کے۔ کورو ولا ان میں سے ایک تھے۔ انہوں نے ایک دن اچھوتوں کے علاقہ میں مشترکہ کھانے کا انتظام کیا، مگر افسوس یہ ہے کہ بہت کم عیسائی آئے۔ لیکن جو شریک ہوئے انہیں یاد رہا۔ کہ اینڈریوز اپنے اچھوت بھائیوں کو اس امر کا احساس کرانے کے شوق میں کہ وہ بھی ان میں سے ہیں کس طرح مجمع میں ننگے پاؤں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہے۔۔۔۔۔ اور کس طرح کھردری سڑک پر چل کر اپنے پیروں کو زخمی کر لیا۔

یہ کش مکش جس میں وہ تنہا لڑ رہے تھے برابر جاری رہی۔ مدراس میں شریف شہر نے ایک عام جلسہ منعقد کیا کہ کینیا کی مخالفت ایشیائی پالیسی کے خلاف لیجسلیٹو کونسل نے جو صدائے احتجاج بلند کی ہے، اس کی تائید کی جائے۔ یہ معاملہ ایسا تھا جس میں سارا ہندوستان متحد ہو سکتا،

تھا۔ لیکن "عدم تعاون کرنے والوں" نے جلسہ کو درہم برہم کردیا، اور پلیٹ فارم پر جو اعتدال پسند تھے۔ ان کو غل مچا مچا کر خاموش کردیا۔ اینڈریوز نے بھی اس بدتمیز مجمع کا مقابلہ کیا، انہوں نے کہا ؛ "میں صرف پانچ الفاظ کہنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں: "میں — تمہارے — باعث سخت — شرمندہ — ہوں!"

دس دن کے بعد وہ دوہزار میل پرے تھے۔ اور ٹونڈلہ کے ہندوستانی ریلوے مزدوروں کی لائنز میں ایک چھوٹے سے تنگ کمرے میں جس میں فرنیچر تک نہ تھا مقیم تھے۔ یہ زمانہ ہڑتال کا تھا۔ اور اس مصیبت میں انہوں نے اپنی سی پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس ہڑتال کی وجہ وہ ناقابل برداشت اور حقارت آمیز سلوک تھا جو ریلوے کے بڑے "یوروپین" ملازم اپنے ماتحت ہندوستانی ملازمین سے روا رکھتے تھے۔ یہ بے عزتی انہیں کھل رہی تھی۔ اور بالآخر ملازمین نے جذبات سے متاثر ہو کر اور نوٹس دئے بغیر کام چھوڑ دیا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ جس معاملہ کو سامنے رکھ کر انہوں نے یہ قدم اٹھایا تھا وہ بہت ہی بودا تھا اور مظلوم شخص نے بہت غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ اینڈریوز نے غیر ہر دلعزیز فریق کا ساتھ دیا۔ اور ہڑتالیوں کو کام پر واپس جانے کی ترغیب دینی شروع کردی، ان طعنوں کی پرواکئے بغیر کہ "انہیں یقیناً رشوت دی گئی ہوگی۔" کئی دن کے خاموش، صبر آزما اور دوستانہ مباحث کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ ملازمین کے ایک نجی جلسہ نے بہ اتفاق رائے کام پر چلے جانے کی رائے دی۔ مگر اس کے بعد ایک پبلک جلسہ نے سارا کیا کرایا کام اکارت کردیا۔ بیرونی لوگ مجمع کے ساتھ مل گئے۔ مجمع عام کے ایک غیر معروف مقرر نے بالکل بے جوڑ تقریر کے ذریعہ اپنے سامعین کو خوب بھڑکایا۔ اور ہڑتال از سر نو شروع کردی گئی۔ اینڈریوز جتنا کام کر چکے تھے اس سب کو پھر نئے سرے سے کرنا پڑا۔ انہوں نے تین ہفتے سے زیادہ مدت لی۔ اور اس تمام عرصہ میں تحقیق کرنے والے وہی تن تنہا شخص تھے، حالانکہ دہلی صرف چند گھنٹے کے فاصلہ پر تھی۔ عام پبلک کی بے اعتنائی سے انہیں سخت اذیت پہنچی۔ انہوں نے اخبارات کو ڈانٹ کر لکھا ؛ "ہم اس کے مستحق ہیں کہ ہمیں بے آرامی اور تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر یہ غریب لوگ جاہل اور نا واقف ہیں تو یہ خود ہماری غفلت کا نتیجہ ہے۔" انہوں نے ٹیگور کو لکھا: ؎

؎ مکتوب مورخہ ۲۶ فروری ۱۹۲۲

"میں اس قدر تھک گیا ہوں کہ مرنے کے قریب جا پہنچا ہوں۔ بلاشبہ اس قسم کی زندگی میں جیسی بسر کر رہا ہوں، کوئی آرام، کوئی آسائش، کوئی سکون یا کوئی سبکدوشی نہیں ہے۔ لیکن میں غربا میں ہوں اور ان کی تکلیف کو کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ ہمیشہ یہی غریب گھاس سے ان بڑے لوگوں کے پاؤں تلے روندی جاتی ہے۔"

اس اثنا میں سول نافرمانی کا نہایت المناک طریقہ سے خاتمہ ہو چکا تھا۔ جب چوری چورا کے مقام پر پولیس کے ۲۱ سپاہی ایک مشتعل مجمع کے ہاتھوں سنگسار کر دیے گئے تو گاندھی نے اس تحریک کو بند کر دیا۔ خود انہیں گرفتار کر لیا گیا اور قید میں ڈال دیا گیا۔ لیکن دوران مقدمہ میں ان کے طرز عمل کی شرافت نے بہت حد تک اس عام تلخی کا مداوا کر دیا تھا۔ جہاں تک اینڈریوز کا تعلق ہے۔ چوری چورا کے خوفناک واقعہ نے کلیتہً ان کے اس اعتقاد کو اور قوی کر دیا کہ سیاسی اور معاشرتی آزادی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

"(ایک ہندوستانی طالب علم نے کہا تھا کہ) جب میں ان مظالم اور استحصال بالجبر کے واقعات کا خیال کرتا ہوں۔ جو میرے خاندان کے لوگ اور ان جیسے دوسرے لوگ: زمیندار، ہمارے حصۂ ملک میں غربا پر روا رکھتے ہیں، تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیوں نہیں اٹھتے اور کیوں سوتے میں ہم سب کو قتل نہیں کر دیتے؟" کسی نے اتفاقیہ طور پر پوچھا کہ وہ "حصۂ ملک" کونسا ہے؟ اس نے جواب دیا "چوری چورا جو صوبجات متحدہ میں واقع ہے۔"

اینڈریوز نے لکھا: "آج ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ وہ ظلم ہے جو غریبوں پر ڈھایا جاتا ہے۔ اور غریبوں سے بے رحمی کے ساتھ پیش آنے والا سب سے بڑا ظالم وہ ہے۔ جو خود کمینہ ہے اور اپنے سے اونچوں کے ساتھ غلامانہ طریقے سے پیش آتا ہے۔"[1]

---

[1] ماڈرن ریویو مارچ ۱۹۲۲

باب ۱۳

"عامۃ النّاس پر شفقت"

۱۹۲۲ سے ۱۹۲۴ تک عمر ۵۱ - ۵۳

عدم تعاون کے زمانہ کی شدید جذباتی معرکہ آرائیاں اب ختم ہو چکی تھیں۔ گاندھی جی کی قید کی دو سالہ مدت کے دوران میں اینڈریوز نے شانتی نکیتن کو اپنا مستقر بنا لیا، لیکن بنی نوع انسان کی خدمت کے کاموں کے سلسلہ میں ہندوستان بھر کا سفر کیا اور مارچ ۱۹۲۴ میں تین ہفتے کے دورہ کے بعد سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ میں انہوں نے انگلستان کا سفر کیا۔

(۱)

ان کے مسائل میں سب سے اہم مسئلہ واپس شدہ تارکانِ وطن کا تھا جو زیادہ تر فجی اور برطانوی گائنا سے آئے تھے اور جن کی بپتا کی طرف اشارہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔[1] ۱۹۲۰ کا سال فجی کے لئے بہت سخت سال تھا اور بہت سے پابندِ معاہدہ مزدور مع ایسے چند آدمیوں کے جو نوآبادی میں پیدا ہوئے تھے،

---

[1] ملاحظہ کیجئے باب ۱۱

آزاد ہونے کے بعد ہندوستان واپس آنے کے اوّلین موقع سے فائدہ اٹھا چکے تھے۔ ان میں فیصد ایک بہت بڑی تعداد ایسی تھی جسے ان اضلاع کی اقتصادی زندگی میں نہیں کھپایا جا سکتا تھا جہاں سے انہوں نے ابتداءً ترکِ وطن کیا تھا یہ لوگ کلکتہ میں تھی لٹائی اور تباہ شدہ حالت کو پہنچ گئے تھے اور خود ان کے اپنے دیہات میں یہ حالت تھی کہ انہیں اچھوت قرار دیدیا گیا تھا، ایسی حالت میں وہ مایوس ہو کر مٹیا برج پہنچے اور کلکتہ کی گودیوں سے پرے ملیریا زدہ کچے مکانوں میں اس امید میں رہنے لگے کہ شاید انہیں فجی واپس جانے کے لئے جہاز میں جگہ مل جائے۔ قدرتاً وہ اینڈریوز سے رجوع ہوئے جو ہندوستان میں ان کے واحد دوست تھے تاکہ وہ ان کی مصیبت میں کچھ دستگیری کریں۔

اینڈریوز پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۲۱ میں مٹیا برج گئے۔ انہوں نے ابتداہی سے معلوم کر لیا تھا کہ "واپس شدہ تارکانِ وطن زیادہ تر بدترین اشخاص پر مشتمل ہیں اگرچہ ان میں کچھ اچھے آدمی بھی آ گئے ہیں۔" اور یہ کہ نہایت فوری مسئلہ ان لوگوں کا تھا جو فجی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے حکومتِ ہند کے ذمہ دار افسر کو لکھا: "میں اس امر کے متعلق واضح خیالات رکھتا ہوں کہ اگر فجی کی حکومت اُن لوگوں کے لئے مفت جہازی سفر کا انتظام کر دے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت ملنی چاہیئے۔"[1] باقی لوگوں میں اگرچہ بہت سوں کی حالت ناقابلِ اطمینان تھی تاہم وہ انسان تھے جو مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے، اور اینڈریوز نے انہیں ہندوستان میں از سرِ نو بسانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ اس مسئلہ نے ۱۹۲۲ میں اور زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر لی۔ اسی سال فروری کے مہینہ میں کولونیل شوگر ریفائننگ کمپنی نے جسے پچھلے سال اس قدر زبردست منافع ہوا تھا کہ "سڈنی بلیٹن" تک یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ "یہ ناقابل

---

[1] یہ مراسلہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ کو سر جارج بارنس کے نام بھیجا گیا تھا۔ اس فیصلہ کی وجہ سے انہیں ایسے حلقوں میں بہت برا بھلا کہا گیا جو فجی میں مزدوروں کی بے چینی کو سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

یقین کارنامہ" ہے، ہندوستانی مزدوروں کی مزدوری میں ½ سے زیادہ کی کمی کردی اور اسے اس سطح تک پہنچا دیا جس کے متعلق فجی کی حکومت کے افسروں نے یہ اعلان کردیا تھا کہ اس میں کسی انسان کی گزر نہیں ہوسکتی۔ اب یہ امر تعجب انگیز نہیں رہتا کہ "قلیوں کے جہاز" بھرے ہوئے کلکتہ آنے لگے۔

اینڈریوز نے بتدریج ایک چھوٹی سی کام کرنے والی کمیٹی کی تشکیل کی جس کا نام "انڈین ایمی گریشن فرینڈلی سروس کمیٹی" تھا اور اس میں حکومت بنگال، پورٹ ہیلتھ کمیٹی اور پبلک کے نمائندے شامل تھے۔ مسٹر ایف۔ای۔جیمز اور مسٹر ایچ۔کے۔مکرجی اس کے سرگرم سیکریٹری تھے۔ وہ آنے والے جہازوں پر جاتے، وہ بددیانت منی چینجرز (روپے کا تبادلہ کرنے والوں) اور چوروں سے مزدوروں کو بچاتے اور بے گھر مزدوروں کو رہنے کے لئے جگہ بھی دیتے۔ اینڈریوز کی مستقل مزاجی سے ان کے لئے سرکاری امداد بھی حاصل کرلی۔ یہ بہت ہی حوصلہ شکن کام تھا، جن لوگوں سے اینڈریوز نے اِن واپس شدہ خاندانوں کو دوبارہ بسانے میں امداد دینے کی اپیل کی تھی، اُن میں سے بہت کم اشخاص نے ان کے محتاط ذاتی خطوط کا جواب دیا۔ فجی کے ہندوستانیوں میں سے بہت کم نے ان مواقع سے فائدہ اٹھایا جو انہیں دیئے گئے۔ انہیں اتنی بار ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ بسایا گیا کہ پھر ان میں جڑ پکڑنے کی طاقت ہی نہیں رہی۔ جب اینڈریوز ان کے پاس جاتے تو وہ رورو کر یہی کہتے کہ "ہمیں گولی ماردو یا واپس بھیجدو" اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، تشدد کا خطرہ بڑھتا گیا۔ پہلی ستمبر کو اینڈریوز نے لکھا: "اگر کچھ نہ کیا گیا تو فساد ہوجائے گا۔" ان کی ٹولیاں کی ٹولیاں شانتی نکیتن میں، ان سے ملنے کے لئے آتیں اور بولپور تک بغیر ٹکٹ کے سفر کرتیں۔ وہ ان کی داستانِ غم بار بار سنتے، ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور اور جو کچھ جیب میں ہوتا وہ انہیں دے کر واپس کلکتہ بھیج دیتے۔ وہ اُن کے پُرجوش برادرانہ حسنِ سلوک اور اس حقیقت کے علم سے کہ ان کی بدقسمتی میں ان کا ایک شریک غم ہے، قدرے مطمئن ہوکر واپس مٹیا برج آجاتے اور اینڈریوز آہ بھرکر اپنی میز پر

بیٹھکر یہ سوچنے لگتے کہ کسی کو خط لکھنا تو باقی نہیں رہ گیا، کوئی ایسا منصوبہ باقی تو نہیں رہ گیا، جس کو آزمایا نہ گیا ہو، ورجس سے ان کے دکھ کا مداوا ہو سکے۔

کوئی شخص کبھی بھی یہ بات صحیح صحیح نہیں جان سکے گا کہ خود اینڈریوز نے ان سالوں میں ہندوستان میں اپنی زندگی کس طرح گزاری۔ مارواڑی ایسوسی ایشن اور امپیریل انڈین سٹی زن شپ ایسوسی ایشن جیسی جماعتوں نے ان کی امداد کی تاکہ وہ مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی کرتے ہوئے ان کی امداد کریں اور انہیں اس قابل کیا کہ وہ سمندر پار کے ہندوستانیوں کے لئے دفتری کام کے مصارف ادا کر سکیں۔ مالدار دوستوں نے بھی بعض اوقات امداد دی۔ ہر جگہ ان کی مہمان نوازی کے لئے دروازے کھلے ہوئے تھے: ہندوستانی اور انگریز خواتین بھی اُن کی میزبانی اس طرح کرتی تھیں کہ ان کی جرابوں کو رفو کر دیتی تھیں، ان کے بٹن لگا دیتی تھیں یا ان کی قمیصوں کی کمی کو پورا کر دیتی تھیں۔ ریلوے کے ٹکٹ بھی خوشی خوشی خرید لئے جاتے تھے، ڈاک کے ٹکٹ بھی مہیا کر دئے جاتے تھے اور ٹیکسیوں کے کرائے بھی ادا کئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک دوست نے ان کے متعلق یہ بات بالکل صحیح کہی تھی کہ "بے غرض سے بے غرض آدمی بھی نادانستہ طور پر نہایت سخت گیر ہو سکتا ہے۔" افتادِ طبیعت کے اعتبار سے وہ آرٹسٹ تھے مگر وقتی تجربہ اور ضرورت میں وہ کلیۃً اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ انہیں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہ صبح کے پانچ بجے چائے طلب کرتے تھے اور پھر دوپہر کا کھانا ایک بجے مانگتے تھے لیکن چار بجے آتے اور ان کے ساتھ ساتھ ہر طبقہ کے کافی آدمی ہوتے۔ وہ پھر اپنی پریشان میزبان خاتون سے کہتے "میری پیاری خاتون، ناراض نہ ہونا، گھر میں جو کچھ ہوگا، وہ کفایت کریگا۔" [1]

اکثر اوقات ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ ہوتا تھا۔ ان کے خطوط میں یہ فقرہ بار بار ملتا ہے: "میں تار دینا چاہتا تھا، لیکن روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے خط لکھ رہا ہوں۔"

---

[1] ٹوررا کی صاحبزادی ایلا (مسز جی۔سی۔چیٹرجی)

جب اُن کے پاس روپیہ ہوتا اس وقت وہ اس اصول کی پیروی کرتے جسے انہوں نے بہت عرصہ بیشتر والورتھ میں اختیار کر رکھا تھا کہ نالائق آدمیوں کے ہاتھوں دھوکا کھانا بہتر ہے بجائے اس کے کہ ضرورتمند اشخاص کی امداد سے انکار کیا جائے۔ بلاشبہ انہیں دھوکا دیا جاتا تھا: ایک فقیر جسے انہوں نے مدراس جانے کا کرایہ دیا تھا تین دن بعد کلکتہ میں گھومتا ہوا پایا گیا، ایک "حاجتمند طالب علم" نے چند مضامین "ٹائپ کرنے کے لئے ان سے پیشگی روپیہ لے لیا اور پھر نہ تو وہ مضامین ہی واپس ہوئے اور نہ طالبعلم ہی دکھائی دیا۔ اینڈریوز ایسے لوگوں کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کہتے: "ہم فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟" ایک مارواڑی دوست نے انہیں قمیض کی کفوں کے لئے سونے کے بٹن دئے۔ جب اینڈریوز ان سے دوبارہ ملنے گئے تو اس وقت تک وہ غائب ہو چکے تھے۔ شملہ کی پہاڑیوں پر انہوں نے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک پہاڑی آدمی کو اپنا اوورکوٹ دیدیا اور خود بارش میں بھیگتے ہوئے گھر پہنچے جہاں ان کے میزبانوں نے انہیں محبت اور فکرمندی کے جذبات کے ساتھ سرزنش کی۔

دوسرے آدمیوں کی چیزیں بھی ان کی اپنی چیزوں کی طرح ان کے پاس کبھی محفوظ نہ رہیں، لیکن ان کے غائب ہو جانے پر خواہ کتنی ہی تکلیف ہوتی تاہم یہ بہت مشکل تھا کہ ان سے عرصہ تک ناراض رہا جائے۔ ایک مرتبہ وہ دہلی میں رُودرا کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور ریلوے سفر پر جا رہے تھے۔ رُودرا کو اس کا خیال رہا کہ چارلی کو صبح کی چائے مل جایا کرے۔ انہوں نے اپنے بیٹے شدھیر سے پوچھا: "کیا کہتے ہو، انہیں تھرماس دیدیں؟" یہ بہت اعلیٰ درجہ کا تھرماس تھا جسے شدھیر اپنے والد کے لئے انگلستان سے تحفہ کے طور پر لائے تھے۔ انہوں نے بربنائے محبت کہا: "مگر میں نے تو اسے آپ کے لئے خریدا تھا۔ اینڈریوز کو کوئی چیز دینا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ وہ اسے واپس نہیں لاتے۔" اتنے میں اینڈریوز آ گئے۔ سوشل نے کہا کہ "وہ آپ کو تھرماس دے دینگے بشرطیکہ آپ اسے واپس لے آئیں۔" شدھیر کہتے ہیں: (شدھیر نے میں

نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی") اینڈریوز جلدی ہی واپس آ جاتے ہیں۔ لیکن تھرماس نظر نہیں آتا۔ جب وہ کھانے پر بیٹھے تو شدھیر نے پوچھا "مسٹر اینڈریوز، تھرماس کہاں ہے؟" "تھرماس! کیا میں تھرماس لے گیا تھا؟ ہاں ہاں، یاد آگیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ گاڑی میں ایک اینگلو انڈین عورت تھی اور اس کا بچہ بری طرح چلا رہا تھا اور رو رہا تھا اور وہ اس کے لئے گرم دودھ لانا چاہتی تھی۔ بس . . . ."

(۲)

ستمبر ۱۹۲۲ میں اینڈریوز امرتسر گئے جہاں سکھ اکالیوں کی ایک جماعت جو اپنے گوردواروں کے نظم ونسق کی خرابیوں کی اصلاح کرنے پر تلی ہوئی تھی، مہنت سے نبرد آزما ہو رہی تھی جو انہیں "گرو کے باغ" سے درختوں کی سوکھی لکڑیاں کاٹنے سے روک رہا تھا۔ مہنت نے پولیس کو بلا لیا تاکہ مداخلتِ بیجا کے ارتکاب سے اکالیوں کو روکا جاسکے لیکن چونکہ مقابلہ کرنے والوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تھی، اس لئے پولیس کو ہدایت کی گئی کہ وہ گرفتاریاں نہ کرے بلکہ "کم سے کم قوت کا استعمال کرکے" انہیں منتشر کر دے۔ اکالیوں نے غیر متشددانہ ستیاگرہ کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کی ایک ایک ٹولی دروازہ تک جاتی جہاں پہرہ لگا ہوا تھا اور اس وقت تک خاموشی کے ساتھ وہاں کھڑی رہتی۔ جب تک اُسے ڈنڈے مار کر گرا نہ دیا جاتا یا ہٹا نہ دیا جاتا۔ ہمدرد لوگوں کا ایک جم غفیر خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے کھڑا رہتا۔ اینڈریوز بھی بہ نفسِ نفیس یہ ڈراما دیکھنے کے لئے گئے اور اکالیوں جیسی جنگی قوم کے ڈسپلن اور مذہبی جوش کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا:-

"یہ محض زمین اور ملکیت کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں ایک بہت بڑا اصول کارفرما ہے۔ یہ قانونی قبضہ یا قرقی کی ٹیکنیکل حدود سے گزر چکا ہے۔ ملک میں ایک نئی جرأت کا احساس جسے جسمانی اذیت کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے پیدا ہو رہا ہے۔ اخلاقی جنگ وجدل میں دنیا کو ایک نیا سبق سکھایا جا رہا ہے۔

یہ حقیقت مداخلتِ بیجا کے قانونی سوال سے بالکل بے نیاز ہے جس کا اکالیوں کی موافقت یا مخالفت میں فیصلہ کیا جا سکے۔ ان کا شدت سے یہ عقیدہ ہے کہ گرو کے باغ سے لکڑیاں کاٹنے کا جو حق انہیں حاصل ہے وہ مذہبی حق ہے اور جو انہیں ہمیشہ سے حاصل رہا ہے، ان کے اس عقیدہ کو یقیناً نیکی پر مبنی سمجھنا چاہیئے خواہ ناقص یا فرسودہ قانون حقِ جواز کے بارے میں کچھ ہی فیصلہ صادر کرے۔

"..... میں نے مقابلہ کا کوئی فعل یا برہم نگاہ نہیں دیکھی۔ یہ ان کے مذہب کا ایک فعل تھا خدا کی عقیدت مندی کا ایک سچا فعل، سچی شہادت کا جذبہ جبکہ وہ آگے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں یاد تھا کہ ان کے گرو کیا کیا تکلیفیں برداشت کر چکے ہیں اور وہ اپنے حیرت انگیز اعتقاد کے خزاد میں اپنی جسمانی تکلیفوں کا اضافہ کر کے خوش ہوتے تھے۔

"..... ان میں سے بہت سے اشخاص نے جو پرانے آزمودہ کار سپاہی تھے اور فرانس میں لڑ چکے تھے، مجھ سے بعد میں ہسپتال میں کہا: یہ نئی قسم کی لڑائی ہے۔ اس سے پیشتر ہم نے اس قسم کی جنگ نہیں لڑی۔ یہ مہاتما گاندھی کی جنگ ہے۔"

امرتسر کے گردوارہ میں جہاں اکالی جتھے ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو کر "ست سری اکال" کے جنگی نعرے بلند کرتے تھے (۱۹۱۹ کے واقعات کی یاد ابھی تازہ تھی) ــــ اینڈریوز کی محبوب اور معتمد شخصیت نے "اس نئی قسم کی لڑائی" میں حیرت انگیز ڈسپلن کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے کچھ کم نمایاں حصہ نہیں لیا۔

گاندھی کی قید کے دوران میں وہ دن رات تسلسل کے ساتھ مذکورہ بالا نوعیت کے مضامین لکھ کر گاندھی کے مطمحِ نظر کا پرچار کرتے رہتے تھے۔ پھر ستمبر کے آخر میں انہوں نے ٹیگور کی معیت میں جنوبی ہندوستان اور سیلون کا دورہ کیا اور اپنے دوست

کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی پُرمحبت تشویش میں انہوں نے سیکریٹری کی ذمہ داری کے بھاری بوجھ کو خود اٹھایا اگرچہ ساتھ ہی اس ضمن میں کہ ٹیگور کے خیالات کا علم سب کو ہوجائے انہوں نے ان کے لئے ایسے بھرپور پروگراموں کا بھی انتظام کردیا جنہیں پورا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس دورہ میں اُن کی توجہ سب سے پہلے "اچھوتوں" کی طرف منتقل ہوئی۔ ۸ اکتوبر کو انہوں نے مدراس میں ایک مذہبی خطبہ دیا جسے انہوں نے سارے جنوبی حصہ میں باربار دہرایا اور جس کا موضوع مسیح کے یہ الفاظ تھے: "میں عامۃ الناس پر شفقت رکھتا ہوں۔"

میں نے صرف تین دن پیشتر ایسا نظارہ دیکھا جس نے میرے دل کو رنج سے معمور کردیا۔ ہم صوبۂ مدراس کے ایک گاؤں میں گئے جہاں شاعر کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ میں شاعر کے پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے پہنچ گیا۔ وہاں گاؤں میں گاؤں کے لوگ بھی تھے اور دوسرے لوگ بھی تھے اور وہ سب شاعر سے ملنے کی پوری تیاریاں کرکے آئے تھے۔ وہاں قریب ہی تھوڑی دور پر کچھ پریشان حال غربت زدہ نیم عریاں لوگ بھی تھے جن میں مرد، عورت اور بچّے سبھی تھے۔ میں نے کہا: "یہ کون لوگ ہیں؟" انہوں نے کہا: "یہ پنچم ہیں۔" میں ان کے پاس گیا تاکہ ان سے اظہار ہمدردی کروں، مگر وہ لوگ بھاگ نکلے۔ دراصل وہ مجھ سے ڈر کر بھاگے تھے اور مجھے یہ دیکھکر بہت دکھ ہوا کہ وہ مجھ سے ڈر رہے ہیں۔ پھر میں نے ان میں سے ایک کو بلایا تاکہ وہ ان سے کہے کہ وہ بھاگیں نہیں بلکہ میرے قریب آئیں اور میں ان کے پاس گیا اور ان سے بغلگیر ہوا۔ اگرچہ میں ان سے باتیں نہ کرسکا تاہم وہ سمجھ گئے کہ میرے دل میں ان کے لئے محبت اور ہمدردی ہے۔ انہیں بالکل نظرانداز کردیا گیا تھا۔

شاعر کے استقبال میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اور پھر کسی نے جو کچھ فاصلہ پر کھڑا تھا، ان سے کہا کہ وہ سربسجود ہوجائیں۔ چنانچہ وہ سربسجود ہوگئے

اور انہوں نے مٹی میں اپنی پیشانیوں کو رگڑا۔ یہ تھا وہ نظارہ جس سے میرا دل رحم کے جذبہ سے لبریز ہوگیا۔

..... صرف ایک بات ہے جسے میں کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے ۔ "میرے دل میں عامۃ الناس کی شفقت ہے" یہی بات مسیح نے کہی تھی۔ اسی بات کو اُن سے پہلے مہاتما بدھ کہہ چکے تھے۔ یہ بہت سادہ فقرہ ہے۔ اس کے سمجھنے کے لئے رقیق قلب کی ضرورت ہے۔ کیا اس گرجا میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس جملہ پر عمل کرتے ہوئے اس معاملہ کو ہاتھ میں لے، ان میں زندگی بسر کرے اور اپنی تمام تر زندگی انہی میں گزار دے ؟ پنچم بنو، ان کی مصیبتوں کا احساس کرو اور ان کے دل تک پہنچو۔ ..... اگر میں دوسرے فرائض سے سبکدوش ہوسکتا تو میں یقیناً یہی کرتا۔ آپ میں سے کیوں کچھ آدمی ایسے نہیں نکلتے جو یہ کام کرسکیں ؟ میں آپ سے انسان ہونے کی حیثیت سے پوچھتا ہوں، ہندو ہونے کی حیثیت سے نہیں، عیسائی ہونے کی حیثیت سے نہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مرد ہونے کی حیثیت سے، انسان ہونے کی حیثیت سے، کہ کیا آپ ان کا بوجھ دُور نہیں کرسکتے ؟"

مدراس سے وہ پھر جانبِ شمال اپنے پرانے دوستوں یعنی ریلوے والوں میں گئے۔ بمبئی کی ایک کانفرنس میں اور پھر لاہور میں نارتھ ویسٹرن ریلوے مینز کی کانفرنس میں جہاں انہوں نے صدارت کی تھی، انہوں نے آل انڈیا ریلوے مینز فیڈریشن کے قیام کے لئے کام کیا جس کی مرکزی اسٹینڈنگ کمیٹی دہلی میں ہونی چاہیئے تاکہ وہ ریلوے بورڈ کے سامنے اپنے مفاد کی نمایندگی کیا کرے۔ اس کے بعد ڈیلیگیٹوں کا اجتماع الہ آباد میں ہوا اور فیڈریشن کی بنیاد پڑ گئی۔

دسمبر کے ان طویل سفروں کی ایک کہانی ہم تک ریورینڈ ایس۔ این۔ طالب الدین کے ذریعہ پہنچی ہے جو بے حد اثر انگیز ہے۔ ایک سرد صبح کو ان کی گاڑی شمالی ہندوستان کے ایک بڑے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی اور اینڈریوز اور ان کے

ساتھی باہر نکلنے کے راستہ کی طرف اونی شالوں میں لپٹے ہوئے جا رہے تھے انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کے سامنے بھیڑ دیکھی۔ بھیڑ کے بیچوں بیچ اسٹیشن ماسٹر بڑی برہمی کے ساتھ ایک سکڑی سکڑائی سردی کی ماری کپکپاتی ہوئی عورت کو گالیاں دے رہا تھا۔ مجمع نے کہا: "وہ اس کے کمرے میں انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہوئی آگ تاپ رہی تھی مگر اس نے اسے باہر نکال دیا۔" اینڈریوز نے اسے مخاطب کرکے آہستگی کے لہجہ میں کہا: "میں تمہیں دیکھ کر سخت شرمندہ ہوں۔ تم عیسائی ہو! تمہیں کم سے کم با اخلاق تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔" پھر عورت کی طرف مڑ کر انہوں نے آہستگی سے اپنی شال اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

بنگال میں اُن دیہات میں جہاں پچھلے سال سیلاب سے تباہی برپا ہوگئی تھی قحط کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ ٹیگور کے خاندان کی کچھ اراضیات متاثرہ علاقہ میں تھیں اور رابندرا ناتھ کو لوگوں کی حالت کے بارے میں بیحد تشویش تھی۔ اینڈریوز ان کے نام سے پوٹیسر گئے اور گورنر (لارڈ لٹن) سے دو متعلقہ کلکٹروں کے نام خطوط بھی لے لئے۔ انہوں نے اطلاع دی:

"ہم ایک چھوٹی سی کشتی میں دریا نے ناگر سے گزرتے ہوئے جا رہے ہیں تاکہ اس کے کنارے پر جو دیہات آباد ہیں، ان کا دورہ کریں۔ صبح سے رات گئے تک غریب کشتی کے قریب کنارے پر بیٹھتے ہیں اور اپنی درخواستیں ساتھ لاتے ہیں۔ میں نے کہدیا کہ کسی شخص کو میرے پاس آنے سے نہ روکا جائے۔ جب میں کنارہ پہ اُترتا ہوں تو وہ آجاتے ہیں میرے پیچھے پیچھے چلتے ہیں اور ہر جگہ جہاں جہاں میں جاتا ہوں یہی نظارہ دیکھنے میں آتا ہے۔

"...... یہاں فوری اہمیت رکھنے والا سوال: بیجوں اور مویشیوں کا ہے۔ بیج بونے میں ایک مہینہ سے کم عرصہ رہ گیا ہے۔ لیکن ہل کیسے جوتا جائے گا اور بیج کہاں سے آئیں گے؟"[1]

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۸ جنوری ۱۹۲۳

اپنے بستر پر بے خوابی کی حالت میں پڑے پڑے انہیں اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ دوسری صبح سات بجے وہ افتان وحیزان اتر ئی کے مقام پر امدادی کام کرنے والوں کے کیمپ میں پہنچ گئے جو وہاں سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر تھا۔ کیا وہ اس تجویز کو منظور کرینگے کہ بیجوں کی خریداری اور مویشیوں کے لغم البدل کے طور پر ایک ٹریکٹر کے لئے حکومت سے قرضہ کی درخواست کریں تاکہ وقت پر اراضی کی کاشت کی جا سکے ؟ کیا وہ ایسا کرینگے ؟ بہت اچھا ! نہیں شکریہ ! انہوں نے ناشتہ کے لئے بھی انتظار نہیں کیا ۔ انہیں فی الفور کلکتہ چلا جانا چاہیئے اور لارڈ لٹن کو تمام واقعات کی اطلاع دیدینی چاہیئے ۔

قرضہ منظور ہوگیا، ٹریکٹر کا وعدہ کرلیا گیا۔ پانچ ہفتے کے بعد اینڈریوز نے پونڈیسر سے پھر لکھا:-

" بہت اچھا ہوا کہ میں واپس آ گیا۔ اس کی وجہ سے سب باتیں جلدی جلدی طے ہوگئی ہیں اور حکومت اس وقت صرف کالیگرام میں بیجوں اور مویشیوں کے لئے پچاس ہزار روپے تقسیم کررہی ہے اور یہ وہ رقم ہے جس کا میں نے مطالبہ کیا تھا۔ جیسا کہ (شاعر کے داماد) نوگن بابو نے ابھی ابھی کہا ہے کہ لوگوں کو یہ رقم نہیں مل سکتی تھی اگر میں عین موقع پر زور دینے کے لئے موجود نہ ہوتا ۔ . . . . آخرکار ٹریکٹر سے کام شروع کردیا گیا ہے اور لوگ اسے دیکھکر خوش ہیں ۔ ماہی گیروں کے جس فساد کا ذکر میں نے کیا تھا وہ بیحد تکلیف کا باعث ہوا ہے اور میں خوش ہوں کہ ان کے معاملات کو درست کرنے میں مدد دینے کے لئے میں یہاں موجود ہوں میں جو کچھ کرسکتا تھا، کرچکا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب سب کام پورے طور پر حسن وخوبی کے ساتھ طے پاگئے ہیں۔" [1]

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۱۵ فروری ۱۹۲۳

عامۃ الناس کی خبرگیری کے معنی یہ نہیں تھے کہ انفرادی طور پر اشخاص کا خیال نہ کیا جائے
پونیسر کے دو دوروں کے درمیانی وقفہ میں اینڈریوز شانتی نکیتن واپس چلے گئے۔ جنوبی
ہند سے تامل بولنے والا ایک لڑکا آرٹ اسکول میں شامل ہونے کے لئے آیا تھا اور
اینڈریوز کی موجودگی کی وجہ سے اس نے شانتی نکیتن کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں وہ چند دن
کے اندر بیمار ہوا اور مر گیا۔ غمزدہ باپ کو یہ معلوم کر کے بیحد تسکین ہوئی کہ مرتے وقت
اینڈریوز اس کے پاس تھے۔ "میرا یقین کیجئے کہ انہوں نے ایک فرشتہ کی طرح، خدا کے
بھیجے ہوئے فرشتہ کی طرح اس کی تیمارداری کی۔ میرا بیٹا خوش نصیب تھا کہ اسے اس
عیسائی محبت کے مظاہرہ نے پورے طور پر ڈھک لیا۔"[1]

کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ اینڈریوز تاروں بھری رات میں پھرتے پھرتے بولپور
جا نکلتے اور پھر وہاں سے صبح کی ٹرین میں بیٹھکر کلکتہ چلے جاتے۔ مجمع میں سے گزرتے
ہوئے وہ شہر میں پیدل چلتے چلتے کبھی تو "ماڈرن ریویو" اور کبھی "دشال بھارت" کے دفتر
میں پہنچ جاتے یا اچاریہ پی۔ سی۔ رے سے ملنے کے لئے چلے جاتے جو اُن دنوں سائنس
کالج میں تھے اور سیلاب زدہ علاقوں میں امدادی کام کرنے کے لئے طلبا کو تیار کرنے
میں مصروف تھے۔ ان کے دوست ان سے بحث کرتے ہوئے کہتے "آپ پیدل کیوں
چلتے ہیں؟ آپ بس میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟" پھر وہ دیکھتے کہ ان کے صبح کے اخبار
میں ان کا ایک پُر جوش مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں مثالاً یہ پوچھا گیا ہے کہ کلکتہ
کے شہری اس بات کو کیسے برداشت کرینگے کہ ٹھٹھرتے ہوئے دس دس برس کے
چھوٹے لڑکوں کو سڑک پر بھیجا جائے تاکہ وہ شہر کی بدرروں کے اندر رہ کر کام کریں۔
شریفانہ آواز نے کہا: "تم دیکھتے ہو، مجھے ان باتوں کا علم نہ ہو سکتا اگر میں پیدل نہ
چلتا۔" اور ان کے سامعین میں کم سے کم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ جانتے تھے کہ وہ خود
بھی ہیریسن روڈ سے بیشمار مرتبہ گزرے ہیں اور "آنکھیں رکھتے ہوئے بھی" انہوں نے

---

[1] پی۔ تیار۔ پلے کا مکتوب بنام ڈاکٹر ایل۔ پی۔ لارسین، ۱۲ فروری ۱۹۲۳

وہ باتیں نہیں دیکھیں" جو انہوں نے دیکھی تھیں۔

ایک ایسی صبح کو انہوں نے اخبار فروش لڑکے کو بلایا اور اس سے اخبار طلب کیا اور پھر پیسے نکالنے کے لئے جیب میں اپنا ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ سڑک کے بھکاریوں کو وہ سب کچھ دے چکے ہیں جو اُن کی جیب میں تھا۔ لڑکے کی آنکھیں گہری نظر سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے یکایک کہا: "آپ اینڈریوز صاحب ہیں! میں آپ سے کچھ نہیں لونگا" اور وہ ایک دم بھاگ کر مجمع میں غائب ہو گیا اور پرچہ اینڈریوز کے ہاتھ میں چھوڑ گیا۔

مگر دوسرے نوجوان بنگالی لازماً نکتہ چین واقع ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کا بیان ہے:

"میں اچاریہ پی۔ سی۔ رے کے ساتھ سائنس کالج، کلکتہ، میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ ناشتہ پر ایک بہت بڑا آدمی آرہا ہے۔ یہ سنکر مجھ میں انہیں دیکھنے کا جوش پیدا ہو گیا، مگر صرف ایک یوروپین جو بہت ہی خراب کپڑے پہنے ہوئے تھا، اور جو مستری معلوم ہوتا تھا ایسی حالت میں اندر آگیا کہ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ ناشتہ کے بعد ان دونوں میں کچھ دیر تک سنجیدہ بحث ہوتی رہی، میں مشکل سے یہ یقین کرسکا کہ یہ بڑا آدمی ہو سکتا ہے، لیکن حیران تھا کہ آیا مجھے اس خط و کتابت کے متعلق اس سے کچھ امداد مل سکیگی جو جرمنی میں بین الاقوامی طلبا کے مجوزہ بین الاقوامی جلسہ کے متعلق ہو رہی تھی۔ اچاریہ نے پھر مجھ سے کہ مسٹر اینڈریوز کو (اسطرح سے مجھے ان کا نام معلوم ہوا) راجہ رام موہن لائبریری میں لیجاؤ۔ میں نے راستہ میں اس موضوع کو چھیڑا جو میرے دماغ پر مستولی تھا، لیکن ان کا جو اثر مجھ پر پڑا وہ یہ تھا کہ وہ میری بات سننے کی بجائے مجھے دیکھ رہے ہیں۔۔ ظاہر میں ۱۰۰ فی صدی گاندھی کا مقلد اور باطن میں دہشت پسند۔ یکایک انہوں نے اپنا تھیلا میرے سر پر رکھدیا اور مجھ سے کہا کہ اسے لے چلو اور مجھ سے سوالات پوچھنے شروع کردئے۔ کیا میں درحقیقت اپنے غربا سے واقف ہوں؟ کیا میری

جماعت نے کوئی امدادی کام کیا ہے؟ میں نے خیال کیا کہ یہ شخص انسان دوست اور اصلاح پسند قسم کا آدمی ہے اور یہ کہ بنگال کے نوجوان انقلابی ان سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے۔ تاہم اس گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ بالآخر وہ مجھے عوام کی تحریک میں گھسیٹ لائی۔"

(۳)

مارچ ۱۹۲۳ سے اینڈریوز کی توجہ پھر ایک مرتبہ کینیا کے ہندوستانیوں کے معاملات کی جانب مبذول رہی۔ ۱۹۲۱ کے موسم خزاں میں انہوں نے ان کی نہایت تاکیدی درخواست پر نوآبادی کا دوسرا مختصر دورہ کیا تاکہ وہاں نسلی طور پر ہندوستانیوں کے خلاف جو امتیاز قانوناً روا رکھا گیا تھا اس کا مقابلہ کرنے میں ان کی امداد کریں۔ اس نسلی امتیاز کی جھلک ان تجاویز سے ظاہر تھی جنہیں سال ماسبق میں لارڈ ملنر نے پیش کیا تھا۔ ہندوستانی چاہتے تھے کہ انہیں مشرقی افریقہ کی انڈین کانگریس کا پریسیڈنٹ بنادیں، لیکن اینڈریوز نے اس عزت افزائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا یہ کہکر کہ ان کی خواہش خدمت کرنا ہے نہ کہ رہنمائی کرنا۔

اس دورے میں نوآبادکار انتہاپسند یورپین اس "غدار" کے خلاف غصہ میں اس قدر آپے سے باہر تھے کہ ایک موقع پر زبردست خطرہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ انہیں کہیں سنگ سار نہ کردیں۔ ہندوستانی اور افریقی باشندوں نے جس گرم جوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اس پر اخبارات میں نہایت بھدے انداز میں تبصرہ کیا گیا اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ساتھ دیکر اپنی عیسائیت کے ساتھ دغا کررہے ہیں۔ ایک نامہ نگار نے جسے اپنی نیکی کا حد سے زیادہ احساس تھا، طنزاً لکھا:
"جب میں اس نقصان کا خیال کرتا ہوں جو اس شخص اور اس کے پروپیگنڈے کی وجہ سے پہنچا تو اس وقت میں مسیح دین کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوجاتا ہوں کہ اُسے دیکھکر خود مسیح بھی رو دیتے۔" اس کے تھوڑے دن بعد اینڈریوز نیروبی سے دوسری

مرتبہ یوگنڈا گئے۔ جب آدمی رات کو گاڑی نکورو اسٹیشن پر پہنچی، تو نوآبادکار یورپین کی ایک پارٹی ان کے کمرہ میں داخل ہوئی اور ان کی ڈاڑھی پکڑ کر اس کوشش میں تھے کہ انہیں پلیٹ فارم پر لے آئیں۔ اس پارٹی کا سرغنہ نہایت حقارت اور نفرت کے الفاظ میں چلا چلا کر یہ کہہ رہا تھا: "مسیح بھی رو دیئے! مسیح بھی رو دیئے!" بظاہر اینڈریوز کے بچ جانے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے دن سفر نہیں کیا بلکہ اپنی بیماری کی وجہ سے چوبیس گھنٹے کے لئے اپنے سفر کو ملتوی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کافی دیر تک انتظار کرتے رہے اور غیر یقینی حالت کی وجہ سے ان کے حملہ آوروں کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بیمار تھے اور انہیں بہت بری طرح جھنجھوڑا گیا تھا۔ ان کے دوست ڈاکٹر کُک نے جو کمپالا (یوگنڈا) کے مشن ہاسپٹل کے انچارج تھے، علاج اور تیمارداری کر کے ان کی صحت کو از سرِ نو بحال کیا۔ انہوں نے اس واقعہ کا ذکر گورنر (لارڈ نارتھے) سے کیا جس نے اسکا حال لندن بھیجے جانے والے مراسلہ میں لکھکر بھیجدیا۔ مسٹر ونسٹن چرچل نے اپنے جواب میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ اینڈریوز نے متعلقہ اشخاص کے نام بتانے سے احتراز کیا ہے۔ انہوں نے لکھا: "مجھے اور بلا شبہ نوآبادی کے دوسرے تمام صحیح الخیال لوگوں کو اس امر سے تسکین ہو جاتی اگر ان بدمعاشوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا۔"

چرچل کا خیال صحیح تھا۔ کینیا کے یورپین باشندوں کی اکثریت نے اس طرزِ عمل کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا، لیکن سیاسی اعتبار سے وہ خاموش قسم کے آدمی تھے اور انتہا پسند اپنی آواز رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی غیر معقول منافرت کہاں تک پھیلی اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو اسوقت وقوع پذیر ہوا جب اینڈریوز جھیل کے جہاز پر یوگنڈا سے لوٹے۔ وہ ایک سکھ خاتون اور اُن کے خاوند سے باتیں کر رہے تھے اور ان کے شیرخوار بچہ سے کھیل رہے تھے کہ اتنے میں ایک یورپین نوآبادکار مسافر ایسی حالت میں اُن کے پاس آیا کہ شدتِ طیش سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے چلا کر کہا: "تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جب میں نے تمہیں اس کالے

بچہ کو اپنی گود میں لیتے دیکھا تو میرے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ میں تمہیں قتل کردوں! میں تمہیں گردن سے پکڑ کر سمندر میں دھکیل سکتا تھا!"

نومبر ۱۹۲۱ میں کینیا کی فضا ایسی ہی تھی اور مارچ ۱۹۲۳ تک یہ کشیدگی بڑھتے بڑھتے خطرے کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس سے قبل ستمبر کے مہینہ میں ہندوستان اور نوآبادیات کے دفاتر چند تجاویز پر متفق ہو گئے تھے جو اگرچہ کبھی سرکاری طور پر شائع نہیں ہوئیں، تاہم ان میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ نسلی بنیاد پر علیحدگی کی پالیسی کو ترک کردیا جائے گا، فہرست رائے دھندگان مشترکہ ہوگی اور رائے دینے کا معیار تعلیم یا ملکیت پر رکھا جائے گا۔ ان تجاویز سے ہندوستانی جماعت بالکل مطمئن نہیں ہوئی، اس لئے کہ ان میں ملک کے بالائی حصوں کی شکایت کی تلافی نہیں کی گئی تھی تاہم ہندوستانیوں نے مساوی شہریت کی جانب ایک ٹھوس اقدام سمجھتے ہوئے انہیں منظور کرلیا تھا۔ مگر یورپین نوآبادکاروں نے نہ صرف ان پر بحث کرنے سے انکار کردیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انہیں عملی جامہ پہنانے کی کوئی کوشش کی گئی تو مسلح بغاوت شروع کردی جائے گی۔ چنانچہ گورنر مشورہ کے لئے لندن گیا، اسی طرح یورپین اور ہندوستانی جماعتوں کے وفود بھی گئے۔ موخرالذکر نے اینڈریوز سے بہ منت درخواست کی کہ وہ ان کے مشیر کی حیثیت سے ساتھ چلیں، اور وہ رائٹ آنریبل سرینواس شاستری کے ساتھ اپریل میں ہندوستان سے روانہ ہوگئے۔ شاستری نے کہا: "اگر کینیا جاتا رہا تو سب کچھ جاتا رہے گا۔"

شاستری کے بغیر یہ بحری سفر اینڈریوز کے لئے سخت تکلیف دہ تنہائی کا سفر رہتا۔ انہوں نے لکھا:

"سارے جہاز میں در پردہ مخالفت کی فضا پھیلی ہوئی ہے میں سب کی نظروں میں آگیا ہوں اور مجھ سے شدید نفرت کا اظہار کیا جارہا ہے۔ .... میں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وہ بات کی ہے جو میں معقولیت کے ساتھ کرسکتا تھا، مثلاً میں نے ہر چیز میں مغربی آداب کو ملحوظ رکھا ہے اور تمام

مواقع پر دوستانہ انداز میں سوشل بننے کی کوشش کی ہے، لیکن ایک دو مرتبہ اس کی بنا پر بہت ناخوشگوار باتیں کہی گئی ہیں جنہیں میں جلد سے جلد بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں یہ وہ جرمانہ ہے جس کا ادا کیا جانا فروری ہے اور مجھے بڑبڑانا نہیں چاہیئے ـــ کیونکہ خوش طبعی کا ذوق معجزات کو عمل میں لا سکتا ہے۔"

ایک شخص حیرت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آیا" مغربی آداب کو ملحوظ رکھنے" کی جو کوششیں انہوں نے کی تھیں وہ اتنی ہی کامیاب تھیں جتنی وہ سمجھتے تھے، یا یہ کہ کیا وہ درحقیقت ویسے ہی نظر آتے تھے جیسے وہ ایک بار بحری سفر میں دو سال بعد نظر آئے؟

" بچارے اس وقت ہندوستانی وضع کے یورپین کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر پاؤں ننگے تھے ـــ اور ان کے رفقائے سفر کے تبصرے ذرا تلخ تھے! "[1]

بہرحال وہ اقرار کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں وہ گھر جانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں اپنے سامنے جو تصویر رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ گرمی کی مسرت بخش تعطیلات کا زمانہ کیمبرج میں اپنے کالج کے باغ میں گزاروں۔ وہاں درخت کے نیچے ایک میز ہے (جو مجھے اچھی طرح سے یاد ہے) جہاں بیٹھکر میں کتاب لکھا کرتا تھا۔ وہاں تنہائی اور سکون ہے اور موٹر کاروں کی آواز نہیں آتی، نہ دھواں ہے نہ گرد اور نہ شور۔

لیکن جب میری یہ خیال آرائیاں مجھے مسرور کر دیتی ہیں اس وقت پریشان کرنے والا چھوٹا خدا جسے ضمیر کہتے ہیں، آتا ہے اور سخت آواز میں کہتا ہے:

---

[1] ریورنڈ ای۔ سی۔ ڈیوینیک کا مکتوب مصنفین کے نام

تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ تم کیوں پہلو تہی کرنا چاہتے ہو جبکہ اس گرما کے موسم میں ہندوستان میں ہزارہا لوگ ابھی قید خانہ میں پڑے ہوئے ہیں؟ تم ایمبرٹ کے کالج گارڈن میں اپنے آپ کو آرام طلب اور کاہل بنانے کی بجائے دن کا بوجھ اور اس کی گرمی کیوں نہیں برداشت کرنا چاہتے؟ کینیا کے مسئلہ کے لئے بہرصورت جنگ کرنی چاہیئے خواہ اس میں ہمیں یقینی شکست ہی کیوں نہ ہو جائے۔ بجائے اس کے کہ ہم ہندوستان اور مسیح کے ساتھ غداری کریں۔"[1]

اس مسئلہ کے لئے نہایت وفاداری سے جنگ کی گئی۔ ۱۹۲۳ء کی ایک پاکٹ ڈائری سے ظاہر ہوتا ہے کہ مئی اور جون کے مہینوں میں بہت سی ملاقاتوں کے لئے اوقات مقرر کئے گئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اینڈریوز نے اپنے سامنے یہ مقصد رکھا تھا کہ وہ ہر ایسے مرد اور عورت کی ہمدردی حاصل کریں جو افریقی معاملات سے واقفیت کے ذریعہ، فیاضانہ اور پُرجوش اخباری مضامین کے ذریعہ یا عیسائی لیڈروں کے ذریعہ رائے عامہ کی تربیت کر سکے اور واقعات کی رفتار پر اثر انداز ہو سکے۔ ہندوستان اور نوآبادیوں کے سیکرٹری اور ہند سیکریٹری ان سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن انہوں نے لبرل کلب میں تقریر کی، دارالعوام میں کھانا کھایا، نوآبادیوں کے ایسے عمالِ حکومت، ماہرینِ تعلیم اور پادریوں سے جا کر ملے جن کے پاس وہ جا سکے اور بار بار کینٹربری گئے تاکہ آرک بشپ سے ملیں۔ جب گرمی کی تعطیلات کا سکون پیمبرک گارڈن پر چھا گیا تو وہ پھر عازم ہندوستان ہو گئے۔

پبلسٹی کی مہم کے دوران میں ایک موقع پر شاستری اور اینڈریوز دونوں لندن میں انڈین اسٹوڈنٹ ہوسٹل کے ایک بڑے جلسہ میں موجود تھے۔ شاستری نے

---

[1] مکتوب بنام رابندرناتھ ٹیگور۔

معتدل الفاظ میں فصیح و بلیغ اپیل کی، مگر ان کے بعد جو مقرر آئے انہوں نے انگریزوں پر نہایت جوشیلے الفاظ میں حملے کئے اور کہا کہ اگر وہ تشدد کے خواہشمند ہیں تو انہیں اس کا پورا پورا مزا چکھایا جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے ایک شخص نے جو وہاں موجود تھا، یوں بیان کیا ہے:

ہوسٹل کا ہال نعرہ ہائے مسرت سے گونج رہا تھا۔ یہ نعرہ ہائے مسرت وہ طلبا بلند کر رہے تھے۔ جو ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع تھے۔ پھر سی۔ ایف۔ اے نے تقریر کی۔ انہوں نے اس طرح اپنی تقریر شروع کی: "اس تقریر کے بعد جسے ہم نے ابھی ابھی سنا ہے، میں آپ سے وہ سب باتیں نہیں کہہ سکتا جو میں آج رات کہنا چاہتا تھا"، اور پھر انہوں نے محبت آمیز مگر صاف اور صاف اور واضح الفاظ میں اس جذبہ کی مذمت کی جو نفرت کا جواب نفرت سے چاہتا ہے اور حاضرین کو مہاتما بدھ کے وہ الفاظ یاد دلائے جنہوں نے مسیح سے پانچ سو سال قبل بنی نوع انسان کو یہ تعلیم دی تھی کہ۔

نفرتوں کو نفرت کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔
صرف محبت ہی ہمیشہ کے لئے اُن کا خاتمہ کر سکتی ہے۔
صرف محبت ہی تمام جھگڑوں کو امن کی طرف لا سکتی ہے۔
یہی سچا اور قدیم قانون ہے۔

انہوں نے کہا: "کرم سچا ہے۔ کرم سچا ہے۔ آدمی جو کچھ بوئیگا وہی کاٹے گا۔ ہم نے ہندوستان میں ۶ کروڑ انسانوں کو اپنے درمیان ایسی حالت میں رکھا ہے جو ایک باپ کے بچوں کے لئے انتہائی رُسوا کن ہے۔ کیا ہم اسکی شکایت کر سکتے ہیں اگر آج دوسرے لوگ ہم سے ویسا برتاؤ کرتے ہیں؟"

یہ نہایت ہی ہیجان انگیز لمحہ تھا اور میں نہیں جانتا کہ آیا مجھے اس شخص کی جرأت کی داد دینی چاہئے یا اس خاموشی کی تعریف کرنی چاہئے جس کے ساتھ طلبا نے ان کی ڈانٹ کو گوارا کیا ـــــ یہ خاموشی اُس ادب اور احترام کی آئینہ دار

تھی جو ان کے لئے طلبا کے دلوں میں تھا۔ اور اختتامِ تقریر پر ان سب نے پھر نعرہ ہائے مسرت بلند کئے۔

دفتر نوآبادیات نے کینیا پر اپنی یادداشت جولائی میں شائع کی جبکہ اینڈریوز ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ مشترکہ فہرستِ رائے دہندگان کی تجویز کی بجائے فرقہ وارانہ اصول پر حق رائے دہندگی کی تجویز پیش کی گئی، ترکِ وطن کے مسئلہ کا فیصلہ کینیا ہی میں ہونا چاہیئے۔ یہ شکست تھی۔ تقریباً اسی وقت (۲۴ جولائی ۱۹۲۳ کو) جنرل اسمٹس نے نیٹال میں نسلی اصول پر ہندوستانیوں کو علیحدہ علاقوں میں بسانے کی تجویز پیش کی تاکہ جنوری ۱۹۲۴ میں پیش ہونے والے مسودۂ قانون میں اسے شامل کر لیا جائے۔ اینڈریوز بھی پوری طرح ہندوستان کے ساتھ غم و غصہ میں شریک تھے، لیکن یادداشت کا ایک حصہ ایسا تھا جس کے متعلق ان کی رائے تھی کہ وہ حقیقی مستقبل کی جانب حقیقی اقدام کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حصہ یہ ہے:

"ملک معظم کی حکومت اسے ضروری خیال کرتی ہے کہ اپنی پختہ رائے کے طور پر معرضِ تحریر میں لے آئے کہ افریقی باشندوں کے مفاد کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہیئے اور یہ کہ جب کبھی اس مفاد میں اور باہر سے آنے والی قوموں کے مفاد میں آویزش پیدا ہو جائے تو اس صورت میں اول الذکر مفاد ہی غالب رہنے چاہئیں۔ ..... ملک معظم کی حکومت ملکی باشندوں کی حفاظت اور ترقی کے لئے ایک امین کی حیثیت سے کام کرنا چاہتی ہے اور وہ اس حق کو کسی دوسرے کو سپرد کرنا یا اس میں کسی دوسرے کو حصہ دار بنانا نہیں چاہتی۔"

اینڈریوز نے ہر جگہ اسی امر کی تلقین کی تھی کہ خالصتہً کراؤن کولونی کی حکومت قائم کر دی جائے جہاں حقِ رائے دہندگی مطلقاً نہ ہو اور یہ بتایا تھا کہ فرقہ وارانہ اصول پر رائے دہندگی سے یہ چیز کہیں بہتر ہے۔ اب انہوں نے اس پبلک تنبیہ کا خیر مقدم کیا جو "سفید نام" باشندوں کی ذمہ دارانہ حکومت کے حامیان

کو حکومت کی طرف سے کی گئی۔ مگر ان کے بہت سے ہندوستانی رفقائے کار نسلی توہین آمیز افعال پر جن کا وہ اب تک شکار ہو چکے تھے، اس قدر شدت سے ناراض تھے کہ وہ اس بات پر مطلق تیار نہیں ہوئے کہ افریقہ کے اصلی باشندوں کے بارے میں برطانوی حکومت کے اعلان کو باور کریں، یا اینڈریوز کی "عدم رائے دھندگی" کا اصول بطور حل کے تسلیم کرلیں۔ انگلستان کی سردمہری اور مخالفت کو اپنی مستقل مزاجی اور قوتِ برداشت کے ذریعہ سہنے کے بعد جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ہندوستان میں بھی وہ یکہ وتنہا رہ گئے ہیں تو ان کی صبر آزمائی پر بہت برا اثر پڑا اور ان کے دل میں بہت زیادہ تڑپ پیدا ہوئی کہ وہ گرفتارِ قید و بند گاندھی کی رفاقت اور روشن مشورہ کو تلاش کریں۔ ایک خط سے جو انہوں نے اپنے ایک پرانے اور عزیز رفیق کار مسٹر جے۔ بی۔ پیٹٹ کو لکھا تھا، ان کے دلی کرب کا اظہار ہوتا ہے:

ہمیں پورا پورا یقین تھا کہ حق رائے دھندگی نہیں ملے گا۔ اب ہمیں انتخاب کرنا تھا کہ اصول رائے دھندگی کو تسلیم کیا جائے یا سرے سے حقِ رائے دہندگی ہی قبول نہ کیا جائے۔ فرقہ وارانہ رائے دھندگی کے معنی ملکی باشندوں کی تباہی ہیں، اس کے معنی ہندوستانیوں کی موت ہیں..... میں آپ سے کہتا ہوں کہ میں واپس آکر مہاتما گاندھی کو دومنٹ میں اس کا یقین دلا سکتا ہوں اس لئے کہ وہ صورتِ حالات کو سمجھتے ہیں۔

لیکن بمبئی کی کمیٹی نے میری تمام باتوں کو سنا اور انگلستان اور کینیا میں ایک تار بھیجدیا جس کے متعلق مجھ سے مشورہ نہیں کیا گیا اور "عدم حقِ رائے دہندگی" کے حل کے خلاف دونوں ملکوں کو خبردار کردیا۔ یہ امر میرے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے کہ میں ایک مسئلہ کے متعلق مہینوں صرف کروں اور مشرقی افریقہ اور انگلستان کے طول طویل سفر اختیار کروں اور سارے

واقعات جمع کروں اور پھر میرے ہی خلاف بہ عجلت فیصلہ صادر کر دیا جائے۔"

لیکن ابھی اس سے بدتر صورت حال پیدا ہونے والی تھی۔ افریقی باشندوں کے مفاد کی جو حفاظت اینڈریوز کر رہے تھے اسے کینیا کے بعض ہندوستانی طبقوں نے خود اپنے مقصد کے خلاف غداری سے تعبیر کیا اور وہاں ان کے خلاف سب وشتم کا دروازہ کھول دیا۔ جب مشرقی افریقہ کی ڈاک اگست کے آخری حصہ میں آئی تو انہوں نے دیکھا کہ نیروبی کے ایک ہندوستانی اخبار "ڈیما کریٹ" (۱۱ر اگست ۱۹۲۳) میں ایک زہریلا مراسلہ شایع ہوا جسے پڑھکر انہیں زیادہ کوفت یوں ہوئی کہ یہ اُس شخص کا لکھا ہوا تھا جو کینیا میں ان سے دوستانہ مراسم رکھتا تھا۔ الزام یہ تھا:

"ہمارے دشمن ایک اور وضع کے بھی ہیں، پُرفریب، متواضع، لجاجت کرنے والے، کھدر پوش، ننگے پاؤں رہنے والے سفید فام سادھو۔ جو ہمارا ساتھ اس لئے دیتے ہیں کہ بالآخر ہم کھیل ہار جائیں۔ ۔ ۔ ۔ وہائٹ پیپر کے غائر مطالعہ سے ظاہر ہو جائے گا کہ ہندوستانی مطالبات کو شکست دینے کے مقصد سے ملکی باشندوں کے مفاد کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ یہ مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز تھے جنہوں نے مقامی سیاسیات میں اس ملکی معاملہ کے عنصر کو داخل کر دیا ہے۔"

اس کے بعد راقم مراسلہ نے لکھا کہ اینڈریوز نے دیدہ و دانستہ برطانوی حکام کے سامنے "ملکی معاملہ کے عنصر" کی تجویز اس لئے پیش کی ہے تاکہ اس چال کے ذریعہ ہندوستانیوں کو بدحواس کر دیا جائے۔

شاذ و نادر ہی اینڈریوز کو اس سے زیادہ کبھی رنج پہنچا ہوگا۔ وہ جسمانی طور پر بیمار تھے اور تین ہفتے تک بخار کی وجہ سے اور اپنی ہر کوشش کی ظاہری شکست کی وجہ سے اذیت میں مبتلا رہے۔ آخر کار انہوں نے مسٹر سی۔ راج گوپال اچاری کو جو

اُن دنوں "ینگ انڈیا" کی ادارت کر رہے تھے، ایک خط بھیجا اور ساتھ ہی "ڈیما کریٹ" کے اقتباسات ارسال کر دئیے۔ انہوں نے لکھا:

"اس حملہ کی وجہ سے جی میں آتا ہے کہ میں گمنامی میں چلا جاؤں اور اپنے خدا کی پناہ میں رہوں جو جانتا ہے کہ یہ سب باتیں کس قدر جھوٹی ہیں۔ اس وقوعہ کے بعد میں پہلے جیسا کیسے رہ سکتا ہوں؟"

اس کے بعد انہوں نے ذاتیات سے بلند ہو کر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بحث کی اور بتایا کہ یہ پُرفریب بیماری کی ظاہری علامت ہے جسے ہندوستان کو تسلیم کرنا چاہیئے اور اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ انہوں نے بتایا کہ غلام قوم میں بے اعتمادی اور شک وشبہ وبائی صورت اختیار کر لیا کرتے ہیں جیسا کہ جنگ کے زمانہ میں تمام اقوام کے ساتھ ہوا کرتا ہے ۔۔ انگلستان اور آئرلینڈ نیز ہندوستان میں "جاسوسوں کے جنون" کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آخر میں ہندوستانیوں کے نام ہندوستانی کی حیثیت سے اپیل کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

"میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اسے براہ راست اپنے نام سے شایع کردوں اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ کیا وقت نہیں آگیا ہے کہ ہم وفاداری اور سچائی سے ذاتی حملے کرنے اور تہمت لگانے سے محترز رہیں؟ یہ عادت پختہ ہو جانے کے بعد سخت مہلک بن جاتی ہے۔"[۱]

محبت کی جس فراوانی سے راج گوپال اچاری اور سارے ہندوستانی پریس نے اینڈریوز کی امداد و اعانت کی اور جس غصہ و نفرت سے انہوں نے "ڈیما کریٹ" کے الزاموں کا بطلان کیا، اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں۔ کینیا اور انگلستان میں جو کام کیا گیا وہ کلیتاً بے کار ثابت نہیں ہوا۔ انگلستان کے مذہبی اور سیاسی حلقوں میں مختلف اشخاص نے مشرقی افریقہ کے معاملات کے متعلق ایک غیر جانبدارانہ تحقیقات کی ضرورت کو ثابت

---

[۱] ینگ انڈیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۲۳

کرنے کے سلسلہ میں مسلسل دباؤ کے ذریعہ جس شہادت کی پیشکش کی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۲۴ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر کر دیا گیا۔ اس دباؤ کے ڈالنے میں سی ایف۔اینڈریوز نے قابلِ احترام حصہ لیا تھا۔

(۴)

۱۹۲۴ کے موسم خزاں میں اینڈریوز نے بہت سوچا کہ انہیں آیندہ کیا کام کرنا ہے۔ وہ اس دوران میں مسلسل علیل رہے، لیکن وہ ایسی باتوں کو نظرانداز کر دینے کے خوگر تھے۔[۱] بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ ان کی ضرورت جنوبی افریقہ میں ہوگی تاکہ ہندوستانیوں کو الگ بسانے کے خطرے کے پیشِ نظر اس سلسلہ میں قانون سازی کا جم کر مقابلہ کیا جائے۔ پھر اکتوبر کے مہینہ میں جب وہ آسام میں طلبا کی کانفرنس کی شرکت کے لئے گئے تو انہوں نے افیون کی تجارت کی خرابیوں کا مشاہدہ کیا اور انہوں نے سوچا کہ آیا انہیں وہیں رہ کر افیون کے خلاف کانگریس کی مہم میں شامل نہ ہو جانا چاہیئے۔ اس معمہ کا حل المیہ طریقہ پر ہوا۔ آسام میں اینڈریوز کو اطلاع ملی کہ ان کے عزیز اور محبوب دوست ولی پیئرسن اٹلی میں ریلوے کے حادثہ میں مارے گئے ہیں۔ یہ آخری اور دلی صدمہ تھا جو انہیں پہنچا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اینڈریوز کی صحت بالکل خراب ہوگئی اور نومبر ختم ہوتے ہوتے وہ اپنے علاج کے لئے عازمِ انگلستان ہو گئے۔

شروع شروع میں یورپ کی آب و ہوا سے انہیں کچھ زیادہ افاقہ نہیں ہوا جب اینڈریوز ایک تاروں بھری رات میں جبکہ مطلع صاف تھا اور سخت سردی پڑ رہی

[۱] افریقی باشندوں کے لیڈر ایم۔ای۔راتھ بین نے ۱۰ فروری ۱۹۲۸ کو اینڈریوز کے نام خط بھیجا جس میں لکھا "میں ہمیشہ سے آپ کے متعلق یہ رائے رکھتا ہوں کہ آپ کی ساری طاقت زائل ہو چکی ہے اور آپ تھکان زدہ ہیں، لیکن پھر بھی آپ ان چیزوں کا نوٹس نہیں لیتے، حالانکہ آپ دوسروں میں جرأت پیدا کرتے رہتے ہیں۔"

تھی، کرسمس سے قبل کی شام کو گرجا کی گھنٹیاں سن رہے تھے تو انہیں اس تشدد، نفرت اور بے اعتقادی کا خیال آگیا جو ہر جگہ کرسمس کے پیغام امن و خیر سگالی کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ انگلستان میں گاندھی پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ وہ فسادات کو تقویت پہنچاتے ہیں اور اہنسا کو چھوڑتے جا رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہیں قید کی سزا دی گئی۔

تاہم ۱۹۲۳ میں انہوں نے انگلستان کے جو دو مختصر دورے کئے ان کی وجہ سے وہ انتہائی علیحدگی اور تنہائی ختم ہو گئی جس کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔ اینڈریوز کے پرانے کیمبرج کے دوست جی۔ پی۔ گوچ (ایڈیٹر "کنٹیمپوریری ریویو") میں سی۔ پی اسکاٹ (ایڈیٹر "مانچسٹر گارڈین") میں اور اُن حلقوں میں جن میں وہ اِن اصحاب کی بدولت داخل ہوئے، انہوں نے ایسے انگلستان کا مشاہدہ کیا جو وشو ابھارتی کے مطمح نظر کی قدر کرتا ہے اور ہندوستان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے مشتاق اور بے چین ہے ایسے آدمیوں میں جیسا کہ وینیکرا سٹیفن ہاب ہاؤس تھے، اور سوسائٹی آف فرینڈز کے ارکان میں انہوں نے عیسائی امن پسندی کی وہ جھلک دیکھی جو اہنسا کے ہندوستانی تخیل کی ہم نوا تھی اور جو قید خانون کی اصلاح اور انسدادِ افیون کی مہم کی حامی تھی، وہ ووڈ بروک کی کویکر سیٹلمنٹ کو دیکھنے کے لئے پہلی مرتبہ گئے اور جے۔ ایس۔ ہوآئے لینڈ کے یہاں ٹھہرے جن سے وہ سینٹ اسٹیفنز کالج کے زمانہ سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ اگرچہ ابھی چند سال اور گزرنے باقی تھے اس سے پہلے کہ وہ انگلستان کو اپنا مستقر بنائیں، انہوں نے ۱۹۲۴ کی ابتدا سے انگریز ہمدردوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کیا اور "مانچسٹر گارڈین" میں ان کے جو مضامین شایع ہوئے ان کی ابتدا اسی تاریخ سے ہوتی ہے۔

اس تمام وزٹ میں ان کے لئے انتہائی مسرت کا موقع وہ تھا جبکہ وہ "تاریخی مسیح کی تلاش" کے مصنف البریٹ شوئیٹزر سے ملے۔ یہ ملاقات ان کے مشترکہ دوست مسٹر و مسز جے۔ ایچ۔ اولڈہم کے گھر پر ہوئی تھی اور اس کا بڑا گہرا اثر اینڈریوز پر ہوا تھا۔ جب ملاقات کے بعد وہ ایک ساتھ اسٹیشن پیدل جا رہے تھے، اسوقت

ایک واقعہ رونما ہوا جسے اینڈریوز مسرت کے ساتھ ہندوستان میں بھی دہرایا کرتے تھے یہ دکھانے کے لئے کہ یورپ کی عیسائی اسپرٹ میں اہمسا کی روح کامل طریقہ پر جلوہ گر ہے:

"ہم دونوں البیرٹ شوئٹزر کا وزنی جرمن تھیلا لکڑی پر لٹکانے لئے جا رہے تھے۔ اس صبح کو برف نے قدرے پگھل کر راستہ کو پھسلواں بنا دیا تھا یکایک شوئٹزر نے چلا کر کہا "اخاہ، آپ ہیں"! اور رُک کر کھڑے ہو گئے جس کی وجہ سے میں ذرا پریشان ہو گیا۔ انہوں نے جھک کر بڑی شفقت سے سکڑے ہوئے سانپ کو سڑک کے گڑھے سے نکالا اور اسے بہ حفاظت تمام سڑک کے کنارے کی جھاڑیوں میں رکھ دیا۔ انہوں نے کہا: "یہاں یہ بالکل محفوظ رہیگا سڑک پر تو غریب مر جاتا۔"

ضروری طبی علاج عین وقت پر کیا گیا اور اینڈریوز کی صحت سرعت کے ساتھ بحال ہوتی گئی۔ پھر ۱۹۲۴ کی ابتدا میں انہیں یہ تکلیف دہ خبر ملی جس کی وجہ سے وہ بعجلت تمام ہندوستان واپس آ گئے کہ گاندھی اپینڈی سائیٹس (التہاب زائدہ) کے مرض میں یکایک مبتلا ہو کر یروڈا جیل میں بیمار ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی آدھی رات کو ہنگامی آپریشن کر کے بچالی گئی، اور انہیں غیر مشروط طریقہ پر رہا کر دیا گیا مگر انہیں پونا کے سیسون ہاسپٹل میں اس وقت تک رکھا گیا جب تک ان کی صحت پوری طرح عود نہ کر آئی۔

باب ۱۴

افیون کی تجارت

(۱۹۲۴-۲۵)　(عمر ۵۳-۵۴)

جیل سے گاندھی کی رہائی کے ساتھ اینڈریوز اور ان کی دوستی اپنے تیسرے اور نہایت بے تکلفی کے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔ یہ دوستی مظلوم اور کچلے ہوئے انسانوں سے مشترکہ ہمدردی اور محبت کی بے پایاں طاقت اور حقیقت پر مشترکہ اعتقاد کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور اس لئے وہ مخصوص طریقوں اور پالیسیوں کے بارے میں زبردست اختلاف رائے کی آزمائش پر پوری اُتر چکی تھی اور طویل جدائی نے اعتماد اور یقین کی بندھنوں کو اور زیادہ مستحکم کر دیا تھا۔

(۱)

جب اینڈریوز جنوری ۱۹۲۴ میں شانتی نکیتن میں دوبارہ نمودار ہو گئے اس وقت ٹیگور نے پوچھا: "آپ مہاتما جی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے؟ آپ کا کام تو وہی ہے" اینڈریوز کو کسی بیرونی ترغیب و تحریص کی ضرورت نہ تھی۔ ہندوستان کے ساحل پر آتے ہی پونا میں اپنے مختصر سے قیام کے دوران میں انہوں نے کافی طور پر اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی وہاں کس قدر ضرورت ہے۔ آئندہ دو مہینوں تک وہ گاندھی کے ساتھ رہے،

ان کی صحتیابی کے زمانہ میں ہر جگہ سے آنے والے لیڈروں سے جو بے شمار مشورے ہوئے ان میں وہ بھی شریک رہے اور "ینگ انڈیا" کی ادارت بھی سنبھال لی جسے گاندھی نے اپنے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

جو دو بڑے فیصلے ان مہینوں میں کئے گئے ان کا اینڈریوز کی زندگی پر خصوصی اثر پڑا۔ اس وقت وہ بھی موجود تھے جب گاندھی اور جارج جوزیف (ہندوستانی عیسائی قوم پرست) نے موخرالذکر کی رہنمائی میں شمالی ٹراونکور کے مقام وائی کوم میں ستیاگرہ کا پروگرام تیار کیا تھا تاکہ اس شاہ راہ عام کو جو گاؤں کے مندر کے قریب واقع تھی، استعمال کرنے کے لئے "اچھوتوں" کا حق منوایا جائے۔ ان باتوں کو یاد کر کے جو انہوں نے تین مہینے قبل آسام میں دیکھی اور سنی تھیں، انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی پر زور دیا کہ وہ وہاں افیون کے استعمال کے سلسلہ میں پوری تحقیقات کرے اور خود بھی انہوں نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا۔ اس اثنا میں ٹیگور چین کی سیاحت کر رہے تھے۔ اینڈریوز واپسی پر ان سے ہانگ کانگ میں ملے اور جون، جولائی اور اگست کا زمانہ ملایا اور برما میں گزارا اور مشرق اقصیٰ میں افیون کے استعمال کے بارے میں اپنی تحقیقات کی توسیع کے ساتھ ساتھ انہوں نے وشوا بھارتی کے لئے بھی کام کیا۔ اس اثنا میں ۱۹۱۹ کے ایکٹ کے ماتحت ہندوستان میں مجالسِ قانون ساز "فرقہ وارانہ رائے دہندگی" کے نظام پر قائم ہو چکی تھیں جو قریب قریب اسی جیسا تھا جس کے خلاف کینیا میں اینڈریوز جنگ کر چکے تھے۔ اس نظام میں جو افتراقی رجحانات مضمر تھے ان میں اور زیادہ شدت یوں پیدا ہو گئی کہ "اچھوتوں" نے سیاسی طاقت کے حصول کے لئے اپنی تنظیم شروع کر دی اور سوراج پارٹی نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ مجالسِ قانون ساز میں داخل ہو گی۔ اگست میں نہایت شدید قسم کے فرقہ وارانہ فسادات تمام ملک میں اور خصوصیت کے ساتھ سرحدی صوبہ میں شروع ہو گئے۔ گاندھی دہلی میں تھے اور شرم کی وجہ سے سخت اضطراب میں مبتلا تھے چوبیس گھنٹے تک غور و فکر کرنے اور دعا مانگنے کے بعد انہوں نے کفارہ ادا کرنے کی نیت سے دہلی میں ۲۱ دن کا برت رکھا۔ یہ برت ۱۷ ستمبر سے شروع ہوا اور ۸ اکتوبر کو ختم ہوا۔ برت کے دوران میں ہندوستان کے ہر مذہب اور ہر صوبہ کے نمائندے چار سو

کی تعداد میں دہلی میں "یونٹی کانفرنس" (مجلسِ اتحاد) میں ایک دوسرے سے ملے اور انہوں نے فرقہ وارانہ اختلافات کے زخموں کو مندمل کرنے کا پختہ وعدہ کیا۔ اینڈریوز پھر گاندھی کے ساتھ رہنے لگے اور پھر ایک مرتبہ انہوں نے "ینگ انڈیا" کی ادارت سنبھال لی۔ اور اس طرح پھر ایک مرتبہ انہوں نے گاندھی کے برت اور صحتیابی کے دوران میں دوستی کے عہد کو پختہ کیا۔

مزدور اور اچھوت دونوں پر اینڈریوز کی یکساں نظرِ توجہ رہی۔ ۱۹۲۸ میں فجی سے لوٹتے وقت وہ ملایا میں تین ہفتے تک ٹھہرے تھے تاکہ کھیتوں میں کام کرنے والے ہندستانی مزدوروں کی بہبودی کے کاموں کا مطالعہ کریں اور سنگاپور سے مدراس تک جہاز "تارا" میں سفر کیا جو باقاعدہ طور پر "قلیوں" کو لانے لیجانے کا کام میں آتا تھا۔ آنے والے موسمِ گرما میں جب خود پلانٹرز ایسوسی ایشن نے انہیں اپنے ملک میں دوبارہ آنے اور مزدوروں سے متعلقہ مسائل کے متعلق اسے مشورہ دینے کی دعوت دی تو انہوں نے حالات سے مجبور ہو کر بڑے افسوس کے ساتھ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ملایا میں حالات مقابلتہً بہت اچھے تھے اور ملایا ان دو ملکوں میں سے ایک تھا جہاں غیر کاریگر مزدوروں کو انڈیا ایمی گریشن ایکٹ ۱۹۲۲ء کے ماتحت ترکِ وطن کرنے کی اجازت تھی جس کا مسودہ خود اینڈریوز کے مشورہ سے تیار کیا گیا تھا[1] بالآخر وہ ۱۹۲۳ء میں پلانٹرز ایسوسی ایشن سے ملے اور ایک تقریر میں جس میں ان باتوں کا پورا پورا اعتراف کیا گیا تھا جو حاصل کی جاچکی تھیں، انہوں نے قلیوں کے جہازوں کے وحشیانہ حالات کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہی اُن تمام اخلاقی خرابیوں کا

---

[1] ایکٹ کے الفاظ یہ ہیں:۔ "غیر کاریگر مزدوری کے مقصد کے لئے ترکِ وطن جائز نہیں ہوگا سوائے ایسے ملکوں کو اور سوائے ایسی شرائط پر جن کی گورنر جنرل با جلاسِ کونسل گورنمنٹ آف انڈیا میں بذریعۂ اعلان اس بارے میں صراحت کر دیں۔ دوسرا صراحت کردہ" ملک سیلون تھا۔

سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز (۱۹۲۴)
سابرمتی

سرچشمہ ہیں جو مزدوروں میں پائی جاتی ہیں۔ انہوں نے زور دیکر کہا کہ "تارا" جیسے جہاز پر اپنی بیویوں اور گھر کے دوسرے افراد کو نہیں لانا چاہئے اور بتایا کہ جب تک سفر کے انتظامات میں بنیادی اصلاحات نہ کردی جائینگی، کھیتوں میں صحت بخش سماجی زندگی پیدا نہ ہوگی۔

۱۹۲۵ کی ابتدا میں وہ ٹراونکور میں تھے جہاں انہوں نے والی کوم کی ستیاگرہ کا مشاہدہ کیا جو مسلسل کئی مہینوں تک مستقل مزاجی اور صبر کے ساتھ موسم کی سختیوں کے باوجود جاری رہی۔ نوجوان رضاکاروں کی دلیری اور تخیل پرستی سے وہ بہت متاثر ہوئے، اور خود ان کی موجودگی کی وجہ سے ان میں نئی ہمت اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

ان کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کردیں جس کی بنیاد ۱۹۲۰ میں ڈالی گئی تھی۔ ہندوستانی مزدوروں کے مسائل کے متعلق انکے چارسالہ گہرے تجربہ اور ۱۹۲۳ میں بین الاقوامی لیبر آفس کے معائنہ کی وجہ سے انہیں یقین ہوگیا کہ کسی نہ کسی قسم کی مرکزی ٹریڈ یونین کی موجودگی ضروری اور پسندیدہ ہے اس لئے انہوں نے فروری ۱۹۲۵ میں کانگریس کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ناگپور میں شرکت کی اور وہیں وہ ۲۶-۱۹۲۵ کے لئے اس کے پریسیڈنٹ منتخب ہوگئے۔ اسکے معنی یہ تھے کہ وہ دوران سال میں صنعتی تنازعات کے بارے میں بار بار مشورہ دیں یا مداخلت کرکے ان کا تصفیہ کرائیں۔ انہوں نے افیون کے تحقیقاتی کام کو مکمل کرنے کی غرض سے آسام کا سفر کیا، اڑیسہ کے سیلاب زدہ علاقوں کو دیکھنے کے لئے دوسرا سفر کیا اور ساتھ ہی انہوں نے مٹیا برج کے بھی متعدد دورے کئے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں وہ شانتی نکیتن میں استاد کی حیثیت سے کام کرنے کے منصوبے باندھتے رہے، اور جب جولائی ۱۹۲۵ میں اسکول کا نیا سال شروع ہوا تو انہوں نے بعض جماعتوں کو پڑھانے کے لئے پُرجوش طریقہ سے اپنی خدمات پیش کردیں۔ ان کی یہ پیشکش قبول کرلی گئی لیکن چند ہی ہفتے بعد ریکڑ جسے اینڈریوز کی بیرونی دلچسپیوں سے نہایت گہری ہمدردی تھی، یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ اسکول کا نظام اوقات اساتذہ کی سہولت کا

پابند نہیں ہو سکتا، اور ساتھ ہی اینڈریوز سے درخواست کی کہ وہ اُس مدت کو پورا کریں جتنی مدت تک وہ جلا رہے ہیں۔ یہ ان کی آخری کوشش تھی کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ جماعت کے درس و تدریس کا کام کریں، اسی سال نومبر کے مہینہ میں جنوبی افریقہ نے انہیں پھر طلب کر لیا۔

(۲)

اس خاکہ میں افیون کی مہم کی داستان کا اضافہ کر دینا ضروری ہے۔ اینڈریوز کی وسعتِ نظر، بصیرت اور بے غرضانہ ثابت قدمی کا مظاہرہ جس نمایاں طریقہ پر یہاں ہوا اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔

گھریلو اور غیر ملکی منڈیوں کے لئے ہندوستانی افیون کی فروخت حکومتِ ہند کی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ اینڈریوز کو اس تجارت سے دلچسپی اُس وقت سے پیدا ہوئی جب سے انہوں نے مس لاٹوش کی کتاب "افیون کی اجارہ داری" کا مطالعہ کیا تھا جس کے انکشافات پر انہوں نے نہایت سختی سے ایک مضمون کی شکل میں نکتہ چینی کی تھی جو دسمبر ۱۹۲۰ کے "ماڈرن ریویو" میں شایع بھی ہوا تھا۔ چین کو افیون کی جو درآمد کی جاتی تھی وہ قانوناً ناجائز تھی، لیکن اس کے متعلق سب سے نازیبا حرکت یہ تھی کہ ہر ممکن مقامی ضروریات سے ہزاروں گنا زیادہ مقدار میں یہ افیون ہندوستان سے ہانگ کانگ سنگاپور، بنگ کاک اور جنوبی چین کی بندرگاہوں کو بھیجی جاتی تھی اور جس سے ان بندرگاہوں کے حکام اپنی آمدنی کی بہت بڑی رقم حاصل کرتے تھے۔ اینڈریوز نے مس لاٹوش سے اپنا رابطہ قائم رکھا اور اس موضوع پر جسقدر لٹریچر مل سکا اس سب کا مطالعہ کر ڈالا۔ ۱۹۲۱ کی ابتدا میں ڈاکٹر منی لال نے جو سُووا میں ان کے میزبان رہ چکے تھے، ماریشس سے انہیں لکھا کہ یہاں کے مقیم ہندوستانیوں میں افیون خوری کی عادت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ بجائے خود ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اور ساتھ ہی انہیں آنے اور تحقیقات کرنے کی دعوت دی۔ مگر اینڈریوز نہیں جا سکے، لیکن اس دعوت نامہ کی وجہ سے افیون کی

تجارت سے ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ بعد میں اسی سال جب گاندھی آسام گئے اور وہاں افیون کے مروجہ غلط استعمال کے متعلق زبردست مہم جاری کی تو سرکاری حلقوں نے اس مہم کے نتائج کو کم کرکے دکھایا۔ حکومت کے محکمۂ آبکاری کی رپورٹ برائے ۲۲-۱۹۲۱ میں ظاہر کیا گیا کہ "عدم تعاون کا مقصد منشی اشیا کے استعمال کی روک تھام نہیں ہے بلکہ حکومت کو پریشان کرنا ہے" اور یہ کہ "مارچ ۱۹۲۲ تک حالات معمول پر آگئے ہیں۔" لیکن جب اینڈریوز اکتوبر ۱۹۲۳ میں آسام کے دورہ پر گئے اس وقت محکمۂ آبکاری کے ایک افسر نے بتایا کہ افیون کے استعمال میں ۴۰ فیصدی کی کمی ہوگئی ہے اور کانگریس کے کارکن بھی اس کے دعویدار تھے۔ انہوں نے جنیوا میں منعقد ہونیوالی بین الاقوامی افیون کانگریس کے اجلاس کے پیش نظر مقامی لیڈروں کو قابلِ اعتماد اعداد فراہم کرنے کی اہمیت کی یاد دلائی۔ اس موضوع کے زیادہ جامع پہلوؤں پر ان کی ماہرانہ معلومات سے کانگریس کی تحقیقاتی کمیٹی کو انتہائی فائدہ پہنچا جو آئندہ موسم گرما میں مقرر ہوئی۔ اس معلومات میں اُن کے دورۂ ہانگ کانگ اور ریاستہائے ملایا کے باعث جو ۱۹۲۴ میں کیا گیا تھا، مزید اضافہ ہوا اور انہوں نے ذاتی تحقیق و تجسس کا کوئی موقع فروگزاشت نہیں کیا۔ جب وہ ہندوستان واپس آگئے اس وقت آسام کی رپورٹ انہیں دیدی گئی اور دہلی کے برت کے دَوران میں انہوں نے فرصت کے تمام لمحات کو شہادت جمع کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں صرف کردیا۔ انہوں نے اپنا مقدمہ صاف، سادہ اور پرزور الفاظ میں تیار کیا اور مس لاموٹ کو اور انگریز کو نیکر ہارلیس الیگزنڈر کو جملہ تفصیلات خطوط میں لکھکر بھیجدیں۔ یہ دونوں جنیوا کی کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے تھے۔

ان کا کام صرف یہی نہیں تھا کہ وہ اپنے رفقائے کار کو حقائق سے آگاہ رکھیں، بلکہ فجی کی طرح اس موقع پر بھی انہوں نے کمال دانشمندی کا اظہار کیا اور پوری احتیاط سے مہم کو جاری رکھنے کا منصوبہ تیار کیا۔

جنیوا کی کانفرنس کے انعقاد سے بہت پہلے انہوں نے نوجوان ہندوستانی جرنلسٹ

تارنی سنہا کو انگلستان میں ایک جگہ دلوادی تاکہ وہ ہارلیس الیگزنڈر کے ساتھ مل کر افیون کے مسئلہ پر کام کرے۔ بعد میں انہوں نے اسے جمعیت اقوام کی سیکریٹریٹ متعینہ جنیوا میں جگہ دلوادی تاکہ وہ وہاں رہ کر واقعات کے رخ کا مشاہدہ کرتا رہے کانفرنس سے پہلے انہوں نے ممتاز ہندوستانیوں سے جن میں ٹیگور، گاندھی، کے۔ ٹی پال، راما نند چیٹرجی وغیرہ شامل تھے، ایک عرضداشت پر دستخط کرائے اور انہوں نے خود بھی اس پر دستخط کئے جس میں پوست کی کاشت کی بیخ کنی کا مطالبہ کیا گیا تھا سوائے اس حد کے جس کی ادویہ سازی کے لئے ضرورت ہو۔ ہارلیس الیگزینڈر نے انہیں کانفرنس سے تار بھیجا تاکہ وہ گاندھی سے کہکر خصوصی پیغام بھجوائیں۔ اور اینڈریوز نے پیغام حاصل کر کے بھجوادیا جو عین موقع پر وہاں پہنچا۔ مس لاموٹ نے ایک خط میں اس منظر کو بیان کیا ہے جو اس وقت کانفرنس میں دیکھنے میں آیا۔

"بہرحال عرضداشت پیش کر دی گئی اور اس نے اچھا خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا! وہ اور ایم۔کے۔گاندھی کا تار ہی سہ پہر کے اجلاس کے نمایاں واقعات تھے۔ جب ہندوستانی عرضداشت پڑھکر سنائی گئی اور کیمپبل اس کے خلاف صدائے احتجاج کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اجلاس میں کافی ہیجان تھا۔"[1]

حکومت ہند کے نمائندہ مسٹر کیمپبل کے لئے یہ لمحہ نہایت پریشان کن تھا اس لئے کہ وہ عرضداشت کے پیش ہونے سے پہلے کانفرنس کے سامنے یہ چونکا دینے والا بیان دے چکے تھے کہ "حکومتِ ہند کے سخت ترین دشمنوں نے بھی جن میں مسٹر گاندھی شامل ہیں، افیون کے بارے میں اس کی پالیسی کے متعلق مذمت کا ایک لفظ آج تک نہیں کہا۔"

اینڈریوز نے اس "شرمناک لائیبل" کا جواب دادا بھائی نوروجی اور جی۔کے۔ گوکھلے کی شایع شدہ تقریروں کے اقتباسات پیش کر کے دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے

---

[1] مکتوب بنام سی۔ایف۔اے، ۲۳ نومبر ۱۹۲۴

ہندوستانی اخبارات کو ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائی جو انہیں دنیا کے ہر حصہ سے ملتی رہتی تھی، اور جس سے رائے عامہ پر اچھا اثر پڑ سکتا تھا۔ انہوں نے افیون کی تجارت پر ٹیگور کے تبصرہ کو جو ۱۸۸۱ میں شائع کیا گیا تھا، بڑی محنت سے برآمد کیا اور اس کا ترجمہ کرا کے اُسے استعمال کیا۔ اسی طرح انہوں نے لارڈ چیسٹر فیلڈ کی ایک تقریر برآمد کی جو انہوں نے دار الامرا میں "برٹش ایکسائز اینڈ لائیسنس بل" کی مخالفت میں ۱۷۴۳ میں کی تھی اور موثر انداز میں اس تقابل کو یوں پیش کیا تھا:

"مائی لارڈز، عیاشی کی ہر چیز پر ٹیکس لگانے کی ضرورت ہے، لیکن برائی کی بھی ہر طریقہ سے روک تھام کرنی چاہئے، خواہ قانون کو عملی جامہ پہنانے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں۔ یہ مسودۂ قانون ایسی شرائط پر مشتمل ہے جن پر چلکر لوگوں کو آئندہ زیادہ سے زیادہ بدکاری کرنے کی اجازت ہوگی، ایسی بدکاری جس کی قانون اجازت دیتا ہے اور جسے مجسٹریٹ نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لئے کچھ شبہ نہیں کہ ارباب اختیار کو اپنے آقاؤں کی طرف سے یہ ہدایت ملے گی کہ اس شراب کی کھپت کو ترقی دیجائے جس سے اتنی بڑی آمدنی کی توقع ہے۔"

اینڈریوز نے شرارت آمیز شوخی سے کہا کہ آبکاری کے معاملہ میں لارڈ چیسٹر فیلڈ بھی فرشتوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے انڈین کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبروں کے استعمال کے لئے اہم حقائق کا ایک فاضلانہ خلاصہ تیار کیا جس میں جنیوا کانفرنس کی کارروائیاں بھی شامل تھیں، تاکہ ۱۹۲۵ کے موسم بہار میں افیون پر جو مباحثے ہوں ان میں وہ کام آئے۔ اعداد اور افیون کے کنٹرول کی تاریخ کی وضاحت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اخلاقی اصول کی بنا پر یوں اپیل کی:

"انجام کار یہ اخلاقی ساکھ جو ہندوستان کو اس مسئلہ پر خالصتہً انسان دوست طرز عمل اختیار کرنے سے دنیا بھر میں حاصل ہوگی، وہ ہندوستان کے لئے

اس روپے سے کہیں زیادہ مادی اور روحانی اہمیت رکھتی ہے جو دوسرے لوگوں کو ایسی چیز پیش کرنے سے حاصل ہوتی ہے جسے زہر تسلیم کر لیا گیا ہے"

کونسل آف اسٹیٹ میں افیون کی قرارداد منظور نہ ہو سکی۔ لیکن لیجسلیٹو اسمبلی میں حکومت ۵۲ کے مقابلہ میں ۶۱ آرا سے شکست کھا گئی۔ اینڈریوز کے پرانے دوست ڈاکٹر ایس۔ کے۔ دت کی شاندار تقریر نے بحث کا پانسہ بالکل پلٹ دیا اور سر بیسل بلیکٹ نے تحقیقات کا وعدہ کر لیا۔۔۔ اگرچہ صرف چھ مہینے پیشتر وہ اسی اسمبلی کے روبرو یہ اعلان کر چکے تھے کہ "مس لاموٹ اور مسٹر اینڈریوز نے جو یکطرفہ بیانات دیے ہیں ان کی بنا پر گورنمنٹ کوئی وجہ نہیں دیکھتی کہ افیون کے بارے میں حکومتِ ہند کی پالیسی پر نظرثانی کرے" [1]

اینڈریوز ایسے شخص نہ تھے کہ صرف غفلت کی وجہ سے ثمراتِ فتح کو ہاتھ سے جانے دیتے۔ لہٰذا انہوں نے آسام کا دورہ کیا اور کانگریس کی تحقیقاتی رپورٹ کو آخری شکل دی۔ انہوں نے ان تحقیقاتی کمیٹیوں کے کام کی عقابی نگاہ سے نگرانی جاری رکھی جو "سیاہ رقبوں" میں قائم کی گئی تھیں، جن میں سے اکثر ان کی امداد کی خواہاں بھی تھیں اور اگر وہ تساہل سے کام لیتیں تو وہ خود جا کر ان کے کام کو دیکھتے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا جیسا کہ انہیں ایک صوبہ میں معلوم ہوا کہ شہادت کو اس بنا پر دبایا جا رہا ہے کہ کمیٹی کا ایک ممبر اس تجارت میں حصہ لیتا ہے، تو پھر وہ حکام کی خبر لیتے۔ ہارس الیگزنڈر کی وساطت سے انہوں نے مسئلہ کو مسلسل پارلیمنٹ کے سامنے رکھا اور اس امر پر جنگ کرتے رہے کہ ہندوستانی ریاستوں [2] سے نیز برطانوی ہندوستان سے افیون کے اعداد و شمار منگا کر جمعیتِ اقوام کے سامنے پیش کئے جائیں۔ انہوں نے اخبارات میں مرکزی حکومت اور صوبجاتی حکومتوں کو مخاطب کرکے اس قسم کے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔۔ کہ وہ اپنی

---

[1] یہ بیان اسمبلی میں ۸ ستمبر ۱۹۲۴ء کو ایک سوال کے جواب میں دیا گیا تھا۔

[2] راجپوتانہ کی بعض ریاستیں خام افیون کی پیداوار کے زبردست مرکز ہیں۔

دیانتداری کا ثبوت اس طرح سے کیوں نہیں دیتیں کہ افیون کی ساری آمدنی تعلیمی کاموں کے لئے یا چوری چھپواں افیون لانے کے خلاف تادیبی کارروائیوں کے لئے وقف کردیں؟ وہ افیون کی قیمت میں اضافہ کو کیوں قائم نہیں رکھتیں جیسا کہ صوبجاتِ متوسطہ نے کیا ہے خواہ اس اضافہ کا نتیجہ گرتی ہوئی آمدنی کی شکل ہی میں کیوں نہ نکلے؟ کیا وجہ ہے کہ افیون کے لیسنس آسام میں ابھی تک ایسی قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں، جس کے باعث جائز منافع بھی ناممکن ہوگیا ہے؟ ممکی کے سے ہٹیلے پن کا جو اظہار انہوں نے کیا اس کا انعام انہیں مل گیا۔ آہستہ آہستہ لیکن واضح طور پر حالات میں بہتری رونما ہوگئی۔ بنگال اور چند دوسرے صوبجات نے افیون کے ناجائز استعمال کی روک تھام کے لئے مفید قوانین وضع کئے۔ مگر اینڈریوز اب بھی احتساب سے غافل نہ رہے۔

(۳)

افیون کی مہم سے اس انسان کی فطرت کی پوشیدہ قوت کا انکشاف ہوتا ہے ایسی فطرت کا جو سطح پر سے لچکدار ہے مگر باطن میں فولادی سلسلہ کی طرح ناقابل تسخیر۔ اس پیکر خاکی کے دل کے اندر اس قوت سے گندھی ہوئی بہت سی دوستیوں کی حرارت ہے، جو متعدد رنگوں کی چمک کے ساتھ چمکتی ہے جب اس کی حساس اسپرٹ کبھی ایک شخصیت کی اور کبھی دوسری شخصیت کی آواز پر لبیک کہتی ہے۔

رابندرناتھ ٹیگور سے انہیں ویسی ہی احترام آمیز محبت تھی جیسی ایک مرید کو اپنے روحانی مرشد سے ہوا کرتی ہے۔ ان کی ذہنی صلاحیتیں اور ان کی جسمانی قوتِ برداشت ہمیشہ شاعر کے مطمحِ نظر کی خدمت کے لئے وقف رہیں اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد بار انہوں نے چندہ جمع کرنے کا "نہایت نفرت انگیز کام" بھی انجام دیا محض اس لئے کہ ان کے دوست اس بوجھ کے اٹھانے سے باز رہیں۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں بھی جبکہ وہ جسمانی طور پر سخت خستہ حالت میں تھے اور انگلستان جانے کے لئے بمبئی میں اپنے جہاز کا انتظار کر رہے تھے، انہوں نے شانتی نکیتن

نے اپنے ایک رفیق کار گور گوپال گھوش کو شہر کے تاجر دوستوں سے آشرم کے کام کے لئے چندے دلوانے میں کئی گھنٹے صرف کر دیئے۔

۱۹۲۴ء میں ٹیگور کے دورۂ چین کے اختتام پر اینڈریوز ان سے کئی دن پیشتر ہانگ کانگ پہنچ گئے تمام ہندوستانی تاجروں سے تعلقات پیدا کئے، ہندوستانی باشندوں کے ہر طبقہ سے وشوا بھارتی کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا، اخبارات کے لئے مضامین لکھے، جلسوں میں تقریریں کیں اور شاعر کی آمد کے موقع پر ایک پرس" کی پیشکش کے لئے تفصیلی انتظامات کئے۔ چند دن بعد ٹیگور سنگاپور سے اپنے وطنِ مالوف کو روانہ ہو گئے، لیکن اینڈریوز وہیں پیچھے رہ گئے تاکہ جو نتائج ان کی آمد سے برآمد ہوئے انہیں مستحکم کریں اور ریاستہائے ملایا کے ہر بڑے شہر میں اسی قسم کی پبلسٹی کا کام انجام دیں۔ انہوں نے ٹیگور کے کام کے بین الاقوامی پہلو پر زیادہ زور دیا اور ملایا کے چینیوں میں بھی اسے ہر دلعزیز بنانے کے لئے سخت کوششیں کیں، اتنی کوششیں جتنی انہوں نے ہندوستانیوں میں اسے مقبول بنانے کے لئے کی تھیں۔ ہندوستانیوں میں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کی دلچسپی کا خیر مقدم کیا جو آشرم کو مختلف قسم کی مذہبی اور صوبائی کلچروں کے ذریعہ مالدار بنانا چاہتے تھے۔ سنگاپور سے ایک خط کے دوران میں وہ رقمطراز ہیں:۔

"ایک نوجوان ملباری ہندو اور ایک موپلا جلسہ میں موجود تھے، بعد میں انہوں نے وشوا بھارتی کا طالب علم بننے کی خواہش ظاہر کی۔ اسی طرح ایک الکٹریکل انجنیئر نائیڈو نامی نے بھی جس کی دادی بنگلور میں مہارشی[1] کی مرید ہو گئی تھی۔ وہ ۸ر اگست تک کلکتہ پہنچ رہا ہے۔ میں نے اسے اپنی ساری باقی ماندہ پونجی ــ ۱۸۵ روپے ــ دیدی ہے تاکہ وہ اس سے اپنے سفر اور سامان وغیرہ کا انتظام کرے۔"

---

[1] شاعر بنگال کے والد دویندرا ناتھ ٹیگور اسی لقب سے عوام میں مشہور تھے۔

محنت اور جانفشانی کا یہ سارا پروگرام دوسرے بہت سے کاموں کے ساتھ موسم برسات کی تکلیف دینے والی مرطوب گرمی میں عمل میں لایا گیا جس کی وجہ سے کسی اور موسم کے مقابلہ میں اینڈریوز کی صحت پر بہت برا اثر پڑا اور ان کی صحت بالکل خراب ہوگئی۔

مگر اینڈریوز اور گاندھی میں جو مساوی العمر تھے اور خدمتِ قوم و ملک میں آزمودہ شریکِ کار کی حیثیت رکھتے تھے، جو رشتہ تھا وہ بے لاگ محبت کا تھا، اسی کے پیش نظر گاندھی ضرورت سے زیادہ تھکے ہوئے اینڈریوز کو جنہیں فرضِ منصبی کے احساس میں راتوں کا سونا بھی حرام ہوگیا تھا، گاندھی "ینگ انڈیا" کے لئے برما کے "تاثرات لکھنے پر یوں آمادہ کرتے ہیں:

۲۵ اگست ۱۹۲۴

میں نے برما پر آپ کا مضمون پڑھا ہے۔ وہ چیز واقعی دہشت انگیز ہے آپ نے بہت سے باتیں ایسی دیکھی ہیں جن کے بارے میں آپ صحت کے ساتھ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اسباب کو دریافت کر سکے ہیں۔ مزید برآں آپ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ آپ ہر ایک مسئلہ کا مطالعہ کرتے۔ کیا آپ کچھ عرصہ کے لئے آرام نہیں کریںگے؟ ...... کام عبادت ہے لیکن ساتھ ہی وہ جنون کی حد تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ ....
بہر حال میں اسے چھاپ رہا ہوں اس لئے کہ اس کی تہ میں آپ کے قلب کی انتہائی پاکیزگی کارفرما ہے۔
اس سے زیادہ گہری محبت کے ساتھ جس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

آپ کا

موہن

اینڈریوز کے لئے یہ جاننا بیحد مسرت بخش تھا کہ ستمبر ۱۹۲۴ والے برت میں ان کی موجودگی کی وجہ سے گاندھی تکان اور دباؤ سے بڑی حد تک محفوظ رہے

بیشمار ملنے والے، اتحاد کانفرنس کے ممبر اور دوسرے اشخاص ان سے ملنے کی خواہش کرتے تھے اور دربان کا کام بہت سخت بن گیا تھا۔

"ہر شخص چاہتا ہے کہ میں اس کے معاملہ میں استثنا برتوں۔ مجھے بلاشبہ بہت زیادہ سخت گیر ہونا پڑتا ہے اور ساتھ ہی بڑے سلیقہ سے کام کرنا پڑتا ہے کہ کہیں کسی کی دل شکنی نہ ہو جائے۔ . . . . اس کے لئے مسلسل احتیاط کی ضرورت ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ میں نے یہ ذمہ داری صرف محبت کے جذبہ کے ماتحت اپنے سر لے رکھی ہے اور وہ بڑی آسانی سے میرا کہنا مان لیتے ہیں حالانکہ یہ اغلب ہے کہ وہ دوسروں کا کہنا نہیں مانتے۔"[1]

بعض دن بڑی پریشانی کے بھی گزرے لیکن اینڈریوز کے دل میں اپنے دوست کے متعلق کبھی مایوسی کے خدشات نہیں پیدا ہوئے۔ خود ان کا متنوع کام بہت سلیقہ کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور غروب آفتاب کی خاموش سرخی میں یا طلوع فجر سے قبل کی خاموش تاریکی میں انہیں روح کا وہ سکون مل جاتا تھا جس کی جھلک ان مضامین میں ہویدا ہے جو انہوں نے "ینگ انڈیا" میں اس زمانہ میں لکھے تھے۔
جب آخری دن آپہنچا اُس وقت گاندھی نے برت توڑنے سے پہلے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنا محبوب عیسائی نغمۂ حمد[2] گائیں۔ اینڈریوز نے ایسی وارفتگی سے اسے گایا کہ سننے والوں کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان کے دلوں میں اُترتا چلا جا رہا ہے۔
گاندھی نے اپنی قوم کے گناہوں کی ذمہ داری جس طریقہ سے اپنے سر لی اسے دیکھکر وہ زیادہ بہتر طریقہ سے مسیح کے کرب کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔
جہاں تک گاندھی کا تعلق ہے ایک خط سے جو ایک دوسرے سے جدا ہوتے

---

[1] مکتوب بنام رویندر ناتھ ٹیگور، مورخہ اکتوبر ۱۹۲۴ء
[2] اسکے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "جب میں عجیب و غریب صلیب کو دیکھتا ہوں۔"

وقت ۳۰ر اکتوبر کو چارلی کے نام لکھا گیا تھا، محبت کی اُس گہرائی کا اندازہ ہوجاتا ہے جو ان دونوں کے درمیان تھی۔ وہ اقرار کرتے ہیں: "آج ہر لمحہ مجھے آپ کی یاد آئی مگر آپ موجود نہ تھے۔ ہائے، آپ کی محبت!"

ایک اور خط میں جس میں سرزنش اور تعریف کے ملے جلے جذبات اس تکلیف دہ اور افسردہ کرنے والی تشویش کے متعلق ملتے ہیں جو ٹیگور کی خرابیِ صحت کی بنا پر اینڈریوز کے دل میں محسوس ہو رہی تھی، اور ساتھ ہی ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ورکس (جمشید پور) میں مزدوروں کے تنازعہ میں ان کے کام کی جانب یوں اشارہ کیا گیا ہے:

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۲۵ (تاریخ درج نہیں)

میرے عزیز ترین چارلی،

اگرچہ آپ کی خواہش نہ ہوگی کہ میں آپ کو خط لکھوں لیکن میں مجبور ہوں۔ آخر گرو دیو آپ کو کیوں بلا رہے ہیں؟ خدا نے آپ کو اب تک تکالیف سے محفوظ رکھا ہے اور جب تک اسے آپ کی خدمت کی ضرورت ہوگی، وہ آپ کو اسی حالت میں رکھیگا۔ لیکن آپ بعض اوقات خدا کی امداد نہیں کرتے اس وقت بھی جبکہ آپ کر سکتے ہیں اور آپ کو کرنا چاہیئے، اور آپ کے لئے کسی چیز یا کسی شخص کے متعلق تشویش رکھنا بُرا ہے۔ جب میں آپ کو کسی چیز کے بارے میں پریشان دیکھتا ہوں اس وقت میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ "خواہ مخواہ پریشان ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟"

آپ کی جمشید پور والی رپورٹ حیرت انگیز ہے۔ صرف آپ ہی اسے تحریر کر سکتے تھے۔ اس میں خالی قیاس آرائیوں سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بھیلوں کے بچوں کے لئے لنگوٹیوں کا انتظام کرنے کے بارے میں، میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

عمیق ترین محبت کے ساتھ

آپ کا موہن

مزید یہ کہ پھر کبھی آئندہ آپ مرغن غذائیں نہ کھائیں، میزبان کو خوش کرنے
کے لئے بھی نہیں۔ میں اس بارے میں آپ سے پختہ وعدہ لینا چاہتا ہوں۔"
ان سالوں میں اینڈریوز کی زندگی کی دوسری جھلکیاں اس دل سوزی اور
روشنی سے معمور نظر آتی ہیں جن کی وجہ سے ان کی شخصیت میں غیر معمولی دلکشی
پیدا ہو گئی تھی۔ دہلی کے ایک پرانے رفیقِ کار نے جو ۱۹۲۴ء میں لشنگاپور اسٹیشن پر
ان سے ملنے کے لئے گئے تھے، غریب ہندوستانیوں کا ایک جمِ غفیر دیکھا جو انہیں
خوش آمدید کہنے کے لئے گاڑی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس "سراپا احترام کی نظر"
کو کبھی نہیں بھول سکے جس کا انہوں نے ان لوگوں کی آنکھوں میں مشاہدہ کیا جبکہ وہ
اپنے دوست کو دیکھ رہے تھے۔ جے۔ ایس۔ ہوآئے لینڈ نے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس
کے صدر کی حیثیت سے ان کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ صابرانہ، اخلاص منکسرانہ
پُر مزاح اور اپنے آپ کو مٹا دینے والے انداز سے کرسیِ صدارت پر جلوہ گر
تھے۔ آسام کے مقام ڈبروگڑھ میں وہ "منگیوں اور قلیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا
ملا کر چلتے ہیں، ان کے بچوں کے لئے اپنی شال بچھا دیتے ہیں تاکہ وہ اس پر بیٹھ جائیں
اور جلسہ کے اختتام پر ان میں سے ہر ایک سے گرم جوشی سے بغلگیر ہوتے ہیں۔"[2]
ذاتی دوستی اور انسانی مصیبت کا احساس ہی تھا جو انہیں ۱۹۲۵ کے موسم خزاں
میں سیلاب زدہ اڑیسہ میں کشاں کشاں لے گیا۔ پنڈت گوپا بندھو داس نے جن
سے ان کی ملاقات ۱۹۲۰ء میں ڈالٹن گنج کی کانفرنس میں ہوئی تھی، شانتی نکیتن تک
کا سفر کیا تاکہ منت سماجت کر کے انہیں لائیں۔ اینڈریوز شروع ہی سے ان

[1] بشپ فرگوسن ڈیوی۔

[2] اینڈریوز کے دوست انہیں اسی بات پر تنبیہہ کیا کرتے تھے کہ وہ نہایت مستعدی سے
گندے سے گندے اور ذلیل سے ذلیل آدمی سے بغلگیر ہو جاتے ہیں بالخصوص جبکہ زبان کی ناواقفیت
کی وجہ سے وہ اپنی نیک نہادی کا اور دوسرے فریقوں سے ثبوت دینے سے معذور ہوتے تھے۔

سے محبت کرتے تھے۔" وہ پوجا پاٹ کے معاملہ میں قدامت پسند تھے لیکن وہ اچھوتوں کے نہایت گہرے دوست تھے۔ ان کی معیت میں رہنا خدا کا قرب محسوس کرنے کے مترادف تھا۔" وہ دونوں .... چڑھے ہوئے دریائے مہاندی کے کنارے کنارے موسم برسات کی تلاطم خیزیوں میں ذخائر سے لدی ہوئی ایک بادبانی کشتی میں ایک ساتھ سوار ہو کر گئے تاکہ سردی زدہ پناہ گزینوں کے لئے جو اس کے ٹوٹے ہوئے کناروں پر بے یارومددگار پڑے ہوتے تھے، آرام وآسایش کا سامان بہم پہنچائیں۔ جس چیز کا انہوں نے تونڈلا میں ریلوے کے تنازعہ کے دوران میں مشاہدہ کیا تھا وہی یہاں انہیں نظر آئی: انہیں بھی اس خلیج کو دیکھکر دلی رنج ہوا جو ذمہ دار سرکاری افسروں اور غربا کے مابین حائل تھی اور جس کی وجہ سے انہیں ان کے دکھ درد سے کوئی ذاتی سروکار نہ تھا۔ ضلع پوری میں چار مہینے تک اراضی سیلاب زدہ رہیں اور اس تمام عرصہ میں کسانوں کے پاس کاشت کرنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا اور نہ کوئی مشغلہ تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ قحط کے آثار رفتہ رفتہ پیدا ہو رہے ہیں، اس کے باوجود کوئی ذمہ دار افسر اپنی آنکھوں سے ان کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لئے نہیں آیا اور جب اینڈریوز نے ایسا کیا اس وقت سرکاری افسران نے سی۔آئی۔ڈی کی شکل میں مشتبہ طریقہ سے ہر جگہ ان کا پیچھا کیا۔

(۴)

"بڑو دادا" دویجندرناتھ ٹیگور کے ساتھ اینڈریوز کی دوستی کے یہ آخری سال تھے مگر محبت سے مملو۔ وہ بڑے میاں کی بڑھتی ہوئی کمزوری کی تنہائی کو نسوانی نزاکت کے ساتھ محسوس کرتے تھے اور شانتی نکیتن سے بار بار باہر چلے جانے پر وہ غیر حاضری کے دوران میں انہیں محبت کے خطوط تقریباً روزانہ بھیجتے رہتے تھے تاکہ "بڑو دادا" انہیں پڑھکر چند ہی منٹ کی مسرت

حاصل کر لیا کریں۔ بڑو دادا کہا کرتے تھے: الحاقی نشان لازماً ناقابل فتح ہے۔ گرودیو اور گاندھی جی کو ملحق کرنے پر قناعت نہ کرتے ہوئے وہ اب پہلی سی زیادہ شاہانہ کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ تاکہ بےکس و معذور بڑو دادا کو اور علما و فضلا، اساتذہ اور طلبا کو برادرانہ محبت کے رشتہ میں منسلک کر دیں۔ یا وہ یوں کہتے: "میں نے علم الحساب میں ایک نئی دریافت کی ہے جو حسب ذیل ہے:

ہائی مین: ازدواجی محبت ہائی فین: برادرانہ محبت"

جب کبھی اینڈریوز آشرم میں گھر پر رہتے وہ شام کے وقت اپنی طویل، دوستانہ گفتگوؤں کو پھر سے تازہ کرتے اور دن میں بھی متعدد مرتبہ بڑے میاں انہیں بچہ کی سی معصومانہ بے صبری کے ساتھ بلا لیتے تاکہ کسی نئے خیال یا نئے مذاق میں انہیں شریک کر لیں، یا یہ یقین حاصل کریں کہ جو انگریزی وہ قدرے جھجک کے ساتھ لکھتے ہیں وہ صحیح اور بامحاورہ ہے۔ اینڈریوز بہ عجلت تمام ان کے پاس جاتے اور بڑو دادا اس طرح سے ان کی محبت کا لطف اٹھاتے گویا کہ وہ اپنے کسی عزیز بیٹے کے پاس بیٹھے ہیں۔ جب اینڈریوز باہر چلے جاتے اس وقت "محبت کے خطوط" جو کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھے جاتے بعض اوقات نظم میں، ان کے نام بھیجے جاتے۔ ایک منظوم خط حسب ذیل ہے:

چونکہ میرا کوئی دوسرا نہیں ہے
اے بھائی چارلی!
ضرورت میں دستگیری کرنے والا دوست
عزم میں اور عمل میں،
میں تمہارے پاس بھیجتا ہوں
میٹھی میٹھی امرتیاں۔
یہ برمحل تحفہ ہے
نہ ٹوٹنے والی دوستی کا۔

انکار نہ کر دینا
اس گیارھویں مہینے کے کیک کا
اچھا استعمال کرنے سے
بڑے دادا کی محبت کی خاطر

آپ کا اپنا
بڑو دادا

ایک اور خط مارچ ۱۹۲۴ میں لکھا گیا تھا جبکہ اینڈریوز عملی جراحی کے بعد گاندھی کے ہمراہ تھے، اسے ذیل کے غیر معمولی جذبہ محبت کے ساتھ یوں ختم کیا گیا ہے:

"میری دلی شکر گزاری، محبت اور احترام مہاتما جی کی خدمت میں پہنچا دیں اور اتنی ہی محبت اور احترام اس واحد شخص کے لئے جو میری نظروں میں ان تمام دوستوں سے زیادہ محترم ہے جو کبھی میرے رہے ہیں یا مجموعی طور پر سب دوستوں سے زیادہ اور جسے میں نہایت فخر و مباہات کے ساتھ اپنا محبوب ترین بھائی کہا کرتا ہوں۔"

نومبر ۱۹۲۵ میں جب اینڈریوز جنوبی افریقہ جا رہے تھے، اس سے ایک دن قبل شام کو وہ دونوں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ان کی آخری گفتگو ہے۔ دوسری صبح کو جب اینڈریوز اسٹیشن کی طرف چلے، تو وہ بڑو دادا کے ورانڈے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے اور عالم خاموشی میں انہوں نے بڑے میاں کی خاموش دعائیں حاصل کیں۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔[1]

[1] اینڈریوز نے "ینگ انڈیا" (جنوری - مارچ ۱۹۲۶) میں اور وشوا بھارتی (سہ ماہی رسالہ) (۱۹۲۸) میں بڑو دادا کے متعلق نہایت دلچسپ اور مزید ارباید داشتیں لکھی ہیں۔

یونٹی کانفرنس (اتحاد کانفرنس) میں جو لوگ شریک ہوئے تھے ان میں بیل ویسٹ کوٹ کے بڑے بھائی ڈاکٹر فوس ویسٹ کوٹ بھی تھے جو ۱۹۱۹ء میں کلکتہ کے میٹروپولیٹن بشپ کی حیثیت سے ڈاکٹر لیفرائے کے جانشین بنے۔ کانفرنس میں یا اس کے کچھ دیر بعد اینڈریوز نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ عیسائی مذہبی رفاقت کی تجدید چاہتے ہیں جس سے وہ اسقدر وسیع حد تک الگ رہے ہیں۔ وائی۔ایم۔سی۔اے اور اسٹوڈنٹ کرسچین ایسوسی ایشن کی طرح کی تحریکیں ۱۹۲۰ء سے بڑے ذوق شوق سے ان کا استقبال کر رہی تھیں۔ کرسمس ۱۹۲۲ء کے موقع پر انہوں نے اسٹوڈنٹ کرسچین کانفرنس منعقدہ مدراس میں جو تقریر "عیسیٰ اور گنہگار" کے عنوان پر کی جس میں انہوں نے اپنی "رجوع الی المسیح کی کہانی" بیان کی تھی اس سے مجمع اسقدر متاثر ہوا کہ اس نے باغ کی تاریک خاموشی میں باہر بیٹھنے اور ساری رات عبادت میں صرف کر دینے کی خواہش ظاہر کی خود اُن کے ہندوستانی عیسائی دوستوں اور شاگردوں کو جو اعتماد اُن پر تھا، وہ کبھی متزلزل نہیں ہوا، اور کرسمس ۱۹۲۳ء کے موقع پر انہوں نے اپنی مختصر سی سیاحتِ انگلستان میں بہت سی نئی عیسائی دوستیوں کی مسرت حاصل کی۔ لیکن ہندوستان میں خود اپنے کلیسا کی اور اپنے آدمیوں کی تکلیف دہ مخالفت ابھی باقی تھی۔ کلکتہ کیتھیڈرل کے اجتماع میں ایک ممتاز ممبر نے جبکہ بشپ ویسٹ کوٹ اینڈریوز کا تعارف کرانے کے لئے اسکے پاس پہنچے، چلّا کر کہا: "میں اُس شخص کا ہاتھ چھونا بھی پسند نہیں کرونگا وہ غدّار ہے۔" بشپ نے کہا "چارلی میں صدق دلی سے آپ کو اس گرجا کی عبادت میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہوں لیکن اگر آپ ان لوگوں کے ساتھ اتوار کے دن آئیں گے تو ممکن ہے تکلیف دہ نظارے دیکھنے میں آئیں۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ آپ ہفتہ کے باقی دنوں میں جب

کبھی آسکیں، ضرور آئیں۔"

مخالفت کے اُن ایام میں میٹرو پولیٹن کو جو اعتماد اینڈریوز کی ذات پر تھا۔ اس کے لئے اینڈریوز ہمیشہ بہت شکرگزار رہے۔ انہیں اس دوستی کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی اس لئے کہ دوستی کا ایک دوسرا باب ختم ہو رہا تھا۔ ۲۹ جون ۱۹۲۵ کو سوشل رُودرا نے شملہ کی پہاڑیوں کے مقام سولن میں وفات پائی۔ اینڈریوز اُن کے پاس بیٹھے تھے جبکہ وہ بالآخر عالمِ بیہوشی میں چلے گئے۔ اس وقت اُن کے منہ سے یہ الفاظ اس طرح سے نکل رہے تھے کہ صاف سنائی دے رہے تھے: "اے میرے ملک، میرے پیارے ملک!" اور پھر "خدا کس قدر حیرت انگیز ہے! خدا کس قدر حیرت انگیز ہے!" دوسرے دن اینڈریوز نے لکھا: "میں ابھی تک کما حقہٗ یہ محسوس نہیں کر سکا کہ ان کی موت میرے لئے کیا مفہوم رکھے گی۔ میری روح اور میرا تن دونوں بے حد تھک چکے ہیں اور خستہ ہو گئے ہیں۔" ان کے ہندوستانی دوستوں کے پورے شاندار جمگھٹ میں یہ امر مشکوک ہے کہ آیا اور کوئی شخص ایسا تھا جس نے ان کے نظریۂ حیات پر اس قدر تعمیری اثر ڈالا ہو جتنا اس شریف، دانشمند اور منکسر المزاج شخص نے ڈالا تھا۔

باب ۱۵

جنوبی افریقہ

۱۹۲۵ تا ۱۹۲۷ تک عمر ۵۴-۵۶

(۱)

جنوبی افریقہ کی یونین گورنمنٹ نے ۲۱-۱۹۲۰ میں جو ایشیاٹک انکوائری (ریکنگ کمیشن) مقرر کیا تھا، اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ "مختلف علاقوں میں ایشیا والوں کی غیر محتاط جداگانہ سکونت قطع نظر اس کی ناانصافی اور ظلم کے ایشیائی باشندوں کو رسوا کر دے گی اور اس کا ردعمل یوروپین باشندوں پر بھی ہوگا" لیکن ساتھ ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ "رضاکارانہ علیحدگی" قابل عمل ہو سکتی ہے۔ یہ ایشیا والوں کے خلاف ایک نئی مہم کا آغاز تھا، جسے کینیا کی مساوی جدوجہد سے متاثر ہو کر اختیار کیا گیا تھا، اور جس کا نتیجہ "کلاس ایریاز بل" تھا جس کے بارے میں جنرل اسمٹس جولائی ۱۹۲۳ میں اعلان کر چکے تھے۔

مسودۂ قانون یونین پارلیمنٹ میں جنوری ۱۹۲۴ میں پیش ہوا۔ لیکن پارلیمنٹ کے انفساخ کے بعد وہ خود بخود ختم ہو گیا۔ آنے والے انتخابات میں اسمٹس کو شکست ہو گئی۔ اور جنرل ہرٹز وگ کی نیشنلسٹ پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ جون ۱۹۲۵ میں ساؤتھ افریکن مائنز اینڈ ورکس امنڈمنٹ بل" جس میں یہ انتظام گیا تھا کہ قابلیت کے لیے سرٹیفکٹ جن کی رو سے ایک شخص مشینوں کا انچارج ہو سکتا ہے، ملکی یا ایشیائی باشندوں کو نہ دیے جائیں، ہاؤس آف اسمبلی میں

تیسری خواندگی میں سے گذر چکا تھا مگر اس بل کو (جو عام طور پر "کلر بار بل" کے نام سے مشہور تھا) سینٹ نے نامنظور کر دیا۔ جولائی ۱۹۲۵ میں ایمکش کے کلاس ایریا بل کو اور زیادہ سخت بنا کر ایریاز ریزرویشن اینڈ امی گریشن رجسٹریشن بل کی شکل میں زندہ کیا گیا۔ حکومت کا دعویٰ تھا کہ وہ لینگ رپورٹ کی سفارشات پر مبنی ہے۔ اس کی رو سے "ایشیا والوں" کو نیٹال میں مخصوص ساحلی حلقہ کے علاوہ اور کہیں زمین حاصل کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ یونین کے صوبوں کے مابین ان کی نقل و حرکت کی آزادی کو محدود کر دیا گیا تھا۔ اور متوطن تارکانِ وطن کی بیویوں اور بچوں کے داخلہ پر بھی رکاوٹ ڈالنے والے ضوابط عائد کر دیئے گئے تھے مگر کیپ، ملایا اور ماریشس کی رنگدار آبادیوں کو اس قانون کے عملدرآمد سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اور ڈاکٹر مالن (ہوم منسٹر) نے اپنی ایک تقریر میں جارحانہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اس مسودۂ قانون کی ابتدا بدیہی طور پر اس عام نظریہ سے ہوتی ہے کہ ہندوستان یہاں کی آبادی کا ایک غیر ملکی عنصر ہے، اور یہ کہ کوئی حل قابلِ قبول نہیں ہوگا، تاوقتیکہ وہ اس ملک میں ہندوستانی آبادی کی معقول تخفیف پر منتج نہ ہو۔"

جب تک یہ قانون یونین پارلیمنٹ کے سامنے رہا، صوبائی آرڈیننس نیٹال اور ٹرانسوال میں جاری کئے گئے، جن کا مقصد زمین کے استعمال اور تجارتی لیسنسوں کے اجراء پر پابندیاں عائد کرنا تھا اور جو بدیہی طور پر ہندوستانیوں کے خلاف تھے۔

۱۹۲۵ کے سارے سال میں اینڈریوز کا زیادہ تر وقت پبلسٹی کے کام کے لئے وقف رہا۔ مقصد یہ تھا کہ جنوبی افریقہ اور کینیا دونوں میں واقعات کی رفتار کے بارے میں ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو بیدار کیا جائے۔ انہوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ دونوں ممالک کے مسائل پر ایک ساتھ غور کرنا چاہئے اور دونوں پر ایک ہی لازمی اخلاقی اصولوں کا اطلاق ہونا چاہئے۔

"کینیا اور جنوبی افریقہ دونوں میں ہندوستانی اپنی نسلی مساوات کا مطالبہ پیش کر رہا ہے، خود غرضانہ طور پر نہیں بلکہ اس غرض سے کہ جنوبی افریقہ کے ملکی باشندوں کے لئے بھی وہی حق حاصل کیا جائے۔ اپنی سرزمین کی آزادی کے لئے کشمکش کرنا اور ساتھ ہی دوسری نسل کی اراضی پر غاصبانہ قبضہ جمائے رکھنا بالکل ناممکن ہے۔ کینیا میں ہندوستانی کو

رشوت دی جارہی ہے۔ تاکہ وہ افریقی بھائیوں کا ساتھ چھوڑ دے۔ جنوبی افریقہ میں انہیں اصلی باشندوں کی صف میں رکھا جارہا ہے .....۔"

جس "رشوت" کی جانب اینڈریوز نے اشارہ کیا ہے۔ وہ اس شکل میں تھی کہ ایک مناسب نشیبی علاقہ "کینیا" میں ہندوستانیوں کی سکونت کے لئے علیحدہ کر دیا جائے، بشرطیکہ ہندوستان اپنے اس مطالبہ سے دست بردار ہو جائے کہ سطح مرتفع میں تمام اقوام کو اراضی رکھنے کا مساوی حق ملنا چاہیئے۔ اینڈریوز نے ایک یادداشت حکومتِ ہند کی اسٹینڈنگ کمیٹی دوبارۂ ترکِ وطن کے لئے اور دوسری امپیریل انڈین سٹی زنشپ ایسوسی ایشن کے لئے مرتب کی اور ہر ممکن طریقے سے اس امر پر زور دیا کہ ہندوستانیوں کو اس امر پر ہرگز ہرگز رضامند نہ ہونا چاہیئے کہ وہ افریقہ والوں کو ان کی رہی سہی قلیل قابلِ زراعت اراضی سے بے دخل کر دیں، اس لئے کہ از روئے حق وہ ان ہی کی ہے اور یہ کہ انہیں اپنی خاطر اور ان کی خاطر شہریت کے معمولی حقوق کے حصول کی حمایت کرتے رہنا چاہیئے جو مرتفع علاقوں میں خطرے میں آپڑے ہیں۔ ان کا استقلال بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ ہندوستان نے سرکاری طور پر اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔

انہوں نے چند ماہ بعد ٹیگور کے نام ایک خط میں اپنے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: "میرا ہمیشہ سے ایک ہی مطمحِ نظر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان کو مظلوموں اور بیکسوں کے ساتھ جو قدرتی ہمدردی رہی ہے۔ وہ اس قدر مستحکم اور پاکیزہ ہے کہ وہ افریقی باشندوں کے لئے دنیا بھر میں جو جدوجہد کی جارہی ہے۔ اس میں حصہ لے سکتا ہے۔"

اسی قسم کی محنت اور استقلال کی بدولت اینڈریوز اور ان کے رفقائے کار نے حکومتِ ہند پر ایسا دباؤ ڈالا اور حکومتِ ہند نے اپنی طرف سے جنوبی افریقہ کی حکومت پر ایسا دباؤ ڈالا کہ جس نسلی قانون کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا، اس کے متعلق قیمتی مہلت مل گئی۔ ایریا زریزرویشن بل دوسری خواندگی سے پیشتر ہی نہ کہ اس کے بعد ایک منتخب کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا، اور حکومت ہند کا ایک کمیشن جی۔ ایف پیڈیسن کی زیر سرکردگی واقعات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے ۲۵ نومبر ۱۹۲۵ کو جنوبی افریقہ روانہ ہو گیا۔ خود اینڈریوز گاندھی کی درخواست پر کمیشن کی روانگی سے چند روز پہلے جنوبی افریقہ روانہ ہو گئے، اور ۱۹۲۰ کی طرح انہوں نے سرکاری مندوبین کے کام

میں ہر ممکن امداد دی۔

(۲)

کینیا میں ۱۹۲۱ میں اینڈریوز کے بارے میں جو تجربہ ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر حکومت ہند یہ دیکھ کر گھبرا گئی کہ جنوبی افریقہ میں ان کی موجودگی سے کیا کیا امکانی اثرات مرتب ہوں گے۔ اور اس لئے پاسپورٹ کے انتظار میں انہیں کلکتہ میں کافی دن انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار پاسپورٹ مل گیا۔ اینڈریوز نے بمبئی سے بیرا تک کا ٹکٹ لیا۔ اور پھر بذریعہ ٹرین بیرا سے ڈربن تک کا سفر کیا، جیسا انہوں نے ۱۹۲۰ میں کیا تھا۔ یہ تکلیف دہ اور تھکا دینے والا سفر تھا مگر بچھڑے ہوئے ہندوستانی خاندانوں کو اس مختصر ملاقات سے۔ جو وہ سر راہ اسٹیشنوں پر کر لیتے تھے، جو خوشی حاصل ہوتی تھی وہ اینڈریوز کے لئے کافی معاوضہ تھا، اُن بے آرامیوں اور کلفتوں کا۔ جو سات دن کے ریلوے کے سفر سے انہیں پہنچی تھیں۔

وہ اپنے مشن کے سلسلہ میں یونین کے بہت سے حصوں میں گئے، اور ہر موڑ پر انہیں انسانی دکھ سے دو چار ہونا پڑا جو نسلی تفاخر کا نتیجہ تھا۔ ریلوے کے ایک سفر میں انہوں نے زولوں کے ایک سردار سے گفتگو کی۔ (انہوں نے ٹرین کے گارڈ سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس نے انہیں "یوروپین ڈبہ" میں منتقل کرنے پر اصرار کیا تو اسے طاقت کے ذریعہ ایسا کرنا ہوگا) اور گفتگو سے ان پر واضح ہو گیا کہ تعلیم یافتہ افریقی باشندے کی روح ذلیل سلوک سے کس قدر متاثر ہو چکی ہے۔ پریٹوریا میں انہیں ایک ہندوستانی حجام کا حال معلوم ہوا جس نے اپنی نفاست اور محنت کی بدولت یورپینوں کی سرپرستی حاصل کر لی تھی اور جسے یکا یک حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی دکان پر یہ سائن بورڈ لگائے: "صرف رنگدار لوگوں کے لئے"۔ اینڈریوز یہ سائن بورڈ پڑھتے ہی بال ترشوانے کے لئے اس کے پاس گئے، حالانکہ ان کے بال پہلے سے چھوٹے تھے۔ دکان نہایت صاف ستھری حالت میں تھی۔ بوڑھے مسلمان حجام نے اپنی متوسط درجہ کی روزی کو تباہ ہوتے دیکھ کر کہا: "زمانہ بہت خراب آگیا ہے۔ خدا ایسی بے انصافیوں کو دیکھ کر یقیناً ویسا ہی طوفان بھیجے گا جیسا حضرت نوح کے زمانہ میں بھیجا گیا تھا۔ اینڈریوز خود بھی سفید قوم سے

اپنی "غداری" کی سزا پائے بغیر نہ رہے، اور ان کے اخراج کے لئے خوب غل مچایا گیا۔ اپنی بے عزتیوں کے بارے میں واحد حوالہ صرف ایک فقرہ میں ملتا ہے، جو انہوں نے ٹیگور کے نام پرائیویٹ خط میں تحریر کیا تھا۔ "یورپین حلقوں میں رہ کر مجھے بعض اوقات ایسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں جو ناقابل برداشت ہوتی ہیں" اور اس طنزیہ تبصرہ میں بھی کہ "جب وہ مجھ پر ہنستے ہیں تو ان کا ہنسنا مجھے سنگساری سے بدتر معلوم ہوتا ہے"۔[1]

صورت حال تقریباً مایوس کن نظر آتی تھی، لیکن اینڈریوز مایوس نہیں ہوئے۔ اگرچہ وہ روزانہ راتوں کو جاگتے اور (خدائی) امداد کے لیے دعائیں مانگتے رہتے۔ وہ ہر ایک کے پاس گئے۔ اور جو لوگ جنوبی افریقہ سے اچھی طرح سے واقف تھے۔ وہ یہ دیکھ کر محو حیرت تھے کہ انہوں نے آدمیوں کی اتنی بڑی تعداد سے اور مختلف معاشرتی حلقوں سے کس قدر جلد روابط پیدا کر لئے ہیں۔ عیسائیوں سے انہوں نے عیسائی اصول کے نام پر اپیل کی۔ اور یہاں انھوں نے محسوس کیا کہ خاص طور سے پریٹوریا اور جوہنزبرگ کے انگریز عیسائی لیڈروں نے نہایت دلیری سے ان کی پشت پناہی کی ہے۔ پریٹوریا کے بشپ نے کھلم کھلا اعلان کر دیا کہ "ایریاز ریزرویشن بل" ایک ایسا قانون ہے جو پختہ مواعید کو کاغذ کے پرزے قرار دیتا ہے" جوہنزبرگ میں "انہیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے۔ کہ تمام فرقوں کے اشخاص اسی گرجا میں معروف عبادت ہیں، جو ایک زمانہ میں نسلی تعصبات کا زبردست مرکز بنا ہوا تھا"[2] اور یہ معلوم کر کے اور زیادہ خوشی ہوئی کہ عیسائی اخوت کی روح جس کے لئے وہ ۱۹۱۴ سے زور دے رہے تھے، بالآخر جنوبی افریقہ کے بڑے بڑے مرکزوں کے گرجاؤں میں سرایت کر گئی ہے۔ ایسے گرجاؤں میں ان کے لئے ممکن ہو گیا۔ اب ہندوستانی مقدمہ کی سماعت منصفانہ اور صابرانہ طریقہ سے ہو سکے گی۔ اور یہ بجائے خود ایسا کارنامہ تھا جس کی قدر و قیمت ملک کے مروجہ ماحول میں بے اندازہ تھی۔

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور ۱۴ مارچ ۱۹۲۶!

[2] ڈین پامر (جوہنزبرگ) کا خط مصنفین کے نام۔

اپنے انگریز ہم وطنوں سے خواہ وہ عیسائی تھے یا غیر عیسائی اینڈریوز نے عزت اور "انصاف" کے نام پر اپیل کی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ایریاز ریزرویشن بل ۱۹۱۴ء کے گاندھی اَسمٹس معاہدے کے خلاف ہے اور اس لئے اس سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اور نقضِ عہد ہوتا ہے "کیپ ٹائمز" کے نام ایک مراسلہ میں انہوں نے بتایا کہ مسودۂ قانون میں جس میں لازمی نسلی علیحدگی کی گنجائش رکھی گئی ہے، اور لینگ رپورٹ کی سفارشات میں نمایاں بے ربطیاں موجود ہیں حالانکہ بیان کیا جاتا ہے کہ رپورٹ اسی مسودۂ قانون پر مبنی ہے، اور ڈاکٹر مالن کو چیلنج دیا کہ یا تو وہ ان بے ربطیوں کی تشریح پیش کریں یا مسودۂ قانون پر اصولاً تفصیلی بحث و مباحثہ کی اجازت دیں۔ بہت سے برطانوی نوآبادکاروں نے بھی کھلے دل سے ان کے کام کا ذکر تعریف اور احترام سے کیا۔

"یہاں ان کے درمیان ایک شخص تھا۔ جس کے عقائد میں وہ شریک نہیں تھے۔ لیکن ان عقائد کی اہمیت مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ باوجود انکساری اور گہری حیا کے جو ان عقائد کے ساتھ وابستہ تھی، انہوں نے ایک ایسی زندگی دیکھی جو اپنے احساس فرض شناسی سے سرابور تھی۔ فرض شناسی وہ لفظ ہے جس نے رَینڈ کی مادّی فضا میں بھی اپنی اپیل بے اثر ہونے نہیں دی۔"[1]

اینڈریوز نے افریقی زبان بولنے والی آبادی کا اعتماد اور دوستی حاصل کرنے کے لئے خاص کوشش کی، اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ انگریزوں کے مقابلہ میں وہی ہیں۔ جو زمانۂ مستقبل کے نسلی تعلقات کی کلید اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ مس ہاب ہاؤس نے سب سے پہلے ان کی اصلی اور حقیقی صفات، ان کی گہری مذہبیت اور ان کی گھریلو زندگی کی سیدھی سادی پاکیزگی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ان کا مذہب اور اخلاق زیادہ تر "عہدِ عتیق" سے ماخوذ تھے، جس میں "پسندیدہ قوم" کا تخیل موجود تھا، اور ان میں نسلی تعصب کا بتدریج خاتمہ ہوا۔ وہ سفید فام اقوام کے علاوہ دوسری اقوام کے ساتھ اینڈریوز کے طرزِ عمل کو سمجھنے سے

---

[1] ڈین پامر کا مکتوب مصنفین کے نام۔

قاصر تھے۔ اور ساتھ ہی ان کے اس اشتیاق کو کہ جہاں کہیں ان سے بن پڑے وہ ہندوستانیوں ہی کے ساتھ ہیں۔ لیکن ان کی نیکی کی اپیل اکارت نہیں گئی، اور انہوں نے بہت سے دوست پیدا کر لئے۔ لستنے کہ ڈاکٹر مالن کے اخبار "دی برغر" کو انہیں یہ نصیحت کرنی پڑی کہ وہ "سیاسیات" میں نہ پڑیں بلکہ اپنے آپ کو "صرف انجیل" تک محدود رکھیں!

فروری ۱۹۲۶ میں بھی سیاسی صورت حالات مایوس کن نظر آتی تھی۔ لیکن اینڈریوز جانتے تھے کہ مخالفت میں بھی پلٹی ہو جاتی ہے۔ بہت سے اخبارات میں ان کے مضامین چھپنے لگے تھے۔ اور ٹیگور جو پبلک لیکچر دے رہے تھے، انہیں سننے کے لئے ہجوم کے ہجوم بڑے شوق سے آتے تھے، جن میں ملکی باشندے بھی ہوتے تھے اور انگریز بھی۔ انہوں نے سرکاری عمال اور کابینہ کے وزرا سوشل ورکرز اور محب وطن اشخاص میں، ان میں بھی جنہیں کسی تائیدی خیال پر نہیں لایا جا سکتا تھا اور کٹر قسم کے اشخاص میں بھی دوست پیدا کر لئے تھے اور اسی کے ساتھ ایک اندھی اور نصف فالج زدہ اسی برس کی بوڑھی خاتون کو بھی ٹیگور کے پسندیدہ نغمے سنانے کے لئے انہوں نے چند دن تک سہ پہر کا وقت مخصوص کر لیا تھا۔

اینڈریوز نے "ایریاز ریزرویشن بل" پر غور کرنے والی منتخب کمیٹی کے روبرو جو شہادت دی وہ یادداشت کی شکل میں تھی۔ اس میں انہوں نے پھر ایک مرتبہ تشریح کر کے بتایا کہ ہندوستانی جبر کو کیوں اپنی توہین اور تذلیل سمجھتے ہیں۔ اس کی بجائے انہوں نے مشورہ کا طریقہ سمجھایا۔ جس کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ "آزاد خیال انسان" دوست کی حیثیت سے انہوں نے ایک خاص تجویز پیش کی اور درخواست کی کہ اس کے محاسن پر غور کیا جائے کہ:۔

منتخب کمیٹی حکومت سے درخواست کرے کہ وہ مسودۂ قانون پر غور و خوض کے خیال کو ملتوی کر دے۔

جب دونوں فریقوں کے جذبات ٹھنڈے پڑ جائیں، اس وقت جنوبی افریقہ کی طرف سے ایک مشن ہندوستان جائے، جس کے لئے اکتوبر ۱۹۲۶ کا زمانہ موزوں ہوگا۔

جب اس طرح زیادہ دوستانہ فضا پیدا ہو جائے۔ اس وقت، تجارتی، تعلیمی،

اور دوسرے تمام امور پر بحث کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ دونوں ممالک کے اختلافات ہموار کرکے اس کی بجائے دوستانہ فضا پیدا کی جائے۔ جو پوزیشن اینڈریوز کو جنوبی افریقہ میں حاصل تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ تجاویز تمام تر منظور کر لی گئیں اور انہیں عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا۔ گول میز کانفرنس کے لئے دسمبر ۱۹۲۶ کی تاریخ بھی معین کر دی گئی۔

(۳)

اینڈریوز اپریل ۱۹۲۶ میں ہندوستان واپس آگئے۔ ان کی غیر حاضری میں لارڈ اَرون وائسرائے مقرر ہو چکے تھے۔ اینڈریوز نے جنوبی افریقہ کے بارے میں ان سے طویل گفتگوئیں کیں، اور اَرون نے جو خود بھی سچے عیسائی تھے، ان کی صیانت اور بے غرضی کو فوراً تسلیم کر لیا انہوں نے تجویز پیش کی کہ اینڈریوز بھی اس سرکاری ہندوستانی وفد کے ممبر بنیں، جو گول میز کانفرنس میں جانے والا تھا۔ اینڈریوز نے اپنی آزاد پوزیشن قائم رکھنے کو ترجیح دی۔ لیکن وہ رضامند ہو گئے کہ ستمبر میں جنوبی افریقہ جائیں، اور کانفرنس کے لئے مناسب فضا تیار کرنے میں مدد دیں۔

۱۹۲۶ کے موسم گرما میں ٹیگور پھر ایک مرتبہ یورپ گئے، اور اس لئے اینڈریوز کا تمام تر وقت شانتی نکیتن میں گزرا۔ لیکن جولائی میں نئی ٹرم کا کام شروع ہونے سے پہلے آرام کرنے کی بجائے۔ جس کی انہیں سخت ضرورت تھی انہوں نے اپنے تھکے ہوئے ہاتھوں اور دماغ کو جنوبی افریقہ کے متعلق ہندوستانی اخبارات کے لئے متعدد مضامین لکھنے میں صرف کیا، یہاں تک کہ ایک چھوٹے سے کیڑے کے کاٹنے سے انہیں بخار آگیا، اور جسم میں زہر پھیل گیا، ایک مرتبہ پھر گاندھی نے ایک محبت بھرے خط کے ذریعہ جس میں غصہ اور تنبیہہ کے جذبات جلوہ گر تھے، انہیں رک جانے کے لئے کہا۔

جو آرٹیکل آپ نے مجھے بھیجا، وہ اچھی طرح غور و فکر کے ساتھ نہیں لکھا گیا تھا۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ جنوبی افریقہ کی مشکلات کا واحد سبب رنگ کا تعصب ہے۔

افیون پر جو مضمون آپ نے لکھا ہے۔ وہ بھی بہت سطحی اور بے ربط ہے۔ ان دونوں مضامین سے آپ کی ذہنی تکان کا اندازہ ہوتا ہے۔

۔۔۔۔ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ خدائی دعوت ہے کہ آپ کا قلم ہمیشہ چلتا رہے۔ ؟ اگر آپ کچھ عرصہ کے لئے لکھنا بند کردیں گے تو دنیا ٹکڑے ٹکڑے ۔۔ نہ ہوجائے گی۔ گرنیگ کا کہنا ہے کہ آپ کو جو کیڑے نے کاٹا ہے، وہ خدائی نعمت ہی اس لئے کہ اس نے آپ کے قلم کو روانی کو روک دیا ہے ۔۔۔ کیا یہ مسرت کا مقام نہیں ہے۔ کہ آپ کے ایسے دوست بھی ہیں جو ہمیشہ آپ کے ساتھ سنجیدہ نہیں رہتے ؟ [1]

شانتی نکیتن میں اینڈریوز کے یہ مضامین ہی قدر کے قابل نہ تھے، بلکہ ذاتی دوستی پیدا کرنے کے لئے ان کی غیر معمولی قابلیت بھی بے حد قدر کے قابل تھی، جس کی وجہ سے وہ ذاتی دوستیاں پیدا کرسکے۔ ڈاکٹر جے۔ ایچ۔ کرنز اس ٹرم میں لیکچرر کی حیثیت سے گئے تھے۔ اور اس لئے اینڈریوز نے ہر تفصیل کا خیال رکھا تھا کہ ان کے ذاتی آرام و آسایش کے ساتھ ساتھ ان کے کام کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوجائے۔ انہوں نے لڑکوں میں ہاتھ سے کام کرنے کا تازہ جذبہ پیدا کردیا۔ اور ایک غیر مستعمل کوئیں کو بھرنے اور سڑکیں بنانے کے کام پر لڑکوں کو لگا دیا۔ انہوں نے اسکول کے نظم و نسق کے مسئلہ کو بھی ہاتھ میں لیا۔ جس میں مختلف عناصر کی وجہ سے سست روی پیدا ہوگئی تھی۔

عام حالت اب بہت بہتر ہے۔ ایک لڑکے کو جس کا نام این تھا، اس لئے اسکول چھوڑنا پڑا۔ تاکہ معیار قایم رہے۔ یہ ایسے طریقہ سے کیا گیا کہ طلبا کی ہمدردیاں چاروں ساتھ ہوگئیں اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس کے دل میں اب تک آشرم کی محبت باقی ہے۔۔۔۔ اگرچہ ذاتی طور پر میں این کو ایک اور موقع دینے کے حق میں تھا، لیکن میں ایسے ڈسپلن کی جس سے دوستی میں کسی قسم کا

---

[1] مکتوب بنام سی۔ ایف۔ ملے ۲۲، جولائی ۱۹۲۶

فرق نہ آئے۔ زبردست اہمیت کا اچھی طرح سے اندازہ کر سکتا ہوں[1]

اٹلی میں فسطائی حکومت کے ساتھ ٹیگور کے جو روابط تھے، ان کی وجہ سے ان کے دوستانہ تعلقات سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جب وہ اپنے اطالوی دورے کے اختتام پر سوئٹزرلینڈ پہنچے، تو ٹیگور کو معلوم ہوا کہ بعض فسطائی اخبارات نے ان کی نہایت محتاط عملک تقریروں کو نئے معنی پہنا کر یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ وہ "نئے نظام" کو پسند کرتے ہیں۔ ساتھ ہی انہیں ایسی شہادت ملی جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ پارٹی اپنے مخالفین کو خاموش کرنے کے لئے کیسے کیسے قابلِ اعتراض طریقے استعمال کر رہی ہے۔ اس بات سے نادم ہو کر ان کے نام کو غلط طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، انہوں نے "مانچسٹر گارڈین" میں ایک مراسلہ چھپوایا۔ جس میں معاملات کی تشریح کے ساتھ ساتھ صدائے احتجاج بھی بلند کی گئی تھی۔ اس خط نے اٹلی میں طوفان برپا کر دیا۔ اور پروفیسر ٹکی کو جو دو شواکھارتی کے عملہ میں اطالوی پروفیسر تھے، مشکل میں ڈال دیا۔ یہ مشکل اس لئے اور زیادہ تکلیف دہ ہوئی کہ تمام واقعات کے بارے میں پورے حالات کئی ہفتہ تک شانتی نکیتن میں نہ پہونچ سکے۔ اینڈریوز ہر روز بہت دیر تک تنہا اور بیکس اطالوی کو سمجھاتے تھے جس کی نسبت وہ لکھتے ہیں کہ رنج کے غلبہ کی وجہ سے وہ تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہیں۔

"جب اٹلی میں گرودیو کے قیام کی خبریں آ رہی تھیں، اس وقت میرے لئے یہ مسرت بخش بات تھی۔ کہ میں ٹکی کے ساتھ تھا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں اور میری دوستی پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ غالباً ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے، لیکن خوش خوش جائیں گے۔"[2]

ایک اور خط سے جو تین ہفتہ بعد لکھا گیا تھا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ باہمی میل ملاپ کرانے میں ان کی خدمات کس قدر دانشمندانہ اور کامیاب رہی ہیں۔

"اطالوی تو بلفعل بہت ہی پریشان تھا، اور یہی حالت ٹکی کی تھی۔ لیکن

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور ۳۱ اگست ۱۹۲۶
[2] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور ۱۷ اگست ۱۹۲۶

میں نے اس خط کو ماڈرن ریویو میں چھپنے نہیں دیا۔ اور اس طرح انقطاع تعلقات نہیں ہونے پایا۔ ٹیگی کے دل سے صدمہ کے ابتدائی اثرات جاتے رہے ہیں۔ اب وہ خوشی کے ساتھ ٹھہریں گے، بشرطیکہ ان کی حکومت نے اجازت دیدی۔ انہوں نے شاندار کام کیا ہے۔"

دوستی کا ایک اور کام تھا۔ جسے اینڈریوز نے اپنی زندگی میں کبھی بھی شایع ہونے نہیں دیا۔ یہ دیکھ کر کہ آشرم ابھی تک مالی مشکلات میں ہے، انہوں نے اپنی طبیعت کے خلاف اس کے لئے فقیر کی جھولی لے کر نہ صرف اپنے آپ کو ختم کردیا، بلکہ اپنا قلیل سرمایہ بھی جس میں ٹروداکا ترکہ بھی شامل تھا، اس میں لگادیا تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔ وہ اسے اپنا سب سے کم اور سب سے ہلکا تحفہ قرار دیتے تھے۔

(۴)

۲۹ ستمبر ۱۹۲۶ کو اینڈریوز پھر ایک مرتبہ جنوبی افریقہ روانہ ہوگئے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے خیرسگالی رکھنے والے بے شمار لوگوں کی امیدیں اور دعائیں بھی گئیں۔ گاندھی نے ہندوستان کی طرف سے کہا:

روانہ ہونے سے پیشتر مجھے چارلی کے ساتھ چند دن تک رہنے کی مسرت حاصل ہوئی کانفرنس کچھ بھی نہیں کرسکے گی، اگر جنوبی افریقہ کی رائے شدت کے ساتھ ہندوستانیوں کے خلاف ہوگی۔ وہ کسی حد تک اس رائے کو متاثر کرسکتے ہیں۔ ان کی موجودگی ہی نکتہ چینی کو زائل کرتی ہے اور مخالفت کا خاتمہ کردیتی ہے۔ وہی سفید فام اشخاص اور ہندوستانیوں کے مابین زندہ رابطہ ہیں۔

نارمن لیز نے کینیا کی طرف سے کہا:

"ہر ممکن کوشش عمل میں آنی چاہیئے۔ تاکہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کو علیحدہ رکھنے کی اسکیم میں تاخیر ہوسکے۔ اس کے اثرات کینیا اور یوگنڈا تک محسوس

---

[۱] یہ خط جس میں شاعر نے اپنی پوزیشن کی تشریح کی ہے، وشوابھارتی میں اکتوبر ۱۹۲۶ میں شایع ہوا۔

کیے جائیں گے۔"[۱]

سی۔ پی۔ اسکاٹ، ایڈیٹر "مانچسٹر گارڈین" نے انگلستان کی طرف سے کہا:

"کیا میں بیان کر سکتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی دوستی کی کتنی قدر ہے۔؟ یہ صرف آپ جیسے اشخاص اور اس اسپرٹ کی وجہ ہے، جس کی نمایندگی آپ کرتے ہیں، کہ ہم ہمیشہ ہندوستان میں اپنا فرضِ منصبی ادا کریں گے۔[۲]

غرضیکہ سارے ساحل پر اینڈریوز کی اسپرٹ کا مندمل کرنے والا اثر محسوس کیا گیا۔ ممباسہ میں دو سال سے جو تنازعہ چلا آرہا تھا وہ ختم ہو گیا۔ دارالسلام میں دو اخبارات جن کی باہمی چشمک ہندوستانیوں کو "ہندو" اور "مسلم" فرقوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا خطرہ پیش کر رہی تھی، خوش قسمتی سے متحد ہو گئے، اور اینڈریوز نے اپنی پوری طاقت سے ایک اچھے ہندوستانی اسکول کے منصوبہ کی پوری پوری تائید کی۔

۲۰ر اکتوبر کو وہ ڈربن پہنچ گئے۔ وہاں انہیں ایک ایسی نازک صورت حال سے دوچار ہونا پڑا جس کا اندازہ پہلے سے نہیں کیا گیا تھا۔ گنجان ہندوستانی علاقوں میں ایک شدید قسم کی چیچک کی وبا پھوٹ پڑی تھی اور ۲۵ فیصدی کی شرح سے موتیں واقع ہو رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے شہر میں خوف و ہراس چھا گیا تھا۔ اینڈریوز پورے ایک مہینے تک گندے اور غلیظ علاقوں میں بیماروں کی خدمت میں لگے رہے۔ وہ ہر روز کبھی دن میں دو مرتبہ اور کبھی تین مرتبہ قرنطینہ کے علاقوں کا دورہ کرتے۔ یا وہ "ڈرس اسٹیشن کی بدنام "بارکوں" میں جہاں میونسپلٹی کے غریب ترین ہندوستانی ملازم رہا کرتے تھے، اور جو اس بیماری کا سب سے بڑا مرکز بنی ہوئی تھیں، پورے کے پورے خاندان ایک کمرے میں زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کمروں کی چھتیں نالی دار چادروں کی تھیں، جن میں متعدد سوراخ تھے۔ ان کے فرش سیلے ہوئے تھے، اور مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے بھی وہاں پائے جاتے تھے اور چاروں طرف گندے پانی کا سمندر تھا جو بدرروؤں میں سے نکل نکل کر جمع ہو جاتا تھا۔[۱]

---

[۱] مکتوب بنام سی۔ ایف۔ اے اکتوبر ۱۹۲۶ء۔

[۲] مکتوب بنام سی۔ ایف۔ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۲۶ء۔

زبان کی مشکلات کے باوجود اینڈریوز وہاں تن تنہا کام کر رہے تھے اور حکومت تھی کہ اس نے تامل زبان کے ترجمان کے لئے بھی دوسرا پاس دینا نہیں چاہا۔ اس پر لے دے ہو رہی تھی کہ نئے کیس چھپائے جا رہے ہیں۔ یہ خبریں دیدہ و دانستہ پھیلائی جا رہی تھیں۔ لیکن زیادہ تر اس بات کا نتیجہ تھا کہ سہمے ہوئے پریشان لوگ حفظان صحت کی ہدایات کو سمجھ نہ سکتے تھے، اس لئے کہ وہ ایسی زبان میں جاری کی جاتی تھیں جو ان کی اپنی زبان نہ تھی۔ اس کی وجہ سے غم و غصہ بڑھ رہا تھا۔ اور اس تمام مہینے میں اینڈریوز یہ محسوس کرتے رہے کہ وہ بارود کی سرنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں، اس لئے کہ کشیدگی بے حد بڑھ گئی تھی۔ مگر ان کی اپنی شریفانہ اور عملی ہمدردی نے از سر نو اعتماد کو بحال کر دیا، ایسے طریقہ سے جسے اور کوئی چیز بحال نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے لکھا: "اگر میں وہاں موجود نہ ہوتا تو بارگوں میں فسادات ہو جاتے۔"[1]

اس تمام نازک دور میں اینڈریوز نے میئر شہر کے کونسلروں کے ساتھ اور ڈربن کی ہیلتھ اور ہاؤسنگ کمیٹیوں کے ساتھ برابر تعلق قائم رکھا۔ انہیں اخبارات میں جگہ مل گئی جن میں وہ صحت عامہ کے اصولوں پر بحث کرتے تھے۔ انہوں نے سٹی کونسل پر زور دیا کہ وہ اپنے ملازمین کے لئے نئے سرے سے مکانات کی تعمیر کی اسکیمیں بنائے۔ انہوں نے کھاتے پیتے ہندوستانیوں کی زبردست امدادی کمیٹی بنائی جس نے پریشان حال ہندوستانیوں کی ہر ممکن بیرونی امداد جاری رکھی۔ اس کا یوروپین آبادی پر بہت اچھا اثر پڑا، اور روز بروز اس کے دوستانہ جذبات میں ترقی ہوتی گئی۔ ایک انگریز نے کہا: "تم اپنی کانگریس کمیٹی کو اپنی گورننگ باڈی کیوں نہیں بنا ڈالتے، تاکہ ہم اسی جماعت سے تمام معاملات طے کریں۔ جس طرح سے ایک آزاد جماعت دوسری آزاد جماعت سے کرتی ہے۔"[2] اینڈریوز نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "سیاسی حق رائے دہندگی کا مطالبہ کئے بغیر بھی ہندوستانی یہ عملی حق ہر وقت حاصل کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ صرف اتحاد و اتفاق کے ساتھ کام کرنے لگیں۔"

---

[1] مکتوب بنام فرٹینیڈ بینا ڈٹ (شانتی نکیتن) ۴ نومبر ۱۹۲۶

[2] مکتوب بنام سر جے ڈبلیو۔ بھور ۲۶ نومبر ۱۹۲۶

لیکن انہیں کافی سے زیادہ اندازہ تھا کہ ایک ایسی قوم کے لئے جس میں مختلف قسم کے عناصر موجود ہوں، معمولی حالات میں ایک ساتھ کام کرنا کس قدر مشکل امر ہے۔ مالدار "عرب" (ہندوستانی تاجر بالعموم اسی نام سے مشہور تھے) "قریب قریب کلیتاً حب وطن کے جذبات سے عاری تھے"، اور ڈربن کے بدترین اور تاریک مکانوں کے وہ خود ہی مالک تھے۔ اینڈریوز کو ان سے بہت کم اشتراک عمل حاصل ہو سکا۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کی ہندوستانی کانگریس کے تعلیم یافتہ متوسط درجہ سے تعلق رکھنے والے لیڈر تھے جنہیں ڈربن کی فضا نے نسلی امتیاز کے بارے میں اس قدر حساس بنا دیا تھا کہ جہاں یہ چیز موجود نہ ہوتی وہاں بھی انہیں نظر آجاتی تھی ان کے مفاد مصیبت اور غم میں ڈوبے ہوئے ہندوستانی غربا کے مفاد سے ٹکراتے تھے۔ اینڈریوز کو ان کے نقطۂ نظر سے بے حد ہمدردی تھی، لیکن اس کی وجہ سے میونسپل ہاؤسنگ اسکیم کے بارے میں جس کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ان کی پریشانی میں بیحد اضافہ ہو گیا۔

"اگر کارپوریشن اس کام کو اپنے ذمہ لینے پر آمادہ ہو جائے تو ہندوستانی فی الفور کہنے لگیں گے۔ کہ یہ تو نسلی علیحدگی ہے...... سارے مسئلہ کو مجرد معاملہ کی حیثیت سے دیکھنے کا رجحان اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ غریب آدمی کے نقطۂ نظر سے اس پر غور نہیں کیا جاتا۔ جو لوگ آرام و آسایش سے ہیں اور اپنی ملکیت میں بالکل مامون و مصئون ہیں، وہ یہ فیصلہ بہت آسانی سے کر لیتے ہیں کہ غریبوں کے مکانات بنانے کی یہ اسکیم یا وہ اسکیم اختیار نہ کی جائے۔ اس لئے کہ اس طرح سے خود ان کے ذاتی وقار کو ٹھیس لگے گی۔ ہمیں اس ذاتی وقار پر اس کی اعلیٰ ترین قدر و قیمت کے لحاظ سے غور کرنا ہے یہ چیز آج تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی زندگی میں ایک زندگی بخش سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن ساتھ ہی خود خدا ہمیں اجازت نہیں دے گا کہ ہم اپنے غربا کو قربان کر دیں اور انہیں مجبور کر دیں کہ وہ خوفناک قسم کے تنگ و تاریک اور غلیظ مکانوں میں رہیں جن میں آسایش یا صفائی نام کو نہ ہو۔ صرف ایسی بات کو مطمئن کرنے کے لئے جو ممکن ہے صحیح معنوں میں ہماری قومی عزت کے مترادف نہ ہو۔"[1]

[1] مکتوب بنام مسٹر جے بی۔ پیٹیٹ ۲۰ نومبر ۱۹۲۶ء، ڈربن میونسپلٹی نے پاور ہاؤس بارکوں کو توڑ دا گرا ن کی بجائے ۳۰ ہزار ۱۰ پونڈ خرچ کر کے نئے مکان تعمیر کرائے تھے۔

ہندوستانی کانگریس کے پہلو بہ پہلو ایک نئی سیاسی پارٹی کولونیل بورن ایسوسی ایشن معرض وجود میں آئی تھی، اور اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ غریبوں کے مفاد کی نمائندگی کرے گی خود کانگریس بھی نیٹال اور ٹرانسوال کی گروہ بندیوں کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے بہت کچھ کمزور ہو چکی تھی۔ لہٰذا اینڈریوز نے یہ جانتے ہوئے کہ ایسے اختلافات کس قدر تباہ کن ہو سکتے ہیں، اپنی سی انتہائی کوشش کی تاکہ ان میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ انہوں نے لکھا:

"میں تنازعات کو ختم کرانے کی کوشش میں گھنٹوں صرف کیا کرتا ہوں، اور کسی قسم کی جانبداری نہیں کرتا، اور نہ کسی کی بیلسٹی کرتا ہوں۔ صرف میری ذاتی موجودگی کی وجہ سے کھلم کھلا پھوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ حکومت کے عمال ایک طرف ہمارے اختلافات کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں اور کہتے ہیں :۔ ہاں، ہم ہندوستانیوں کا انتظام کرنا جانتے ہیں میرے لئے یہ امر دائمی ذہنی کوفت کا سامان پیدا کر رہا ہے کہ میں کوئی لفظ ایسا نہ کہوں اور نہ لکھوں جس سے ایک کو دوسرے کے خلاف کچھ کہنے کا موقع ملے۔"[1]

تاہم اینڈریوز کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ذمہ دار یورپینوں کا طرز عمل ایک سال قبل کے طرز عمل کے مقابلہ میں بہت کچھ دوستانہ ہو گیا۔ اخبارات کے کالم ان کے مضامین کے لئے اس طرح سے کھلے ہوئے تھے کہ اس سے پیشتر انہیں یہ بات میسر نہ تھی۔ اگست ۱۹۲۶ء میں ان کی واپسی سے بھی پہلے جنوبی افریقہ کے چند اخبارات نے خود اپنی تحریک سے انہیں ہندوستان پر مضامین لکھنے کے لئے بذریعہ تار دعوت دی تھی۔ اور انہوں نے ان نئے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جن کی وجہ سے وہ بتا سکے کہ ہندوستان ایسا ملک ہے جو اپنی قدیم تہذیب اور جدید کارناموں کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ انہوں نے اس خیال کی ابتدا کی کہ ۱۹ دسمبر کا دن یعنی حکومت ہند کے وفد کے پہنچنے کے بعد کا اتوار سارے ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں یوم دعا کے طور پر منایا جائے، اور اس دن ہونے والی کانفرنس کی کامیابی

---

[1] مکتوب بنام جے۔ بی۔ پیٹیٹ، ۲۶ نومبر ۱۹۲۶ء

کے لئے دعا مانگی جائے۔ اس تجویز کا ہر جگہ خیر مقدم کیا گیا۔ ہندوستان میں گاندھی اور ویٹکوٹ (لاٹ پادری) نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ اس دن کو پوری سنجیدگی سے منائیں۔ جنوبی افریقہ میں کیپ ٹاؤن اور جاہنزبرگ کے بڑے پادریوں کی رہنمائی میں انگریز عیسائی باشندوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ ملکر دعائیں مانگیں اور ڈاکٹر ڈیسمنڈ ٹوٹو بلیسس آف اسٹیلس بوش نے افریقہ کے قدیم باشندوں کے نام اسی قسم کی اپیل جاری کی۔ چنانچہ جب کیپ ٹاؤن میں کانفرنس کا افتتاح ہوا تو اس وقت حالات اینڈریوز کی توقعات سے بڑھکر سازگار ہو گئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"وفد کا معاشرتی حیثیت سے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا ہے۔ پیڈیسن کے وفد سے کہیں بہتر جو پچھلے سال یہاں آیا تھا۔ جنرل ہرٹزوگ نے مسٹر سرینواس شاستری اور مسٹر حبیب اللہ سے دو بدو ہو کر ملاقات کی ہے اور انہیں بہت پسند کیا ہے۔ اس کے مکمل اخلاق اور غور و پرداخت کی وجہ سے ہوٹلوں نے اپنے دروازے نہ صرف ان کے لئے کھول دئے ہیں بلکہ مقامی ہندوستانی لیڈروں کے لئے بھی ایسے زمانہ میں جبکہ کرسمس کا تہوار پورے جوش سے منایا جا رہا ہے۔ اخبارات نے ہندوستان کے وقار اور اس کی عظمت کا احساس کرانے میں کافی امداد دی ہے"[1]

چندرہ دن کے اندر اندر پانسہ پلٹ گیا۔ "ایریا ز ریزرویشن بل" واپس لے لیا گیا، متوطن ہندوستانیوں کی بیویوں اور نابالغ بچوں کے داخلہ کی اجازت دیدی گئی، یہ طے پایا کہ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی باشندوں سے توقع کی جائیگی کہ وہ "مغربی معیارِ زندگی" کی مطابقت کرینگے[2] اور یہ کہ حکومت ہند جنوبی افریقہ میں اپنا ایک ایجنٹ مقرر کرے۔ "وطن واپس جانے کی امداد ی"

---

[1] مکتوب بنام۔ ایم۔ کے۔ گاندھی، یکم جنوری ۱۹۲۷

[2] اس جملے کے وسیع مفہوم سے اینڈریوز پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے بمبئی میں ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ "میرا مفہوم گاندھی کے مفہوم کے کا ہنگ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستانی حفظان صحت اور اقتصادی امور میں جن کا اطلاق سب پر ہوتا ہو، اچھی سادہ زندگی بسر کرتے رہیں مگر انہیں چاہئے کہ وہ یوروپین معیار کی پابندی کریں۔"

اسکیم پر بھی مناسب تحفظات کے ساتھ اتفاق رائے ہوگیا۔ اس عارضی معاہدہ کو جس کی تصدیق دونوں حکومتوں کی جانب سے کردی گئی تھی، ۲۱ فروری ۱۹۲۷ کو ہاؤس آف اسمبلی میں ڈاکٹر مالن نے پڑھکر سنایا۔

اینڈریوز کو اس کامیابی سے جو سکون حاصل ہوا اس کی کوئی حد نہ تھی۔ ان کی خرابی صحت نے جو پچھلی جون سے لیکر اب تک چلی آرہی تھی، ۱۰ ہفتوں کے ان نازک ایام میں ہر روز کے بڑھتے ہوئے کام کو ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے لکھا:

"فکر کی زیادتی کی وجہ سے میری صحت قریب قریب جواب دے چکی تھی، لیکن خدا کی موجودگی کا احساس میرے لئے سب کچھ تھا۔ شاستری کا کام نہایت شاندار رہا۔ جنوبی افریقہ کے مندوبین نے ایسی باتیں نکان محسوس کئے بغیر سنیں اور آخر میں ڈاکٹر مالن نے بھی دل ہلادینے والی تقریر میں ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ شاستری نے مجھ سے کہا: چارلی، اگر آپ بھی ڈاکٹر مالن کی تقریر لکھتے تو وہ بھی اِس سے بہتر نہ ہوتی۔"[1]

(۵)

مگر اینڈریوز جانتے تھے کہ جنوبی افریقہ میں ابھی ان کا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ معاہدہ کیپ ٹاؤن نیٹال کے یورپین باشندوں کی رائے عامہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا اور یہی وجہ ہے کہ فی الفور ہندوستان کے خلاف ان کا ردِّعمل شروع ہوگیا۔ "کونیل یورن ایسوسی ایشن" ہر اسپی وطن واپس جانے کی اسکیم کی دفعہ کے خلاف تھی بلالحاظ اس کے کہ اس کے ساتھ کتنے ہی تحفظات کا کیوں نہ اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس کے ایک لیڈر نے یورپین رجعت پسندوں کو کھلم کھلا دعوت دی کہ وہ میدان میں آئیں اور معاہدہ کو کالعدم کرنے کے کام میں اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں۔ ٹرانسوال کے ہندوستانی اس شرط کی وجہ سے جس میں "رجسٹریشن کے جعلی سرٹیفکیٹوں" کی منسوخی کا انتظام کیا گیا تھا، بڑے ہراساں تھے، زیادہ معقول نکتہ چینی یہ تھی کہ معاہدہ میں "تمل بار لیجسلیشن"

---

[1] مکتوب بنام ایم۔ کے۔ گاندھی، ۱۳ جنوری ۱۹۲۷

یا تجارتی لیسنسوں اور املاک کے متعلقہ آرڈیننسوں کا کوئی ذکر نہ تھا۔ جیسا کہ اینڈریوز نے خود بیان کیا وہ ایک آخری فیصلہ کن تصفیہ کی بجائے ایک "شاندار وقتی انتظام" تھا۔ لیکن ہر چیز کے باوجود ان کے مسودۂ قرارداد کو جس میں بہ حیثیت مجموعی معاہدہ کی تصدیق کی گئی تھی، انڈین کانگریس کے اجلاسِ جاہنز برگ منعقدہ ۱۳ مارچ کو بہ اتفاقِ رائے اور پُرتپاک طریقہ سے منظور کر لیا گیا جاہنز برگ کے اخبار "اسٹار" نے اپنی ۱۶ مارچ ۱۹۲۷ کی اشاعت میں دوستانہ انداز میں کانگریس کے طرزِ عمل کی معقولیت پر ایک اداریہ لکھا اور جہاں تعریف کرنی چاہئے تھی وہاں تعریف بھی کی:

"ریورینڈ سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے سمجھوتہ کو ممکن بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی بدیہی دیانتداری، ان کا وسیع نظریۂ زندگی اور ان کے تدبر کا حقیقی تخیل جنوبی افریقہ اور ہندوستان دونوں ممالک میں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان کا رجحان ہمیشہ مصالحت اور اعتدال پسندی کی جانب رہا ہے۔"

اب بھی بہت سی مشکلات ایسی تھیں جن پر قابو پانا ضروری تھا۔ معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری قانون سازی ایسی پارلیمنٹ میں ہونی باقی تھی جہاں مخالفت کافی زوروں پر تھی اور جہاں اس کی دفعات سے ہندوستانی بے اطمینانی کے بر اشارہ کی گرفت کی جا سکتی تھی، اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ ڈربن کے ایک اخبار نے یہ ذلیل حرکت بھی کی کہ اس نے یہ "افواہ" شایع کر دی کہ "ایک لاکھ پونڈ کی رقم ہندوستان سے لائی گئی ہے تاکہ معاہدہ کے متعلق مصنوعی اطمینان کا جذبہ ملک میں پیدا کیا جاسکے۔" اینڈریوز نے اس افواہ پر خاموش حقارت کا اظہار کیا لیکن ٹرانسوال کے ہندوستانیوں اور کونسل بورن ایسوسی ایشن کی جانب سے تصفیہ پر جو نکتہ چینی کی گئی، اس کا جواب انہوں نے ہر ممکن طریقہ سے دیا۔ انہوں نے ڈاکٹر مالن کو ترغیب دی کہ وہ ٹرانسوال کے رجسٹری کے سرٹیفکٹوں کی متعلقہ شرط کا اطلاق کسی پچھلی تاریخ سے نہ کریں اور انہیں اس امر پر رضامند کر لیا کہ جنوبی افریقہ سے تین سال کی غیر حاضری کا شمار جس کی اجازت ڈومی سائل کا حق ضائع کئے بغیر دی جاسکتی تھی، مسودۂ قانون کی منظوری کی تاریخ سے کریں اور اس سے قبل کی غیر حاضری کو بالکل محسوب نہ کیا جائے۔ لیکن نکتہ چینیوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی صورت مطمئن نہ ہوں گے۔ ایک دن ڈاکٹر مالن نے اینڈریوز کو بلا بھیجا۔ اس نے پوچھا: "کیا اب کچھ نہیں کیا

جاسکتا؟ میں نہیں بتا سکتا کہ یورپینوں کی مخالفت کی موجودگی میں میں ان چینوں کو کس طرح چلا سکتا ہوں اگر ہندوستانی باشندے بھی میری امداد کرنے سے کلیتہً انکار کر دیں گے۔"[1]

مگر اینڈریوز بد دل نہیں ہوئے۔ وہ ہر اُس بات سے واقف تھے جو جنوبی افریقہ کی ہندوستانی جماعت کی نکتہ چینی کے طور پر کہی جائے، اور انہوں نے اس کی کمزوریوں کو مزید مخلصانہ خدمت کی تحریک کے طور پر کسی قسم کا الزامی جواب دئے بغیر قبول کر لیا۔ انہوں نے لکھا:

"میں بالکل مایوس نہیں ہوں اس لئے کہ تمام ماتحت اور مصیبت زدہ اقوام کی تاریخ یکساں ہے۔ یہ برائی کا ایک چکر ہے جس میں سے بغیر قربانی دئے باہر نکلنا ناممکن ہے اور قربانی سے مراد سب کی قربانی ہے۔ ہمیں آگے بڑھتے رہنا چاہئے یہاں تک کہ ہم فتح حاصل کر لیں۔ ہمیں کسی سے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمیں پہلے سے زیادہ اُن سے محبت کرنی چاہیئے اس لئے کہ وہ کمزور ہیں۔"[2]

اس موقع پر انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مخالفت کا بنیادی خیال معاہدہ کی ایماندارانہ بداعتمادی نہیں تھی بلکہ جماعتی بدگمانی تھی ۔۔ تاجر کی مزدور کے خلاف، "سابق پابندِ معاہدہ مزدور" کی "آزاد" مزدور کے خلاف۔ وہ یہ دیکھکر بیحد کڑھتے تھے کہ معاشرتی خرابیوں کا سیاسی طریق پر ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، لیکن انہیں مالدار "عرب" تاجروں کی خود غرضانہ حرص سے اور زیادہ تکلیف ہوئی اور اس زبردست تضاد سے کہ ایک طرف وہ عیش و عشرت اور آرام و آسایش کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور دوسری طرف غریبوں کے "مکانات" گندگی اور غلاظت سے اَٹے ہوتے ہیں۔

ہر قسم کی دشواری کے باوجود معاہدہ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں مسودات یونین کی پارلیمنٹ میں جون کے آخر تک جوں کے توں منظور کر لئے گئے اور مخالفت میں ایک بھی ترمیم پیش نہیں ہوئی۔ اینڈریوز کی نظر میں سب سے اہم دفعہ وہ تھی جس میں تسلیم کیا گیا تھا کہ ہندوستانیوں

---

[1] مکتوب بنام جے۔بی پیٹٹ، ۱۰ جون ۱۹۲۷ء۔

[2] مکتوب بنام بی۔ڈی۔سی، ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء۔

کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ معاہدہ میں جو وعدہ کیا گیا تھا، اس کے الفاظ یہ تھے "یونین کی گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ یونین میں بسنے والی تمام نسلوں کی ترقی کے لئے ان کی قابلیت اور مواقع کی انتہائی حد تک انتظام کرے۔" ابتدائی کارروائی کے طور پر یہ تجویز کی گئی کہ فورٹ ہیئر نیٹو کالج کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کا جو انتظام کیا گیا ہے اس میں ہندوستانیوں کو بھی شریک کیا جائے۔ اس پر چند ہندوستانیوں نے نہایت متمردانہ طور پر اعلان کر دیا کہ ان کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ ان کا شمار اس طریقہ سے دیسی آبادی کے ساتھ کیا جائے۔ ان کے طرزِ عمل سے ہر اس چیز کی نقیض پائی جاتی تھی جس کے لئے اینڈریوز اب تک ان کے نام سے جنگ کر رہے تھے، لیکن انھوں نے نرمی سے جواب دیا:

"یہ دلیل کہ ہندوستانیوں کو کسی افریقی کالج میں جا کر نہ پڑھنا چاہیئے، بالکل بودی ہے۔ ان گہرے دوستانہ تعلقات سے جو ان لوگوں میں جو مستقبل میں افریقی لیڈر ہونگے اور ہمارے اپنے ہندوستانی طلبا میں قائم ہو چکے ہیں، سوائے بھلائی کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ مسٹر این نے افریقی دیسی باشندوں کا جس طریقہ سے ذکر کیا ہے وہ بہت ہتک آمیز ہے اور جس قسم کی نسلی گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش میں وہ مصروف ہیں، وہ بالکل ناپسندیدہ چیز ہے۔"

آنے والے مہینوں میں جبکہ ترمیمی بل ملتوی کر دیا گیا تھا، اینڈریوز نے جنوبی رھوڈیشیا کی سیاحت کی جہاں ایسا کام موجود تھا جس میں انہوں نے ہندوستانی تاجروں کی امداد کی تاکہ وہ مخصوص مجوزہ "لیسنسوں کے قوانین" کے سلسلہ میں اپنی جائز جگہ حاصل کر سکیں۔ وہاں ہندوستانی کم تھے اور جو تھے وہ سب کے سب تجارت پیشہ تھے اور ان میں سے اکثریت ایسے اشخاص پر مشتمل تھی جو خود سالہا سال تک ناکتخدائی کی حیثیت سے ...... افریقہ میں رہتے تھے اور ان کی بیوی بچے ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے۔ یہی رواج قریب قریب مشرقی اور جنوبی افریقہ کی تجارت پیشہ جماعت میں رائج تھا اور ٹرانسوال کے ہندوستانی تاجر کی غیر ہردلعزیزی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ اینڈریوز نے ہر جگہ اس کی مذمت میں تقریریں کیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ایسی زندگی قطع نظر اس کے اخلاقی خطروں کے، لازماً طفیلی زندگی ہوتی ہے اور اگر ہندوستانی افریقہ میں شہری حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کا فرض

ہونا چاہئے کہ وہ شہریت کی ذمہ داریوں کو بھی پورا برداشت کریں اور افریقہ کو صحیح معنوں میں زیادہ سے زیادہ اپنا گھر بنائیں۔

اینڈریوز جنوبی افریقہ میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کے بعد ۲۳ راگست ۱۹۲۷ کو بمبئی پہنچے تاکہ افریقہ میں پہلے ہندوستانی ایجنٹ کی حیثیت سے وہ سرینواس شاستری کا خیر مقدم کریں اور ان کے قیام میں معاون ثابت ہوں۔ جو شہری ایڈریس بمبئی میونسپل کارپوریشن نے انہیں دیا اس کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے اپنی فطری بیباکی سے افریقہ میں ہندوستانیوں کی شہری ذمہ داریوں کا ذیل کے الفاظ میں ذکر کیا:

"میں سرسٹڈنی کے اس ہمہ گیر الزام کی کھلم کھلا تردید کرنا چاہتا ہوں کہ مشرقی افریقہ میں ہندوستانی جماعت کا تجارتی اور ذاتی اخلاق بہت پست ہے۔ انہیں کوئی حق نہیں پہنچا کہ وہ اس طریقہ سے ساری قوم کو بدنام کریں۔ بمبئی نے افریقہ کو اعلیٰ شہری اور اخلاقی صفات سے متصف اشخاص دئے۔ جن پر ان کا اختیار کردہ وطن (جنوبی افریقہ) بلاشبہ فخر کرسکتا ہے۔

لیکن ساتھ ہی میں اس پبلک موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانیوں کی توجہ تین باتوں کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں جن کے اظہار کی سخت ضرورت ہے اور میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انہیں کہہ ڈالوں۔ ...... اولاً یہ کہ انہیں افریقہ میں مستقل گھریلو زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے، ایسی زندگی نہیں جس میں وہ افریقہ کو تو اپنا تجارتی مرکز سمجھیں اور بمبئی کو اپنی گھریلو زندگی کا مرکز خیال کریں۔ ..... ثانیاً میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی جنوبی افریقہ میں جو روپیہ پیدا کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ اسے افریقہ ہی میں صرف کریں۔ ...... ثالثاً یہ کہ افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کو چاہئے کہ وہ اپنے اور اپنے بچوں کے اندر اپنے اختیار کردہ وطن کے لئے پوری صدق دلی کے ساتھ حب الوطنی کا جذبہ پیدا کریں۔ جب وہ اچھے جنوبی یا مشرقی افریقی بن جائینگے صرف اسی وقت وہ افریقہ کے مقیم یورپین باشندوں اور خود افریقی دیسی باشندوں کی محبت اور احترام کو حاصل کرسکینگے۔"

گاندھی نے جارلی کوان کے "حیرت انگیز کارناموں" پر، جو انہوں نے وہاں انجام دئے تھے، دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان کے ہندوستان واپس آجانے پر خوش آمدید کہا، لارڈ ارون نے بھی انہیں اپنی محبت اور شکرگزاری کا خط بھیجا، لیکن بہترین معاوضہ انہیں بعد کے سالوں میں ملا جبکہ مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں پر ان شریف ہندوستانی خواتین نے جنہیں وہ مسرت بخش گھریلو زندگی میں ازسرنو واپس لے آئے تھے، ان کا دلی شکریہ ادا کیا۔

باب ۱۶

پچھلے واقعات ـــ زمانۂ مستقبل

(۱۹۲۷ سے ۱۹۲۸ تک) (عمر ۵۶ - ۵۷)

(۱)

جب اینڈریوز اگست ۱۹۲۷ میں ہندوستان واپس آئے اس وقت بعض ایسے عناصر کارفرما تھے جن کی وجہ سے ان کی بیرونی زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوگیا۔ جب سے انہوں نے سرزمینِ ہند پر ۲۳ سال قبل اپنا قدم رکھا تھا اسوقت سے لیکر اب تک وہ بیک وقت چند ماہ سے زیادہ ہندوستان سے باہر نہیں رہے اور ان کی طویل ترین غیر حاضریاں بھی ۱۸-۱۹۱۷ میں فجی میں اور ۲۷-۱۹۲۶ میں جنوبی افریقہ میں بڑی حد تک ان ہی ممالک کے ہندوستانی نوآبادکاروں میں بسر ہوئی تھیں۔ اس کے بعد تقریباً ۱۰ سال تک انہیں کلیتہً مغرب میں رہنا پڑا اور اس اثنا میں ہندوستان میں ان کا آنا جانا قلیل مدت کے لئے اور بے قاعدہ ہوتا تھا بعینہٖ جس طرح سے اس سے قبل کے سالوں میں ہندوستان سے اُن کی غیر حاضریاں قلیل مدت کے لئے اور بےقاعدہ ہوا کرتی تھیں۔

مگر ابتدائی چند مہینوں میں انہوں نے نئے سرے سے اپنی پہلی زندگی کے

رشتوں کو جوڑیا۔ افلاس زدہ اڑیسہ نے جو آسمانی وباؤں کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا۔ اپنے اس دوریِ ابتلا میں انہیں طلب کر لیا۔ ستمبر ۱۹۲۷ میں جہاں ندی کے ایک سیلاب میں ۸۰ ہزار مکانات بہ گئے تھے۔ اینڈریوز فی الفور وہاں پہنچ گئے نہ صرف فوری امدادی کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے بلکہ "یہ معلوم کرنے کے لئے بھی کہ آیا اس آسمانی آفت سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل بھی ہے یا نہیں جو سال کے سال صوبہ پر نازل ہوتی ہے۔" وہ ان ابتدائی اشخاص میں سے تھے جنہوں نے رائے عامہ پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ دریا کے سارے راستہ کا اچھی طرح سے سروے کیا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ جس طرح دریائے مسی سپی کے راستہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے ردّوبدل کر دیا ہے اس کے تجربہ سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ان میں اور صوبہ کے نوعمر کانگریسی لیڈروں میں باہمی پُرخلوص دوستی پیدا ہو گئی جن کے لئے وہ ایک قابلِ احترام بڑے بھائی کا درجہ رکھتے تھے۔

۱۹۲۱-۲۲ کی صنعتی بے چینی کے بعد مقابلتہً حالات میں استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ مگر ۱۹۲۷ کے آخر میں قیمتوں میں پھر مزید کمی ہو گئی۔ مالکان نے "تخفیفیں" کرنی شروع کر دیں اور یہ اہتمام بہت سے تنازعات کا سبب بنا۔ اینڈریوز نے کانپور میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے اجلاس منعقدہ نومبر میں شرکت کی اور وہ ایک مرتبہ اس کے صدر پھر منتخب ہو گئے اور ان کا بہت سا وقت لیلوآہ میں ایسٹ انڈیا ریلوے کے مزدوروں اور ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی واقع جمشید پور کے ملازمین کی جانب سے نامہ و پیام کرنے میں صرف ہوا۔ ٹریڈ یونینوں میں کمیونسٹ پارٹی کا اثر بتدریج بڑھ رہا تھا اور وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس پر زور دے رہی تھی کہ وہ ماسکو میں قائم شدہ ریڈ انٹرنیشنل لیبر یونین کے ساتھ اپنا الحاق کرے۔ مگر اینڈریوز کی صدارت میں کانپور کے اجلاس نے اس کے ساتھ یا ایمسٹرڈم کی "اعتدال پسند" انٹرنیشنل کے ساتھ اس وقت تک الحاق کرنے سے انکار کر دیا گیا جب تک ان دونوں کے درمیان اتفاق نہ ہو جائے۔ ایک سال بعد جبکہ کانگریس

کا اجلاس جھریا میں دسمبر ۱۹۲۸ میں ہوا، تو اینڈریوز انگلستان میں تھے۔ وہاں سے انہوں نے ایک طویل پیغام بھیجا جس میں تاکید کی گئی تھی کہ ہندوستانی مزدوروں کو اپنی آزادیٔ عمل برقرار رکھنی چاہیئے۔ مغرب میں مزدوروں کا "دایاں بازو" مایوس کن طریقہ سے کمزور تھا اور "امپیریلزم" اور سفید فام مزدوروں کی پالیسی کے بارے میں متذبذب تھا۔ کمیونسٹوں نے جنہوں نے ان باتوں کے خلاف دیانتدارانہ اور شریفانہ رویہ اختیار کیا تھا، جماعتی جنگ اور متشددانہ انقلاب کی حمایت کی۔ اینڈریوز نے کہا: "ہمیں بشرطیکہ ہم دانشمندی سے کام لیں، کسی فریق سے نہیں ملنا چاہیئے ہمارے پاس خود اپنا کام کرنے کو موجود ہے اور بہتر یہ ہے کہ ہم اسے تنِ تنہا انجام دیں۔" ٹریڈ یونین کے معاملات میں یہ ان کا براہ راست آخری امدادی مشورہ تھا۔ دوسرے سال خود کانگریس کے اندر پھوٹ پڑ گئی جو ان کی زندگی تک بدستور باقی رہی۔

دوسرے حلقوں میں عدم رواداری اور تشدد کی اسپرٹ کے آثار نمایاں تھے تاکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ تنازعہ کو بھڑکایا جائے جس کے خلاف اینڈریوز پوری طاقت سے جنگ کر چکے تھے۔ اس اسپرٹ کا اظہار اس طرح ہوا کہ ہندو طلبا نے کلکتہ کے سٹی کالج کا بائیکاٹ کر دیا اور اس پر بزور بعض ایسی مذہبی رسوم عائد کرنے کی کوشش کی جو برہمو سماج کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھیں۔ اس اسپرٹ کا مزید اظہار سمندر پار کے ہندوستانی باشندوں میں ناخوشگوار قسم کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی صورت میں ہوا مثلاً ڈربن میں غریب "ہندوؤں" کو مالدار "مسلمانوں" کے خلاف اکسایا گیا، کینیا اور فجی میں بھی اسی قسم کے جذباتِ اسفل کو ابھارنے کے لئے بے تحاشا اپیلیں کی گئیں اور ملایا میں بھی کٹر فرقہ پرستوں نے شدید قسم کی فرقہ وارانہ گڑبڑ مچائی۔ اینڈریوز نے اپنے آپ پر ایک سے زیادہ مرتبہ بالضرور سخت ملامت کی ہوگی اس لئے کہ انہوں نے اپنی سادہ دلی سے ہندوستان سے مذہبی اساتذہ کو بلایا تھا تاکہ وہ سمندر پار کے "عظیم تر ہندوستان" کی آبادیوں میں

ہندومت کے مطمحِ نظر کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کا پرچار کیا کریں، لیکن ان اساتذہ نے یہاں آکر سختی کے ساتھ دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کی تحریک شروع کر دی جو مذہبی خدمت کے متعلق خود اُن کے اپنے تخیل سے بالکل جداگانہ چیز تھی۔ خود ہندوستان میں ایک ہندو مناظرہ کرنے والے نے عیسیٰ کے ذاتی کیرکٹر پر بیجا اور نامناسب حملے کئے۔ اینڈریوز نے اپنے تبحرِ علمی اور واقعیت پسندانہ سچائی کے ساتھ ایک رسالہ کے ذریعہ اس کا جواب دیا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے جواب سے مزید بحث کا دروازہ کھل گیا ہے تو انہوں نے شائستہ انکساری کے ساتھ معافی مانگ لی اور تسلیم کر لیا کہ عیسائی مبلغین نے بھی بسا اوقات اسی طریقہ سے ان اشخاص کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے جو دوسرے بزرگانِ دین کے معتقد تھے یا جن کا احترام وہ کرتے تھے۔

کچھ اور بھی امور تھے جن کی نگرانی کی ضرورت تھی۔ مثلاً کینیا میں نئے سرے سے کوشش کی گئی کہ مجلسِ قانونساز میں "سفید فام" غیر سرکاری اشخاص کی اکثریت حاصل کی جائے اور ہندوستانیوں سے اس کی تائید کرانے کے لئے انہیں یہ کہہ کر رشوت دی گئی کہ دیسی باشندوں پر جو "تولیت" قائم کی جائیگی اس میں دفترِ نوآبادی کے ساتھ ساتھ دونوں تارکانِ وطن جماعتوں کے نمایندے ہونگے حالانکہ ۱۹۲۳ کے قرطاسِ ابیض میں جن اصولوں کو پیش کیا گیا ہے، اس تجویز سے اُن کی کھلی ہوئی مخالفت ہوتی ہے برطانوی گائنا میں بھی ہندوستانیوں کی حالت فوری توجہ کی محتاج تھی۔ ۱۹۲۳ اور ۱۹۲۵ کی درمیانی مدت میں جو سابقہ تحقیقات کی گئی تھی، اس نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہاں کی متوطن ہندوستانی جماعت ۱۹۳۰ سے قبل ترکِ وطن کی تجدید کی مخالف ہے۔ اور ۱۹۲۵ میں اینڈریوز نے بھی اپنے طور پر قبل از وقت بھرتی کئے جانے کی اسکیم کو نامنظور کرانے کے سلسلہ میں انتہائی کوشش کی تھی۔ اب ۱۹۳۰ قریب آرہا تھا اور ضرورت تھی کہ تازہ تحقیقات کی جائے۔

اینڈریوز ۵ جون ۱۹۲۸ کو کولمبو سے عازم یورپ ہو گئے۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ رابندر ناتھ ٹیگور کو بھی جانا چاہیئے اور موسم خزاں میں آکسفورڈ میں ہبرٹ لکچر دینے چاہئیں۔ لیکن وہ بیمار ہو گئے اور ان کا سفر منسوخ کرنا پڑا۔ مگر اینڈریوز اپنے پروگرام پر قائم رہے۔ وقت آ گیا تھا جبکہ ہندوستان کے ایک ترجمان کی مغرب میں شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ ۱۹۲۷ کے موسم گرما کے آخری دنوں میں کیتھرائن میو نے اپنی رسوا کُن کتاب "مادرِ ہند" شائع کی اور بہت جلد معلوم ہو گیا کہ ہندوستان کے متعلق عوام کا طرزِ عمل نہ صرف امریکہ میں بلکہ ساری دنیا میں اس کی وجہ سے طاقتور اور ضرر رساں ہو گیا ہے۔ جنوبی افریقہ کے ایک دوست نے اینڈریوز کو لکھا کہ "میں نے ٹیگور کا مطالعہ کرنے، آپ کے لکچر سننے اور ہندوستانی وفد سے ملنے کی وجہ سے ہندوستان کی جو تصویر اپنے ذہن میں بنائی تھی، اس کے بعد اس کتاب کو پڑھکر مجھے بیحد صدمہ ہوا۔"[۱] اسی زمانہ میں ہندوستانی آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں سائمن کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ جس میں کوئی بھی ہندوستانی ممبر نہ تھا۔ ہندوستان کی مایوسی اور غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا اور مہاتما گاندھی کی سیاسی لیڈری جسے وہ ۱۹۲۲ میں کسی حد تک کھو چکے تھے، پھر سے بحال ہو گئی۔ دونوں دوستوں نے اس امکان پر گفتگو کی کہ ضرورت ہے کہ گاندھی اصالتاً قریبی زمانۂ مستقبل میں انگلستان کی سیاحت کریں اور اینڈریوز جانتے تھے کہ اگر وہ گئے تو خود اُنہیں ان کا راستہ تیار کرنے کے لئے بہت کچھ کام کرنا ہوگا۔

جب وہ انگلستان پہنچے تو وہاں ایک خط ان کے انتظار میں رکھا ہوا تھا۔ یہ خط لندن کے پبلشر ہاڈر اینڈ اسٹاؤٹن کا تھا اور مسٹر آرتھر ہرڈ کی طرف سے آیا تھا جس میں اینڈریوز کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ یہاں آئیں اور ان سے "ایک کتاب کے لکھنے کے سلسلہ میں" ملیں۔ خط میں مزید تفصیلات درج نہیں تھیں۔ ملاقات

---

[۱] ایم۔ ای۔ ٹروتھمین کا مکتوب بنام سی۔ ایف۔ اے، ۱۰ فروری ۱۹۲۸

کے دوران میں مسٹر ہرڈ نے بتایا کہ وہ اینڈریوز کے مذہبی تجربہ کے ارتقائی مدارج کے متعلق ایک کتاب لکھوانا چاہتے ہیں جو بالفاظِ دیگر۔ اینڈریوز کی "روحانی خودنوشت سوانح حیات" بھی ہوگی۔ اینڈریوز گھبرا گئے۔ وہ اتنے بڑے کام کی عظمت اور ذمہ داری لینے سے ہچکچائے۔ لیکن جب دوسرے لوگوں نے بھی فرداً فرداً اسی قسم کی درخواستیں کیں تو اس وقت انہیں محسوس ہوا کہ انہیں انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ "واٹ آئی اونو کرائسٹ" کو مکمل کرنے میں تین سال لگے لیکن ۱۹۲۸ء کے بعد سے وہ کبھی ان کے خیالات سے دور نہ ہوئی۔

اس وقت اینڈریوز نے اپنے سامنے تین کام رکھے۔ انہیں مس میو کی کتاب کے خلاف جسے گاندھی نے "نالیاں صاف کرنے والے انسپکٹر کی رپورٹ" سے تعبیر کیا تھا، "حقیقی ہندوستان" کی تصویر پیش کرکے جنگ کرنی چاہیئے تاکہ عظیم المرتبت مذہبی اور کلچرل روایات اپنے پورے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہو جائیں اس طرح سے کہ ٹیگور ان کی زندہ تصویر قرار پائیں۔ انہیں ایک بیدار شدہ قوم کی سیاسی امنگوں کی ترجمانی کرنی چاہیئے اور مغرب کی مدد کرنی چاہیئے تاکہ وہ گاندھی کی زندگی اور خیالات کو سمجھ سکے۔ انہیں یورپ اور امریکہ کے روحانی اشخاص کو بتانا چاہیئے کہ مسیح اور مسیحی خدمت سے وہ کونسا نیا تخیل مراد ہے جس کا تجربہ انہیں مشرق میں ہوا ہے۔

چھ مہینے کے اندر اندر سمجھوتہ کے اس پل کی بنیادیں ڈالدی گئیں۔ اینڈریوز نے برطانوی اخبارات کے ساتھ جن میں دنیوی اور مذہبی اخبارات دونوں شامل تھے، اپنے روابط کو بہت کچھ بڑھا لیا۔ انہوں نے فیلوشپ آف ریکنسی لی ایشن کی کانفرنس میں شرکت کی، انگلستان میں اور جنیوا میں امن کے اداروں کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کر لئے اور امریکہ جانے کا منصوبہ تیار کر لیا۔ انہوں نے رومین رولینڈ کے ساتھ ایک دن گزارا جو ان کی زندگی میں نہایت اہمیت رکھتا تھا، اور اس طرح ایک اور دن "سیودی چلڈرن فنڈ" کے بانی ایگلینٹائن جیب کے ساتھ بسر کیا۔ انہوں نے

ہر بڑی برطانوی یونیورسٹی کے طلبا کے بھرے جلسوں میں اور مختلف عقائد کے گرجاؤں میں تقریریں کیں۔ اس کے علاوہ لندن میں سیاسی لیڈروں اور ہندوستانیوں کے ساتھ انہوں نے گہرے اور دوستانہ روابط پیدا کرلئے۔

اسی زمانہ میں اینڈریوز نے ٹیگور پر چار کتابیں[1] مرتب کیں اور انہیں شایع بھی کرایا۔ یہ محنت بربنائے محبت تھی۔ سیاسی ملاقاتوں یا ہیجانی مگر عارضی اہمیت رکھنے والے موضاعات پر بڑی تیزی سے مضامین لکھنے اور ان پر تقریریں کرنے کے طویل ایام کے بعد وہ اپنی دل پسند کتابوں کے حسن کے مطالعہ سے اپنی روح کو خوش کرتے اور اس خیال سے اپنے میں ایک نئی قوتِ عمل پاتے کہ وہ ان کے پیغام کو پھیلانے میں معاون ثابت ہورہے ہیں:

"میں واضح طور پر آپ سے بیان نہیں کرسکتا کہ مجھے آپ کے لئے یہ کام کرنے میں کسقدر مسرت ہوتی ہے۔ شام کو جبکہ میں بالکل تھک جاتا ہوں، میں بار بار انہیں پڑھتا ہوں اور آپ کے خوبصورت الفاظ سے سکون اور تازگی حاصل کرتا ہوں میں شکریہ کے احسان سے اسقدر زیربار ہوں کہ میں کبھی بھی اس کا معاوضہ ادا نہیں نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ لندن میں میں اپنے مسلسل قیام کی وجہ سے یہ سب کچھ کرسکا۔ تقریباً ہر روز میں کسی نہ کسی کام کے سلسلہ میں اِدھر اُدھر جاتا رہا ہوں: اور پبلشرز اس کے لئے بیحد شکرگزار ہیں کہ میں نے ذاتی دلچسپی لی۔۔۔۔۔ یہ چیز بھی کسقدر مسرت افزا ہے کہ میں آپ کے لئے اس طرح سے کچھ کام کرنے کے قابل ہوسکا اور آپ کے خیالات کو ساری دنیا میں پھیلا سکا۔[2]

---

[1] (۱) نیبرز ٹو اے فرینڈ۔ (۲) فایر فلائز۔ (۳) ٹیگور برتھ ڈے بک اور (۴) تھاٹس فرام ٹیگور۔

[2] مکاتیب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۲۲ نومبر ۱۹۲۸ و ۲ دسمبر ۱۹۲۸

اس کے ساتھ ساتھ وہ "خیالاتِ مہاتما گاندھی" کے متعلق گاندھی کو بھی لکھتے رہتے تھے۔

"میں آپ سے یہ کہنے کے لئے بے حد فکرمند ہوں کہ جو کتاب میں لکھ رہا ہوں، وہ بڑی پُر از معلومات اور روح پرور ہوگی: اور ساتھ ہی کافی سلیس، سادہ اور ہردلعزیز تاکہ یورپ اور امریکہ میں اوسط درجہ کے آدمی بھی اس کا مطالعہ کر سکیں۔ ..... میں درحقیقت یہ خیال کرتا ہوں بشرطیکہ میں انکسار کے جذبہ کے ساتھ ایسا کہنے کے قابل ہو سکوں کہ یہ سال جس کے دوران میں میں انگلستان اور یورپ میں رہا ہوں اور امریکہ کا آنے والا دورہ دونوں راستہ ہموار کرینگے اس وقت کے لئے جبکہ آپ خود بنفسِ نفیس یہاں تشریف لائیں۔"[1]

اینڈریوز کے فوری سیاسی مسائل کے عام مباحث میں "گول میز کانفرنس" کا معنی خیز جملہ ایک سے زیادہ مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے لیبر پارٹی پر الزام لگایا کہ اس نے کیوں سائیمن کمیشن کی امداد سے دست کشی نہ کرلی کم سے کم اسوقت تک کے لئے کہ "گول میز کانفرنس" کا اصول تسلیم کرلیا جاتا؛ وہ اور دیوان چمن لال ہندوستان کے نمایندگان کی حیثیت سے امپیریل لیبر کانفرنس سے جو نومبر ۱۹۲۷ میں منعقد ہوئی تھی، اس لئے چلے آئے تھے کہ ان کی تحریک جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کا آئینی مستقبل کانفرنس کا انعقاد کرکے طے کیا جائے، خلافِ ضابطہ قرار دیدی گئی تھی۔ انہوں نے لکھا کہ دیانتداری متقاضی ہے کہ خود سائیمن کمیشن تمام متعلقہ پارٹیوں پر مشتمل ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کو منظور کرلے۔

(۳)

اینڈریوز نے ۱۹۲۸ میں "ینگ مین آف انڈیا" کے لئے "تلاشِ حق" کے

---

[1] مکتوب بنام ایم۔ کے۔ گاندھی، ۱۰ دسمبر ۱۹۲۸ء

عنوان سے جو سلسلۂ مضامین لکھا تھا اس میں انہوں نے اپنے مذہبی عقائد پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ خوبصورت حوالہ جس میں انہوں نے اپنی تصدیقِ عیسائیت کا ذکر کیا ہے، ایک خط میں ملتا ہے جو انگریزی مذہبی اخبار "دی برٹش ویکلی" کے نام لکھا گیا تھا اور جو "واٹ آئی او ٹو کرائسٹ" پر تبصرہ کی حیثیت سے ۱۸ اگست ۱۹۳۲ کو شایع ہوا تھا!

"میری سب سے بڑی تمنا یہ رہی ہے کہ میں اُن باتوں کی تشہیر کروں جو خود مسیح نے مجھ پر منکشف کی ہیں۔ لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے کو بھی مذہبی تجربہ کی مسرت میں حصہ دار بنایا جائے، بجائے اس کے کہ کوئی مذہبی عقیدہ کسی دوسرے پر مسلط کر دیا جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کسی دوسرے شخص کو قیمتی سچائی میں حصہ دار بنانے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ نہیں ہے کہ خود اپنی روح کی اندرونی روشنی کو اتنا پاک رکھا جائے کہ سچائی خود اپنے نور کی چمک کے ساتھ جلوہ گر ہو؟ کوئی سچائی جو جاننے کے قابل ہے، سکھائی نہیں جا سکتی، اسے صرف زندگی کے ذریعہ نمایاں کیا جا سکتا ہے۔"

دو اشخاص نے جن کے مزاج ایک دوسرے سے بیحد مختلف تھے، جو کہانیاں بیان کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس سچائی پر اینڈریوز زندگی بھر عمل پیرا رہے خود ان کی روح کے ذریعہ کس طرح جلوہ ریز رہی۔ پہلے شخص نے کیمبرج کے "کامن روم" کی ایک شام کے منظر کو یوں بیان کیا ہے:

یہ پرانا سوال پھر زیر بحث آیا کہ سب سے بڑے غیر عیسائی مقدس شخص کا علم خدا کے بارے میں زیادہ تھا یا بیت اللحم کے کونے میں رہنے والی ایک حقیر عیسائی عورت کا۔ اس سلسلہ میں اینڈریوز نے ایک کہانی بیان کی۔ انہوں نے کہا "کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک خاتون کلیرا انٹ شانتی نکیتن میں ایسے وقت میں آئیں جبکہ وہ کسی ذاتی صدمہ کی وجہ سے نڈھال ہو رہی تھیں۔ انکے

قیام کی آخری رات کو ہم تاروں بھرے آسمان کے نیچے بیٹھے ہو ئے باتیں کررہے تھے اور ہمارے چاروں طرف لڑکے ہی لڑکے تھے۔ اس خاتون نے کہا! کیا آپ میرا گانا سننا پسند کرینگے؟ اور شاعر نے جواب میں کہا کہ ہم سب سے زیادہ اسے پسند کرینگے۔ اتفاق سے وہ زمانہ مقدس ہفتہ کا تھا اور انہوں نے وہ گیت گایا جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں! کیا تم وہاں موجود تھے جب انہوں نے میرے آقا کو پھانسی دی تھی؟ جب یہ شیریں آواز خاموش ہوگئی اس وقت تھوڑی دیر کے لئے چاروں طرف سناٹا چھا گیا اور پھر کسی نے جواب دیا —— کیا وہ میں تھا یا شاعر تھے، لیکن جو بھی تھا وہ ہم سب کا غیرادا شدہ لفظ تھا —— ہاں، ہم سب وہاں موجود تھے۔"

میں اس کہانی کو یا ان کے اندازِ بیان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور میں کہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے صلیب کے بارے میں کچھ حقیقی ادراک حاصل ہوا تو اس کا آغاز اسی وقت سے سمجھنا چاہیئے۔"[1]

دوسرا منظر برمنگھم کی کانفرنس کا ہے جہاں اینڈریوز نے یہی کہانی دہرائی تھی:

"کیا تم وہاں موجود تھے جب انہوں نے میرے آقا کو پھانسی دی تھی؟"

انہوں نے ایک معنی خیز جملہ میں اس تمام انسانی کرب و بلا کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا جس کا نقش آج بھی میرے دل پر باقی ہے اس لئے کہ اس علامتی طریقہ سے انہوں نے ہندوستان کے جملہ مصائب کو اور حبشیوں کی غلامی کی دردناک کہانی کو بیان کر دیا تھا۔ مجھ میں جرأت نہیں کہ میں ان کے اصل الفاظ کا اعادہ کروں، لیکن تمام منظر اور اس کے پیغام کا نقش اب تک امٹ ہے اور چونکہ اس میں پاکیزگی پیدا کرنے کا جذبہ

---

[1] ریورنڈ اے۔ مارکس ہوارڈ کا مکتوب مصنفین کے نام۔

موجود ہے اس لئے مجھے اس کا رہ رہ کر خیال آتا رہتا ہے اور مجھے ایک اور چھوٹی سی مگر علامتی چیز یاد ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب وہ بول رہے تھے۔ اس وقت چارلی اینڈریوز (نامعلوم طریقہ سے) ہمارے قریب آتے گئے تھے۔ خطبہ دیتے وقت وہ تقریباً غیر متحرک تھے مگر درحقیقت وہ اپنے سامعین کی طرف حرکت کر رہے تھے گویا کہ یہ بڑی خواہش انہیں کشاں کشاں قریب لا رہی ہے کہ وہ ہمیں اپنا مفہوم سمجھائیں۔"[1]

ان سے اتفاقیہ ملاقات کا جو اثر دل پر ہوتا تھا اس کا اظہار ان کے پبلشرز میسرز جارج ایلن اینڈ آن وِن سے پہلی ملاقات کی کہانی سے کیا جا سکتا ہے تعارف کرانے والے کلرک نے سر اسٹینلے آن وِن کو ٹیلیفون کیا "ان سے ملاقات کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ضروری ہے کہ آپ ان سے ملاقات کر لیں۔ وہ معمولی آدمی نہیں معلوم ہوتے۔"

معلوم نہیں ہوتا کہ اینڈریوز نے کبھی ذہنی طور پر خدا کی فطرت یا مسیح کی شخصیت کے بارے میں اپنے عقائد کو دوبارہ اصولی شکل دی ہو جنہیں ایک زمانہ میں وہ مسترد کر دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔ جب ان کے دوست اسٹوکس نے کلیسائی عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اس کے بعد سے انہوں نے اپنے آپ کو عیسائی کہنا بھی ترک کر دیا تھا۔ مگر اینڈریوز قدرے مختلف ساخت رکھتے تھے۔ ان کی مذہبی زندگی کا مرکز یہ تھا کہ وہ ایک زندہ انسان (مسیح) سے گہری ذاتی عقیدت رکھیں۔ ان کی دعائیں رفیقِ اعلیٰ کے ساتھ دوستانہ گفتگوؤں پر مشتمل ہوتی تھیں اور انہیں ہر وقت یہ احساس رہتا تھا کہ اناجیل کے مسیح ان کے قریب ہیں۔ بچپن ہی سے اس پیاری صورت پر ان کا راسخ مرئی تخیل مرکوز رہتا تھا۔ ان کی نظر میں مذہب محض نظری قیاس آرائیوں

---

[1] ریجی نلڈ اے۔ رینالڈز کا مکتوب مصنفین کے نام۔

کے نظام کا نام نہ تھا، وہ محبت آمیز عقیدت مندی کا منبع اور اس کا مستثنٰی تھا، اس محبت کا جسے وہ اپنے ارضی دوستوں پر نچھاور کرتے رہتے تھے، وہ بھگتی کا تخیل تھا، ذہنی خیال آرائیوں سے الگ تھلگ۔

"میرے لئے مسیح میرے اخلاقی اور روحانی تجربہ میں خدا کی زندہ مرئی شکل ہیں۔ خدا کی لامحدودیت کے بارے میں جو اس سے ماورا ہے میں ہستی کی اس موجودہ منزل پر ایسی کوئی بات نہیں جانتا جس کی تشریح کی جاسکتی ہو۔ لیکن مسیح کی انسانیت کو جو ربانی بھی ہے، میں درحقیقت جان سکتا ہوں۔ اور جب میں اس ربانی حسن بھائی اور محبت کو دوسروں میں بھی دیکھتا ہوں تو اس وقت میرے لئے یہ قدرتی بات ہوجاتی ہے کہ میں اسے مسیح سے نسبت دیدوں۔"[1]

اس طرح وہ اپنے ہی کلیسا کے تاریخی عقائد کو تسلیم کرنے لگے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ خدائی تجربہ کو انسانی الفاظ میں ادا کرنے کی ایک کوشش ہے جسے الفاظ کے ذریعہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کلیسائے انگلستان ان کا روحانی گھر تھا اور زندگی بھر رہا۔ لیکن مذہبی رفاقت کا جو حلقہ انہوں نے قائم کیا تھا اس میں ہر ایسا شخص شامل تھا، خواہ وہ کسی عقیدہ اور مذہب و ملت کا ہو، جو سب کے زندہ خدا کی خدمت عاجزی اور برادرانہ محبت کے جذبہ سے کرتا ہو۔

---

[1] یہ الفاظ ماخوذ ہیں ایک مضمون سے جسے ایک جاپانی نے ۱۹۲۷ میں تحریر کیا تھا اور جس کا عنوان تھا "میں عیسائی کیوں ہوا؟"

باب ۱۷

امریکی سفر

(۱۹۲۹ سے ۱۹۳۰ تک)

(۱)

۱۹۲۸ء کے آخر کا واقعہ ہے کہ سر گارڈن گگس برگٹ جو برطانوی گائنا کے نامزد گورنر تھے، ایک دن لندن کے فیشن ایبل علاقہ پال مال کی آرمی اینڈ نیوی کلب میں سی۔ایف۔اینڈریوز کا انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت پادری۔ اے جی فریزر اُن کے ساتھ تھے۔ وہ سر گارڈن کو گولڈ کوسٹ کے محبوب گورنر کی حیثیت سے جانتے تھے اور سر گارڈن ہی نے ان سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اینڈریوز سے ملاقات کا انتظام کرا دیں۔

دفعتہً ہال کا دربان اپنی وردی کی پوری شان و شوکت کے ساتھ اندر آیا اور اس نے کہا: "جناب عالی! دروازے پر ایک شخص منتظر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ملاقات کا وقت مقرر ہے، لیکن میں نے پسند نہیں کیا کہ میں اسے اندر آنے دوں جب تک آپ اُسے نہ دیکھ لیں۔"
فریزر مسکرا دیئے۔ انہوں نے کہا: "میں نے پہلے سے آپ کو آگاہ کر دیا

تھا! وہ اینڈریوز ہی ہیں۔" اور وہ دونوں استقبال کے لئے دروازے تک گئے۔ کوئی شخص بھی جو کلب کے لباس کے بے عیب معیار سے واقف ہو، دربان کو اس کے شبہات کے متعلق الزام نہیں دے سکتا، کیونکہ خراب قسم کی کینوس کے جوتوں سے لیکر پرانی فلالین کی بدقطع پتلون اور کرکٹ کی قمیض تک سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اینڈریوز اس دن معمول سے زیادہ خراب لباس پہنے ہوئے تھے۔ لیکن کجس برگ نے ان کا مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور وہ لنچ کھانے کے لئے اندر چلے گئے اور امیرالبحر، جنرل اور گورنر سب ہی یکے بعد دیگرے سرگارڈن سے ملنے کے لئے آتے اور وہ ان سب کا تعارف اپنے محترم مہمان سے کراتے رہے۔ اس کے بعد وہ ایک کونے میں جاکر خاموشی سے معروفِ گفتگو ہو گئے اور طے پایا کہ اینڈریوز برٹش گائنا کا دورہ کرنے کے لئے جائیں گے۔ رخصت کے وقت سرگارڈن انہیں سڑک تک پہنچانے گئے اور جب تک انھیں ٹیکسی میں نہ بٹھادیا واپس نہ آئے۔ ان کا سر احتراماً جھک گیا اور جہاں تک نظر کام کرتی رہی وہ برابر ٹیکسی کو دیکھتے رہے۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے اپنے رفیق کی طرف مڑکر آہستگی سے کہا: "میں محسوس کرتا ہوں کہ اپنے آقا خداوند کو لنچ دینے میں میری بہت عزت افزائی ہوئی ہے۔"

اینڈریوز جنوری ۱۹۲۹ میں ریاستہائے متحدہ پہنچے اور وقت ضائع کئے بغیر انہوں نے مس میو سے ملاقات کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا: "میں اس سے ملکر بالکل ناراض نہیں ہوا، لیکن میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ ہر اُس چیز کی جسے ہم مشرق میں قابلِ احترام سمجھتے ہیں" انتہائی ضد واقع ہوئی تھی۔" ملاقات کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنے جذبات میں سچی ہے اور اس لئے انہیں اس کے متعلق "سیاسی بدنیتی" کا الزام واپس لے لینا

چاہیئے جیسے انہوں نے ابتدا میں اس کے خلاف عائد کیا تھا۔ انہوں نے کہا: "بدیہی طور پر اس میں سیاسی تعصب موجود ہے لیکن مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس کی نیت پر حملہ کروں۔"

انہوں نے اخبارات کے ایڈیٹروں سے ملاقات کی اور امریکی کونگریس کے ساتھ مل کر اس امر کا انتظام کیا کہ ان کے ایک رکن ڈاکٹر ہمبرز وشوا بھارتی جائیں اور دیہات میں ملیریا کی روک تھام کے لئے کام کریں۔ اس کے بعد وہ کناڈا گئے تاکہ وہاں ٹیگور کی آنے والی سیاحت کے لئے راستہ تیار کریں۔ اس کام میں انہیں جتنی اذیت برداشت کرنی پڑی۔ اس کا اظہار ان کے نجی خطوط سے ہوتا ہے۔ بحرِ اوقیانوس کے سرد اور طوفان خیز سفر کی وجہ سے انہیں انفلوانزا ہوگیا اور وہ مہینوں اس کے اثرات کو دور نہ کرسکے۔ زندگی کی عجلت پسندی اور اس کا شور وشغب ان کی روح کے لئے مسلسل کوفت کا باعث رہا۔ انہوں نے اقرار کیا کہ "یہ صرف قوت ارادی ہی کا نتیجہ ہے جس نے مجھے اب تک متحرک رکھا ہے۔"[1]

فروری کے آخر میں وہ جنوب کی جانب گئے تاکہ ٹسکیگی۔ واشنگٹن کے عظیم الشان ادارہ کو دیکھیں جس کے دیکھنے کی انہیں مدت سے تمنا تھی۔ یہ ادارہ حبشیوں کی تعلیم کے لئے ٹسکیگی میں قائم ہے۔ وہاں انہوں نے دس پُرسکون دن بسر کئے، اسکول کی زندگی کے ہر شعبہ میں شرکت کی اور چھوٹوں اور بڑوں سب سے دوستانہ مراسم پیدا کئے۔ اخبار "ٹسکیگی میسنجر"[2] میں ان کے اس دورہ کا جو حال محفوظ کردیا گیا ہے اُسے درجِ ذیل کیا جاتا ہے:

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۵ فروری ۱۹۲۹

[2] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۱۶ فروری ۱۹۲۹

[3] مورخہ ۹ مارچ ۱۹۲۹

ٹیگور میں مشرق سے ایک پیغامبر آیا تھا۔ اس کی اسپرٹ سادگی، سکون، غور وفکر اور اطمینان کی اسپرٹ تھی۔ اس کا ایک پیغام تھا یعنی آج کی دنیا کے دو سب سے عظیم المرتبت مہا تماؤں، ٹیگور اور گاندھی کی سیدھی سادی اور تصنّع سے خالی کہانی۔ ان کی ہر بات میں ہندوستان کی تمناؤں کا، اس کے لیڈروں کی قربانی اور نفس کشی کا اور ان کے مطمعِ نظر کے اتحاد کا ذکر ہوتا تھا جس میں جملہ پست جماعتوں کی ترقی کا مقصد بھی شامل تھا۔ انہوں نے امریکہ میں ٹسکیگی اور ہندوستان میں شانتی نکیتن کے مابین دوستانہ روابط قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی جو اپنے سامنے آزادی کا ایکساں مقصد رکھتے ہیں۔

وہ کوئی راہب نہ تھا۔ وہ کسی دوسری دنیا کا رہنے والا بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ عجیب وغریب طریقہ سے عملی آدمی تھا۔ لیکن جتنی دیر تک وہ ہم میں رہا ہم اس کے چہرے سے اس کی اندرونی اسپرٹ کی مسرت سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ایک لڑکے نے تو یہاں تک کہ دیا کہ وہ تو ہم سے مسیح کی طرح باتیں کرتا تھا"

اپریل میں اینڈریوز وینکوور گئے تاکہ ٹیگور سے ملاقات کریں جب موخر الذکر سرزمینِ کناڈا میں اُتریں۔ وہاں وہ سکھوں کی چھوٹی سی جماعت سے ملے جس کے حقوقِ شہریت کی کشمکش کا مطالعہ وہ مدت سے کر رہے تھے لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸-۱۹۱۷ کی امپیریل کانفرنس میں ان کی طرف سے مداخلت کی تھی، لیکن اس وقت ان کی تعداد گھٹ کر تقریباً ۱۲ سو رہ گئی تھی۔ جب اینڈریوز پہنچے اس وقت ان کے بیوی بچوں کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دیدی گئی تھی اور تمام صورتِ حالات بہت زیادہ مسرت بخش ہو گئی تھی۔ سکھوں نے ان کا بہت ہی پُرجوش استقبال کیا، انہیں دعا کے لئے گوردوارہ لے گئے اور اس خوشی میں بڑے پیمانہ پر دعوت کا انتظام کیا۔ یہ ایک بے حقیقت

سی شے تھی کہ وہ خود سکھ نہیں ملتے — بہرحال وہ خدا رسیدہ بزرگ تو تھے اور انہی میں کے ایک شخص اینڈریوز نے ان کے لئے وہ تمام حقوق شہریت جو اب تک انہیں عطا نہیں کئے گئے تھے، حاصل کرنے کے لئے اپنی سی انتہائی کوشش کی۔ ایک عینی شاہد نے ان کے متعلق لکھا ہے "آپ نے مجھے تعجب میں ڈال دیا ہے کہ ایک شخص ایسی خاموشی کے ساتھ گھبراہٹ یا اضطراب کا اظہار کئے بغیر اس قدر زیادہ کام کرنے کے قابل ہو سکتا ہے" لیکن اس سلسلہ میں ان کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔

(۲)

جب ٹیگور سان فرانسسکو روانہ ہو گئے تو اینڈریوز اپنے طویل سفر کی پہلی منزل برطانوی گائنا کی طرف چلے گئے، پانچ دن اور پانچ رات کے سفر کے بعد وہ نووا اسکوشیا کے مقام ہیلی فیکس پہنچے تاکہ وہاں سے جارج ٹاؤن کے لئے جہاز میں سوار ہو جائیں۔ راستہ میں جہاز برموڈا اس، اینٹالوسیا اور پورٹ آف اسپین میں رکا اور اینڈریوز ہر جگہ ساحل پر اترتے اور ہندوستانی نوآبادکاروں کی تعداد اور بہبودی کے بارے میں اطلاعات حاصل کرتے۔ انہوں نے دیکھا جیسا کہ برطانوی گائنا میں دیکھ چکے تھے کہ ہندوستان سے ان کی علیحدگی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اخبارات میں ہندوستانی خبریں مطلق شایع نہ ہوتی تھیں اور اکثر اوقات خطوط کے آنے میں مہینوں لگ جاتے تھے۔

جارج ٹاؤن میں ایسٹ انڈین ایسوسی ایشن نے ان کا پرتپاک استقبال کیا۔ اس کے بعد پھر کئی ہفتے سفر میں گزرے۔ یہ سفر شدید بارش اور سیلاب زدہ دریاؤں میں کرنے پڑے۔ اینڈریوز کی ڈائری میں پہلے تین چار ہفتوں کا پورا ریکارڈ محفوظ ہے اور مقصد یہ تھا کہ اس مواد کو کتاب کے لکھنے میں کام میں لایا جائے۔ ان یادداشتوں سے بہترین طریقہ سے اندازہ ہو سکتا

ہے کہ نو آبادیوں کے بارے میں ان کی تحقیقات کا طریقہ اور انداز کیا تھا۔ وہ ہمیں اس قابل بناتی ہیں کہ ہم ان کے خیالات کے عمل کو دیکھیں اور اُس اعتبار سے وہ کسی قدر تفصیل سے قلمبند کی گئی ہیں اگرچہ وہ مختصر ہیں اور ان میں صیغۂ واحد غائب استعمال کیا گیا ہے۔

اینڈریوز ۱۸ مئی کو ہفتہ کے دن جارج ٹاؤن پہنچے۔ ۱۹ تاریخ کو اتوار کے دن ان کا پہلا کام یہ تھا کہ جارج ٹاؤن کے گرجا میں جاکر صبح کی نماز پڑھیں پھر وہ ڈیمی رارا کے مشرقی ساحل پر نیشکر کے اجڑے ہوئے کھیتوں میں گئے جہاں ابھی تک ہندوستانی پابندِ معاہدہ مزدوروں کے خستہ اور غیر صحت بخش کوارٹروں میں رہ رہے تھے۔ وہ صبح شام گرجا کی نماز کے اوقات میں ہندوستانی زبان میں تقریریں کرتے تھے جہاں ہندوستانی خبریں معلوم کرنے اور اپنی ہی زبان کی آواز سننے کے بھوکے ہندو بہت بڑی تعداد میں آتے تھے کناڈا کے پادری کے ساتھ سہ پہر کے وقت اور ہندوستانی جماعت کے لیڈروں کے ساتھ شام کو لمبی گفتگو کرکے انہوں نے ان خیالات کی صداقت کا امتحان کیا جو وہ پہلے سے قائم کرچکے تھے۔ اُن سے کہا گیا تھا کہ وہاں نسلی تعصب یا تو بہت کم ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ہندوستان سے اس اُکھڑی ہوئی جماعت کی انتہائی علیحدگی کی وجہ سے اور مادری زبان کے فقدان کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والے مذہبی اثرات کے کمزور پڑجانے کے سبب شراب نوشی اور جوئے جیسی معاشرتی خرابیاں ان میں انتہائی خطرناک حد تک بڑھ چکی تھیں۔

پیر کا سارا دن ہندوستانی ملنے والوں کے ساتھ ملاقات میں گزرا۔ اس کے بعد دو گھنٹے تک ایسٹ انڈین ایسوسی ایشن کی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی جہاں اس پر بحث ہوئی کہ ہندوستان کے ساتھ رسل ورسائل میں ترقی ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد ٹاؤن ہال میں انہیں خوش آمدید کہنے

کے لئے ایک زبردست اجتماع ہوا۔ وہاں اینڈریوز نے کہا، کہ میں یہاں سب جماعتوں سے ملنا اور سب کی بہبودی کے امور کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔میں یہاں اس لئے نہیں آیا ہوں کہ صرف ایک جماعت کے لئے مراعات طلب کروں۔"

چونکہ اینڈریوز کو ٹیکے لگوانے ضروری تھے اسلئے انہوں نے دوسرا دن بشپ کے مکان میں جہاں وہ مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے "آرام" کرنے میں صرف کیا — یعنی اپنے موضوع کا مطالعہ کرنے اور اپنی یادداشتیں تیار کرنے میں بدھ کے دن انہوں نے انگریزامیگریشن آفیسر سے اپنی سہ روزہ تحقیقات کے عارضی نتائج کے متعلق بحث کی: انہوں نے ایک اہم معاشرتی اصلاح کی ضرورت یعنی ہندوستانی شادیوں کی رجسٹری پرزور دیا اور کہاکہ ہندوستان واپس جانے کے لئے فری ٹکٹ کی جو دلکش تجویزپیش کی گئی ہے اسے ختم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ باشندوں کومناسب اراضی عطاکی جائے جس سے ہندوستانیوں کو اور کم آبادنوآبادی کو بہت فائدہ پہنچیگا۔

آئندہ تین دنوں میں اینڈریوز نے حبشی قوم کے افراد کے ساتھ متعدد ملاقاتیں کیں اور یہ معلوم کرنا چاہاکہ شراب نوشی اور جوئے کی لعنتوں کے انسداد جیسے مشترکہ مقاصد میں ہندوستانیوں اور حبشیوں کے مابین کہاں تک منظم اشتراکِ عمل ہوسکتا ہے ہندوستانیوں اور حبشیوں کے مشترکہ جلسوں میں انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی باشندوں کی جوشادیاں عمل میں آچکی ہیں انہیں فی الفور قانونی طورپرتسلیم کرلیا جائے اور آئندہ کے لئے ان کی شادیوں کی رجسٹری کا ایک سیدھا سادہ طریقہ رائج کردیا جائے۔

دوسری اتوار (۲۶ مئی) کو اینڈریوز ویسٹ کوسٹ کے موعودہ

دورے پر گئے۔ وہ ایک ہندوستانی زمیندار کے مہمان تھے، اور نوآبادی خوشحال اور صحت بخش تھی، لیکن انہوں نے تاڑ لیا کہ اسامی پابندی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں اس کا شبہ تھا اور مابعد کی تحقیقات نے ان کے شبہات کی تصدیق کردی کہ لگان بہت زیادہ ہے، نیز چاول کا چھلکا اتارنے اور اسے فروخت کرنے پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ چاول کی نئی صنعت کا مطالعہ کرینگے اور انہوں نے ذہن میں سوچ لیا تھا کہ ان تمام مشکلات کا حل کوآپریٹو اصول پر روپیہ قرض دینا ہے۔

بعد کے چند دنوں تک جارج ٹاؤن کے بیکار اشخاص نے انہیں گھیرے رکھا جو بیماری کا بہانہ کرکے واپس ہندوستان جانے کے متمنی تھے۔ قریب ہی کھیتوں میں کام مل سکتا تھا لیکن وہ کام کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے مٹیابرج کے مصائب کے بارے میں ان سے کھلے دل سے بات چیت کی۔ ان کا پھر یہی خیال ہوا۔ کہ عطائے ارضی ہی واحد حل ہے۔ اگر لوگوں کو اپنا نام درج رجسٹر کرانے کی دعوت دیجائے تو نفسیاتی نقطۂ نظر سے یہ تجویز صحیح ہوگی۔

پہلی جون کو ہفتہ کے دن اینڈریوز نے مدارس کے اساتذہ کے ایک بڑے جلسہ میں تقریر کی اور اس وقت ایک نئی صورتِ حالات رونما ہوگئی، یعنی ان اساتذہ میں ایک بھی ایسٹ انڈین نہیں تھا۔ اینڈریوز کو کامل یقین تھا کہ "تعلیم کے بغیر قومی زندگی کی بنیادیں ایسی ہیں گویا کہ وہ ریت پر تعمیر کی گئی ہیں" لیکن انہوں نے دیکھا کہ ہندوستانیوں میں تعلیم کا بہت ہی کم چرچا ہے اور یہ بھی دیکھا کہ ہندوستانیوں کے لئے ملازمت کے مواقع بھی بہت کم ہیں خواہ وہ اسکولوں میں جو تقریباً سب کے سب عیسائیوں کے مذہبی ادارے تھے، درس و تدریس کا مشغلہ ہی

کیوں نہ اختیار کرلیں۔

دوسرے دن (اتوار) ان کا سارا وقت نیشکر کے کھیتوں میں گزرا۔ اینڈریوز کی نظر میں، وہاں کی حالت نیٹال سے بھی بدتر تھی، اور انہوں نے محسوس کیا کہ اس صنعت کے لئے روپیہ کی اور سائنٹفک منصوبہ کی سخت ضرورت ہے۔

پیر (۳ر جون) کو بادشاہ کی سالگرہ تھی۔ اینڈریوز نے بھی پریڈ دیکھی۔ ساری پولیس فورس میں کوئی بھی ہندوستانی نہ تھا، حالانکہ ہندوستانی پولیس جو اپنے بھائی بندوں کی افتادِ طبیعت کو سمجھتی تھی، یقیناً زیادہ مفید ہوسکتی تھی۔ اس دن سہ پہر کو وہ کولونیل سیکریٹری سے ملے اور اُسے چاول کی صنعت کے بارے میں اپنے نتائج سے آگاہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر کوآپریٹو بنیاد پر پیداوار کو منظم کیا جائے اور ٹرینیڈیڈ جیسی قریب جگہ میں اس کی منڈی ہو تو ترقی کے زبردست امکانات ہوسکتے ہیں۔

اسی شام کو حبشیوں کے ایک جلسۂ عام میں انہوں نے قومی بیداری کی ایک ایسی جھلک دیکھی جو بنتو قوم کی بیداری سے کہیں زیادہ طاقتور تھی۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا: کیا انہیں ہندوستانیوں کے مقابلہ کا اندیشہ ہے؟ دوسرے دن انہوں نے ایک اخبار نویس سے جو حبشیوں سے قریبی تعلقات رکھتا تھا، اس مسئلہ پر بحث کی۔ اس نے کہا: فطرتاً ویسٹ انڈین حبشی اولین رہتا ہے، کاشتکار نہیں ہے (جیسا کہ اینڈریوز کے خیال میں ملایا میں حبشی کاشتکار تھے) اور اس طریقے سے اس کے اور ہندوستانی کے اقتصادی مفاد عام طور پر مشترک ہیں نہ کہ مخالفانہ، لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتا کہ وسیع پیمانہ پر ہندوستانیوں کو امداد دیکر ملک میں لایا جائے یا انہیں پیشۂ معلمی میں داخل جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ اگر ایسٹ انڈین باشندوں کی نوآبادی کی کوئی اسکیم عمل میں لائی جائے تو اسی قسم کی پیشکش حبشی زراعت پیشہ اشخاص کے لئے بھی کرنی چاہیئے۔

دوسرے دن (۵ جون) اینڈریوز نے تعلیمی مسئلہ پر اپنی توجہ مرکوز

رکھی، رپورٹوں کا مطالعہ کیا اور اساتذہ سے بات چیت کی۔ اسکول کی تعلیم کا سارا انتظام جو آکسفورڈ اور کیمبرج کے امتحانات پر مبنی تھا، کلیۃً ویسٹ انڈین بچوں کی زندگی کے ہم رنگ نہ تھا۔ کیا مقصد ویسٹ انڈین یونیورسٹی کا طریقۂ تعلیم ہونا چاہیئے جس میں باربیڈوس اور ٹری نیڈیڈ کو بھی شامل کر لیا جائے؟ — یا ایک عارضی تعلیمی نظام جو صرف برطانوی گائنا کی ضروریات کے لئے وضع کیا گیا ہو؟ انہوں نے یہ منصوبہ تیار کرنا شروع کیا کہ آیا حبشیوں اور ہندوستانیوں کا ایک ملاجلا اسکول زیادہ مسرت بخش طریقہ سے منظم کیا جا سکتا ہے، اس طرح سے کہ اس کی تعلیم تو برطانوی گائنا پر مرکوز رہے لیکن اس کا پھیلاؤ افریقہ اور ہندوستان پر بھی ہو۔

اس کے بعد وہ ایک ہفتہ تک سفر کرتے رہے اور جہاں جہاں گئے انہوں نے اسکولوں کا معائنہ کیا اور شادی کے مسئلہ، شراب نوشی اور تعلیم پر ہر جگہ ہندوستانی آرا کو معلوم کیا۔ انہوں نے ایسی املاک کا بھی معائنہ کیا جن کا نظم و نسق بہت اعلیٰ تھا، جہاں ہندوستانی خاندانوں کے رہنے کے لئے جداگانہ کوارٹر بھی تھے، جہاں شرائطِ ملازمت بہت اچھی تھیں، جہاں چاول کی کاشت کے لئے بہت کافی زمین بھی مہیا تھی اور جہاں انہیں گائے رکھنے کی بھی آسانیاں حاصل تھیں۔ انہوں نے دوسری املاک کو بھی دیکھا جس کا انتظام ایسی کمپنی کے ہاتھ میں تھا جو وہاں موجود نہ تھی اور جسے مقامی حالات سے کوئی واقفیت نہ تھی، لیکن جس کی سیلی زمین اگرچہ نیشکر کے لئے اچھی نہ تھی، مگر چاول کی کاشت کے لئے موزوں ہو سکتی تھی۔

ایک شام وہ بیٹھکر سورج ڈوبنے کا منظر دیکھتے رہے۔ وہ کس قدر حسین ملک تھا! اسکولوں میں ضرورت سے زیادہ لڑکے کیوں ٹھونسے جائیں اور انہیں مکروہ اور بدنما حالت میں کیوں رکھا جائے؟ بہترین املاک پر بھی چھوٹے چھوٹے اور تنگ قسم کے مکانات قطار در قطار کیوں بنائے جائیں؟

کیوں نہ ہندوستان کی طرح دریا کے گھاٹوں پر خوبصورت سایہ دار درخت ہوں؟۔۔۔کیوں نہ جاوا یا فلپائن کی طرح مدارس کی عمارات سادہ اور دلکش ہوں جو اس آب وہوا کے عین مطابق ہوں؟ کیوں نہ ہندوستانی اپنی پسند کے مطابق مکانات تعمیر کریں بشرطیکہ حفظانِ صحت کی ضروریات کا بھی پورا لحاظ ہو؟ زمین کافی تھی اور مکانات کے لئے دیجا سکتی تھی۔ اگر پٹہ داری اور بانی، زمین اور گائے کا انتظام کردیا جائے تو پھر حکومت کے کانوں تک کوئی شکایت نہیں پہنچیگی۔ افسوس یہ ہے کہ اس اثنا میں شراب کی دکانیں بھی ترقی پر تھیں اور شام کے جلسوں میں اکثر اوقات شرابیوں کے جھگڑوں کی وجہ سے نقضِ امن ہوتا رہتا تھا۔

اینڈریوز ۱۴ جون کو جارج ٹاؤن میں واپس آگئے اور آتے ہی انہوں نے نوآبادی کے سارے ہندو پنڈتوں کا ایک جلسہ منعقد کیا اور ان کے روبرو صغیرسنی کی شادی کا مسئلہ پیش کردیا۔ پنڈت کوئی سو کے قریب تھے اور ان میں دو ایسے تھے جنہیں قائل کرنا بہت مشکل تھا، لیکن آخرکار متفقہ طور پر یہ طے پاگیا کہ شادی کی عمر بڑھاکر چودہ سال کردی جائے۔ جلسہ چار گھنٹے تک رہا اور اس نے سب کو تھکا دیا۔" لیکن اس کا انعقاد بہرحال مفید ثابت ہوا، اس لئے کہ اس سے پیشتر یہ پنڈت کسی متفقہ فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ اینڈریوز نے صاف صاف ان سے کہدیا کہ وہ اس فیصلہ کو تو صرف ابتدائی کارروائی سمجھتے ہیں، لیکن وہ جانتے تھے کہ نہ تو پنڈت اور نہ ہندو جماعت کے دوسرے افراد اس وقت اس سے آگے جانے کے لئے تیار تھے۔

(۳)

جس طرح سے اینڈریوز جنوبی افریقہ میں ۱۹۲۷ کی کامیابیوں کو مستحکم کرنے کی غرض سے ٹھہر گئے تھے، اسی طرح وہ برطانوی گائنا میں بھی ٹھہرے

رہے تاکہ جدید آبادکاری کی اسکیموں کا مطالعہ کریں۔ کوآپریٹو اصول پر چاول کی کاشت کی صنعت کی تجاویز کو عملی شکل دیں، اور کناڈا کی چاول کی منڈی پر بحث کریں ــــ اس کے علاوہ وہ جہاں جہاں جاتے وہاں کے مدارس کا معائنہ کرتے۔ اس لئے کہ "تعلیم خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم نو آبادی کی بہبودی کے لئے مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔" انہوں نے پلانٹرز ایسوسی ایشن کے ممبروں سے ملاقات کی: ان کے دلی شبہات کا ازالہ کیا کہ چاول کی کاشت شکرسازی کی صنعت کی "حریف" بنجائے گی اور ملیریا پیدا کرنے کا باعث ہوگی اور انہیں بتایا کہ یہی ایک یقینی طریقہ ہے جس کے ذریعہ شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بہاؤ کو روکا جا سکتا ہے اور کاشتکاری کی زندگی کو مسرت بخش اور آسودہ حال بنایا جاسکتا ہے۔ ایسٹ انڈین لیڈروں سے مل کر انہوں نے شکستہ خودداری کی تعمیر اور ویسٹ انڈیز کے نسلی عناصر کو ایک نئی قوم کی تدریجی تشکیل جیسے مسائل پر بحث کی جس میں ہندوستانی باشندے فخریہ حصہ لے سکیں۔ ایک مرتبہ اور ڈائری کے الفاظ پڑھئے:

"ایک یا زیادہ ایسٹ انڈین چھٹیاں منانی چاہئیں اور انہیں تسلیم کرنا چاہیئے۔ مگر اس دن شراب کی دوکانیں ہرگز ہرگز نہ کھلنی چاہئیں۔...... کیوں نہ ایسٹ انڈینز کی پہلی آمد کو جو کلکتہ سے "لارڈ ہنگرفورڈ" نامی جہاز کے ذریعہ فروری ۱۸۴۵ میں عمل میں آئی تھی، قومی تہوار کے طور پر منایا جائے؟ تہوار کے لئے فروری کا مہینہ موزوں بھی ہے اور ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے ہولی کے موقع پر شراب نوشی کی رسم جو کوئی مذہبی مفہوم نہیں رکھتی، سرے سے ختم ہو جائے! اگست میں تعزیوں کے جلوسوں کو بھی ناقابلِ اعتراض بنایا جا سکتا ہے اس طرح سے کہ شراب کی دوکانیں اس دن بھی بند رکھی جائیں اور پھر ایسے تہوار اتحاد اور برادرانہ محبت کے علمبردار بن جائیں گے۔"

اسطرح آہستہ آہستہ انکے نتائج نے تعمیری شکل اختیار کی اور وہ آزمائش پر بھی پورے اترے۔
اینڈریوز برطانوی گائنا سے یہ خیال لیکر روانہ ہوئے کہ "ان کی آمد کی وجہ سے نوآبادی کے افریقی باشندوں میں ہندوستان کے متعلق زیادہ حقیقی ادراک پیدا ہوگیا ہے۔"[1] جارج ٹاؤن کے گرجا میں ان کا الوداعی وعظ بچوں کے متعلق تھا: "میں آقا کے نام سے جو چھوٹے بچوں سے محبت کرتے تھے، آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ نوعمر شیرخوار بچوں کی صحت کو عزیز رکھیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص طور سے توجہ کریں اور ان کی خاطر ازدواجی تعلقات کو صحیح سالم حالت میں رکھیں۔ اگر آپ میرے اس ایک پیغام کو قبول کرلینگے تو آپ دیکھینگے کہ اس ملک کی مشکلات کم ہوجائینگی اور اس کی خوشحالی بڑھ جائے گی۔"
اینڈریوز اکتوبر میں کناڈا واپس لوٹے اور یہاں آتے ہی انہوں نے کناڈا کے مشن کو آمادہ کرنے کی کوشش شروع کردی تاکہ وہ اپنے مدارس میں غیرعیسائی مذہبی جماعتوں کے مطالبات کو بھی تسلیم کرلے۔ ساتھ ہی انہوں نے کناڈا کی حکومت پر بھی زور دیا کہ وہ ایسی جہازی سروس کے امکانات پر غور کرے جو ٹرینیڈیڈ اور برطانوی گائنا کے راستہ سے براہ راست کیپ ٹاؤن اور ہندوستان جایا کرے۔ ایچ۔ این۔ بریلزفورڈ جن سے ان کی ملاقات اس کے بعد ہی نیویارک میں ہوئی، اینڈریوز کی قوتِ ارتکاز اور انہماکِ کار سے بیحد متاثر تھے۔ وہ رقمطراز ہیں: "انہوں نے برطانوی گائنا میں اس طرح زندگی بسر کی کہ میں یہ دیکھکر حیران تھا کہ وہ گاڑیوں کی زبردست آمد و رفت میں مرنے سے کیسے بچ جاتے تھے۔ یقیناً کوئی خاص خدا اُن کا نگہبان رہا ہوگا۔"

---

[1] ہندوستان میں دوستوں کے نام گشتی چھٹی، ۱۳ر جون ۱۹۲۹

"۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ کو از دواجی اصلاحات نے جن کی ابتدا وہ کر چکے تھے، قانونی شکل اختیار کر لی؛ آرڈیننس ۴۲ برائے ۱۹۲۹ کے ذریعہ ایمی گریشن آرڈیننس میں ترمیم کر دی گئی اور" اس اقل عمر کا تعین بھی کر دیا گیا جس کے بعد ترکِ وطن کرنے والی لڑکیوں کی شادی کی جا سکتی تھی اور ایسی شادیوں کی رجسٹری کو بھی لازمی قرار دیدیا گیا جنہیں تارکانِ وطن اپنے مذہبی اور پرسنل قانون کے مطابق کریں۔"

دو سال کے بعد سرایڈ ورڈ ڈینہم نے جو سر گارڈن لِجس برگ کے بعد گورنر مقرر ہوئے تھے، اینڈریوز کو ایک خط لکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اینڈریوز جس عام پالیسی کی وکالت کر رہے تھے، وہ کس قدر دانشمندانہ تھی۔ خط کے جستہ جستہ حصے یہ ہیں:

"... ایسٹ اِنڈینز نے بتا دیا ہے کہ واقعی وہ قابلِ تعریف کام کرنے والے لوگ ہیں۔ امپیریل گورنمنٹ کی طرف سے پلانٹرز کو جو قرضہ دیا گیا ہے اس غرض سے کہ وہ اسے مکانات کی تعمیر میں اور بہبودی کے دوسرے کاموں میں صرف کریں، وہ ان کے اور مزدوروں دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔.... چاول کی صنعت کو پہلے سے بہت زیادہ قابلِ اطمینان بنیاد پر قائم کر دیا گیا ہے اور اب ڈیمی رارا کے چاولوں کی اچھائی کے بارے میں کسی قسم کا شک باقی نہیں رہا۔ ہم جمیکا اور سان ڈومنگو میں اور ویسٹ اِنڈیز کے بہت سے مقامات میں منڈیاں قائم کر رہے ہیں اور ساتھ ہی دھان اور چاول کناڈا برآمد کر رہے ہیں۔.... میں انگلستان سے ایک ایسے افسر کے حصول کی کوشش کر رہا ہوں جسے کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیوں کا کافی تجربہ ہو۔ پلانٹرز کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اراضیات اپنے اسامیوں کو

کرایہ پر دیں اور وہ حفظانِ صحت اور صحت کے دوسرے مسائل میں بھی پہلے سے زیادہ دلچسپی لیں۔ بعض مرکزوں میں بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کمیٹیاں بھی قائم کی جا رہی ہیں۔

.....میں نے ایک ایسٹ انڈین کو اپنی ایگزیکیوٹو کونسل میں لے لیا ہے — اور یہ پہلا موقع ہے کہ اِس کونسل میں کوئی ایسٹ انڈین بیٹھا ہو۔ میں ان کی تعلیم کے بارے میں بھی ان کی امداد کررہا ہوں، لیکن ان میں تعلیم کا بہت کم جوش پایا جاتا ہے۔

آپ نے مجھ سے شراب کی مقدار کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ .....مقدار کو دیکھکر مجھے واقعی بے حد تعجب ہوا ہے۔ شراب کے صرف میں بہت زیادہ کمی ہو جانے سے ہمارے محاصل میں زبردست کمی ہو گئی ہے اور بلاشبہ کسٹمز کی آمدنی میں بھی انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ آج ہلکی شرابوں کی مانگ زیادہ ہے۔

آپ سے ملکر مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ آپ میرے لئے نہایت مددگار ثابت ہوئے۔ اسی طرح آپ کی یادداشتیں بھی میرے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔" [۱]

مگر ایک کام میں بظاہر انہیں ناکامی ہوئی۔ ہندوستانی جماعت نے تعلیم کی ضرورت کے سلسلہ میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے ویسٹ انڈین یونیورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا، اس کے دوسرے علمبردار پیدا ہو گئے اور حال کے سالوں نے دیکھ لیا کہ وہ خواب بالآخر پورا ہو کر رہا۔

(۴)

---

[۱] مکتوب بنام سی۔ایف۔اے، ۹ جون ۱۹۳۱

اینڈریوز نے ۳۰-۱۹۲۹ کا موسم سرما کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں بسر کیا۔ انہوں نے بڑی شدت سے "گوپ لینڈ بل" کی مخالفت کی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ریاستہائے متحدہ میں ان کی آریائی نسل کی بنا پر یوروپین باشندوں کے ساتھ مساوی حیثیت سے داخل ہونے دیا جائے۔ انہوں نے جے۔ بی۔ پیٹٹ کے نام ایک خط میں تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ "میں اس کے خلاف ہوں۔ اس سے اصولاً نسلی امتیاز کی بو آتی ہے اور جنوبی ہندوستان کے غیر آریائی باشندوں کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچیگا۔ میں اس کی بجائے کوٹا سسٹم کے لئے کوشش کر رہا ہوں جس میں نسلی امتیازات کو کچھ دخل نہ ہوگا"

ان امور پر محکمۂ خارجہ کے سینیٹر پورٹر سے طویل بحثیں رہیں جن کے خیالات اور اینڈریوز کے خیالات میں بڑی حد تک ہم آہنگی موجود تھی اس لئے کہ ۱۹۲۴ میں وہ جنیوا کی افیون کانفرنس میں ریاستہائے متحدہ کے وفد کے لیڈر تھے۔ اینڈریوز کی دلیل یہ تھی کہ اگرچہ کوٹا سسٹم کی وجہ سے ہندوستان کو تھوڑی تعداد کے داخلہ کی اجازت ملے گی لیکن یہ "زیادہ دیانتدارانہ اور زیادہ عملی چیز ہوگی" بہ مقابلہ ایشیاٹک ایکسکلوشن ایکٹ ۱۹۲۴ء کے جسے بہ عجلتِ تمام پاس کیا گیا تھا اور جو نفرت انگیز بھی ہے، اور پھر اس کی منسوخی بھی ممکن الوقوع ہو سکے گی۔ اینڈریوز نے مغرب کی بیداری اور اس کے شعور کے سامنے ایشیائی ممالک کی عزت اور اہمیت کو پیش کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انہوں نے "نیو ریپبلک" میں ہربرٹ ہوور کے آرمسٹس ڈے کی تقریر (نومبر ۱۹۲۹) پر یوں طنزیہ تبصرہ کیا:

"ریاستہائے متحدہ کی کتابِ قوانین میں ۱۹۲۴ کا ایشیاٹک پروہیبیشن لا جو نسلی اعتبار سے ہتک آمیز ہے، ابھی تک موجود ہے

رنگ کی بنیاد پر پابندیاں عائد کرنے والا قانون ابھی تک جنوبی افریقہ میں کارفرما ہے، کینیا کی پالیسی یورپین نسل کے حق میں نسلی امتیازات کا ابھی تک اظہار کر رہی ہے۔ تاہم ہم اس سکون بخش فقرے کو کہ "مغربی محاذ پر کامل خاموشی ہے" سنتے سنتے تھک گئے ہیں اور خود کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر بحری مساوات کے "ینگ پلان" نے کامیابی کے ساتھ عملی شکل اختیار کر لی تو اس وقت "دنیا کے امن" کا حل ممکن الوقوع ہو جائے گا"

اس زمانہ میں وہ مسلسل سفر کرتے رہتے۔ جہاں جاتے وہاں تقریریں کرتے اور مختلف جرائد میں مضامین لکھتے۔ ان کی زندگی بہت ہی مہیب رفتار سے جا رہی تھی اور ان کا جسم اس "روز روز کی روحانی اذیت"[1] کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہا تھا۔ لیکن جو چیز ان کے لئے سہارا بنی ہوئی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ہندوستانی زندگی کی صحیح طریقہ سے ترجمانی کریں اور "مدر انڈیا" جیسی کتابوں کے ذریعہ اس کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، اس کی اصلاح کر دیں۔ خالی اوقات میں وہ گاندھی[2] پر اپنی کتاب لکھتے رہے جو اسی سال ختم ہوئی اور شایع بھی ہو گئی۔ وہ اپنی تقریروں میں قومی زندگی کے احیا کی کہانیاں سناتے جو گاندھی کے ذریعہ یا ان کی رہنمائی میں عمل میں آرہی تھی۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے ٹیگور کو بھی ثانوی جگہ دی۔ اگرچہ وہ کافی اہم تھی ہندوستان کے امریکی دوست جے۔ ٹی۔ سنڈرلینڈ نے ان کے بارے میں لکھا تھا:۔

"انہوں نے امریکہ کے روبرو اس امر کی صحیح تصویر پیش کرنے میں کہ ہندوستان کا عظیم المرتبت مقدس شخص اور پبلک لیڈر کیا ہے اور کیا نہیں

---

[1] مکتوب بنام رابندرا ناتھ ٹیگور، ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء۔

[2] "خیالاتِ مہاتما گاندھی"

ہے اور وہ ہندوستانی باشندوں کے لئے کیا کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے
یا نہیں کر رہا ہے۔ ایسا کام کیا ہے جو اس سے پیشتر کبھی نہیں کیا گیا ہے[1]

اینڈریوز کی اپنی شخصیت نے تمام اوضاع و اطوار کے اشخاص پر اپنا مستقل اثر چھوڑا۔ اسٹار کامن ویلتھ میں تقریر کرنے کے بعد اسکولوں کے بہت سے لڑکوں نے انہیں خطوط لکھے جن میں انہیں "چچا چارلی" سے خطاب کیا گیا تھا اور "بغیر تلوار اور بندوق کے طریقۂ جنگ" پر طفلانہ بحث کی گئی تھی۔ فلیڈلفیا کے کوئیکر اسکول کے ایک لڑکے کے کمرے میں محض اینڈریوز کی موجودگی کا یہ ناقابلِ فراموش اثر پڑا کہ اسے ایسا معلوم ہوا کہ ساری فضا ہی بدل گئی ہے۔ نیویارک کے ایک وکیل نے ان سے مختصر سی ملاقات کے بعد ان کے بارے میں یہ خط لکھا: "میں آپ سے نہیں کہہ سکتا کہ چند دن پیشتر جو مختصر سی ملاقات آپ سے ہوئی تھی، اس سے مجھے کس قدر مسرت حاصل ہوئی۔ آپ کی آمد میرے لئے اپنے ساتھ روحانی فیضان بھی لائی۔" ایک اور شخص نے لکھا: "میں تین دعوتوں میں شامل رہا ہوں جہاں اینڈریوز محترم مہمان کی حیثیت سے مدعو تھے۔ دو موقعوں پر انہوں نے والیؔ کوم کی ستیاگرہ کا حال سنایا اور میں نے برسوں میں ایسا جلسہ نہیں دیکھا جہاں حاضرین کسی مقرر کی تقریر سے اس درجہ متاثر ہوئے ہوں۔" ایک قانون داں نے جو وہاں موجود تھا، کہا: "لوگوں کا میرے متعلق یہ خیال ہے کہ میں فلسفۂ کلبیہ کا پیرو ہوں لیکن جب مسٹر اینڈریوز تقریر کر رہے تھے، اس وقت میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔"

مگر ریاستہائے متحدہ میں ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے مہاتما گاندھی کے نام "کھلی چٹھیاں" لکھکر پبلک طور پر ان کے کام پر حملے کئے تھے۔ وہ مس میو کے خلوصِ نیت کے بارے میں اینڈریوز کے اعلان سے

---

[1] "ماڈرن ریویو" جون ۱۹۳۰ء

سخت برہم تھے اور اس لئے بھی کہ انہوں نے "سیاسی بدنیتی" کا جو الزام اس کے خلاف پہلے عائد کیا تھا، اسے واپس لے لیا تھا۔ انہوں نے اس پر بھی اعتراض کیا کہ انہوں نے وائیکوم کے واقعہ کو ڈراماتی انداز میں پیش کیا ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ اس کی وجہ سے اصل تصویر مسخ ہو گئی ہے اور یہ کہ امریکہ والوں پر اس کا یہ اثر پڑیگا۔ کہ ملک میں اب بھی مظالم ہو رہے ہیں اور وہ ان وسیع اور خاموش اصلاحات کا خیال نہ کرینگے جو بتدریج عمل میں لائی جارہی ہیں۔ وہ اس بات سے بھی ناراض تھے کہ وہ کھلم کھلا ہندوستانی اتحاد میں رخنوں کا ذکر کرتے ہیں مثلاً یہ کہ ٹریڈ یونین کانگریس کمیونسٹوں کے تصورات کی طرف جھک رہی ہے اور آغا خان کے اس دعوے کو بحث میں لاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان بجائے خود ایک "قوم" ہیں۔ مگر ان کے غصہ کی اصل وجہ یہ تھی کہ اینڈریوز کوپ لینڈ بل کے مخالف تھے جس کی رُو سے ہندوستانیوں کو "آریا" ہونے کی حیثیت سے بعض خصوصی حقوق دینے کی تجویز کی گئی تھی۔ ہندوستانیوں کے اِس طبقہ نے مسودۂ قانون کی حمایت کی تھی اور ان کے غیر نسلی اصولوں کو "خیالی خرافات" سے تعبیر کرتے ہوئے غیر منطقیانہ طور پر کہا تھا کہ اُن کے دلائل وہ ہیں جو واشنگٹن کے برطانوی سفارتخانے سے انہیں حاصل ہوتے تھے۔"

اس بات سے انہیں بہت صدمہ ہوا کہ انہیں "برطانوی جاسوس" کہا گیا تھا۔ اس سے پیشتر بھی وہ سخت الفاظ برداشت کر چکے تھے اور اب بھی وہ .....انہیں خاموشی سے برداشت کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا دل سخت مجروح ہوا۔ ایک ہندوستانی دوست مسٹر ہری گودل اسوقت ان کے ساتھ تھے جبکہ یہ طعن آمیز جملے ان تک پہنچے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اینڈریوز غصہ سے کانپ رہے تھے اور ان سے مخاطب ہو کر کہ رہے تھے اگر اتنے برسوں تک کام کرنے کے بعد بھی میرے متعلق اس قسم کے خیالات

ظاہر کئے جاتے ہیں تو پھر میں اس قابل نہیں کہ ہندوستان میں قیام کروں
کیا مجھے چین چلا جانا چاہیئے؟ وہاں سے میرے پاس متعدد اور پیہم
بلاوے آرہے ہیں۔" دوست نے جواب دیا: "اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ
اپنے ضمیر کے ساتھ بہت تشدّد کریں گے۔" اینڈریوز نے اپنے دوست کا ہاتھ
دبایا اور کہا: "میرے ساتھ آؤ۔ ہم ان کے دفتر میں چلینگے۔" انہوں نے نہایت
منکسرالمزاجی سے اپنے نقّاد سے دو بدو گفتگو کی اور اسے بتایا کہ خدمت
کرنے کے سلسلہ میں ان کا مطمحِ نظر کیا ہے۔ انہوں نے حقیقی دوستانہ
گرم جوشی کے ساتھ جس کی دلربائی اثر کئے بغیر نہ رہی، اس سے اپیل
کرتے ہوئے کہا: "آپ نے اور میں نے اپنی زندگیوں کو اس ملک کی
خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے ۔۔۔ اس لئے کہ آپ کا ملک اور میرا ملک ایک
ہی ہے۔ ہمیں ہندوستان کی آزادی کے لئے ایسے طریقوں کی تائید
نہیں کرنی چاہیئے جو ہم لوگوں کی فطرت کے خلاف ہوں۔ ہمارے دلوں
میں اہمسا اور سچائی ہونی چاہیئے۔"

اگرچہ اس نکتہ چینی کا بڑا حصہ جارحانہ اور غیر منصفانہ تھا تاہم اینڈریوز
کے بعض گہرے دوستوں اور پُرجوش مدّاحوں نے بعض الزامات کی جزوی
صحت کو تسلیم کیا ہے۔ ان کے مزاج کی افتاد ایسی تھی جو انہیں اس طرف
مائل کرتی تھی کہ جب کبھی وہ اپنے مطمحِ نظر کو کسی انسانی ہیرو میں علامتی
مواقع پر مجسم طور پر دیکھتے تو وہ ان کی پرستش کرنے لگتے تھے۔ یہ خدشہ
کہ واقعہٴ وائیکوم کو انہوں نے ڈرامائی اور علامتی رنگ دیدیا تھا اور
اس وجہ سے بعض حلقوں میں ان کے مقصودِ ذہنی سے الگ اخذ کیا جائے گا
بالکل حق بجانب نہیں ٹھہرتا۔ ایک ریویو نگار دوست کا خیال تھا کہ "دی
ٹرو انڈیا" (حقیقی ہندوستان) میں جس ہندوستان کی عکاسی کی گئی ہے
وہ ضرورت سے زیادہ فاصلہ سے کی گئی ہے اور یہ کہ اس میں مس میو کو

"پاجی" اور دہاتما گاندھی کو "ہیرو" اس کثرت سے کہا گیا ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی ملک کے منظر کو چھپا لیتے ہیں۔ مزید برآں جہاں ہندوستانی مسائل کے بارے میں اینڈریوز کے بہت سے الہامی بیانات مرورِ زمانہ سے کافی حد تک حق بجانب ٹھہر چکے ہیں وہاں بعض اوقات ان کے جذبہ کی شدت ہی ان کی رائے میں کجی پیدا کر دیتی تھی اور وہ محسوس کر سکتے تھے کہ انہیں کب اور کہاں ایسا زوردار طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جب وہ جذبات سے گہرے طریقہ سے متاثر ہو جاتے تھے تو پھر ان کے لئے ضبط کرنا دشوار ہو جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ میں "نسلی گرجا گھروں" کے بارے میں انہوں نے اپنے کرب و بلا کا اظہار ہندوستان میں ہندو مجمع کے سامنے زیادہ شدت سے کیا بمقابلہ عیسائیوں کے جو ابتداءً اس کے ذمہ دار تھے۔ اور یہ محسوس نہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ ۲۱-۱۹۱۹ میں انہوں نے ہندوستانی نقطۂ نظر کی جو حمایت کی وہ شاید زیادہ موثر ہوتی اگر اس کا بیشتر حصہ برطانوی اخبارات اور رسائل نیز ہندوستانی اخبارات اور رسائل کے ذریعہ پبلک کے سامنے آ جاتا (جیسا کہ بعد کو ہوا)۔ اسی طرح امریکہ میں ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی بہبودی اور برطانیہ کے ساتھ ہندوستانی تعلقات کے بارے میں ان کے خدشات اور توقعات کا اظہار بعض اوقات اس کا لحاظ کئے بغیر کیا جاتا تھا کہ ایسے اجتماعات جو زیرِ بحث امور کو جانچنے کی ان سے کہیں کم فہم و فراست رکھتے ہیں، ان کی تقریروں کا کیا اثر قبول کریں گے۔

اینڈریوز نے اس حملہ کا کوئی پبلک جواب نہیں دیا۔ انہوں نے اخبارات میں بھی کچھ نہیں لکھا حالانکہ کینیا میں جو طعنے انہیں دیئے گئے تھے، ان کا جواب انہوں نے ۱۹۲۳ میں دیا تھا۔ اس موضوع پر صرف دو خطوں میں حوالہ ملتا ہے جو بنارسی داس چترویدی کے نام لکھے گئے تھے:

"بلاشبہ صلح کرانے والا بننا بہت مشکل کام ہے، لیکن ہم سے

یہ بھی نہیں کہا گیا تھا کہ یہ کام آسان ہے۔۔۔۔۔ میں نے اُس حملہ کے بارے میں جو مجھ پر کیا گیا ہے، کچھ نہیں لکھا، کیونکہ یہ کہیں بہتر ہے کہ اسے کلیتہً بھلا دیا جائے۔ بدقسمتی سے جو نقصان پہنچ گیا ہے، وہ بہت زیادہ ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن انجام کار وہ اچھائی میں تبدیل ہو جائے گا۔ میں خوش ہوں۔۔۔ کہ اس نے مجھے پریشانی میں مبتلا نہیں کیا جس طرح سے میں کچھ عرصہ پہلے جب مشرقی افریقہ میں مجھ پر ایسے حملے کئے گئے تھے، پریشانی میں پڑ چکا تھا۔ اس مرتبہ میں زیادہ خاموش اور زیادہ پُرسکون رہا ہوں اور نِش کاما کرما کے بارے میں بھگوت گیتا کے الفاظ کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکا ہوں۔۔۔۔۔ بہترین چیز جو میں دریافت کر سکا ہوں وہ خاموشی ہے۔ میری جو تعریف کی گئی ہے، وہ ضرورت سے زیادہ بلند ہے اور میں اس کا کسی نوع مستحق نہیں ہوں۔ یہ امر موجبِ برکت ہے کہ کچھ نہ کچھ ایسی چیز حاصل ہو گئی ہے جس سے دوسری جانب کا توازن بحال ہو گیا ہے۔"

۱۹۲۹ کے کرسمس میں سینٹ ہیلینا کے جزیرہ کے سیدھے سادے حبشیوں میں اینڈریوز نے "واٹ آئی او ٹو کرائسٹ" کے ابتدائی ابواب پر نظر ثانی کی تھی جو اِن طوفان خیز مہینوں کا حاصل تھے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد نوجوان عیسائی لیڈروں کی ایک جماعت ایک شام کو نیویارک میں ان سے ملنے کے لئے آئی جس نے ان کے چہرہ کی طرف غائر نگاہوں سے دیکھ کر ان کی زندگی کے راز کو دریافت کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک نے اچانک طریقہ پر کہا: "ہم سے ہندوستان کے بارے میں کچھ نہ کہئے۔ ہمیں دعائیں مانگنا یا عبادت کرنا سکھا دیجئے۔" اس فقرے کی اہمیت کی وجہ سے خاص شدت پیدا ہو گئی تھی مگر اینڈریوز نے اس واقعہ سے یہ سبق لیا کہ روحانی سکون سخت دل مغربی دنیا کی ایک بڑی ضرورت ہے۔

باب ۱۸

گول میز کانفرنس

(۱۹۳۰ سے ۱۹۳۲ تک)

(۱)

ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی سیاسی تعلقات میں اکتوبر ۱۹۲۹ سے ایک نیا تغیر رونما ہوا جبکہ لارڈ اَروِن انگلستان کا دورہ کرکے اِس اختیار کے ساتھ دہلی واپس لوٹے کہ وہ ملک معظم کے نام سے کہ ہندوستانیوں کو گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جو بیانات مسٹر ریمزے میکڈانلڈ جیسے ذمہ دار لیڈروں نے دئے ان سے ہندوستانیوں کو توقع ہوگئی کہ یہ کانفرنس ایسا دستور تیار کرے گی جس سے ہندوستان کو "ڈومینین اسٹیٹس" حاصل ہو جائے گا۔ جب برطانوی سیاست دانوں کے بعض غیر محتاط بیانات کے ذریعہ اس حقیقت سے انکار کر دیا گیا تو ہندوستان کو تلخ مایوسی ہوئی جس کا نتیجہ سخت ردِ عمل کی شکل میں نکلا۔ دسمبر ۱۹۲۹ میں کانگریس نے اپنے اجلاس منعقدہ لاہور میں "مکمل آزادی" کی قرارداد منظور کی اور چھبیس جنوری ۱۹۳۰ کو پہلا "یوم آزادی" منایا گیا۔ اپریل میں گاندھی نے خلاف قانون طریقہ سے نمک بنانے کے سلسلہ میں ڈرامائی انداز سے تین ہفتہ کا "دھاوا" شروع کر کے حکومت کو مقابلہ کا

چیلنج دیا۔ گو گورنمنٹ نے اس چیلنج کو قبول کرنا پسند نہیں کیا لیکن جب وسیع پیمانہ پر تجارتی بائیکاٹ عمل میں لایا گیا اور عوام کے متشددانہ مظاہرے اِدھر اُدھر ہونے لگے تو اس وقت گاندھی اور بہت سے دوسرے اشخاص کو گرفتار کر لیا گیا اور جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ۱۰ خصوصی "آرڈیننس" وضع کئے گئے اور بعض اضلاع میں مارشل لا کا نفاذ بھی کر دیا گیا۔ سائمن رپورٹ جو گول میز کانفرنس میں بحث و مباحثہ کی بنیاد بننے والی تھی ـــ

"ایک ایسی دستاویز تھی جو اپنی ہیئتِ ترکیبی کے اعتبار سے اور اُن حالات کے پیشِ نظر جس میں وہ شایع ہوئی، نہایت منحوس ثابت ہوئی ...... اس میں ہندوستانی باشندوں کے اختلافات پر اور ان کے فرقہ وارانہ تنازعات پر دیدہ و دانستہ زور دیا گیا تھا، اور حالیہ واقعات پر جو تبصرہ کیا گیا تھا اس میں قوم پرستانہ جذبہ کی گہرائی اور شدت کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ ...... مرکزی حکومت میں کسی قسم کی موثر تبدیلی کی تجویز نہیں کی گئی تھی جب تک کہ ریاستیں فیڈریشن میں آنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں اور ملک آپ اپنی حفاظت کرنے کے قابل نہ بن جائے۔ یہ شرائط ایسی تھیں جنہوں نے ..... مستقبل کو دو عناصر کے ساتھ مشروط کر دیا تھا جن میں سے ایک پر بھی ہندوستانی اقتدار نہ تھا۔"[۵]

جب اینڈریوز ریاستہائے متحدہ امریکہ کے دورے سے اپریل ۱۹۳۰ء میں انگلستان واپس آئے، اس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ اِن کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ انگریزی پبلک کے سامنے ہندوستانی نقطۂ نظر کی وضاحت کریں، اُن اہم امور کے بارے میں جن پر کانفرنس میں بحث ہوگی۔ چنانچہ "انڈیا اور سائمن رپورٹ" نہایت

---

[۵] "رائز اینڈ فل فل منٹ آف برٹش رُول اِن انڈیا" مصنفہ ٹامسن و گیرٹ، صفحات ۶۳۵-۶

عجلت کی حالت میں موسم گرما کے آغاز میں لکھی گئی اور مسز ایلیس کے خاموش مکان واقع ری میڈ مین جولائی کی ابتدا میں اسے مکمل کر لیا گیا۔ یہ مکان اُن چند گوشہ ہائے عافیت میں سے ایک تھا جہاں اینڈریوز دنیا وما فیہا سے بے خبر ہوکر اپنے دماغی کام سکون کے ساتھ انجام دے سکتے تھے۔ جب گاندھی کی گرفتاری کی خبر مئی میں انگلستان پہنچی اس وقت ٹیگور بھی وہیں موجود تھے اور انہوں نے جس پُر وقار اور دل گداز طریقہ سے ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو اخلاقی اور روحانی بنیادوں پر حق بجانب ٹھہرایا، اس کا زبردست اثر ہوا اور اینڈریوز نے اپنی کتاب کو اور زیادہ موثر بنانے کے لئے ان کے بیان کو بھی داخلِ کتاب کر لیا۔ جب ۱۹۳۰ کے موسم خزاں میں کانفرنس شروع ہوئی اسوقت خاموشی کے ساتھ سائمن رپورٹ کو طاقِ نسیاں میں رکھدیا گیا۔

خود اینڈریوز اس وقت ٹیگور کے ساتھ دوبارہ ریاستہائے متحدہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ سے ایک تار آیا جہاں ٹرانسوال میں نہایت اہم نسلی مسائل ازسرِ نو چھڑ گئے تھے۔ وہ بہ عجلت تمام لندن واپس آئے اور وہاں فوراً جہاز میں سوار ہوکر کیپ ٹاؤن چلے گئے۔[1] وہ دوبارہ اپریل ۱۹۳۱ میں انگلستان واپس آئے اور یہاں آکر انہوں نے بدلی ہوئی فضا کا مشاہدہ کیا۔ ہندوستان میں "گاندھی۔ اِروِن پیکٹ" پر دستخط ہو چکے تھے اور کانگریس کی جانب سے اسکی تصدیق بھی عمل میں آچکی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے لئے کانگریس نے اپنے واحد نمایندہ کی حیثیت سے گاندھی کا نام پیش کیا۔ یہ کانفرنس ۱۹۳۱ کے موسم خزاں میں منعقد ہونے والی تھی۔

اینڈریوز نے فوراً ہی اپنے دوست کی آمد کے لئے اور ساتھ ہی گاندھی کو انگریزی رائے عامہ سے واقف رکھنے کے لئے تیاریاں کرنی شروع

---

[1] پورے حالات کے لئے دیکھئے باب ۲۰

کردیں۔ انہوں نے "ہینسرڈ" [1] کی پارلیمنٹری رپورٹ برائے ۲۳ مئی بھی انہیں بھیجدی
تاکہ وہ اس کا غور سے مطالعہ کرلیں کہ لنکاشایر کی تجارتِ پارچہ بافی کی کساد بازاری نے
ہندوستان کی بحث میں کس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے لکھا: "جب آپ آئیں
تو آپ کو بہ نفسِ نفیس لنکاشایر جاکر صورتِ حال کا مشاہدہ کرنا چاہیئے جس طرح میں
خود کررہا ہوں۔" اپنے خط کو سر بمہر کرنے کے بعد وہ ہندوستانی اسٹوڈنٹ
ہوسٹل کے کینٹین میں چلے گئے۔ وہاں ہندوستانی دوستوں کی ایک جماعت کھانا کھانے
کے لئے بیٹھنے والی تھی۔ انہوں نے ان سے کہا: "میں ابھی مانچسٹر جارہا ہوں تاکہ لنکاشایر
کے بیکار مزدوروں کی حالت کا مشاہدہ کروں" ـــــ اور ویٹر سے کہا کہ "دال اور چاول کی
آدھی پلیٹ لاؤ۔" اس زمانہ میں اس قسم کے کھانے کی قیمت ۳ آنے تھی۔ جب وہ
کھانے سے فارغ ہوگئے تو اُن کے دوستوں نے کہا: "ہم آپ کے لئے ٹیکسی لائے
دیتے ہیں۔" مگر جو شریفانہ جواب انہیں ملا، وہ یہ تھا: "نہیں نہیں، میرے خیال میں بس
ٹھیک رہیگی۔" مسافر کے پاس ٹکٹ کے علاوہ جو کچھ اثاثہ تھا اس کی مجموعی میزان تین پنس
سے زیادہ نہ تھی!

جو تباہی انہوں نے اپنی آنکھوں سے لنکاشائر میں دیکھی اس کی بنا پر انہوں نے
گاندھی پر زور دیا کہ وہ غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک کو واپس لے لیں بالکل
اسی طرح جس طرح سے انہوں نے ۱۹۱۴ میں جنوبی افریقہ میں سول نافرمانی کی تحریک
واپس لے لی تھی۔ گاندھی کے جواب سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے
دوست کی افتادِ طبیعت کو کیسے اچھے طریقہ سے سمجھا تھا:

"جیسی آپ کی عادت ہے آپ دیدہ و شنیدہ واقعات کی بنا پر پریشان
ہوجاتے ہیں۔ اب کی مرتبہ لنکاشایر کی خوفناک بیکاری کا سوال ہے۔ جو کچھ

---

[1] برطانوی پارلیمنٹ کی رپورٹیں ۱۸۲۸ میں لیوک ہینسرڈ چھاپا کرتا تھا۔ آج حکومت یہ رپورٹیں
خود چھاپتی ہے مگر پرانا نام آج تک استعمال ہوتا ہے۔ مترجم۔

آپ دیکھتے یا سنتے ہیں وہ صداقت کا اندازہ کرنے کی راہ میں زبردست رکاوٹ ثابت ہورہا ہے۔۔۔۔۔ جنوبی افریقہ کے بارے میں جو کچھ آپ کہتے ہیں وہ غلط تمثیل ہے۔ اور جو مداوا آپ نے پیش کیا ہے وہ لنکا شایر کے لئے کچھ مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔"

لیکن گاندھی نے وعدہ کرلیا کہ وہ لنکاشایر کے مزدوروں سے بطورِ خود ملاقات کرینگے۔

اینڈریوز نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوستان میں مشنریوں کے کام کے متعلق گاندھی کے طرزِ عمل کے بارے میں جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اسے اخبارات کے ایک طبقہ میں نہایت عیّارانہ طریقہ سے اچھالا جارہا ہے۔ خود گاندھی پر انہوں نے جو دو کتابیں[1] لکھی تھیں، اُن سے پبلک کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں بہت مدد ملی اور جنوبی افریقہ سے لوٹتے ہی وہ تیسری کتاب (مہاتما گاندھی اپنے کام میں) کو مکمل کرنے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے برطانیہ اور امریکہ کے عیسائی جرائد کو عیسائی قارئین کے مطالعہ کے لئے میٹریل بہم پہنچایا اور ساتھ ہی کئی بار پبلک جلسوں میں اسی موضوع پر تقریریں کیں۔

لیکن بظاہر اس امر کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ شاید گاندھی نہ آئیں۔ ہندوستان میں حکومت اور کانگریس دونوں میں یہ گہرا احساس پھیلا ہوا تھا کہ "گاندھی۔اَروِن معاہدہ" کی خلاف ورزی ہورہی ہے اور کانگریسی کارکن عمّالِ حکومت کے خلاف برملا یہ الزام عائد کررہے تھے کہ وہ دیہات میں صنعتی پروگرام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کررہے ہیں حالانکہ اَروِن نے اس کی تائید کرنے کا یقینی وعدہ کرلیا تھا۔ انگلستان میں گاندھی کی دیانتداری اور مقصد کی صیانت کے بارے میں گہرا شبہ ظاہر کیا جاتا تھا اور اینڈریوز نے اپنی تمام طاقتیں اسی رکاوٹ کو دور کرنے پر مرکوز کردیں۔

---

[1] خیالاتِ مہاتما گاندھی (۱۹۲۹)؛ مہاتما گاندھی: ان کی اپنی کہانی (۱۹۳۰)

اس کے بعد سے روزانہ ملاقاتوں اور مراسلوں میں، وہائٹ ہال اور ڈاؤننگ اسٹریٹ میں انہوں نے مسئلہ کے اس رخ کا بار بار اعادہ کیا جو اُن کی نگاہ میں نہایت اہم تھا۔

"میں آپ سے صرف اتنا کہ سکتا ہوں کہ تقریباً ۲۰ سال کے تجربہ کے بعد میں نے حقیقی معنوں میں ان سے زیادہ سچا انسان نہیں دیکھا اگر آپ ان کے ساتھ معاملہ طے کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ اس عقیدہ میں میرے ہم نوا ہو جائیں۔ ..... کسی دوسری بنیاد پر ہندوستان کی صورتِ حال کا صحیح تصفیہ نہیں ہو سکتا سوائے اسکے کہ مسٹر گاندھی کی دیانتداری اور خلوص پر پورا پورا اعتماد کیا جائے۔"

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ اینڈریوز پہلی مرتبہ اگاتھا ہیریسن سے ملے جو بعد کو مصالحت کے اِس کام میں ان کی گہری شریکِ کار بن گئیں۔ انہوں نے اپنے ایک مشترکہ دوست کے مکان میں اپنی پہلی ملاقات کا حال یوں بیان کیا ہے:

"وہ کمرے میں ایسی حالت میں داخل ہوئے کہ ان کے ہاتھ کاغذات سے لدے ہوئے تھے اور ان کے پاس ایک اٹاچی کیس بھی تھا جس میں دنیا بھر کے لوگوں کے خطوط تھے جن کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں یہ چیزیں بھی تھیں: ان کی کتاب "مہاتما گاندھی اپنے کام میں" ان کی نصف تکمیل شدہ کتاب "واٹ آئی اوؤ کرائسٹ" کے کچھ ابواب، کچھ مکمل مضامین جو بہت عرصہ پہلے لکھے جانے چاہیئے تھے۔ یہ تو روزمرہ کا منظر ہے پر انہوں نے رسمی باتوں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے کام سے گہری دلچسپی رکھتی ہوں۔ ..... ہم نے اٹاچی کیس لیکر کام شروع کر دیا جو ضرورت سے زیادہ کاغذات سے اٹا ہوا تھا۔"

(۲)

مہاتما گاندھی بالآخر پہنچ گئے۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز ان سے مارسیلز جا کر ملے

اور وہی کانفرنس کے باہر ان کی وزٹ کے جملہ انتظامات کے واحد ذمہ دار تھے
گاندھی مُصر تھے کہ وہ موریل لیسٹر کی نوآبادی میں قیام کریں گے جو لندن کے ایسٹ
اینڈ علاقہ کے غربا میں واقع تھی اور جنہیں وہ اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ مگر یہ خوشگوار
گھر ویسٹ منسٹر کی سیاسی جدوجہد کے مرکز سے چند میل کے فاصلہ پر تھا۔ اینڈریوز
جو متفکر تھے کہ گاندھی کی جملہ طاقتیں صرف ان کے انتہائی اہم کام پر مرکوز رہیں، یقین
رکھتے تھے کہ ان کا دفتر کانفرنس کے ہیڈ کوارٹرز کے قریب ہونا چاہیئے۔ گاندھی
بالآخر بہت پس وپیش کے بعد اس بات پر رضامند ہو گئے کہ نائٹس برج والے مکان
نمبر ۸۸ کو کرایہ پر لے لیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں چارلی کے "اسراف بیجا"
پر اچھا خاصا تنازعہ سا ہو گیا تھا جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ بہرحال
معاملہ طے ہو گیا۔ چارلی کے دو قدیم دوست ڈاکٹر اور مسز ایس۔کے۔دت نے مکان
کی دیکھ بھال کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اور وہ خود اوپر والے کمرے میں قیام پذیر
ہوئے جہاں وہ فرصت کے لمحات میں جو اُن ہیجان خیز ایام میں کبھی کبھی میسر آجاتے
تھے، "واٹ آئی او ٹو کرائسٹ" لکھتے رہے۔

مگر فرصت کے ایسے اوقات بہت کم تھے۔ دن بھر وزیٹر آتے رہتے تھے اور
اینڈریوز دربان کے فرائض ادا کرتے رہتے تھے جیسا کہ ۱۹۲۴ میں انہوں نے دہلی
میں یہ فرائض ادا کئے تھے تاکہ وہ چم چچڑ قسم کے لوگوں سے گاندھی کو بچائیں اور
طے کریں کہ کون ان سے ملنے کے قابل ہے اور کون نہیں ہے۔ یہ بڑی کٹھن ذمہ داری
کا کام تھا اس لئے کہ بہت سے "ناپسندیدہ اشخاص" ایسے تھے جو بار بار آتے تھے
مگر اینڈریوز اپنے اصول پر سختی سے جمے رہے۔

مگر گاندھی کے دورۂ انگلستان کی افادیت میں جس چیز نے سب سے
زیادہ اضافہ کیا وہ دور اندیشانہ حکمت عملی تھی جس کی مطابقت میں اینڈریوز نے
ان کے لئے یہ پلان تیار کیا تھا کہ وہ سکون اور خاموشی کی فضا میں ملک کے بعض
بہترین اشخاص سے ملاقات کریں۔ ہنری پولک اور دوسرے دوستوں کے تعاون

سی - ایف - اینڈریوز کام میں

سے انہوں نے اندرونِ ملک میں ہفتہ کے آخری دنوں میں دوروں کا انتظام کیا۔ ان میں سے ایک موعودہ دورہ لنکا شایر کا تھا۔ چنانچہ تمام مزدوروں نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا کہ ہندوستانی تحریکِ بائیکاٹ کے اچھے اور برے پہلو خواہ کچھ ہی ہوں، افلاس کے خلاف جنگ میں گاندھی ان کے رفیقِ کار کی حیثیت رکھتے ہیں اور وہ نہایت شفقت اور احترام کے ساتھ ان سے ملے۔ ایک شخص نے کہا "میں بھی بیکار مزدوروں میں سے ایک ہوں، لیکن اگر میں ہندوستان میں ہوتا تو میں وہی کہتا جو گاندھی کر رہے ہیں۔"

بالائی متوسط طبقوں کے سوفسطائی وضع کے اشخاص سے اشتراکِ عمل کرنا آسان کام نہ تھا، مگر اینڈریوز نے اس بارے میں بھی بہت کام کیا۔ وہ گاندھی کو کینٹربری لے گئے تاکہ وہ وہاں اپنے دوست ہیولیٹ جانسن سے جو وہاں ڈین کے عہدہ پر فائز تھے، ملاقات کرائیں ــــ یہ ڈین سب کے لئے معاشی انصاف کے حصول کی جدوجہد کی وجہ سے "سرخ ڈین" کے لقب سے مشہور تھے۔ ایک اور ہفتہ کے آخری دن "مانچسٹر گارڈین" کے ایڈیٹر سی۔پی۔اسکاٹ کی معیّت میں بسر ہوئے۔ ایک ہفتہ کے آخری ایّام پیمبروک کالج کیمبرج کے پسندیدہ ماحول میں صرف ہوئے۔ ایک اور ہفتہ کے آخری دن برمنگھم میں کوئیکر دن کے ساتھ بسر ہوئے جو ہندوستان کی نسبت دوستانہ جذبات رکھتے تھے۔ اسی طرح ایک ہفتہ کے آخری ایام بیلیل کالج آکسفورڈ کے ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر لنڈسے کی معیّت میں گزرے۔ اینڈریوز نے خود ان نتائج کو جو اُن کے خیال میں ان ملاقاتوں سے حاصل ہوئے، ذیل کے الفاظ میں قلمبند کیا ہے:۔

"ان کی بے مثال شخصیت بہترین انگریزی دماغوں پر چھا گئی اور ان کے خیالات کی ندرت نے ان اشخاص کو جن سے وہ ملے، اس طرح سے غور و فکر پر اُکسایا کہ اس سے پہلے وہ کبھی اس طرح متاثر نہ ہوئے تھے وہ ہر امر میں ان سے متفق الرائے نہ تھے، لیکن وہ سب نہایت اخلاص مندی کے ساتھ

ان کی روحانی عظمت کے معترف تھے جو انہوں نے اُن میں دیکھی۔ انگلستان بہت چھوٹا ملک ہے اور اس قسم کے خیالات بلاشبہ بڑی تیزی سے پھیل جاتے ہیں، اس لئے کوئی سنجیدہ انسان ایسا نہ تھا۔ جو اس خیال پر قائم رہ سکا ہو جو اُن کی آمد سے پیشتر بہت کچھ پھیلا ہوا تھا کہ مہاتما گاندھی ایسے کٹر قسم کے شخص ہیں جن سے سمجھوتہ کرنا ناممکنات سے ہے۔" لہ

باقی رہا گول میز کانفرنس کا معاملہ تو اس کے متعلق اینڈریوز کی یہ رائے تھی کہ گاندھی کی سیاحتِ انگلستان "ایک شاندار ناکامی ہے۔" بلاشبہ وہ زبردست مایوسی کا دَور تھا۔ دوسری کانفرنس کے انعقاد پذیر ہونے تک لیبر گورنمنٹ جس نے کانفرنس کے طریقۂ کار کی ابتدا کی تھی، عام انتخاب کے بعد حکومت سے ہٹا دی گئی تھی اور اگرچہ رَیمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہے تاہم انکی کابینہ نے ان گفتگوؤں کے سلسلہ میں جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا اس میں نمایاں طور پر سختی آگئی تھی۔ جہاں تک ہندوستانی نمایندوں کا تعلق ہے سوائے گاندھی کے باقی سب کے سب "اعتدال پسند" جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور جوں جوں کانفرنس کا کام بڑھتا گیا گاندھی برابر مجبور ہوتے گئے کہ وہ ان تجاویز کی مخالفت میں اپنی رائے دیں جنہیں ان کے اکثر رفقائے کار منظور کرنے پر آمادہ تھے۔ اس وقت یہ واضح ہوگیا کہ حکومت کے سامنے دو راستے ہیں: یا تو وہ گاندھی کے نقطۂ نظر کو سرے سے نظرانداز کر دے اس توقع پر کہ "اعتدال پسند" حضرات ہندوستان میں اپنی تجاویز منوا لینگے، یا وہ یہ تسلیم کرلے کہ نیشنل کانگریس کے نمایندہ کی حیثیت سے وہی ان سب کے مقابلہ میں ہندوستان کی نمایندگی بہتر طریقہ سے کرتے ہیں اور اسی کے مطابق ان سے مصالحت کرے۔

اینڈریوز نے جنہیں وِٹ اور پولک کی پُر زور تائید حاصل تھی، اپنی سعی انتہائی

لہ اقتباس از مضمون "مہاتما گاندھی لندن میں" جو ۱۹۳۲ میں لکھا گیا تھا۔

کوشش کی کہ میکڈانلڈ اور ان کے رفقائے کار کو یہ ترغیب دیں کہ وہ دوسرے راستہ کو اختیار کریں جو ان کے یقین کے مطابق صحیح معنوں میں حقیقت پسندانہ راستہ تھا۔ انہوں نے دوسرے ہفتہ کے آخری دن ڈاکٹر لنڈزے کی معیت میں آکسفورڈ میں بسر کرنے کا انتظام کیا اور وہاں اہم کام کی ابتدا کر دی۔ لارڈ لاتھین موجود تھے اور مسٹر مالکم میکڈانلڈ اپنے باپ کے غیر سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے شریک تھے۔ کیمبرج کے پروفیسر کولنش اور ڈاکٹر لنڈزے نے انہیں ترغیب دی کہ وہ آئینی بلندیوں سے نیچے اتریں اور فاقہ زدہ ہندوستانی کسان کی بہبودی کے لئے گاندھی کے عملی کام کو اختیار کریں۔ کام کی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا حقیقی سمجھوتہ میں اب کچھ تاخیر نہیں ہے اور ڈاکٹر دت کے الفاظ میں یہ ختم ہونے والا ہفتہ "تاریخ بنانے والا" ثابت ہوگا۔ لیکن معاملہ یہیں پر پہنچ کر رک گیا، کابینہ (خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو) اس راستہ پر گامزن ہونے سے قاصر رہی اور اس طرح سمجھوتہ کی توقع مرجھا کر ختم ہوگئی۔

(۳)

ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی کوشش ناکام ہو چکی تھی لیکن اینڈریوز انتھک طریقہ پر اس امر کی کوشش کرتے رہے کہ صورتِ حال کے اہم امور کو تسلیم کر لیا جائے۔ انہوں نے بتایا کہ موجودہ دستور کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے بھی حکومتِ ہند کے لئے ممکن ہے کہ وہ ہندوستان میں حقیقی معنوں میں ہندوستانی گورنمنٹ بن جائے بجائے ایسی برطانوی حکومت کے جو تمام اہم امور میں وائٹ ہال کے احکام کے ذریعہ چلائی جاتی ہو۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ۱۹۱۷ کا اعلان ایک ایسا وعدہ تھا جس کا مقصد نہ صرف ذمہ دارانہ حکومت کے لئے کام کرنا تھا بلکہ نظم ونسق کے کام میں بھی ہندوستانیوں کو شریک کرنا تھا۔ انہوں نے کہا کہ برطانوی حکومت اپنی دیانتداری کا ثبوت یوں دے سکتی ہے کہ

وعدہ کے موخرالذکر حصّہ کو عملی جامہ پہنائے اور ایسے تعمیری "آرڈرز اِن کونسل" جاری کرے جس میں سرکاری افسروں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ دیہی صنعتوں کی ترقی میں کانگریس کے ساتھ موثر اشتراکِ عمل کریں۔[1] یہ آخری تجویز اس توقع کے ساتھ کی گئی تھی کہ گاندھی کے ہندوستان پہنچنے پر پوری سرگرمی سے دیہاتی تعمیری کام شروع کر دیا جائیگا۔ لیکن واقعات نے ایک المناک صورت اختیار کر لی یعنی ہندوستان میں آنے کے تین ہفتے کے اندر اندر جنوری ۱۹۳۲ میں گاندھی کو پھر ایک مرتبہ جیل بھیجدیا گیا اور کانگریس کو ناجائز جماعت قرار دیدیا گیا۔

جب اینڈریوز کو یہ خبر ملی اس وقت وہ جنوبی افریقہ میں تھے۔ ان کی وہاں ضرورت تھی تاکہ وہ ۱۹۳۲ کی ہندوستان اور جنوبی افریقہ کی گول میز کانفرنس کے لئے راستہ ہموار کریں۔ جنوبی افریقہ کے کچھ یہودی فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کی روز افزوں کشمکش کے سلسلہ میں سخت متفکر تھے اور انہوں نے اینڈریوز کو مصارف ادا کرنے کی پیشکش بھی کی تھی تاکہ وہ وہاں جاکر مصالحت کرائیں۔ اسی زمانہ میں وکٹوریہ کے ڈین کی معیت میں چین کے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کرنے کے متعلق بھی عارضی پلان تیار کر رہے تھے۔

لیکن جب گاندھی گرفتار ہو گئے تو انہوں نے اپنے ہر پروگرام کو منسوخ کر دیا اور بہت جلد جنوبی افریقہ سے سیدھے ہندوستان چلے گئے۔ جب وہ وسط مارچ میں وہاں پہنچے تو اس وقت تک تقریباً ۳۰ ہزار سے زائد افراد "سول نافرمانی" کے سلسلہ میں نظربند کئے جا چکے تھے۔ لارڈ ولنگڈن جو ۱۹۳۱ میں لارڈ اِرون کی جگہ پر وائسرائے مقرر ہوئے تھے، یہ یقین رکھتے تھے کہ مصالحت کی جس پالیسی پر اِرون گامزن تھے وہ انتہائی غلط ہے اور خصوصیت کے ساتھ سرحد میں خان عبدالغفار خان کی "سرخ قمیض" کی تحریک کو سختی سے دبانا نہایت ضروری ہے۔ گورنمنٹ کا کہنا تھا

---

[1] مکتوب بنام ریمزے میکڈانلڈ، ۲۶ نومبر ۱۹۳۱

کہ سول نافرمانی کی تحریک کا مقصد یہ ہے کہ جان بوجھکر پولیس سے ایسے کام کرائے جائیں جن کی وجہ سے رائے عامہ اس کے خلاف ہو جائے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں کہ اپنے ماتحتوں کو زیادتیاں کرنے سے روکیں اور زیادتیوں کی صورت میں انہیں سزا نہ دیں کیونکہ ان کی دلیل یہ تھی کہ ایسے حالات پیدا کرنے کی بڑی ذمہ داری جن میں ایسی زیادتیاں ممکن ہو سکتی ہیں، کانگریس پر عائد ہوتی ہے اور اگر سختی نہ کی گئی تو نتیجہ سخت افراتفری کی صورت میں نکلے گا۔ تینوں انگریز کو تیکروں نے جو اینڈریوز کی درخواست پر آزاد مشن کی حیثیت سے مصالحت کے مقصد سے ہندوستان کی سیاحت پر آئے تھے، اپنے آزاد تاثرات قلمبند کرتے وقت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ "سرکاری عمال کا مقصد مصالحت نہیں بلکہ فتح حاصل کرنا ہے۔"

شانتی نکیتن میں ٹیگور بھی عام مایوسی سے متاثر تھے، لیکن اینڈریوز اور تین دوستوں سے طویل گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے انہیں نہایت اچھے الفاظ میں ایک اپیل دی جس کے مخاطب وہ سب لوگ تھے جو "بنی نوع انسان کی بہبودی کو عزیز رکھتے ہیں" اور جس میں انہوں نے اصرار کیا تھا کہ بداعتمادی اور عناد کے جذبات کو ترک کر دیا جائے اور "افراد اور اقوام کے مابین تخلیقی سمجھوتہ کی زبردست طاقت پر گہرا اعتقاد رکھا جائے۔" مگر نہ تو اینڈریوز کو اور نہ کسی دوسرے شخص کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ اس اپیل کو جیلخانہ میں گاندھی کے حوالے کرے، البتہ گورنمنٹ نے صرف اتنا کہا کہ وہ اسے اپنے خط کے ساتھ بھیجنے کی مصلحت پر "غور" کریگی[1] خود اینڈریوز کو پولیس کے ایک حکم کے ذریعہ دہلی نہ چھوڑنے کی ہدایت کر دی گئی تھی اور جب انہوں نے اس کے متعلق ہوم ممبر سے نہایت سخت الفاظ میں صدائے احتجاج بلند کی تو اس کے جواب میں فوراً ہی ایک معافی نامہ آ گیا، مگر اس واقعہ سے اُس زمانہ کے ماحول کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے ہوم ڈیپارٹمنٹ کو لکھکر بھیجا:

---

[1] یہ اپیل بعد کو انگلستان میں چھاپی گئی جہاں اس کی خوب اشاعت ہوئی۔

"یہ حالت تو وہ ہے جو ۱۹۱۹ میں پنجاب میں رونما تھی" مگر ان کے اس "کلام نرم و نازک" کا کچھ اثر نہ ہوا۔

یہ مقدس ہفتہ کا زمانہ تھا اور تلخ واقعات کی یاد سے ان کی روح بیحد غمگین تھی وہ جسمانی طور پر ہی بیمار نہ تھے بلکہ ان کی روح بھی بیمار تھی۔ انہوں نے دہلی کے ایک گرجا میں ایسٹر کے موقع پر خطبہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا اور وہ اپنی مایوسی کی تاریکی میں فکرمند تھے کہ وہ اس موقع پر کیا پیغام دیں۔ لیکن ایسٹر کی صبح کو جب وہ یہ کہانی پڑھ رہے تھے کہ حضرت مریم اپنے جی اٹھنے والے آقا سے باغ میں کس طرح ملیں اسی وقت روشنی اور ایمان اور امید کے جذبات ان کے دل میں امڈ آئے اور وہ اپنے کام میں نئی جرأت سے مشغول ہو گئے اور مئی کے پہلے ہفتہ میں پھر انگلستان پہنچ گئے۔

آئندہ دو مہینے تک ان کے تمام اوقات ذاتی ملاقاتوں کے لئے وقف رہے۔ انہوں نے لارڈ اروِن، لارڈ سینکے اور وزیر ہند سر سیموئیل ہور سے ملاقاتیں کیں۔ انہوں نے ریمزے میکڈانلڈ کو بھی ڈھونڈ نکالا، جبکہ وہ لوسی ماؤتھ میں گولف کھیلنے کی غرض سے تعطیل منانے میں مشغول تھے اور وہ دونوں گولف کے میدان میں ایک ساتھ پھرتے رہے اور اینڈریوز اپنا مقدمہ پیش کرتے رہے۔ انہوں نے زور دیکر کہا "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جب جون کے آخر میں خصوصی آرڈیننس ختم ہو جائیں تو اس وقت مصالحت کے لئے از سر نو کوشش کی جائے؟" انہوں نے دیکھا کہ انہیں ایک بار پھر اسی پروپیگنڈا کا مقابلہ کرنا پڑا جس میں گاندھی کی ذاتی صیانت کے متعلق شبہ کا اظہار کیا جا رہا تھا اور ساتھ ہی عام آدمی کی اس ناپسندیدگی کا بھی جو اسے ہندوستان کے پریشان کن اور پیچیدہ مسائل پر مزید بحث کرنے کے سلسلہ میں محسوس ہوتی تھی۔ وہ رقمطراز ہیں: "ہندوستان کا تمام موضوع ہی ممنوع تھا۔ اگر میں واپس آنہ جاتا تو نہ معلوم کیا ہو جاتا!"

جون کا آخری ہفتہ آیا بھی اور چلا بھی گیا مگر سرکاری پالیسی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اینڈریوز کو اپنے مقصد میں بظاہر شکست ہوئی لیکن وہ جانتے تھے کہ حقیقی ترقی کیجا چکی ہے۔ لہذا جولائی میں انہوں نے کوشش کی تاکہ ہندوستانی مسئلہ کے اخلاقی پہلو کے متعلق عیسائی ضمیر سے اپیل کریں۔ انہ

کام کے لئے دروازے اب پورے طور پر کھل چکے تھے، "واٹ آئی اوٹو کرائسٹ" اسی سال کے شروع میں شایع ہو چکی تھی اور پندرہ دن کے اندر اندر اس کے تبصرے ایڈیشن کی مانگ شروع ہو گئی تھی عیسائی حلقوں میں تقریر کرنے کے دعوت نامے آنے شروع ہو گئے جس سے انہیں موقع مل گیا کہ وہ اس سے زیادہ وسیع پیمانہ پر "مصالحت کی خدمت" انجام دیں جتنی اب تک کر چکے تھے انہوں نے ایک اور نئی کتاب لکھنے کا خاکہ تیار کیا تاکہ وہ زیادہ مکمل طریقہ پر اپنے اندرونی سکون کے راز کا اظہار کر سکیں۔

استنے میں یکایک امداد کا ایک المناک بلاوا آگیا۔ ٹیگور کا اکلوتا پوتا (نیتو) جو جرمنی میں تعلیم پا رہا تھا، دق کے مرض میں مبتلا ہو کر صاحبِ فراش ہوگیا۔ وہ غریب مر رہا تھا اور اس نے والدین کو بلانے کے لئے تار بھی بھیجے تھے۔ اینڈریوز اس لڑکے کو بچپن کے زمانہ سے جانتے تھے اور اس کے والدین انکے دوست تھے۔ روحانی اذیت کے ان ایام میں انہوں نے غمزدہ باپ اور ماں کے بوجھ کو ہر ممکن طریقہ سے ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے بلیک فاریسٹ کے چھوٹے قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھائی اور اگرچہ وہ خود اتنے تھکے ہوئے تھے کہ الفاظ میں اسے بیان نہیں کیا جا سکتا، تاہم انہوں نے ان کے رشتہ داروں کو جو ہندوستان میں تھے، طویل خطوط کے ذریعہ ڈھارس اور تسکین دی اور انہیں بتایا کہ لڑکے کے ساتھ ان سب نے کس قدر محبت و شفقت کا سلوک کیا اور یہ کہ اس کی آخری آرام گاہ کس قدر حسین ہے!

اینڈریوز نے انگلستان میں اپنے دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس المناک واقعہ سے انہیں کس قدر صدمہ پہنچا تھا۔ گرد و پیش کے پہاڑوں کی خوبصورتی سے بھی انہیں کوئی تسکین نہیں ہوئی کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ جو صدمہ انہیں پہنچا تھا وہ قریب قریب ناقابلِ برداشت تھا۔ انہیں اگر تسکین ملی تو صلیب میں ملی۔ اس رنج و محن کی حالت میں جس کی وجہ سے ان کے اعتقاد پر انتہائی وزن پڑا، ایک اور کتاب "کرائسٹ اِن دی سائی لینس" (مسیح عالم خاموشی میں) لکھی گئی۔ اس کا خاکہ ان کے دماغ میں اس وقت آیا تھا جبکہ وہ نیتو سے ملنے کے لئے

بعجلت تمام جرمنی میں سے گزر کر رہے تھے اور ان کی نیند دوران سفر میں بالکل اچاٹ ہو چکی تھی۔

جب سب کچھ ختم ہو گیا تو وہ بیک فاریسٹ سے سوئٹزر لینڈ چلے گئے جہاں انھوں نے آکسفورڈ گروپ کی ایک "ہاؤس پارٹی" میں وعدہ کے مطابق شرکت کی۔ اگرچہ جسمانی طور پر وہ بالکل نڈھال تھے تاہم ان کے دل میں نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے یہ تمنا پیدا ہوئی کہ انگلستان کی زیادہ جانی پہچانی سرزمین میں واپس چلے جائیں۔ انھوں نے لکھا: "اپنے پیارے انگلستان میں پھر ایک مرتبہ واپس آنے سے کس قدر سکون حاصل ہوگا!.... میں صحیح معنوں میں ایک مرتبہ اور سر زمین انگلستان کی آغوش میں اپنا سر رکھنا چاہتا ہوں۔" لیکن فرضِ منصبی کے احساس نے انھیں اپنے وعدہ پر قائم رکھا۔

اس کا انھیں پورا پورا معاوضہ ملا۔ ارسے تیجبن کی "ہاؤس پارٹی" کی شرکت سے ان کی تکان میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ وہاں انھیں منزل کرنے والا سکون میسر آیا۔ انھوں نے وہاں آرام کیا اور ایک اور کتاب لکھنے کا خواب دیکھا تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کے بعض اور بلند حوصلہ جذبات کو اُن مشتاق نوجوانوں تک پہنچا سکیں جو ان کے گرد و پیش رہتے تھے۔ چنانچہ جب وہ برف سے ڈھکی ہوئی بلند پہاڑیوں پر نظر جمائے بیٹھے تھے جو جھیل سے دُور واقع تھیں تو ان کے خیالات کوٹ گڑھ کے برفانی سلسلوں اور تبت کے قلعوں کی طرف منتقل ہو گئے جن کی سمت ۱۹۲۹ میں سادھو سندر سنگھ ایک ایسے سفر پر روانہ ہوئے تھے جس سے وہ پھر کبھی واپس نہ لوٹے۔ انھوں نے کتاب "سادھو سندر سنگھ — ایک یادداشت" کا پلان بھی تیار کر لیا، مگر ابھی اس کے لکھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

باب ۱۹

ہندوستان وبرطانیہ

(۱۹۳۲ سے ۱۹۳۵ تک)

اگست ۱۹۳۲ میں انگلستان سے اینڈریوز کی غیر حاضری کے دوران میں ہندوستان میں نہایت اہم واقعات رونما ہو رہے تھے۔ گول میز کانفرنس کے بعض مندوبین نے جن میں اچھوتوں کے نمایندہ ڈاکٹر امبیڈکر بھی تھے، یہ مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستان کے جدید دستور میں ان کمتر فرقوں کے لئے جداگانہ نمایندگی دی جائے اور قانون ساز مجالس میں ان کے لئے علیحدہ نشستیں رکھی جائیں۔ گاندھی نے کانفرنس کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو وہ اس پالیسی کی "جان کی بازی لگا کر" مخالفت کریں گے اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا ٹھیک وہی ان کا منشا تھا۔ جنوری ۱۹۳۲ میں ان کی گرفتاری نے انہیں اس تجویز کے خلاف ذاتی جہاد کرنے سے روکے رکھا، اور جب ریمزے میکڈانلڈ کا "کمیونل ایوارڈ" اگست ۱۹۳۲ میں شایع ہو گیا تو اس وقت انہوں نے محسوس کیا کہ اس میں ان کے اعتراضات کو کما حقہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن ایوارڈ میں ایک دفعہ تھی جس کی وجہ سے یہ ممکن تھا کہ اگر متعلقہ پارٹیاں آپس میں کوئی سمجھوتہ کرلیں تو پھر اس میں ترمیم ہو سکے گی۔ لہذا گاندھی نے برت شروع کر دیا تاکہ اخلاقی دباؤ سے اونچی ذات کے ہندوؤں اور "اچھوتوں" کے لیڈروں کو ترغیب دے سکیں کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق ایوارڈ میں ترمیم کرانے کے مقصد سے متفقہ مطالبہ کریں

اس کا نتیجہ وہ سمجھوتہ تھا جسے "پونا پیکٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن اس برت کے طریقے اور اس کے بنیادی اصول کو مغرب میں قدم قدم پر بہت غلط سمجھا گیا، حتیٰ کہ منکر اور ہمدرد یورپینوں نے بھی اس امر پر اظہار تعجب کیا کہ آیا ایسا اخلاقی دباؤ بھا نتک "غیر متشددانہ" کہلایا جا سکتا ہے۔ اینڈریوز خود بھی طریقہ برت کے بارے میں شبہات اور خدشات میں مبتلا تھے اور جو خطوط انہوں نے گاندھی کو لکھے ہیں ان میں آزادی کے ساتھ اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اپنی پبلک تحریروں میں انہوں نے اپنے دوست کے پیچھے بنیادی تخیل کی تشریح کے ساتھ کلیتاً ہم نوائی کی ہے۔ ان کے خیال میں وہ برت محبت کے جبر کا ثمر تھا۔

"انہوں نے ان غریب ترین انسانوں کو دیکھا جن سے انہیں گہری محبت تھی کہ وہ غلط ڈگر پر چل رہے ہیں جو انہیں ایک نامعلوم گہری چٹان کی طرف لے جا رہی ہے۔ عقیدتمندانہ محبت کی جرأت رندانہ کے ساتھ انہوں نے آپ کو ان کی راہ میں ڈال دیا...... یقیناً ایسے فعل میں ایک حسن ہے، لاثانی اور حیرت انگیز جو ان لافانی الفاظ کی یاد دلا دیتا ہے، کوئی شخص (کسی) سے اس سے زیادہ محبت کا اظہار نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے دوستوں کے لئے اپنی جان دے ڈالے"[1]

بہت سعی کیجئے تو مر رہیے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

جب برت کی خبر انگلستان پہنچی اس وقت اینڈریوز مانچسٹر میں مقیم تھے۔ وہ فوراً لندن واپس آ گئے اور وزیر اعظم، دفتر وزارت ہند اور لارڈ اِرون، لارڈ سینکی اور لارڈ لوتھین جیسے با اثر دوستوں سے ملے جو صورت حالات کو صحیح طریقہ سے سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے گاندھی کو بھی پوچھنے کے لئے تار دیا کہ آیا انہیں ان کی امداد کے لئے ہندوستان روانہ ہو جانا چاہئے گاندھی نے بذریعہ تار جواب بھیجا کہ انہیں یقین ہے کہ برت خدا کی مرضی کے مطابق رکھا گیا ہے اور یہ کہ چارلی کو انگلستان ہی میں رہنا چاہئے۔ مابعد کے ایام کی داستان کبھی بھی پوری

---

[1] کریسچین سپکٹیٹر اکتوبر ۱۹۳۲

طور پر معرضِ تحریر میں نہیں آ سکے گی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اینڈریوز کے کام ہی سے جو خاص پلان، تسلسل اور انہماک کے ساتھ عمل میں لایا گیا تھا، گاندھی کی جان بچالی ہو۔

انڈین کن سیلی ایشن گروپ (ہندوستانی مصالحتی جماعت) جن میں کارل ہیتھ، ہنری پولک اگا تھا ہیریسن، ہارلیس الیگزینڈر بھی شامل تھے، اور دوسرے محبانِ ہند نے لندن کے مرکزی مقام میں عارضی دفتر قائم کرلیا، اور وہاں وہ اور اینڈریوز روزانہ مشورے کرتے تھے۔ اخبارات کی اس طاقت کا کہ وہ امداد دے سکتے ہیں اور رکاوٹ ڈال سکتے ہیں، ابتدا ہی سے اندازہ لگا لیا گیا تھا اور پولک اور الیگزینڈر کی مدد سے اینڈریوز نے زیرِ بحث مسائل کے متعلق ایک بیان مرتب کیا جسے انگلستان کے ہر روزنامے کو بھیجا گیا اور مختلف خیالات کے ۲۵۰ ہفتہ وار اخباروں کو بھی۔ امریکی اور کناڈوی خبر رساں ایجنسیوں نے بھی اپنے نامہ نگاروں کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ وہ واقعات کی تشریح کرنے میں اینڈریوز کی امداد طلب کریں۔ "ورکر سپیمین سنچری" کے ایڈیٹر نے انہیں ایک ذاتی خط بھیجا جس میں ان کی امداد پر اظہارِ تشکر کیا گیا تھا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے ہندوستان سے تار آتے گئے جن میں گاندھی کی روز افزوں کمزوری پر انتہائی تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ اینڈریوز نے اپنا سارا وقت اور اپنی ساری طاقت اس کام پر صرف کردی کہ وہ وزیرِ اعظم سے ایک اعلان کرائیں کہ اگر اونچی ذات کے ہندوؤں اور "اچھوتوں" میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا تو برطانوی حکومت اسے فی الفور منظور کرلے گی۔ آخرکار ۲۳ ستمبر کو انہیں یقین دلا دیا گیا کہ "اگر اسکیم قابلِ عمل ہوئی تو اس پر منظوری دیدی جائے گی۔" دوسرے دن (ہفتہ) ۲۴ ستمبر کو ذرا دیر سے "پونا پیکٹ" کی خبر آگئی بہت سے وزرا ختمِ ہفتہ کی وجہ سے شہر سے باہر تھے۔ خود وزیرِ اعظم میکڈانلڈ بھی اپنے دیہاتی کنج عزلت چیکرز گئے ہوئے تھے۔ اتوار کی صبح کو ۷ بجے اینڈریوز وہاں روانہ ہوگئے۔ اس دن ان کا سارا وقت ملاقاتوں ہی میں گزرا اور اگا تھا ہیریسن لندن میں ٹیلیفون پر بیٹھی رہیں اور ہندوستان سے یکے بعد دیگرے جو لمبے لمبے تار موصول ہوتے انہیں اُن تک پہنچاتی رہیں۔ برطانوی عمّالِ حکومت کے ساتھ اُن کی مہینوں کی صابرانہ با اخلاق اور دوستانہ ملاقاتوں کے

انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۴ کی سی سرد مہری اور مخالفت کا مدت ہوئی خاتمہ ہو چکا تھا اور انڈیا آفس اور ڈاؤننگ اسٹریٹ کا ہر دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا۔ وقت کا سوال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ وزیر اعظم کا فیصلہ فوری طور پر منظر عام پر آجانا چاہئے اور اس کے الفاظ کی نشست و ترتیب صحیح ہونی چاہئے ۔۔۔ اس لئے کہ ذراسی اجتہادی غلطی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اور جیسا کہ اینڈریوز کی زندگی کے بہت سے نازک موقعوں پر ہوا۔ خلاق استعانت کے جذبہ نے ان کے دماغ کو یکسو کر کے ان کی ذہنی طاقتوں کو تیز تر کر دیا۔ کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا گیا۔ پیغام شایع ہو گیا اور گاندھی نے اپنا برت ختم کر دیا۔

دوسرے دن اینڈریوز نے ایک مخصوص مراسلہ "مانچسٹر گارڈین" میں شایع کرایا۔

"یہ اطلاع کہ مہاتما گاندھی نے اپنا برت توڑ دیا ہے اور یہ کہ برطانوی حکومت کے فیصلہ کی خبر شملہ کی مجلس قانون ساز میں تالیوں کی گونج میں سنی گئی، اپنے اندر اس امر کا امکان رکھتی ہے کہ وہ ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ میں خیر سگالی اور امن کی جانب ایک زبردست انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

کیا میں ایسے شخص کی حیثیت سے جسے ان انتہائی مشکلات میں سے کم سے کم کچھ کا علم ہے اور جن پر قابو پانے کی ضرورت تھی، وزیر اعظم کی خدمت میں خراج تحسین پیش کر سکتا ہوں جنہوں نے اس موقع پر جرأت اور تدبر کی اعلیٰ صفات کا ثبوت دیا ہے؟۔ عام پبلک کے لئے ان خطرات کا سمجھنا بہت مشکل ہے جو درمیان میں حائل تھے اور جن پر جرأت رندانہ سے قابو پالیا گیا ہے۔

سب سے پہلا خیال یہ ہے کہ خدائے برتر کا دل کی گہرائیوں سے شکر ادا کیا جائے جس نے ایسی عظیم الشان باتوں کو رونما ہونے دیا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں ممالک میں خیر سگالی کے جذبات رکھنے والے اشخاص (مرد اور عورتیں) اس عظیم الشان موقع کو خدا کی خدمت کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔"

مسٹر میکڈانلڈ نے لکھا: "میری توجہ اس بیحد فیاضانہ اور اعلیٰ درجہ کی اسپرٹ رکھنے والے مراسلہ کی جانب مبذول کرائی گئی ہے جو کل کے "مانچسٹر گارڈین" میں شایع ہوا ہے۔ یہی وہ شخصیت ہے جس کا احترام کئی سال سے میرے دل میں ہے اور میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں

کو اس مراسلہ کا مجھ پر کس قدر گہرا اثر پڑا ہے۔[1]

یہ اینڈریوز ہی تھے جنہوں نے اس صدائے احتجاج کو انگلستان کے اخبارات میں شایع کرایا جسے ڈورناکل کے بشپ ازاریہ نے بھی ہندوستانی عیسائیوں کو جداگانہ حق رائے دہندگی . . . . کے خلاف پیچھے مذہب اور سچی حب الوطنی کے نام سے تعبیر کیا۔ یہ اینڈریوز ہی تھے جنہوں نے حکومت کی توجہ برت اور پونا پیکٹ سے پیدا ہونے والی ان تازہ کوششوں کی جانب مبذول کرائی جو ہندو مسلم اتحاد کے لئے کی جا رہی تھیں، اور جنہوں نے کامیابی کے ساتھ اس امر پر زور دیا کہ گاندھی کو اتحاد کے اس اہم کام کو انجام دینے کے لئے قید خانہ سے امدو پیام کی پوری آزادی حاصل ہونی چاہیے خود اینڈریوز نے بھی محسوس کر لیا کہ ان کی اپنی زندگی کے مقصد کی پوری پوری وضاحت ہو گئی ہے۔ انہوں نے گاندھی کو ۴ اکتوبر کو لکھا۔

"مجھے اپنی زندگی کے باقی ماندہ حصہ کا ایک ایک لمحہ اس نہایت اہم مسئلہ کے لئے وقف کر دینا چاہیئے۔ میرے لئے یہی حقیقت ہے اور یہی سچائی ہے، یہی چیز مجھے ہندوستان میں جنوبی افریقہ میں اور دوسرے مقامات میں لئے لئے پھرے گی، لیکن جہاں کہیں میں جاؤں گا یہ بدیہی مقصد پیش نظر رہے گا کہ عیسائی گرجا کے اندر کی چھوت چھات پر ضرب کاری لگائی جائے . . . . آپ مجھے ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ اس مقصد کی جانب لے آتے ہیں، جس کے لئے خدا تعالیٰ نے مجھے زندگی، صحت اور طاقت بخشی ہے۔ میں اس کے لئے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

انہوں نے انگلستان کے ضمیر کی توجہ اس خیال کی جانب مبذول کرائی کہ گاندھی کا ڈرامائی فعل اس قابل ہے کہ ان دوسرے میدانوں میں مساوی کوشش کی جائے۔ انہوں نے وولور ہمپٹن میں ایک عام جلسہ میں جس میں تقریباً ایک ہزار پادری شریک تھے، اس امر کا اظہار کیا کہ "میں اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جبکہ چھوت چھات نہ صرف ہندوستان سے بلکہ جنوبی افریقہ، امریکہ کی جنوبی ریاستوں اور ہر ایسی جگہ سے ختم ہو جائے گی جہاں عیسائی اپنے ان بھائیوں کے

---

[1] مکتوب بنام سی ایف اینڈریوز ۲۸ ستمبر ۱۹۳۲ء۔

ساتھ ذاتی عداوت کرنے سے انکار کرتے ہیں جن کا رنگ ان کے رنگ سے ذرا سیاہ ہے۔ جس مکمل اور بھرپور طریقہ سے یہ تقریر ہر سیاسی خیال کے اخباروں میں شائع کی گئی، وہ ثبوت ہے اس تبدیلی کا جو انہوں نے کسی دوسرے واحد شخص کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہندوستان اور گاندھی کی جانب جون اور اکتوبر ۱۹۳۲ء کے درمیانی مدت میں عام برطانوی رویّہ میں پیدا کر دی تھی۔

(۲)

ابتدائے نومبر ۱۹۳۲ء میں ایم کیلپّن نامی ایک شخص نے گُرو وَیُور (جنوبی ہند) کے ایک مندر میں "اچھوتوں" کے لئے حقِ داخلہ حاصل کرنے کے لئے "مرن برت" رکھا اور گاندھی نے بھی اعلان کیا کہ اگر یہ حق نہ دیا گیا تو وہ بھی پہلی جنوری ۱۹۳۳ء سے اس برت کی تقلید میں برت رکھیں گے۔ اس فیصلہ کی خبر پر اینڈریوز نے گاندھی کو ایک طویل خط بھیجا جس میں انہوں نے ایسے برت کے اخلاقی پہلو سے بحث کی ہے، بشرطیکہ اسے خودکشی کے درجہ تک نہ پہنچا دیا گیا ہو:

"میری اپنی ساری مذہبی تربیت اس طرح سے ہوئی ہے کہ میرے لئے خودکشی کا خیال تک ناممکن ہو گیا ہے۔

"مجھے ابھی تک اس خیال سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ کہ اس قسم کے عمل کو متعصب اور کم تر اشخاص ہر ایک مسئلہ کا جبری فیصلہ کرانے کے لئے استعمال کرنے لگیں گے جو ترقی پسند ہونے کی بجائے رجعت پسندانہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً نچلا پن، حتیٰ کہ وہ مجہت بھی جو چھچھلے پن تک پہنچ جائے، اس طریقہ سے ظالمانہ بن سکتی ہے۔ خود میرے تفکرات اور میرے خدشات کہاں تک انسانی محبت کے ساتھ مل جل گئے ہیں یہ میں بھی نہیں سمجھ سکتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں نے آپ کو بالآخر خود اپنی زندگی کو گزشتہ برت کے موقع پر اچھوتوں کے لئے قربان کرتے دیکھا ہے۔

— اور مجھے یہ دیکھکر بڑی مسرت ہوئی ہے کہ میں نے اس میں "عظیم محبت" کا جلوہ دیکھا۔ میں پھر آپ کو پہلی جنوری کو یہی کرتا ہوا دیکھ رہا ہوں البتہ مندر کے کرتا دھرتا خوف سے اس مدت میں سرِ تسلیم خم کر دیں۔[1]

---

[1] ۶ر اکتوبر ۱۹۳۲ء

"مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی خوشی کے ساتھ اپنی جان دے ڈالوں گا تاکہ صفحہ نام
کو ان لوگوں میں جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں، اور دوسری قوموں میں چھوت چھات دور کروں
لیکن بظاہر آپ اس مسئلہ کا جبریہ طور پر فیصلہ کرانے کے قریب پہنچ گئے ہیں اور مجھے مسیح کے
الفاظ میں اس پر غور کرنا ہوگا۔

"میرا خیال ہے کہ انہوں نے بھی فیصلہ کے لئے مجبور کر دیا تھا جبکہ وہ نہایت استقلال سے
یروشلم جانے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے اس وقت انہوں نے دیکھ لیا کہ صرف
اُن کی موت ہی یہودی لیڈروں کو جھکنے پر مجبور کر سکے گی۔ مسیح کا ایک عجیب و غریب قول ہے؛
خدا کی سلطنت تشدد برداشت کر رہی ہے اور تشدد پسند اسے بہ جبر لے رہے ہیں۔ علاوہ
ازیں مجھے یقین نہیں ہے کہ آیا ان کا ہیکل کو پاک و صاف کر لے کا فعل اسی نوعیت کا تو نہیں
ہے، یعنی جبریہ طور پر فیصلہ کرانے کا۔ لیکن برت رکھنے یعنی خود کشی کرنے کا طریقہ وجدانی
طور پر میرے دل میں کراہیت پیدا کر رہا ہے"[1]

جب ۱۹۳۳ء کی ابتدا ہوئی اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا مندروں میں داخلہ
کے سلسلہ میں قانون سازی کی اجازت دی جائے گی۔ گاندھی نے اپنا مجوزہ برت ملتوی کر دیا
تھا۔ لیکن جو چیز اینڈریوز کے لئے باعث تشویش رہی وہ یہ تھی کہ ممکن ہے کہ رجعت پسندانہ رجحان
رکھنے والی حکومت "مذہبی غیر جانبداری" کے اصول کی آڑ لیکر اور اس مسئلہ پر کسی پرائیویٹ بل
(مسودہ قانون) کو بھی پیش کئے جانے کی اجازت نہ دے۔ وہ انڈیا آفس اور کابینہ کو امداد پہنچانے کے
کام میں مصروف ہو گئے تاکہ وہ اندازہ لگالیں کہ اس کی تہ میں جو مسائل کار فرما ہیں ان کی اہمیت کس
قدر زیادہ ہے۔ لارڈ ہیلی فاکس (اُس وقت لارڈ ارون)؟ لارڈ ہیلی آف برٹش وُوڈ نے جو ریمزے میکڈانلڈ کے معتمد مشیر تھے، وعدہ کیا کہ
وہ ہندوستان کی گتھی کو سلجھانے میں "ہر ممکن امداد دیں گے اور انہی کے ایما سے اینڈریوز نے
ان کی ضرورت کے لئے ایک مختصر سی یادداشت تیار کر دی؛

اس ہفتہ میں نے انڈیا آفس سے طویل گفتگوئیں کی ہیں اور اس کے سامنے بعض چیزیں رکھی ہیں اور

---

[1] مکتوب بنام ایم۔ کے۔ گاندھی، ۱۰ نومبر ۱۹۳۲ء

میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی ان سے باخبر رہیں۔

(۱) مجھے یہ بات صاف دکھائی دیتی ہے کہ اگر وائسرائے نے مرکز میں اور صوبوں میں قانون سازی کی راہ میں مزاحمت کی تو اس کا نتیجہ خطرناک دھماکے کی شکل میں نکلے گا۔ .... اگر ایسا ہوا تو گاندھی برت رکھیں گے اور اس معاملہ میں ہندوستان کا ہر ہوشمند انسان ان سے ہمدردی رکھے گا......

(۲) اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر یہ قانون منظور ہوا تو وائسرائے کو نامنظوری کا حق حاصل نہ ہوگا اب بھی اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ مسودۂ قانون پر دستخط کرنے سے انکار کر دے اور وہ اسے پھر مجلس اصلاح قوانین کو دوبارہ واپس بھیج سکتا ہے بشرطیکہ اسے یہ احساس ہو کہ اس کا نتیجہ مذہبی چپقلش کی شکل میں نکلے گا......

(۳) میں نے اپنی پوری طاقت اس بات پر زور دینے میں صرف کر دی ہے کہ وائسرائے کو اعلان کر دینا چاہیے کہ وہ کھلم کھلا اور فراخدلی سے چھوت چھات کی لعنت کو دور کرنے کے حق میں ہے اسے اس کا اظہار اس جنوری کے آخر میں منعقد ہونے والے مرکزی اسمبلی کے اجلاس دہلی میں کر دینا چاہیے۔ برطانوی حکومت نے ہندو کے قانون چھوت چھات کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا ہے اور اب صحیح معنوں میں وقت آگیا ہے کہ وائسرائے ملک معظم کے نمائندہ کی حیثیت سے اعلان کر دیں کہ ہندوستان کی معاشی زندگی کے اس داغ کو دور کرنا ضروری ہے...... یہ ممکن ہے کہ چھوت چھات کو دور کرنے کے دوران میں مذہبی احساسات کا لحاظ رکھا جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ایسا کرنے کی غرض سے اس اصلاحی تحریک کو غیر معینہ وقت کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

(۴) چھوت چھات کے اس مسئلہ کو دور کرنے کے معاملہ میں حکومت ہند مسٹر گاندھی سے تعاون کر رہی ہے۔ وہ اس مسئلہ پر ان تمام آسانیوں کے لئے نہایت شکر گزار ہیں جنہیں وہ انہیں بہم پہنچا رہی ہے...... میں نے انڈیا آفس کے سرکاری عمال پر زور دیا ہے کہ وہ مسٹر گاندھی کے ساتھ ہر ممکن طریقہ سے تعاون جاری رکھیں اور ساتھ ہی ان کو آپریشن کے لیڈر مسٹر سی۔ راج گوپال آچاری کو بھی جو آج کل جیل سے باہر آ چکے ہیں، مشورہ کے لئے بلایا جائے۔ میں نے انڈیا آفس پر زور دیا ہے کہ مسٹر شاستری سے بھی مشورہ کرے اور یہ دیکھے کہ آیا کوئی فیصلہ جو سارے ہندوستان پر حاوی ہو، اور جس پر کانگریس لیڈر اور اعتدال پسند سب متفق ہوں، ہو سکتا ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ

اس اتحادِ عمل اور متحدہ کارروائی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی زبردست اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے ..... آپ کو بہ نظر احتیاط ان انتہائی خطرات کو بھی دیکھنا ہوگا جو اس طریقہ سے مسٹر گاندھی کو جیل میں رکھنے میں مضمر ہیں۔ آپ کا کسی تعلیم یافتہ جماعت سے سابقہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی جماعت سے آپ معاملہ کر رہے ہیں جو حقیقت کی بجائے روایت پر چلتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے مہاتما گاندھی کا جیل میں انتقال ہو گیا تو وہ آنے والے ہزار ہا سالوں کے لئے ایک افسانہ بن جائیں گے اور عوام کی روایتی رائے کے مطابق وہ طاقت جس نے انہیں قید کیا تھا، بلاشبہ ان کی موت کا سبب قرار پائے گی کیا یہ خطرہ اس قابل ہے کہ اسے برداشت کیا جائے جبکہ وہ یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی اچھوتوں کے لئے وقف کر دیں گے؟[۵۱]

لارڈ ایلن نے اس خط کا فوراً جواب دیا اور لکھا کہ وہ اس کی جملہ تجاویز کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسے ڈاؤننگ اسٹریٹ میں چھوڑ دیا ہے تاکہ اس کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا جا سکے مندروں میں داخلہ کے مسودۂ قانون کی اجازت دے دی گئی۔

ہندوستانی دستوری اصلاحات پر جو "قرطاسِ ابیض" مارچ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ وہ بالکل ناقابلِ اطمینان تھا اس لئے کہ "وہ برطانوی سیاست دانوں کے لئے لکھا گیا تھا اور اس میں سارا زور سنئے تجربہ کے درپردہ خطرات کے خلاف تحفظات پر دیا گیا تھا۔ لیکن اینڈریوز نے لندن کے انڈیا کن سلی ایشن گروپ کو مشورہ دیا جس کے کام سے وہ نہایت لرے طور پر وابستہ تھے کہ "وہ سیاسی تفصیلات اور سودے بازی کے معاملہ پر" اپنی طاقتوں کو ضائع نہ کرے بلکہ اپنی تمام قوتوں کو چھوت چھات پر مرکوز کر دے:

"یہ صورتِ حال ہندوستان کے مستقبل کے لئے نہایت ہی تشویشناک ہے اس لئے کہ اگر چھوت چھات دور کرنے کی یہ زبردست کوشش تعویق اور سرکاری لیت ولعل کی وجہ سے منتشر ہو جائیگی تو ہر چیز جو بنیادی طور پر حقیقی دستور کی تعمیر کے لئے اہم ہو سکتی ہے ضائع ہو جائے گی۔

میں اسے اس شدت سے محسوس کرتا ہوں اور اس کے بارے میں اپنی عیسائی ذمہ داری کا بھی جس

---

[۵۱] مکتوب بنام لارڈ ایلن ۱۴ جنوری ۱۹۳۳

تدراحساس ہے کہ میں دن رات یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کیا مجھے اس ملک کے آرام و آسائش میں زندہ رہنے کا ایسی حالت میں کوئی حق حاصل ہے کہ یا ہندوستان میں ان اچھوتوں کی زندگی میں حصہ دار نہ بنوں۔ اگر چھوت چھات دور کرنے کی یہ عظیم الشان تحریک ہماری غفلت سے ناکام ہوگئی تو ہم اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ ذمہ دار ہوں گے جتنے کہ ہم ہوتے اگر ہم قرطاس ابیض کے مندرجہ بنود پر غور کرنے کی کوشش کرتے اور اپنے مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہتے۔ اگر زیر بحث مسئلہ صحیح طریقہ پر سمجھ لیا جائے تو مجھے یقین ہے کہ انگلستان کا دل مہاتما گاندھی کے ساتھ ہوگا۔ وہ سیاست دانوں کو اس امر کی اجازت نہیں دیں گے کہ ہماری اپنی نسل کی سب سے بڑی اصلاحی تحریک تباہ و برباد ہو جائے۔"

بلاشبہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان عظیم الشان اصلاحات کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اونچی ذات کے ہندوؤں اور ہریجنوں میں خیرسگالی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ ان مقامات میں بھی جو بنارس کی طرح تقلیدی مذہب کے زبردست گڑھ سمجھے جاتے تھے۔ بظاہر "معجزہ سے کم نہ تھا"[1] زمانہ دراز کی مروجہ معاشرتی بندشوں کے ٹوٹنے کے بیانات کو جو گاندھی کے نئے ہفتہ وار اخبار "ہریجن" کے ہر پرچہ میں نکلتے تھے، اینڈریوز نے نہایت احتیاط اور دانشمندی سے سرکاری عمال اور مذہبی اخبارات کے لئے استعمال کیا۔

ان بلند توقعات میں مہاتما گاندھی نے خدائی مرضی سے مجبور ہو کر یہ محسوس کیا کہ انہیں قلب کی صفائی کے لئے تین ہفتے کا برت رکھنا چاہئے تاکہ وہ خدمت کے لئے بہتر طریقہ سے تیار ہو سکیں۔ اس مرتبہ انگلستان میں اس خبر پر ناک بھوں نہیں چڑھایا گیا بلکہ صرف حیرت اور پریشانی کا اظہار کیا گیا۔ خود اینڈریوز نے اپنے دوست کو یہ تار دیا:۔ "آپ کے فیصلہ کو میں جانتا ہوں اور اسے سمجھتا ہوں۔ محبت کے جذبہ کے ساتھ۔ چارلی ——— اس پیغام سے گاندھی کو بڑی مسرت ہوئی۔ انہوں نے جواب دیا: "جو تار آپ نے مجھے بھیجا میں اُسے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اسے سمجھ لیا۔"

---

[1] گاندھی:۔ اُن کی زندگی، کام اور اثر۔ مصنفہ بشپ چیٹرجی

خود اینڈریوز کو پورا پورا یقین تھا کہ یہ برت بخیریت گزر جائے گا۔ یہ جذبہ پچھلے ستمبر کے خوفناک کمپاؤ سے کس قدر مختلف تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آزمائش صرف محدود مدت کے لئے تھی۔ لیکن جب خبر آئی تو وہ لندن میں چار دن تک رہے تاکہ چرچل سے گاندھی کی فوری اور غیر مشروط رہائی کی اہمیت پر زور دیں۔ قید کی مدت ۱۹ر مئی ۱۹۳۳ء کو ختم ہونے والی تھی، گاندھی ۸ر مئی کی شام کو چھوڑ دیے گئے یعنی اس دن جس دن انہوں نے برت کا آغاز کیا۔ جب تک برت جاری رہا اینڈریوز تقریباً ہر روز انہیں تار بھیجتے تھے۔ انہوں نے بے پروائی سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ کفایت شعارانہ نہیں ہے، لیکن میں ایسا کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور ساتھ ہی انہیں مسرت ہوگی۔"

وہ نہایت پُرسکون طریقہ سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے جو وقتی طور پر ان کے سامنے تھا یعنی یہ کہ وہ لنکا شایر میں ونسٹن چرچل کے شہنشاہیت پسندانہ پروپیگنڈا کا مقابلہ کریں، اپنی اس خاموش تجویز کے ذریعہ کہ خیر سگالی کے جذبہ کے بغیر تمہاری کوئی تجارت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(۳)

ان تمام مہینوں میں اینڈریوز ووڈبروک کی کوئیکر نوآبادی میں جو برمنگھم کے مضافات میں تھی، اس طرح سے رہ رہے تھے گویا وہ ان کا اپنا گھر ہے۔

ووڈبروک کے کوئیکروں کے ساتھ ان کے تعلقات ۱۹۲۸ء سے بہت گہرے ہو گئے تھے شانتی نکیتن کے ساتھ ان کے ذاتی تعلق میں مزید تقویت اس لئے بھی پیدا ہو گئی کہ وہاں کی کونسل نے شانتی نکیتن کے ایک طالب علم ڈاکٹر امیا چکرورتی کو فیلوشپ عطا کی تھی اور اس لئے بھی کہ ٹیگور ۱۹۳۰ء میں دو مرتبہ وہاں گئے تھے۔ غیر رسمی گھریلو ماحول اور ووڈبروک کے آزاد مذہبی فیضان نے اینڈریوز کے دل میں ان کے پیارے وطن ہندوستان کی یاد تازہ کر دی اور جب کبھی انہیں لکھنے کے لئے فرصت کی ضرورت ہوتی وہ اسے اپنا مستقر بنا لیتے جیسا کہ ۱۹۳۳ء کی ابتدا میں وہ کر چکے تھے۔ ہندوستان میں معاشرتی اصلاحات کے بارے میں ان کے پاس جو مواد تھا اس کے لئے بہت غور و فکر کی ضرورت تھی تاکہ اُسے اس طریقہ سے استعمال کیا جائے کہ بہترین فوائد مرتب ہوں اور یہ کام لندن کی عجلت پسند

فضا سے دور رہ کر ہی بہتر طریقے سے انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس زمانہ میں ان کے نہایت اہم خطوط زیادہ تر ہاتھ ہی سے لکھے جاتے تھے۔ انہوں نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔ "آپ جانتے ہیں کہ ذاتی تحریری خطوط جن کے ساتھ اور متعلقات نہ ہوں، آج کل کے زمانہ میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ ہر ایک شخص کے پاس ٹائپ شدہ گشتی خطوط کا انبار ہوتا ہے"۔

مزید برآں اینڈریوز نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب "کرائسٹ ان دی سائی لینسز" کو مکمل کر دینا چاہیئے۔ اسے شایع ہو جانا چاہیئے، انہوں نے لکھا:۔

"یہ امر واقعہ بالکل صحیح ہے کہ میں انگلستان میں رہ کر ہندوستان کے لئے جو کچھ کر سکا ہوں اس کی اہمیت اس نئی کتاب (یعنی "واٹ آئی او ٹو کرائسٹ") کی اشاعت کے بعد سے بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب سے پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ میں گاندھی کا پُر جوش چیلا ہوں اور بس۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں وہ میری بات اب سنجیدگی سے سنتے ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ چیز غیر معین ہے۔ اور جو کتاب میں اب لکھ رہا ہوں یقینی طور پر اس سنجیدگی میں مزید اضافہ کر دے گی۔۔۔۔ اس کے ہر حصہ میں ہندوستان کی جھلک موجود ہے ۔۔ اس سکون کی تمنا جسے مشرق نے اب تک برقرار رکھا ہے اور جسے مغرب تقریباً کھو چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ میرے ہم خیال ہوں گے کہ اس کام کو ضرور مکمل کر لینا چاہیئے مگر پورے طور پر یہ کتاب اس عجلت میں تیار نہیں ہو سکتی جس عجلت میں دوسری کتاب جو زیادہ واقعیت پسندانہ ہے، ۸ نائینٹس برج میں تیار ہو گئی تھی"[۱]۔

۱۹۳۱ء کے کرسمس کی صبح کو اینڈریوز پہلی مرتبہ افریقیوں کے آزمودہ دوست اور حمایتی جان وہائٹ آف سے شونالینڈ سے ملے جو اب صاحب فراش ہو چکے تھے اور ووڈ بروک کے قریب اپنے مکان میں سرطان کے مرض میں زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے ابتدائی تین مہینوں میں وہ اس یکساں مذاق رکھنے والے شخص سے روزانہ ملنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ زمانہ زیادہ تر دعاؤں میں اور ان کی آنے والی کتاب کے متعلق مشوروں میں صرف ہوتا تھا۔ ایسٹر کی اتوار کو جبکہ شاندار اپریل کی دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دونوں دوست جان

---

[۱] مکتوب بنام اے۔ایچ۔ مارچ ۱۹۳۲۔ تاریخ درج نہیں۔

ہیانٹ کے کمرے میں عشائے ربانی میں مشغول تھے وہ کام کے ختم ہوجانے پر حسرت کا اظہار کر رہے تھے اور اینڈریوز خصوصیت کے ساتھ شکر گزار تھے کہ تاریکی کے جو بادل پچھلے سال الیکشن کے موقع پر دہلی میں چھائے ہوئے تھے وہ سب چھٹ گئے ہیں۔

وڈبروک کے دور کے ایک اور نئے دوست ڈاکٹر رینڈل ہیرس تھے جو بہت با مذاق احمد پابند مذہب کویکر تھے۔ جب "کرائسٹ ان دی سائیلنس" شایع ہوگئی تو انہوں نے کہا "اس بات پر خوش نہ ہونا کہ پبلشر تمہارے ماتحت ہیں، بلکہ اس امر پر خوشی کا اظہار کرنا کہ تمہاری کتابیں آسمان سے نازل ہوئی ہیں" گاندھی نے بھی اگلا تھا ہیرسن کو اسی مضمون کا ایک خط لکھا۔ "ان کی کفایت شعاری کی طرح اینڈریوز کا پردہ بھی ایک دہوکا ہے اور وہ ظاہر تو یہ کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں اپنی کتاب کے لئے خاموش فضا کی ضرورت ہے، لیکن پھر وہ عین شور و شغب میں لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور اندرونی سکون پیدا کر دیتے ہیں"

"آسمان سے نازل ہونے والی کتابیں" ۔۔۔ "اندرونی سکون" ۔۔۔ "اندرونی سکون اور مسرت کا یہ روحانی تجربہ جسے دنیا نہ تو چھین سکتی ہے اور نہ دے سکتی ہے" بلا شبہ ان بعد کے سالوں میں بار بار وقوع پذیر ہوا، خصوصاً ان لمحات میں جب اینڈریوز مقدس یوحنا کی انجیل پر غور و خوض کر رہے تھے اس لئے کہ "کرائسٹ ان دی سائیلنس" انہی احساسات پر مشتمل ہے اس تجربہ کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کا شاذ و نادر ہی کہیں ذکر ملتا ہے، لیکن ایک خط میں جو اس زمانہ میں تحریر کیا گیا تھا، اس کی جانب کھلا اشارہ موجود ہے۔

"شعور اور روح کی سرحدوں کے مابین جو خط ہے وہ تقریباً ٹوٹ گیا ہے اور میں شعور کی دنیا سے مسلسل طور پر گذرتا رہتا ہوں ۔۔۔۔ یا یہ کہ "وہ" میری زندگی میں کبھی بغیر مختلف متعلق طریقوں سے آتے رہتے ہیں؟ اس کے باوجود میرا عقیدہ مسلسل اور پُرسکون نہیں رہتا" ابھی تھوڑی دیر میں اور تم مجھے دیکھو گے اور پھر تھوڑی دیر بعد تم مجھے نہ دیکھ سکو گے "میرے لئے حقیقت پر مبنی ہے"

یہ امر حیرت انگیز نہیں ہے کہ عبادت کے لئے خاموش اور پروگرام میں نہ دیئے ہوئے اجتماعات میں جن سے وڈبروک میں دن کے کام کا آغاز ہوتا تھا، وہ اپنے لئے

گھر کا سا ماحول پاتے تھے اور کبھی کبھی وہ اس خاموشی کو تسلی و تشفی یا اندرونی بصیرت کے الفاظ ادا کر کے توڑ دیا کرتے تھے۔ وہ بہت جلد مختلف ممالک سے آنے والے طلبا کے روحانی مشیر بن گئے۔ جن میں بعض ایسے بھی تھے کہ اس سے پہلے ان پر کوئی مذہبی اثر نہیں پڑا تھا۔

خاموشی کے معنی ان کی نظروں میں تعطل کے نہ تھے بلکہ وہ مضبوط بنیاد بنتی تھی تاکہ زیادہ عملی خدمت کر سکیں۔ ملٹن کو "گریز پا اور صومعہ تک محدود نیکی کے بارے میں جو عملی شکل اختیار نہ کر سکے اور گھٹ کے رہ جائے" جس قدر بدگمانی تھی اینڈریوز سے زیادہ اور کسی شخص کو اس سے اتفاق رائے نہ ہوگا۔ ان قیمتی ہفتوں میں جبکہ ہندوستان میں کوئی اہم واقعہ رونما نہیں ہوا اور لندن کو بھی کوئی اطلاع نہیں بھیجی گئی، وہ صبح کا وقت زیادہ تر ۴ بجے ہی سے غور و فکر میں اور لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ سہ پہر کو وہ برمنگھم کی گلیوں میں چلے جاتے اور وہاں بیماروں، بیکسوں اور محتاجوں کی تلاش میں نکلتے۔ گاندھی نے اس سلسلہ میں اپنے ایک دوست سے یوں اظہار خیال کیا تھا۔ "اقتدار رکھنے والے اشخاص سے جا کر ملنا ان کے لئے دوبھر تھا، مگر آپ جیسے اور مجھ جیسے اشخاص سے ملنا ان کے لئے انتہائی مسرت کا باعث تھا۔ وہ ان لوگوں سے جنہیں دنیا کمزور اور بیکس کہتی ہے اور جو بسا اوقات (اگرچہ غلطی سے) اپنے تئیں ایسا ہی محسوس کرتے ہیں تعلقات رکھنے میں طاقت محسوس کرتے تھے۔"

کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ "کمزور اور بیکس" اشخاص گنتی میں کتنے تھے، لیکن اتفاقیہ طور پر ان میں سے بعض کے بارے میں یادداشتیں محفوظ رہ گئی ہیں۔ لندن کی کنٹری کونسل کی اقامت گاہ سے دنیا کے ایک "ناکام" شخص نے یوں لکھا تھا۔ "آپ نے غیر شعوری طور پر میری اعانت کی ہے۔ میں روحانی طور پر بنجر زمین میں رہتا تھا جس سے ہم سب کو ایک نہ ایک دن گزرنا ہے، لیکن جس لمحہ میری نظر آپ پر پڑی میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں نئی طاقت آگئی ہے۔" یہ شخص کئی ایک اشخاص کا نمایندہ سمجھا جا سکتا ہے اور اینڈریوز بے دریغ ہر ایک کی مدد کرتے تھے۔ ایک نوجوان جاپانی نے جاپان پہنچنے کے بعد ایک خط میں جس پر "سی، ایف اے، جہاں کہیں وہ ہوں" کے الفاظ لکھے تھے، شکریہ کے ساتھ ان گفتگوؤں کا اعادہ کیا تھا جو میں نے برکلے اسکوئر میں آپ سے کی تھیں۔۔۔۔ آہ، جاپان میں آپ جیسا

کوئی مقدس آدمی کیوں (؟) موجود نہیں ہے؟" ان کے دوست صدائے احتجاج بلند کرتے اور کہتے کہ اپنی طاقت کو "زیادہ اہم کام" کے لئے محفوظ رکھئے۔ لیکن وہ کسی کی سنتے نہ تھے۔ ایک بوڑھی خاتون ان کے پاس پوسٹل آرڈر بھیج دیا کرتی تھی جس کی نسبت اینڈریوز کو ہی شبہہ رہا کہ بچاری سینت سینت کر جمع کرتی ہوگی۔ "ہنری (پولاک۔۔) مجھ سے بہت بگڑے اس لئے کہ میں نے اس عورت سے ملنے کی خاطر ایک پورا دن صرف کر دیا تھا، لیکن یہ ملاقات اس قابل تھی کہ اس کے لئے اتنا وقت صرف کیا جاتا۔۔۔ ہنری جذباتی آدمی ہے اور وہ ان جذبات کو دل ہی میں گھونٹ کر رکھتا ہے اور پھر ایک دم وہ پھٹ پڑتے ہیں!" خود ان کے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ یہی کیفیت تھی۔ ایک بھائی کو موٹر کے حادثہ میں دماغی صدمہ پہنچا تھا اور کچھ وقت کے لئے دماغی امراض کے ہسپتال میں اسے جانا پڑا تھا۔ اسی طرح نیوزیلینڈ میں ان کی ایک بہن تھی جس کا خاوند مرچکا تھا اور اس صدمہ کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ "واٹ آئی او ٹو کرائسٹ" کی آمدنی میں سے چارلی نے ان دونوں کی فیاضانہ امداد کی اور وہ مسرور تھے کہ وہ ایسا کرنے کے قابل ہوئے۔

ذاتی امور میں چارلی ویسے ہی غیر اصلاح پذیر رہے جیسے وہ تھے۔ حیرت زدہ میزبان عورتیں نہیں جانتی تھیں کہ ایسے مہمان کی کیسے دیکھ بھال کریں جو کبھی تو سامنے والے دروازے کے باہر علی الصبح ۵ ½ بجے بیٹھے ہوئے دھوپ نکلنے تک اخبارات کے لئے مضامین لکھنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، کبھی صبح کے وقت سونے کے کمرے کے سلیپر پہن کر باہر سیر کے لئے چلے جاتے ہیں، کبھی عبادت میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ ماحول سے غافل ہو جاتے ہیں، اور کبھی صبح کے ناشتہ کے لئے گھنٹہ گھنٹہ بھر دیر سے پہنچتے ہیں۔ ان کے کپڑوں کی الماری کے بارے میں بیشمار کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ مسز میک گریگر اس نے جو کینیا میں ان کی میزبان تھیں، ایک مرتبہ اگا تھا ہیرسین سے ٹیلیفون پر کہا کہ "سی۔ ایف۔ اے" نے اپنے بہت سے پائجامے میزبان کے مکان پر چھوڑ دئے ہیں اور یہ کہ وہ رات ایلی نور رتھ بون کے یہاں بسر کریں گے۔ ان کے بارے میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ریشاران سے اپنی وہ ٹوپی پہن کر کبھی باہر نہیں نکلے جیسے وہ داخل ہوتے وقت پہن کر گئے تھے اور وہ بظاہر پائجاموں اور جرابوں کے نقائص سے

غافل رہتے، یہانتک کہ وہ قابلِ مرمت بھی نہ رہتے۔ وہ درحقیقت اسی قسم کے کھوئے ہوئے پروفیسر تھے جن کا تذکرہ زیبِ داستان رہا کرتا ہے۔

ایک بہترین کہانی جو اُن کے متعلق بیان کی جاتی ہے، یہ ہے کہ ایک دن وہ سنٹرل لندن ہوٹل میں کسی ہندوستانی دوست سے اس کے کمرہ میں محوِ گفتگو تھے، انہوں نے اپنے جوتے اتار دئے تھے اور جرابوں میں آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک ان کی نظر گھنٹے پر جا پڑی۔ ہیمسٹیڈ میں ان کی جائے قیام تک پہنچنے کے لئے آخری زیر زمین ٹرین میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے! وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور زینے سے اتر کر سیدھے بازار میں پہنچ گئے۔ ان کے جوتے کمرہ ہی میں رہ گئے تھے اور وہ انہیں بھول چکے تھے۔ اتفاقاً ان کے میزبان کی نظر ان کے پیروں پر پڑ گئی۔ وہ دوڑ کر اوپر گئے اور بھاگم بھاگ بازار میں سے ہوتے ہوئے وہ بالآخر اپنے مہمان تک پہنچ گئے اور جوتے ان کے حوالے کر دئے۔ اس وقت وہ ٹکٹ لے رہے تھے۔

یہ شریف غیر دنیادار مقدس شخص جو محتاج روحوں کا رکھوالا تھا اور وزرائے سلطنت کا مشیر تھا، ابھی تک برمنگھم والے اسکول کا طالب علم ہی تھا جو ۵۰ سال قبل سٹن کے جنگلوں میں گزرتے ہوئے ان کے حسن سے مدہوش ہو جایا کرتا تھا۔ تیس سال تک اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد ان میں تڑپ پیدا ہوئی کہ وہ واپس گھر جانے کی مسرت سے لطف اندوز ہوں۔ اور انگلستان میں دوبارہ اپنے گھر میں ہونا! ایک مرتبہ پھر موسم بہار کے پھولوں کو کھیتوں کو دیکھنا نہیں میں تتلیاں مدہوش کر دینے والی تھا! ان میں سے سونے کی روشنی کو اس کی حمایت و عنایتوں کے ساتھ چمن چمن کو گزرتے دیکھنا اور الیسٹر کی اقاموں کو ڈیفوڈل[1] لے کر اس قبر پر جانا جہاں میرے والدین سپردِ خاک کئے گئے تھے۔ ان سب باتوں کے لئے میں خدا کا کما حقہٗ شکر ادا نہیں کر سکتا ہے[2]

(۴)

"کرائسٹ ان دی سائیلنس" پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو اینڈریوز نے "سادھو سندر سنگھ"

---

[1] ایک قسم کے پھول [2] کرائسٹ ان دی سائیلنس صفحہ ۲۹۰

لکھنی شروع کر دی، مگر ان کے سکون کا زمانہ ختم ہو رہا تھا۔ انہوں نے گاندھی کے ساتھ اتفاقِ رائے کیا کہ انہیں سیاسی سودے بازی سے بڑھکر اور زیادہ گہری سطح پر رہ کر ہندوستان کے لئے کچھ کام کرنا چاہیئے۔ ان کے لئے یہ سطح اپنی ذاتی دوستی کی سطح تھی جو دوسروں میں اعتماد پیدا کرتی ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے کلیساؤں کے لیڈروں، اور "آکسفورڈ گروپس" کی طرح کی غیر مذہبی تحریکوں سے تعلق قائم رکھا، جو مسائل پر نئے اسلوب سے بحث کرنے میں کوشاں تھے۔ خود انہوں نے بھی محسوس کیا کہ کینٹربری کے لاٹ پادری ڈاکٹر کاسمو لینگ سے، ان کی دوستی کا نتیجہ تھا کہ موخر الذکر نے جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں ہندوستان کا بہت زیادہ ساتھ دیا۔ انہوں نے اسی ذاتی دوستی کے ذریعہ کمیٹی کے ایک اور ممبر ڈاکٹر امبیڈکر کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کی اور ان کی قوم کی ضروریات اور دعاوی کی ہر تفصیل کے متعلق ان سے گفتگو کی۔ وہائٹ ہال میں، انہوں نے زور دیا کہ ہندوستان کے ساتھ بہ حیثیتِ مجموعی دوستانہ طریقہ سے برتاؤ کیا جائے اور ہندوستان کی طرف سے سیاسی معافی اور نئے آغاز کے لئے جو ذہنی عرشماشت آئی تھی اس کی پُرزور الفاظ میں تائید کی۔

لیکن یہ نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ جولائی میں گاندھی اپنے مئی والے برت کے اثرات سے افاقہ حاصل کر چکے تھے اور کانگریسی لیڈروں نے سول نافرمانی کو پہلی اگست سے واپس لے لینے کا ریزولیوشن بھی منظور کر لیا تھا "بشرطیکہ وائسرائے کا مہاتما گاندھی کے ساتھ کوئی باعزت معاہدہ ہو جائے۔" مگر وائسرائے نے اسے ناجائز "سودے بازی" سے تعبیر کیا اور گاندھی کو شرفِ ملاقات بخشنے سے انکار کر دیا۔

لہذا جب پہلی اگست کو گاندھی اپنے چند رفقائے کار کے ساتھ "انفرادی سول نافرمانی" کی مہم کا آغاز کرنے کے لئے سابرمتی سے روانہ ہوائے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا اور یرودا جیل دو بارہ میں انہیں ایک سال کی قید محض کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد انہوں نے درخواست کی کہ انہیں ہریجنوں کے لئے کام کرنے کی ویسی ہی آسانیاں دی جائیں جو انہیں گزشتہ

لے مکتوب بنام ایم۔ کے۔ گاندھی ۲۶ اگست ۱۹۳۳

مل میں دی گئی تھیں۔ اس درخواست کو نامنظور کر دیا گیا اگرچہ ان کی بجائے جزوی آسانیاں بہم پہنچا دی گئیں۔ گاندھی نے ان شرائط کو منظور نہیں کیا اور اس لئے انھوں نے رضاکارانہ برت کا آغاز کر دیا جو صرف "اپنی تسکین قلب کے لئے" تھا۔

دوسرے دن یعنی ۱۷ر اگست کو اینڈریوز بمبئی پہنچ گئے۔ جب ۲۲ جولائی والا ریزولیوشن انہیں انگلستان میں ملا تھا جس میں "انفرادی سول نافرمانی" کی اجازت دی گئی تھی، اسی وقت انہوں نے ہندوستان جانے کا قصد کر لیا تھا یہ اعتقاد کہ انہیں ضرور ایسا کرنا چاہئے۔ دعا کی حالت میں قائم ہوا تھا اور جس سرگرمی سے لارڈ اروِن، لارڈ سینکی اور جنرل اسمٹس (جو ان دنوں لندن میں تھے) نے اس پر لبیک کہا، اس کی وجہ سے ان کے اس عقیدہ کی تصدیق ہو گئی کہ ان کے فیصلہ میں خدائی ہاتھ بھی کارفرما ہے۔ اروِن نے کہا: "خدا آپ کو برکت دے" اور پھر یہ الفاظ کہے: "میرا محبت بھرا سلام اس عجیب و غریب بوڑھے آدمی سے کہہ دینا"۔ لہذا اینڈریوز اپنے پروگرام پر قائم رہے اگرچہ گاندھی نے انہیں انگلستان ہی میں ٹھہرے رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے اپنی آمد کی خبر دیتے وقت گاندھی کو لکھا: "مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے کہ آپ قطعی طور پر کوئی سخت قدم اٹھائیں، آپ کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ آپ مجھ سے مل لیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں خود آپ کا فیصلہ میرے فیصلہ سے کہیں بہتر ہے"[۱]۔

پہلی اگست کو انگلستان سے روانہ ہونے سے پہلے اور پھر جہاز پر سے بھی اینڈریوز نے اپنے آنے کے تار بھیجے مگر یہ تار قیدی تک نہ پہنچے۔ اگر یہ پہنچ جاتے تو اینڈریوز کو یقین تھا کہ برت کبھی نہ رکھا جاتا۔ لیکن گاندھی کو اپنے دوست کے فیصلے کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ اس تکلیف دہ برت میں ان کی حالت بہت خراب ہو گئی اور ۲۰ر اگست کو انہیں پونا کے سیسُون ہاسپٹل میں بھیج دیا گیا۔ اینڈریوز نے اسی دن لندن خط بھیجا جس میں لکھا تھا: "تشویش اور کھچاؤ میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن مجھے اس احساس نے اب تک سہارا دے رکھا ہے کہ خود خدا نے یہ مقدر کیا ہے کہ میں عین اس وقت یہاں پہنچ جاؤں جب کہ میری سخت ضرورت تھی"۔

---

[۱] مکتوب مورخہ ۲۶ر جولائی ۱۹۳۳ء

۲۲ اگست کو گاندھی غیر مشروط طریقہ پر رہا کر دیئے گئے۔ اینڈریوز کے ایک خط سے کچھ کچھ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا ایسے فیصلہ میں کیا حصہ تھا۔ جس نے بلا شبہ ان کے دوست کی جان بچائی :-

"بدھ کے دن خطرہ کا وقت آپہنچا جب میں صبح کے ۱۱½ بجے ان سے ملا اس وقت وہ بمشکل بول سکتے تھے .... انہوں نے اپنی مختصر سی چیزیں بھی وصیت کر کے تقسیم کر دی تھیں میرے آجانے سے ان کی حالت سنبھل گئی اور میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کریں گے۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر میں نے محسوس کیا کہ حکومت نے آخری لفظ کہہ دیا ہے تو میں اس صورت میں سب سے پہلے ان سے یہ بات کہہ دوں گا اور انہیں سکون سے مرنے دوں گا لیکن مجھے یقین نہیں۔ میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش جاری رکھیں گے اور پانی پی لیں گے۔ اس کے بعد میں ہوم سیکرٹیری کے پاس گیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر مجھ سے پہلے اسے آگاہ کر چکے ہیں۔ جونہی میں نے ہوم سکریٹیری سے کہنا شروع کیا کہ ذاتی طور پر میں نے کیا دیکھا ہے، ڈاکٹر واپس آگیا اور اس کی آمد کے تھوڑی دیر بعد بہت جلد رہائی کے حکم پر دستخط ہو گئے۔

خوش قسمتی سے اس وقت کوئی دوسرا آدمی ہمارے ساتھ نہ تھا جب کہ میں اور ڈاکٹر دونوں ساتھ ساتھ غلام گردشوں میں سے گزرے۔ ان سے یہ کہنے کے لئے کہ وہ رہا کر دیئے گئے ہیں۔ ہم دونوں نے ان پر زور دیا کہ ایمبولینس آنے سے قبل وہ نارنگی کا عرق پی لیں اور میں نے سنسکرت کی دعائیں پڑھیں اور ان کے مرغوب بھجن "لیڈ، کانڈلی لائٹ" اور "وین آئی سروے" گا کر سنائے۔ ڈاکٹر کا ابھی خدا حافظ کہنے کے لئے آگیا۔ گاندھی نے بڑی دقت سے اپنا سر اٹھایا اور کہا: "ڈاکٹر آپ کی انتہائی مہربانی کا شکریہ!"

منجملہ دوسری مشکلات کے ایک دقت یہ تھی کہ شہر کے جس مکان میں میں ٹھہرا ہوا تھا وہ طاعون زدہ تھا۔ مجھے خطرہ والے دن ٹیکہ دیا جانے والا تھا اور ایک لمحہ کے لئے بھی آرام کرنے کا موقع نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اس رات تیز بخار چڑھ گیا اور مجھے پانچ

دن کے بعد اس سے چھٹکارا ملا ہے۔ رہائی سے تین دن کے بعد مجھے آپ کا خط ملا جس میں مجھے میرے جگری دوست جان وہائٹ کے انتقال کی خبر دی گئی تھی، اور میں نے اتوار کا دن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ وہ میرے قریب ہیں، حیرت انگیز سکون کے ساتھ بسر کیا۔[1]

آنے والے دنوں میں ان کی طاقت آہستہ آہستہ عود کرتی گئی اور اینڈریوز نے یہ مدت اگاتھا ہیریسن ہینری پولک، کارل ہیتھ اور دوسرے ایسے اشخاص کو خطوط لکھنے میں صرف کی جو اہل انگلستان سے واضح طور سے یہ بتا سکتے تھے کہ گاندھی کے اصول کیا ہیں۔ انہوں نے لکھا:۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے برت کی تکلیف فضا کو پاک وصاف کرنے کے لیے ضروری ہے۔ جب میں نے ان سے کہا:۔ میں یہ دیکھ سکتا ہوں کہ آپ ہندو کی حیثیت سے تکلیف کے روحانی اثر کے بارے میں ہم سے مختلف خیال رکھتے ہیں، تو انہوں نے فوراً کہا:۔ ہاں، ایسا ہی ہے اور آپ کی کتاب "کرائسٹ اِن دی سائیلینس" کے پڑھ لینے سے مجھ پر یہ بات بخوبی واضح ہوگئی ہے۔ آپ اس کتاب میں بالکل انگریز معلوم ہوتے ہیں اگرچہ آپ ساتھ ہی ہندوستانی بھی معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ میں دو قسم کے تناؤ دیکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ انگریزی پہلو کی تشریح کریں۔ میں یہ بھی دیکھ سکتا ہوں کہ میں انگریزوں کو مخالف بنا رہا ہوں اور یہ آخری چیز ہے جسے میں کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک دوسری قسم کا خط سر سیموئیل ہور کے نام بھیجا گیا تھا:۔

"ہم ایک بڑی تباہی سے بچ گئے ہیں اور مجھے یہ معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی کی زندگی اتنی قیمتی ہے کہ ..... ذرا سی بات کے لئے اسے خطرہ میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ وہ اس اصلی خطرہ کے خلاف جس سے فی الحال ہندوستان دوچار ہو رہا ہے، یعنی انفرادی دہشت پسندی جو وسیع پیمانہ پر تشدد تک لے جائے، ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔

میں تقریباً ہر روز ان کے ساتھ رہا ہوں اور میں سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہر

---

[1] مکتوب بنام ایچ۔ جی۔ اے، ۲۸/ اگست ۱۹۳۳

لحہ وہ باعزت صلح کے آرزومند ہے ہیں لیکن وہ سول مقاومت کے اصول سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے جسے وہ ایک صحت مند سیاسی زندگی کے لئے بنیادی طور پر ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ اسے عملی جامہ پہنانا نہیں چاہتے بشرطیکہ اسے ملتوی کیا جا سکے لیکن وہ بطور ہتھیار کے اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔

انہوں نے کھلم کھلا اعلان کردیا ہے کہ وسیع پیمانہ پر سول نافرمانی خراب نتائج پر منتج ہوتی ہے‘ اس لئے انہوں نے اس کی بجائے انفرادی سول نافرمانی کو رائج کیا ہے کیونکہ انہیں پورے طور پر یقین ہے کہ خالص اور مذہبی تکلیف انسان کے ایسے بنائے ہوئے قوانین کو ختم کرانے کا بہترین ذریعہ ہے جو انسانی آزادی کے لئے خطرناک ہیں۔ اس اعتبار سے وہ ان "آرڈیننسوں" کو تباہ کن خیال کرتے ہیں۔ وہ بالکل مطمئن نہ ہوں گے اگر انہیں عملی جامہ پہنایا گیا۔ ان کی عزت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ ان سب لوگوں کی رہائی کے لئے کوشش کریں جنہوں نے عدم تشدد پر عمل پیرا ہو کر سول نافرمانی کر کے ان کے ساتھ دکھ اٹھائے ہیں۔

اپنے آخری برت کے نازک ایام میں مہاتما گاندھی نے مجھ سے ایک سے زیادہ مرتبہ اس حقیقت پر افسوس کیا کہ "انسانی لمس" "کلیتہً" غائب ہے۔ میں نے بسا اوقات یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب وہ کسی ایسے شخص سے ملتے ہیں جس پر انہیں بھروسہ ہوتا ہے اس وقت سب کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ صلح کے لئے جب کبھی باہمی طور پر کوشش کی جائے اس وقت انسانی لمس کے مسئلہ کو نہایت احتیاط سے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے"[1]

دہشت پسندی کے جس خطرہ کا ذکر اینڈریوز نے اس خط میں کیا ہے وہ حقیقی خطرہ تھا۔ چند سال قبل ایک نوجوان مسمی بھگت سنگھ نے ایک انگریز پولیس افسر کو قتل کیا تھا، اور اس کے نتیجہ میں پھانسی پائی تھی، ہندوستانی اہل الرائے کے ایک طبقہ نے اُسے بڑھا چڑھا کر شہید کا درجہ دے دیا تھا اور اسے ہیرو قرار دیا تھا گویا اس کی اس مثال کی پیروی کرنی چاہیئے ۔۔۔ "ہندوستان کا مائیکل کالنز"! اس کے بعد قتل کے اور واقعات بھی ہوئے۔ ایسے

---

[1] مکتوب مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۳۳

واقعات بھی جن میں قتل کرنے کی کوشش نوجوان مردوں اور عورتوں کی طرف سے کی گئی تھی سیاسی حربہ کے طور پر خفیہ طریقہ سے قتل کا اقدام ایسی چیز تھی جس نے بہت سے بہی خواہ انگریزوں کی ہمدردی کو بھی زائل کر دیا تھا۔

اینڈریوز نے دوسرے جملہ ذمہ دار ہندوستانی لیڈروں کی طرح دہشت پسندی کی مذمت کی لیکن انگریز ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ شملہ میں ان کے جو ہموطن ہیں وہ اسے محسوس کرلیں کہ تعزیری اقدامات بجائے خود صرف بیماری میں اضافہ کرنے کا باعث ہوں گے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ سچی سیاست کا تقاضا ہے کہ اس کے بنیادی اسباب کو تعمیری طور پر دور کیا جائے، یہ اتفاقی چیز نہیں ہے کہ بنگالی طالب علم جس نے اتنے عرصہ تک ظلم اور جاسوسی کے ماتحت تکالیف سہی ہوں اور جو اقتصادی نازک صورت حالات کی وجہ سے ۱۹۳۰ میں سخت پریشانی اٹھا رہا ہو، دہشت پسندوں کے اثرات کو سب سے زیادہ قبول کرنے والا ثابت ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ اور زور دیا کہ ہندوستانی طالب علم کے نقطۂ نظر کو ہمدردانہ طریقہ سے سمجھا جائے اور اس کے ساتھ فیاضانہ اور دوررس سلوک کیا جائے تاکہ وہ ہندوستانی کیرکٹر کی گرم جوش فیاضی سے اس کا جواب دے سکے۔

ان کی اس اپیل کا حوصلہ افزا جواب نہیں دیا گیا۔ جواہرلال کے اس طرزِ عمل سے کہ انہوں نے جزائر انڈمان کو تعزیری نوآبادی کے طور پر استعمال کئے جانے کے خلاف ایک پُروقار اور روزنی درخواست پر دستخط کئے تھے، حامیانِ حکومت نے یہ سمجھا کہ وہ "دہشت پسندی کو ترقی" دیتے ہیں، اور خود گاندھی پر بھی یہ الزام لگایا گیا کہ وہ "بھگت سنگھ کے مسلک" سے اغماض کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ کھلم کھلا اور نہایت واضح الفاظ میں اس کی مذمت کر چکے تھے۔ ایسے ظالمانہ اور غیر منصفانہ الزام کی موجودگی میں اینڈریوز کے لئے آسان نہ تھا کہ وہ تقریر و تحریر میں ضبط و عمل سے کام لیں۔ مگر بعض اوقات انہوں نے ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیزی سے کام لے کر اپنے دلائل کو کمزور بنا لیا۔ تعزیری اصلاح کا معاملہ بہت ہی مضبوط تھا۔ اینڈریوز نے انڈمان کے نظم و نسق کے خلاف غیر محتاط طریقہ سے الزامات کو دہرا کر اسے اور زیادہ مضبوط

نہیں بنایا اس لئے کہ ۱۹۳۲ء میں وہ الزامات درست نہ تھے۔ اگرچہ ۱۹۱۹ء میں وہ کتنے ہی حق بجانب کیوں نہ ہوں۔ انہیں پولک کی تنبیہہ کی ضرورت تھی تاکہ وہ بعض مفروضہ "سخت گیری" کے مخصوص واقعات کے بارے میں "ناکافی مستند شہادت" پر اعتماد نہ کیا کریں۔ انہوں نے اپنے مقدور بھر کوشش کی کہ وہ بینا داس کو انڈمان بھیجے جانے سے روکیں۔ یہ وہ لڑکی تھی جس پر قتل کرنے کی کوشش کا الزام تھا۔ ان کا مقصد دانشمندانہ اور رحیمانہ تھا۔ لیکن انہوں نے پرجوش مبالغہ آمیزی سے کام لے کر اس مقصد کو نقصان پہنچا دیا۔ اس لئے کہ انہوں نے لارڈ اِروِن سے یہ کہا تھا کہ وہ "بنگال کی شریف ترین نوجوان لڑکیوں میں سے ایک ہے۔" قوت فیصلہ کی ان کوتاہیوں کی وجہ سے اینڈریوز پر دوستانہ حلقوں میں بار بار یہ الزام لگایا گیا کہ وہ "یک طرفہ" رہتے ہیں یا یہ کہ "ان کا دل بھی ان کے دماغ کے ساتھ گھوم جایا کرتا ہے۔"

(۵)

نومبر ۱۹۳۳ء کے آخر میں اینڈریوز انگلستان پہنچ گئے اور وہاں انہوں نے زور دیا کہ سیاسی اور اقتصادی صورتِ حالات کی نزاکت کا شدید اور تخیلی کارروائی سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ تاکہ اعتماد اور خیر سگالی پیدا ہو۔ بنگال کی صورتِ حالات کا اور قیدخانوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے دیانتدارانہ، مکمل اور آزادانہ تحقیقات کی جائے اور زراعتی بحران کو دور کرنے کے لئے قرضوں میں سختی سے تدریجی کمی کی جائے۔" انہوں نے ایک نامہ نگار سے کہا: "میں مبلغ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں تاکہ ہندوستان کے بارے میں ہماری اخلاقی حس میں ترقی ہو۔" ان کا ارادہ یہ تھا کہ وہ لندن پر اپنی توجہ کو مرکوز نہ رکھیں بلکہ صوبوں میں مذہبی اور یونیورسٹی کے مرکزوں پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں "جہاں رائے عامہ بنتی ہے اور اس قوم کی اخلاقی حس ترقی پاتی ہے۔"

یہ پروگرام اس شکل میں کبھی پورا نہیں ہوا جس میں اسے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس اینڈریوز ہندوستان اور مغرب کے درمیان اپنے بے پایاں جذبۂ مصالحت کی وجہ سے "پرواز گیند" کی طرح اِدھر اُدھر جاتے رہے اور ۱۹۳۴ء کا سال تو تقریباً مسلسل سفروں کا زمانہ تھا۔

۱۵ر جنوری کو زمانۂ حال کا نہایت زبردست زلزلہ آیا جس نے صوبۂ بہار کو تباہ و برباد کردیا۔ ٹیگور نے اینڈریوز کے نام ایک طویل اور تفصیلی تار بھیجا جس میں تباہی و امداد کی وسعت کا ذکر تھا اور اینڈریوز نے اس کے بعد سے امدادی رقوم جمع کرنے والی جماعت میں کام کرنا شروع کردیا۔ مابعد کے چار مہینوں میں وہ سارے برطانوی جزائر میں اور مغربی یورپ کے شہروں میں گھومتے رہے اور اس عرصہ میں وہ تحریر و تقریر اور ریڈیو کے ذریعہ اپنی اپیل عوام تک پہنچاتے رہے۔ انہوں نے بڑی عجلت سے عوام میں پبلسٹی کرنے کے لئے ایک کتاب "ہندوستانی زلزلہ" لکھی۔ سروس سول انٹرنیشنل کے سوئس بانی پیئر سیرے سول رضاکاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت لے کر بہار پہنچے تاکہ دوبارہ تعمیر کی حقیقی محنت کے کام میں ہندوستانی کاشتکاروں کا ہاتھ بٹائیں۔ اینڈریوز کی انکی عملی ہمدردی کے مظاہرہ سے بیحد خوش ہوئے اور انہوں نے ہندوستان متعدد مراسلے بھیجے تاکہ ان کے لئے راستہ تیار کیا جائے۔ اس کے بعد وسط مئی میں وہ پھر جنوبی افریقہ روانہ ہوگئے۔ واٹرلو سے جب ان کی گاڑی روانہ ہوئی عین اس وقت انہوں نے آخری ہدایت، تار اور احکام صادر کئے۔ اگاتھا ہیریسن کی ڈائری کے اندراجات یہ ہیں "سی۔ایف۔اے کو الوداع کہا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُن کے تھیلے میں جوتے، اینوٹر فروٹ سالٹ، کتابیں اور سیب ڈالے۔۔۔۔۔۔"

اینڈریوز نے بہار کے زلزلہ زدگان کے لئے جنوبی افریقہ میں چندہ جمع کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ انہیں نہ صرف ان کی فوری ضرورت کا احساس تھا بلکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ ایسے دوستانہ جذبہ کے اظہار سے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات پر جو اثر مترتب ہوگا وہ نہایت زبردست ہوگا۔ اگرچہ ان کی اپیل ناکام ہوئی تاہم وہ بددل نہیں ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

جس کوشش میں رات دن صرف ہوئے اور جو نہایت شاندار طریقہ سے کامیاب ہوسکتی تھی۔ وہ ناکامی پر منتج ہوئی ہے۔ لیکن اس کا ذرا خیال کیجئے کہ اگر وہ کامیاب ہوجاتی تو کیسے اچھے نتائج برآمد ہوتے! یہ انگلستان سے باہر اچھے مقصد کی جانب پہلا قدم ہوتا اور جنوبی افریقہ کے خلاف جو بدمزگی آج پائی جارہی ہے وہ بہت بڑی حد تک دور ہوجاتی لیکن ہمیں ان مایوسیوں سے گھرا اٹھنا لینا چاہئے اگر کچھ بھلائی کرنی مقصود ہو۔ مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ میں نے کوشش کی اور

ناکام ہا۔

جنوبی افریقہ کی اس سیاحت میں اینڈریوز نے مقامی ہندوستانی باشندوں کی بہبودی سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھا اگرچہ وہ لازمی طور پر ان کے معاملات سے دلچسپی لیتے رہے۔ اب ان کے سامنے زیادہ بڑے مسائل تھے۔ وہ جنرل اسمٹس سے جو موسم خزاں میں انگلستان آنے والے تھے، ان عظیم الشان دستوری تبدیلیوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے جو قریب الوقوع تھیں۔ اسمٹس کا اثر انگلستان میں بہت زیادہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ اسمٹس اور گاندھی ایک دوسرے کو پورے طور پر سمجھ لیں۔ کیپ ٹاؤن سے وہ شمال کی جانب رہوڈیشیا ہو کر گزرے اور انہوں نے میشونا لینڈ میں جان وہائٹ کے افریقی دوستوں سے اور ان کے انگریز رفیق کار شاعر آرتھر شیرلی کریپس سے ملاقات کی اور اس تذکرہ کے لئے مواد جمع کیا جسے بالآخر انہوں نے ۱۹۳۵ میں شایع کر دیا۔ اگست میں وہ پھر ہندوستان آ گئے اور گاندھی اور قومی لیڈروں کو اپنی گہری ذاتی معلومات کی بنیاد پر بتایا کہ وہ کونسی حقیقتیں اور شخصیتیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کی جانب انگلستان کی پالیسی پر اثر ڈالا اور ساتھ ہی انہوں نے ہندوستانی رائے عامہ کے جدید رجحانات سے اپنے آپ کو واقف کرایا۔ ان دنوں اقتصادی صورتِ حال پچھلے سال کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تشویش ناک تھی۔ طویل اور مسلسل بیکاری اور بھوک ملک میں متشددانہ انقلاب کے بیج بو رہے تھے، خود کانگریس کے اندر نوجوانوں کا تشدد پسند طبقہ روز بروز طاقتور بن رہا تھا۔ جواہر لال نہرو ابھی تک نینی جیل میں تھے۔

چھ ہفتے تک اینڈریوز مختلف معتمد دوستوں سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے اور کبھی وہ ایک مقام کو اپنا محبوب گھر بناتے اور کبھی دوسرے کو، ہر جگہ وہ اپنی محبت کی پُر جوش لہر اور مسکراتی ہوئی خوش طبعی کی گونج چھوڑ جاتے۔

مہادیو دیسائی نے لکھا: "ان کے ہونے سے باپو کو تقویت پہنچتی ہے اور گاندھی سیاسیات سے کنارہ کشی کر کے اپنے دوست کو ان کی حیرت انگیز ڈاڑھی کے بارے میں چھیڑ کر گہری مسرت محسوس کرتے ہیں۔" الہ آباد میں نینی جیل کے علاوہ یاترا کا ایک دوسرا مقام بھی تھا، اس لئے کہ شدھ سیر

گورنمنٹ وہاں بس گئے تھے اور ان کے چھوٹے بچوں کی نگاہوں میں چارلی کو دادا کا درجہ حاصل تھا ان کی سب سے آخری اور سب سے عزیز جگہ شانتی نکیتن تھی۔ ایما چکرورتی نے لکھا "ہمیں خوشی ہے کہ سی۔ ایف۔ اے آج صبح پہنچے۔ تمام آشرم میں زندگی پیدا ہو گئی ہے اور شاعرِ اعظم ان سے دوبارہ ملنے کے لئے بچے کی طرح بے چین ہیں"۔ جہاں تک اینڈریوز کا تعلق ہے وہ محبت جو کہ ان دعاوی میں جو انہیں شانتی نکیتن سے تھی اور خود اپنے پیشے کے مطالبات میں کوئی آویزش محسوس نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں ٹیگور کو لکھا: "شانتی نکیتن کا گھیرا زیادہ بڑی دنیا ہے اور مجھے اس سارے گھیرے کے گرد اگرد سفر کرنا پڑتا ہے تاکہ مرکز تک پہنچوں"۔

اکتوبر میں وہ واپس انگلستان آ گئے اور ہائیڈ پارک کے ایک سرے پر مسز ایلگزینڈر اٹیسٹ کے مکان میں فروکش ہوئے تو وہ اپنی صبح کی چہل قدمی کے لئے ہائیڈ پارک جایا کرتے تھے۔ انڈیا آفس میں انہیں اب ہر شخص جانتا پہچانتا تھا اور انہوں نے سر سیموئیل ہور، لارڈ اِروِن اور دائٹ پادری سے نہایت قریبی تعلقات قائم رکھے۔ جو امور اب انہوں نے پیش کئے ان پر پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دوستی اور گہری دلچسپی سے توجہ دی جاتی تھی۔ انہوں نے اقتصادی نا انصافیوں کا اور تشدد کے بڑھتے ہوئے رجحان کا ذکر کیا۔ اور زور دے کر کہا کہ گاندھی کی جانب اور ان لوگوں کی جانب بھی جو غیر متشدد قومیت میں ان کے ہم نوا ہیں، واضح اور دوستانہ فیاضی کا سلوک روا رکھنا چاہئے اور سب سے بڑھ کر انہوں نے نہرو کی رہائی کا مطالبہ کیا۔

جنرل اسمٹس برطانیہ پہنچ گئے تھے اور انہوں نے سینٹ اینڈریوز کی یونیورسٹی میں جو معرکۃ الآرا ایڈریس دیا اس میں انہوں نے بتایا کہ "آزادی کے مسئلہ کے بارے میں اب مزید ٹال مٹول نہیں کی جا سکتی"۔ انہوں نے اور اینڈریوز نے ان تدابیر پر بحث کی جن کے ذریعہ اس تعطل کو دور کیا جا سکتا تھا۔ جس کے پیدا ہونے کا ہندوستان کی دستوری اصلاحات کی جوائنٹ پارلیمنٹری

---

[1] سینٹ اسٹیفنز کالج کے پرنسپل ایس۔ کے۔ رُدرا کے بیٹے تھے اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر تھے۔ بہت ہونہار تھے اور اپنے باپ کے سچے جانشین۔ چند مہینے ہوئے تو دریا میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے۔ مترجم۔

کمیٹی کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد خطرہ تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا بل فروری ۱۹۳۵ میں پیش ہونے والا تھا۔ اینڈریوز نے برٹش براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے دعوت نامہ کو قبول کرلیا کہ اس کے پیش ہوجانے پر جو نشریہ جاری کیا جائے گا اس میں وہ اس کے بنیادی اصول سے بحث کریں۔ لہذا وہ ایک مرتبہ ہندوستان پھر واپس آئے اور ۶ دسمبر کو اس لئے بمبئی میں اُترے تا کہ وہ ہندوستان کے سربرآوردہ اشخاص سے مل کر معلوم کریں کہ رپورٹ کے بارے میں ان کا ردعمل کیا ہے اور اس طرح ۲۴ جنوری کو ہونے والی تقریر کو مکمل کریں۔

(۶)

۳۵-۱۹۳۴ کے موسم سرما کے جو ریکارڈ مل سکے ہیں ان سے واضح ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے مصالحتی کام میں ڈبل پارٹ ادا کررہے تھے۔ ایک طرف تو اپنے نشریہ میں انہوں نے برطانوی پبلک کے ہر فرد سے ان بڑے بڑے انسانی اخلاقی اصول کے ماتحت اپیل کی۔ ان کی تقریر کا بنیادی خیال یہ ہے:-

"سب سے پہلی چیز کرنے کی یہ ہے کہ ہندوستان کی نفسیات کو سمجھا جائے بجائے اس کے کہ ہندوستان پر وہ چیز مسلط کردی جائے جسے انگلستان اس کے لئے اچھا سمجھتا ہے مگر کمل آزادی، مکمل قومیت اور مکمل نسلی مساوات کو ہم بنیادی اصولوں کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں اور اپنی زندگیوں میں بھی انہی پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو پھر شرائط کے بارے میں بہت کم تنازعہ باقی رہ جائے گا اس لئے کہ ہندوستان کی نفسیات ہی ایسی چیز ہے جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہم نے ابھی تک ہندوستان کے قلب کو نہیں چھوا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنے بہترین ارادوں کے باوجود سخت غلطیاں کی ہیں"۔

مسودہ قانون پر خصوصیت سے نکتہ چینی کرتے ہوئے انہوں نے مساوی طریقہ سے قوم کے اخلاقی ضمیر سے اپیل کی:-

جوائنٹ پارلیمنٹری رپورٹ میں ڈومینین اسٹیٹس کا ذکر تک نہ ہونا حالانکہ ساری گول میز کانفرنس کی کارروائی اسی نظریہ سے شروع ہوئی تھی کہ حقیقی مقصد یہی ہے وہ ایک قسم کی وعدہ

خلاف ہے اور ہندوستانی رائے عامہ اسے ایسا ہی سمجھتی ہے۔ یہ دلیل کہ جدید دستور عزلاکی حفاظت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے مرکزی مجلس واضعانِ قوانین کے قیام کی بالکل نقیض ہے جہاں رجعت پسندانہ معاشرتی اور مالی مفاد کی اس قدر پختہ طریقہ سے حفاظت کردی گئی ہے۔"

ان کی کتاب "ہندوستان و برطانیہ: ایک اخلاقی چیلنج" میں بھی جسے انہوں نے کچھ عرصہ بعد ہی شروع کردیا تھا اور مابعد کے تین چار مہینوں میں اسے مکمل کرلیا تھا، اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا گیا ہے۔

دوسری طرف انہوں نے ان لوگوں کے سامنے جو تفصیلی معلومات رکھتے تھے اور براہِ راست ذمہ داری کے حامل تھے، مخصوص قسم کی عملی تجاویز رکھیں تاکہ مسودۂ قانون پر جو نکتہ چینی ہندوستانیوں کی طرف سے کی گئی ہے، اسے مطمئن کیا جاسکے۔ جس مرکزی اصول کے لئے انہوں نے استدلال پیش کیا وہ یہ تھا کہ خود قانون میں اس کے اہم جزو کی حیثیت سے ایسی مشینری کا انتظام کردیا جاتے جس کے ذریعہ یہ ممکن ہوسکے کہ خود ہندوستانی پارلیمنٹ سے استصواب کئے بغیر اس میں ترمیم و تنسیخ کرسکیں۔ یہی وہ اصول ہے جس پر ان میں اور اسمٹس میں اتفاق رائے ہوگیا تھا اور ان کے خیال میں اس اصول کا سب سے بڑا اطلاق "کمیونل اوارڈ" کی نظرثانی تھی جسے مسودۂ قانون کی مندرجہ دس سالہ مدت گزرنے سے پیشتر متعلقہ فرقے باہمی رضامندی سے بدل سکتے تھے۔ اگر یہ نہ ہوا تو ان کے خیال میں بنگال میں صورتِ حال نہایت نازک ہوجائے گی جہاں "کمیونل اوارڈ" کے تحت یورپین تاجروں اور اچھوتوں کی غیر معمولی نمائندگی ہندوؤں پر نہایت مخالفانہ طریقہ سے نظرانداز ہوگی۔ جہاز پر اپنے سفروں کی موقعوں پر اور خود ہندوستان میں بھی وہ متعلقہ فریقوں کے لیڈروں کے ساتھ طول طویل مباحث کرتے رہے اور انتہک طریقہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ متضاد مفاد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا کونسا منصفانہ اور عملی طریقہ ہے تاکہ متفقہ حل نکل آئے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مباحث اپنے مقصد میں قریب قریب کامیاب ہوچکے تھے۔

مگر سیموئیل ہور نے نہایت دوستانہ اور پُرخلوص انداز میں جواب دیا کہ "مسودۂ قانون

اس انتہائی حد تک پہنچ چکا ہے۔ جس کا موجودہ پارلیمنٹ میں امکان ہو سکتا تھا؟ اور یہ کہ ہر ایسی ترمیم جس کی خواہش اینڈریوز رکھتے ہیں، اس امر کو ناممکن بنا دے گی کہ دونوں ایوان اُسے منظور کریں۔ مزید برآں انڈیا آفس کے حکام کمیونل اوارڈ کے بارے میں ان کے نظریہ سے متفق نہیں ہیں چھ سال کی اضطراب انگیز شورش کے بعد انہوں نے یہ دلیل پیش کی کہ بجائے اس کے کوئی مزید اختلافی چیز پیش کی جائے، یہ ضروری ہے کہ معاملات کو خود بخود طے ہونے دیا جائے اور یہ کہ "استثنائی دفعہ" کو جس نے معاہدۂ پونا کو ممکن العمل بنایا تھا، ایکٹ کی منظوری کے ساتھ ہی ختم کر دینا چاہئے۔

اینڈریوز نے ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اسے غیر منطقی چیز سمجھتے ہیں۔

موجودہ تصفیہ درحقیقت سے جھگڑے کی بنیاد بن رہا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میری رائے میں یہ کتے بلی کی سی لڑائی ہے جو آئندہ دس سال تک ہندو مسلمانوں میں ہوتی رہے گی بغیر اس کے کہ کوئی سمجھوتہ ہو سکے۔ دونوں طرف سے انتہا پسند اشخاص منتخب ہو جائیں گے اور جھگڑے کی باتیں کرتے رہیں گے۔ اگر باہمی تصفیہ کے موقع کے لئے میدان صاف چھوڑ دیا جاتا تو ممکن تھا کہ مستقل صلح دو تین سال میں حاصل ہو جاتی۔ اگر اس کی منظوری کے لئے پارلیمنٹری مسودۂ قانون کی ضرورت رکھی جائے گی تو اقلیت کی تکلیف دہ مزاحمت کے لئے کافی میدان ملے گا۔ یہ شبہ اتنا ہی قوی ہے جتنا ممکن ہو سکتا ہے کہ برطانوی حکومت چاہتی ہے کہ یہ جھگڑا قائم و برقرار رہے۔ لوگ حکومت کے اس نئے ایکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ اس سے ان کا شبہ حق بجانب ٹھہرتا ہے[1]

دو امور اور بھی ایسے تھے جن کی جانب اینڈریوز نے وزیر ہند کی توجہ زور دار طریقے سے مبذول کرائی۔ ایک یہ تھا کہ ہندوستان میں عیسائی فرقے کے افراد کے ساتھ بے حد اہمیت کا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ عیسائی آرا کے اہم طبقے نہیں چاہتے کہ اس فرقے کو کمیونل اوارڈ میں شامل رکھا جائے اور اینڈریوز کو یقین تھا کہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کی جانب اگر کوئی

---

[1] مکتوب بنام مسٹر ڈبلیو۔ ڈی۔ کرافٹ۔ پرائیویٹ سکریٹری، سر سیموئیل ہور، وزیر ہند

اقدام کیا گیا تو ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے پنجاب اور بنگال میں دوسری مشکلات کے حل کی راہ میں آسانی پیدا ہو جائے۔" عیسائی گرجا کو تو صرف اس مجوزہ تجویز سے تعلق تھا کہ عیسائی محکمۂ امورِ مذہبی اب محفوظ مرکزی مضمون بن رہا ہے۔ گرجے کا سلطنت کی غیر ملکی طاقت کے ساتھ تعلق ایک ایسا معاملہ تھا جو اینڈریوز کو دہلی میں ان کے زمانۂ قیام سے پریشان کر رہا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ فوجی پادریوں کے لئے انتظام کے مصارف کو فوجی بجٹ کا جز و بنانا چاہئے اور باقی دوسرے پادریوں کے لئے اسمبلی سے ووٹ لینا چاہئے انہوں نے زور دیا کہ عیسائی گرجا کو یہ کہکر بدنام نہ کیا جائے کہ وہ حکومت کی غیر ملکی رکاوٹوں میں سے ایک ہے۔ اسے ہندوستانی اسمبلی کی معقولیت پسندی اور فیاضی پر اعتماد کرنا چاہئے۔

دوسری رعایت جس کے لئے انہوں نے زور دیا یہ تھی کہ ۱۹۳۵ کی شاہی جوبلی ہندوستان میں جواہر لال نہرو اور خان عبدالغفار خاں کی رہائی سے منائی جائے۔ اعتماد اور فیاضی کے اصول کے اس اطلاق پر مزید غور کرنے سے سرکاری انکار نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ کچھ باتیں نہایت صاف کہیں اگرچہ ان گفتگوؤں کا دوستانہ انداز نہیں ٹوٹنے پایا:۔

حکومت مایوس کن طریقے سے اس قدر شہنشاہیت پسند ہو گئی ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی عوام کے جذبات سے دلیل نہیں کرتی۔ وائسرائے نے کتنی مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ آرڈیننسوں کی سختی دوہری پالیسی کا صرف ایک پہلو ہے جس کا دوسرا پہلو آئینی اصلاح ہے۔ انہوں نے سمجھدار شہریوں کی وسیع تعداد سے درخواست کی ہے کہ وہ اس سختی کو قبول کرلیں تاکہ وہ اصلاحات کا تحفہ لا سکیں لیکن یہ تحفہ بہت حقیر ہے اور اخبارات کا گلا اس طرح سے گھونٹا گیا ہے کہ انگلستان میں اسے ظالمانہ قرار دیا جائے گا۔[۱]

صلح و آشتی کے لئے یہ عملی تجاویز صرف یک طرفہ نہ تھیں۔ اینڈریوز نے مساوی کشادہ دلی کے ساتھ مہاتما گاندھی سے بھی بحث کی جن کی یہ درخواست کہ وہ ہریجنوں کے کام کے سلسلہ میں سرحد جائیں، حکومت کی نگاہ میں مشتبہ ٹھہرائی گئی۔ حکومت ہند کے عمّال نے اینڈریوز سے کہدیا

---

[۱] خط بنام مسٹر ڈبلیو۔ ڈی۔ کرافٹ، پرائیویٹ سکریٹری سر سیموئیل ہور، وزیر ہند

کہ انہیں اندیشہ ہے کہ اس تمام عرصہ میں گاندھی نے اپنی آستین میں پستول چھپا رکھا ہے" اینڈریوز نے اس جملہ کو گاندھی تک پہنچایا اور یہ رائے ظاہر کی کہ گاندھی ذجس تباہ کن صفائی سے کانگریس کے عیوب کا پردہ چاک کیا ہے وہ اور اصلاحی کام کے لئے ان کی سچائی یہ دونوں باتیں وقت آنے پر ایسے شبہات کا ازالہ کر دیں گی بشرطیکہ سرحد جانے پر ضرورت سے زیادہ اصرار کر کے انہیں دوبارہ نہ جگا دیا گیا۔

اینڈریوز نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ۱۹۳۵ کے موسم گرما میں ہندوستان واپس جائیں اور اصلاحات کی فیصلہ کن طریقہ سے آزمائش کریں ــــــ کیا جانبین کے نیک نہاد آدمیوں کو حقیقی اور موثر ذاتی رابطہ قائم رکھنا چاہیئے یا انہیں مشین میں مقید کر دینا چاہیئے؟ ان کی آمد کے تھوڑی عرصہ بعد کوئٹہ میں تباہ کن زلزلہ آیا۔ اس کی وجہ سے وسیع پیمانہ پر تلخی پیدا ہو گئی اس لئے کہ سرکاری اعلانات میں بہت زیادہ قومی امتیاز برتا گیا جس کی وجہ سے ان اعلانات کی افادیت جاتی رہی۔ اینڈریوز نے لکھا: "وہاں ہزارہا فوجی لوگ تھے جو زندہ بچنے والوں کے نام لکھکر انہیں اخبارات میں بھیج سکتے تھے۔ اس سے تسکین اور تشفی پیدا ہو جاتی۔ لیکن چار دن تک اخبارات کے کالم انگریز پسماندگان، انتقال کنندگان اور زخمیوں کے ناموں سے بھرے رہے، مگر ہندوستانی سول سرونٹس کے نام تک تحریر نہیں کئے گئے۔ شملہ کی فضا برقی بنی ہوئی تھی" حالات نے بد سے بدتر صورت اختیار کر لی جب گاندھی کو اس مصیبت زدہ شہر میں داخلہ کی اجازت نہیں دی گئی۔ اینڈریوز نے کئی گھنٹے سیکریٹریٹ میں صرف کر دئے مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ ان کے جذبات کا سیلاب امڈ آیا اور انہوں نے غصہ کے لہجہ میں کہا: "ان کے دماغوں میں ذرہ برابر عقل داخل کرنا ناممکن ہے۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس وسیع ملک کا ہر ہندوستانی ان واقعات کو دیکھکر خوش ہے اور وہ واحد شخص جو پریشان ہے اور قومی جذبہ کو بھڑکا رہا ہے، سی۔ ایف اینڈریوز ہے!"[1]

ان کے لئے آزمائش کا ایک اور وقت اس وقت آیا جب اٹلی نے ابی سینیا پر حملہ کر دیا شملہ میں اور دوسرے مقامات میں، انہوں نے یہ معلوم کرنے کی سخت جد و جہد کی کہ فلسطینیوں کی

---

[1] مکتوب بنام اے۔ ایچ۔ مورخہ ۷، جون ۱۹۳۵

اس دلیل کا کہ اٹلی پسماندہ وحشی افریقہ اور اعلیٰ تہذیب یافتہ ایشیا میں فرق ملحوظ رکھتا ہے، ہندوستانیوں پر کیا ردِ عمل ہو رہا ہے۔ انہوں نے اعلان کیا کہ "ان امتیازات کا مجھ پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا" اور وہ جانتے تھے کہ وہ غصے میں بھرے ہوئے ہندوستان کی طرف سے بول رہے ہیں جس کے شریف ترین اشخاص اس لئے خاموش ہیں کہ انہیں اپنی بیچارگی (خارجہ پالیسی ایک "محفوظ" مضمون تھا) کی انتہائی تلخی کا احساس ہے ورنہ وہ اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہناتے۔ انہوں نے بتایا کہ انگلستان نے لیگ میں اٹلی کی جو مخالفت تھوڑی سے کی ہے اس کی تہ میں یہ خواہش کارفرما ہے کہ ہندوستان اور آسٹریلیا جانے کے لئے جو سمندری راستہ اسے ملا ہوا ہے، وہ محفوظ رہے اور جو تباہ کن انجام اس پالیسی کا ہوا ہے اس نے واضح کر دیا ہے کہ یورپ بحیثیت مجموعی دنگر ابا قوام کے ساتھ اپنے تعلقات میں سچائی کی آزمائش میں صحیح اترنے میں ناکام رہا ہے۔

آخر میں اینڈریوز نے محسوس کیا کہ سرحد میں "پولیس کی بمباری کی پالیسی" سے ہندوستان کی جو سخت توہین ہوئی ہے اس میں ذاتی طور پر وہ خود بھی شریک ہیں۔ ہندوستانی امن پسندوں کا یہ خیال تھا کہ پولیس کی کارروائی کی خاطر جس کی کارکردگی کے وہ کبھی قائل نہیں ہوتے اور جس پر ان کا کوئی کنٹرول نہیں رہا، انگلستان نے جینوا کی ہوائی ڈِس آرمیمنٹ کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۳ کی راہ میں روڑے اٹکا دئے ہیں۔ وزیر فضا لارڈ لنڈن ڈیری کا مئی ۱۹۳۵ کے موقع کو پسند کرنا تاکہ وہ اپنے اس کارنامہ پر فخر کرے کہ اس نے بمبار ہوائی جہازوں کے استعمال کو مخصوص کر دیا ہے، کو تشدد اور ابی سینیا کے بارے میں ہندوستانی جذبات کے لئے سخت تکلیف کا باعث تھا۔ انگلستان پھر ایک مرتبہ ہندوستان کے دل تک پہنچنے سے قاصر رہا۔

باب ۲۰

زنجبار کا درمیانی وقفہ

(۱۹۳۴)

(۱)

اینڈریوز نے جنوری ۱۹۳۱، جنوری ۱۹۳۲ اور جون ۱۹۳۴ میں جنوبی افریقہ کے جو تین مختصر دَورے کئے اُن کے بعد سے وہاں کے ہندوستانی مسئلہ سے متعلق ان کے طریقہ کار میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کے بعد سے ان کی رائے یہ تھی کہ جنوبی افریقہ میں پیدا ہونے والے ہندوستانیوں کو (اور اب ان میں ساری ہندوستانی قوم شامل تھی) اپنے تحفظ کے لئے ہندوستان کی طرف دیکھنا بند کر دینا چاہیئے اور جنوبی افریقہ کے باشندوں کی حیثیت سے انہیں اپنی جنگ خود لڑنی چاہیئے۔ انہوں نے ایسا کرنے کے لئے ان کی امداد جاری رکھی ہندوستانی باشندوں کے ایلچی یا نمائندہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ صرف ایک عیسائی اور دوست کی حیثیت سے۔ رنگ کی تفریق کے خلاف جنگ کرتے وقت ان کے خیالات اُن "پابندیوں" کی طرف منعطف رہے جو ممکن ہے حکومت ہند کی جانب سے عائد کی جائیں اور ایک ایسے عیسائی کلیسا کے اخلاقی اثر کی طرف زیادہ مبذول رہے، جو خود نسلی تعصبات سے بالکل معرّا ہو۔

جب اینڈریوز دسمبر ۱۹۳۰ میں امریکہ سے جنوبی افریقہ واپس بلا لئے گئے تو اسوقت

انہوں نے انگلستان میں اپنی آخری شام آکسفورڈ گروپ کی تحریک کے کچھ ممبروں کے ساتھ گزاری۔ ۱۹۲۷ میں جنوبی افریقہ میں ان کے آخری دورے کے بعد سے ان کی "ٹیمیں" ملک میں آچکی تھیں۔ اپنی تکان، بیماری اور فکرمندی کی حالت میں انہوں نے ان سے درخواست کی کہ جو مشکل کام وہ انجام دینے والے ہیں اس میں وہ دعاؤں اور امداد سے دریغ نہ کریں۔ جنوبی افریقہ پہنچنے پر "دروازوں کے حیرت انگیز طریقہ سے کھلنے" کا جو تجربہ انہیں ہوا، وہ یقیناً جزوی طور پر ان کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا اور وہ ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ اسے یاد کیا کرتے تھے۔

سب سے مشکل مسئلہ ٹرانسوال کا تھا جہاں تصادم کی بڑی وجہ ہندوستانی تاجروں کی ایک چھوٹی سی جماعت تھی جس نے افریقہ میں گھریلو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اینڈریوز کے مشورہ کو نظرانداز کر دیا تھا اور اپنی مخصوص گھناؤنی عادات کو مسلسل جاری رکھا تھا۔ اب وہاں یہ تجویز تھی کہ "ایشیاٹک لینڈ ٹینیور بل" پیش کیا جائے جس کا مقصد یہ تھا کہ نسلی طور پر ہندوستانیوں کو مخصوص علاقوں میں آباد کیا جائے۔ بصورتِ حالات بہت تاریک نظر آتی تھی لیکن اینڈریوز نے کوشش کی کہ اس مسودۂ قانون کو فی الحال التوا میں رکھوا دیا جائے، اور یہ بتایا کہ معاہدۂ کیپ ٹاؤن کی وجہ سے جو صورتِ حالات پیدا ہوگئی ہے اس پر دوسری گول میز کانفرنس میں نظرثانی کی جائیگی۔ آزاد خیال یورپین اخبارات نے ان کی تائید کی اور توقع کے خلاف وہ کامیاب ہوگئے اور ۱۳ مارچ ۱۹۳۱ کو لینڈ ٹینیور بل معطل کر دیا گیا۔ وہ خود بھی اسے "ایک حیرت انگیز فتح" سے تعبیر کرتے تھے، جنوبی افریقہ کے ایک نامہ نگار نے اس کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی کہ "گزشتہ بیس سال میں نسلی تعصب کے خلاف یہ سب سے بڑی فتح تھی جو حاصل کی گئی۔"[1]

اُن کی کامیابی کا ایک عنصر بلاشبہ یہ تھا کہ وہ جنوبی افریقہ والوں کے لیے پورے طور پر جنوبی افریقہ ہی کے ایک باشندے تھے۔ جب وہ ہندوستان میں دوستوں کے سامنے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کی تشریح کرتے تو اس وقت وہ بے ساختہ طور پر اور

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۱

سب سمجھ بوجھ "ہم یہاں والے" کے الفاظ استعمال کر بیٹھتے تھے۔ ان کا نام جنوبی افریقہ کی "ہواز ہو" میں شامل کر لیا گیا۔ وہ ڈربن کے غریب ہندوستانی مزدوروں کو اُن کی گندگی اور ان کے معمولی فرقہ وارانہ تنازعات پر اس طرح ڈانٹتے تھے کہ کوئی "باہر والا" نہیں ڈانٹ سکتا تھا اور وہ چپ چاپ ان کی تنبیہہ سہ لیتے تھے۔ کیپ ٹاؤن میں، ڈربن میں، پیٹر میرٹزبرگ میں، الغرض سارے یونین میں — ہندوستانیوں، کیپ ملے والوں، انگریزوں اور افریقی باشندوں کے ایسے گھر تھے جہاں "چچا چارلی" کا بڑی مسرت سے خیر مقدم کیا جاتا تھا، جہاں ان کی سالگرہ پھولوں اور تحفوں کی پیشکش کے ساتھ منائی جاتی تھی اور جہاں یہ پرانا مذاق کہ وہ انگوروں کی فصل کے موقع پر ہمیشہ وہاں موجود ہوتے ہیں، بار بار دُہرائے جانے پر بھی فرسودہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

مشرقی افریقہ میں بھی ان کے طریقے اسی قسم کے تھے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ حق رائے دہندگی اور مخصوص علاقوں میں ہندوستانیوں کو بسانے کی پالیسی کے خلاف طویل کشمکش میں ہندوستانیوں کی مدد کی اور ۱۹۳۱ والی جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے روبرو ان کے ساتھ ہو کر شہادت دی۔ صرف ایک مہم ایسی تھی جس میں اینڈریوز نے ہندوستانیوں کے وطنِ مالوف کی ہندوستانی رائے عامہ سے براہ راست امداد طلب کی تھی۔ یہ واقعہ زنجبار میں ۱۹۳۴ میں وقوع پذیر ہوا۔

کینیا اور جنوبی افریقہ آتے جاتے اینڈریوز زنجبار کے ہندوستانی باشندوں کے ساتھ ایک دو دن ضرور گزارتے۔ وہ ہنستے ہوئے کہا کرتے تھے کہ زنجبار تو ایک چھوٹا سا بہشت ہے عرب زمینداروں، افریقی مزدوروں اور ہندوستانی تاجروں نے ملکر لونگ کی تجارت کو آہستہ آہستہ ترقی دیکر عروج پر پہنچا دیا تھا اور اسی پر جزیرہ کی خوشحالی کا دارو مدار رہا۔ اس کی ابتدا ہندوستانیوں کی اولوالعزمی کا نتیجہ تھی اور ہندوستانیوں کے تعلقات دوسری اقوام کے ساتھ اور سلطان اور گنتی کے چند انگریزی عمّال کے ساتھ نہایت بے تعصبی اور دوستی پر مبنی تھے۔

لیکن جب اینڈریوز اگست ۱۹۳۴ میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان آتے ہوئے زنجبار پہنچے تو اس وقت انہوں نے دیکھا کہ تمام جزیرہ میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ جنگ

کے بعد لونگوں کی قیمت میں نمایاں اضافہ ہوگیا تھا، جس میں عرب زمینداروں نے بے تحاشہ سٹہ بازی کی تھی۔ اس کے بعد قیمتیں پیداوار کے مصارف سے بھی نیچے گر گئیں۔ سٹہ باز دیوالیہ ہوگئے، خود زنجبار بھی دیوالیہ ہوجانے کے قریب آگیا تھا۔ یورپین عمّال کی جماعت کا خیال تھا کہ اس صورتِ حالات کا مداوا یہ ہے کہ لونگ کی تجارت کی واحد اجارہ دار کلوو گروورز ایسوسی ایشن جسے سرکاری امداد بھی ملتی تھی، "مناسب قیمت" کو قائم و برقرار رکھے، لیکن اس کے معنی یہ تھے کہ ہندوستانی تاجر تباہ و برباد ہوجائیں اور اس لئے وہ بندرگاہ پر ہی اینڈریوز کے گرداگرد جمع ہوگئے۔ جب وہ ان کی باتیں سن رہے تھے تو ان کا دماغ اس منظر کی طرف منتقل ہوگیا جو اس سے چند ہفتے پیشتر رھوڈیشیا میں دیکھنے میں آیا تھا جہاں اسی قسم کا مکئی کا ایک کنٹرول بورڈ قائم کیا گیا تھا۔ وہاں انہوں نے ایک ہندوستانی تاجر سے گفتگو کی تھی جس نے کہا تھا: "چھوٹا افریقی کاشتکار اس بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ تو تیس چالیس میل سے اپنی مکئی کے چار پانچ بورے ایک چھوٹے سے چھکڑے پر رکھ کر لاتا ہے اور قدرتی طور پر اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے فوراً پورے دام ملیں۔ جب میں اس سے کہتا ہوں کہ میں ایک بوری کے پانچ شلنگ کے حساب سے اب دام دیتا ہوں اور باقی رقم کے لئے اسے بعد میں آنا چاہئے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے اور وہ بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے معنی تباہی کے ہیں۔" یہ کہکر اس نے اپنے گودام کا دروازہ کھولدیا ۔۔ وہ بالکل خالی تھا۔

اینڈریوز نے پھر ایک دوسرے طریقہ کا خیال کیا جس میں مستقل حقوق رکھنے والے مالدار اشخاص سرکاری مشینری کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے تھے خواہ ایسا کرنے میں غربا تباہ و برباد کیوں نہ ہوجائیں لیکن زنجبار میں اجارہ داری کی پالیسی کو جو بجائے خود نسلی نہ تھی، ایک دوسرے قانون کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا جو اصولی اعتبار سے نسلی امتیازات پر مشتمل تھا اور جس کا مقصد دیوالیہ عرب زمیندار کو اس کے ہندوستانی قرضدار کے مقابلہ میں بچانا تھا۔ یہ ایک آرڈیننس تھا جس کی رو سے زمین کسی غیر عرب یا غریب افریقی کو منتقل نہیں کی جا سکتی تھی اور دلیل یہ پیش کی جاتی تھی: کہ زنجبار جیسی عرب

سلطنت کے لئے یہ امر باعث ذلت ہوگا اگر اس کے بڑے بڑے رقبے غیر عربوں کے ہاتھوں میں چلے جائینگے۔ لیکن ہندوستانی بھی تو زنجبار نہ چھوڑتے تھے: وہ جزیرہ کی خوشحالی کا معمار ہے۔ ایسی صورت میں زمین کو ناقابل انتقال بنا دینے کا مطلب یہ تھا کہ اس ساکھ کو تباہ و برباد کر دیا جائے جس کے بغیر لونگ کی صنعت زندہ نہیں رہ سکتی۔

اینڈریوز اپنی معمولی سرگرمی اور انہماک کے ساتھ کام میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے متعلقہ افسروں سے ملاقات کی، انہوں نے تازہ سرکاری رپورٹوں کا بھی مطالعہ کیا جنہیں سی۔ ایف۔ اسٹرک لینڈ اور سر ایلین پم نے مرتب کیا تھا اور جنمیں جزیرہ کی اقتصادی ضروریات سے بحث کی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ اجارہ داری کی پالیسی ان کی سفارشات کے مطابق نہیں تھی۔ اینڈریوز نے تجویز پیش کی کہ زیادہ سودی بیوپار کرنے والے ساہوکاروں کو خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا عرب، قومی امتیاز والی کارروائیوں کے مقابلہ میں کم قابل اعتراض طریقوں سے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں جو مہم انہوں نے جاری رکھی، اس کی شدت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ زنجبار سے بمبئی پہنچنے کے بعد پہلے دو ہفتوں میں انہوں نے کم سے کم دس راتیں ٹرینوں میں گزاریں تاکہ صورت حالات کو ہر وہ شخص سمجھ لے جس کا رسوخ اثر انداز ہو سکتا تھا۔ انہوں نے ہندوستانی اخبارات کے لئے طول طویل مضامین لکھے اور "دی زنجبار کرائیسس" (زنجبار کی نازک حالت) کے نام سے ایک پمفلٹ بھی لکھا جو سلاست بیان اور اعتدال پسندی کا بہترین نمونہ ہے۔

واقعات نے ان کے خدشات کو حق بجانب ٹھہرایا۔ ایک سال کے اندر اندر دو سو ہندوستانی تاجروں نے اپنا کاروبار بند کر دیا تھا اور باقی دیوالیہ قرار دئے جا چکے تھے۔ فروری ۱۹۳۶ء میں اجارہ داری کے قوانین کے خلاف عربوں نے ہنگامے برپا کر دئے۔ ایک مقامی انگریز سالیسٹر[1] نے اس کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے اجارہ داری کے متعلق کہا کہ دیسی زندگی کے ہر شعبہ میں، ہر تجارت اور ہر کام میں مداخلت روا رکھی جاتی ہے جس سے سوائے نقصان کے اور کوئی

---

[1] اے۔ آر۔ اسٹیفنز۔

نتیجہ مترتب نہیں ہوتا" اور لینڈ ایلی اے نیشن آرڈیننس کے بارے میں کہا کہ "کسی دوسرے قانون نے عربوں اور ملک کے رہنے والوں پر اس قدر شدت کے ساتھ اثر نہیں ڈالا یا انہیں اس قدر تکلیف نہیں پہنچائی" لیکن اس کے باوجود پالیسی میں کوئی موثر تبدیلی نہیں کی گئی۔ بالآخر ہندوستان نے جو زنجبار کا سب سے بڑا گاہک تھا، زنجبار کے لونگوں کے بائیکاٹ کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اور اس کی تائید میں انہوں نے شملہ میں اپنے بستر علالت پر سے بہت سے مضامین بھی لکھے۔ اس سال کے آخر تک زنجبار کے سالانہ محاصل میں ۳۰ ہزار پونڈ کی کمی ہو گئی اور دفتر نو آبادیات نے بائنڈر کمیشن مقرر کر دیا تاکہ وہ لونگوں کے قوانین کے طریقۂ کار کی تحقیقات کرے۔ ۱۹۳۸ میں نائب وزیر سلطنت لارڈ ڈفرن نے زنجبار کا دورہ کیا اور آیندہ چند مہینوں کے اندر اندر ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ اجارہ داری کی جگہ پر لیسنس کا طریقہ جاری کیا گیا جس سے متعلقہ ہندوستانی تاجر مطمئن ہو گئے۔

اس امر کا اندازہ لگانا دشوار ہے کہ اس نتیجہ کے حصول میں اینڈریوز کا حصہ کتنا تھا، لیکن مہم (جس کی پس پشت انڈین نیشنل ایسوسی ایشن تھی) صورت حالات پر اُن کی تیز ذہنی گرفت، ان کی ثابت قدمانہ مہارت اور گہری انسانی ہمدردی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور انہی باتوں کی وجہ سے ان کے لئے ناممکن ہو جاتا تھا کہ وہ ایک مرتبہ حیثیت مدعیان سے مل لینے کے بعد اُن کے مقدمہ کو ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیں۔

باب ۲۱

طلبا کے ساتھ

(۱۹۳۵ سے ۱۹۳۷ تک)

(۱)

یونیورسٹی کے طلبا کے ساتھ خواہ وہ برطانیہ میں ہوں یا ہندوستان میں اینڈریوز کے قریب ترین ذاتی تعلقات رہے چنانچہ جب وہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۸ میں انگلستان واپس آ گئے، اس وقت توضیح وتشریح کے سلسلہ میں ان کا بہت سا کام یونیورسٹیوں کے سپرد کر دیا گیا تھا، اور انہوں نے جنوری ۱۹۲۹ تک ریاستہائے متحدہ کی روانگی میں تاخیر کر دی تاکہ نئے سال کی ابتدا میں لورپُول میں طلبا کی عیسائی تحریک کا جو عظیم الشان چار سالہ اجلاس ہونے والا تھا، اس میں شرکت کریں۔ اس کانفرنس کو انہوں نے ایک پیغام دیا جو مابعد کے سالوں میں طلبا کے ساتھ ان کے جملہ دوستانہ تعلقات کا بنیادی اصول رہا ہے۔

"میں ساٹھ سال کی عمر کے قریب پہنچ چکا ہوں اور میرا جسم گرم ملکوں میں رہنے کی وجہ سے بہت کچھ بیماریوں میں مبتلا رہا ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن ہو تاکہ نوجوانوں کی تحویل میں ہم اپنے دلوں کی ایک بلند خواہش دیدیں، یہ خواہش کہ یسوع مسیح کے خوبصورت نام سے

نسلی منافرت کا داغ دور کر دیا جائے اور اس کی خاطر ان نسلی امتیازات قائم رکھنے والے گرجاؤں کا خاتمہ کر دیا جائے تو پھر ہم جو بوڑھے ہیں، مسرت کے ساتھ دوسروں کو راستہ دے سکتے ہیں جن کی نوجوان امنگیں بڑھاپے کی احتیاط سے نا آشنا ہیں اور جن کی زندگیاں اصلی جرأت سے ابھی تک لبریز ہیں۔"

اس کے بعد کام کے بھرپور سال گزر گئے اور کوئی ایسا بدنما واقعہ رونما نہیں ہوا جسے "بڑھاپے کی احتیاط" سے تعبیر کیا جا سکے۔ مگر ۱۹۳۵ کی ابتدا میں دو واقعات (ایک آکسفورڈ میں اور دوسرا کیمبرج میں) رونما ہوئے جنہوں نے ایک ایسے دور کا آغاز کر دیا جس میں اینڈریوز کا اثر دنیا بھر کے طلبا پر، اور خصوصیت سے عیسائی طلبا پر زیادہ گہرا اور زیادہ دوررس پڑا۔ جنوری کے آخری ہفتہ میں ونسٹن چرچل نے ہندوستان کے متعلق بی۔بی۔سی کے مباحثہ میں حصہ لیتے ہوئے ایک تقریر کی۔ اس تقریر نے آکسفورڈ کے ایک جلسہ میں جس میں اینڈریوز بنفس نفیس موجود تھے جو گرما گرم بحث چھیڑ دی، اس نے واضح کر دیا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کیا شکل اختیار کریں گے۔ چنانچہ چند دن بعد جب انہوں نے کیمبرج میں تقریر کی تو ان کا دماغ ابھی تک چرچل کے دعوے کی نخوت سے بھرا ہوا تھا کہ ہندوستان پر برطانوی "مقبوضہ" کی حیثیت سے برطانوی مفاد کی خاطر قبضہ رکھا جائے گا۔ انہوں نے اس طرز عمل میں اور پیئر کیریسول (Pierre Ceresole) اور ان کے رضاکاروں کے طرز عمل میں جو بہار کے زلزلہ زدہ علاقوں میں بہاریوں کے ساتھ "بھائی" کی طرح ملکر کام کر رہے تھے، باہمی مقابلہ کیا۔ اینڈریوز نے موخرالذکر طریقۂ خدمت کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے نوجوان انگریزوں کے سامنے کچھ اس طرح سے تقریر کی کہ معلوم ہوتا تھا کہ انہیں الہام ہو رہا ہے۔ انہوں نے بہت سے طلبا پر گہرا اور مستقل اثر ڈالا۔

اینڈریوز فروری اور مارچ میں مغربی افریقہ گئے۔ جس کا وعدہ وہ بہت عرصہ

پہلے کر چکے تھے۔ وہ گولڈ کوسٹ کے اچیمونا کالج کے پرنسپل ریورینڈ اے۔جی۔فریزر سے کئی سال پہلے سیلون میں ملے تھے اور فریزر ہی نے ۱۹۲۸ میں ان کا مسٹر گارڈن گگزبرگ سے تعارف کرایا تھا چونکہ انہیں افریقہ کی بہبودی کا بہت خیال تھا اس لئے ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مغربی افریقہ کی تعلیم اور صنعت وحرفت کا مطالعہ کریں۔اس کے لئے انہوں نے وہاں چھ ہفتے بسر کئے۔ اچیمونا کالج میں انہوں نے "مسیح اور دعا" کے موضوع پر لکچر دئے، انہوں نے وہاں کے باشندوں کے کلچر کا مطالعہ کیا اور ان تصورات کا جو ان کے معاشرتی شعائر کے بنانے میں ممد ومعاون ہوئے ہیں اور معلوم کیا کہ عیسائی مذہب کے تصادم کے اثرات کیا کیا مترتب ہوئے ہیں جسے انہوں نے اپنی قومی زندگی کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔

وہ اشانتی علاقہ میں بھی گئے یہ دیکھنے کے لئے کہ سونے کی کھانوں میں کیا ہوتا ہے۔وہاں جو کچھ انہوں نے دیکھا اُس سے وہ خوش نہیں ہوئے۔سونے کی قیمتیں عارضی طور پر چڑھی ہوئی تھیں مگر انہیں معلوم ہوا کہ اس سے ملک کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا۔انہوں نے جدید صنعت کے دو پہلوؤں کا مشاہدہ کیا جن کی وجہ سے لوگوں کی صحت اور مسرت پر تباہ کن اثر پڑ رہا تھا — یعنی ایک جنگلات کی تباہی اور دوسری گھریلو زندگی کی تباہی اس لئے کہ جو مرد ملازم رکھے گئے تھے وہ ملک کے دور دراز حصوں سے لائے گئے تھے۔ وہ رقمطراز ہیں:۔

"لکڑی کے کوئلہ کی زبردست کھپت کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جنگل کے جنگل صاف کر دئے گئے ہیں اور یہ تباہی کا پیش خیمہ ہے اس لئے کہ اس طرح شمالی صحرا کے اثرات ملک پر پڑنے شروع ہو جائینگے اور اخلاقی قسم کا بھی زبردست خطرہ موجود ہے۔شمالی علاقوں کے ہزارہا مرد کھانوں میں کام کرنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر آرہے ہیں، اس لئے کہ اشانتی کے لوگ خود کھانیں نہیں کھودتے، وہ تو قیمتی اور زرخیز زمینوں کے مالک ہیں اور کوکو بوتے ہیں۔"

ملک کی مذہبی زندگی کے بارے میں انہوں نے امید افزا خیالات کا اظہار کیا

انہوں نے دیکھا کہ عیسائی مذہب وہاں تعمیری معاشرتی قوت کی حیثیت سے سوسائٹی کی قبائلی ترکیب ساخت پر اچھا اثر ڈال رہا ہے اور لوگوں کی فطری روایات کو پاکیزہ اور طاقتور بنا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک ناظر لکھتا ہے :۔

"قبائلی ناچ کو دیکھکر انہیں بالکل حیرت نہیں ہوئی بلکہ وہ یہ دیکھکر خوش ہوئے کہ باہمی اعتماد کے ذریعہ ناچ کے قابلِ اعتراض پہلوؤں کو ترک کر دیا گیا ہے"

اچیموٹا کالج پر جو اثر انہوں نے ڈالا، اسے کالج کے عملہ کے ایک انگریز پروفیسر نے یوں بیان کیا ہے :۔

"کالج میں میرے زمانہ میں جو کچھ ہوا، وہ اس جوش کے مقابلہ میں کچھ نہیں تھا جو اُن کی آمد کی وجہ سے کالج کے عملہ، طالب علموں، بوڑھوں اور نوجوانوں سب میں یکساں طور پر رونما ہوا۔ ان میں سے کچھ نے اس سے پہلے مقدس آدمیوں کی صورت دیکھی تھی، سمجھدار لوگوں سے بھی وہ مل چکے تھے، طاقت اور قوتِ برداشت رکھنے والے اشخاص سے بھی وہ ناواقف نہ تھے، لیکن تقدس جس میں سمجھ اور آدمیوں اور دنیوی امور کا تجربہ بھی شامل ہو، جسے عملی (اور کامیاب) بلند خیالی کے کاموں میں پہلے رہنما کی حیثیت بھی حاصل رہی ہو، جس میں ماورانہ رقیق القلبی، شرافت اور اخلاق مجتمع بھی ہوں، سیر ایک ایسی خصوصیت تھی جسے انہوں نے (اور ہر ایک شخص نے۔ اس لئے کہ وہ شخص بے مثل اور یکتا تھا) اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا، اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے اینڈریوز کو دیکھنے کا موقع کھو دیا تو وہ ہمیشہ کے لئے انہیں کھو بیٹھیں گے"

اینڈریوز نے مغربی افریقہ میں سیاسی شعور کی ترقی کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا جو سوداج کا مطالبہ کرنے کے لئے تیار تھی اور کھلم کھلا اس کا اعلان کر رہی تھی۔ "ٹائمز آف ویسٹ افریقہ" نے ایک لیڈنگ آرٹیکل میں لکھا تھا: "ہم ہندوستان کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ اسے ایک ایسا ہمدرد دل گیا جو اپنے سفید فام بھائیوں کو یہ بتا سکا کہ ہندوستانی بھی روح رکھتا ہے اور اسے بھی اپنے جذبات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ اگر ہمیں افریقہ میں ایسا آدمی مل جاتا تو آج ہماری حالت اس قدر مایوس کن

نہ ہوتی۔ ہمیں افسوس ہے کہ وہ جا رہے ہیں، ہماری خواہش تو یہ تھی کہ وہ ہم میں رہکر اپنی زندگی بسر کرتے۔ چارلس فریئر اینڈریوز، الوداع! آپ اسے یاد رکھیں کہ آپ نے اس راستہ سے گزر کر ہماری مسرتوں میں اضافہ کردیا ہے۔" [۵]

ہندوستان میں موسم گرما کے دوران میں جب "ہندوستان اور برطانیہ" نامی کتاب مکمل ہوگئی تو اینڈریوز کی دوسری تصنیف کے لئے راستہ ہموار ہوگیا۔ گاندھی اور بہت سے دوسرے دوست ان پر زور دے رہے تھے کہ وہ اس محنت کی عملی زندگی سے سبکدوش ہوجائیں (اس وقت ان کی عمر ۶۴ سے متجاوز ہو چکی تھی) اور اپنی توجہات کو کسی "ٹھوس" قسم کے تحریری کام پر صرف کریں۔ معلوم ہوتا تھا کہ مشرق اور مغرب کے مابین مذہبی ترجمان کے کام کا وقت آپہنچا ہے جس کا خواب وہ اس وقت سے دیکھ رہے تھے جب وہ پہلی مرتبہ شانتی نکیتن گئے تھے۔ ان کے تخیل پر ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کے بھگت شاعروں اور یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کے مقدس برنارڈ [۶] کے مذہبی گیتوں کے مابین ایک گونہ مشابہت کا بڑا اثر تھا اس لئے کہ "وہ گیت بھی یکساں افراتفری کے زمانہ میں لکھے گئے تھے اور عوام بڑی حد تک ان سے متاثر تھے۔" چنانچہ ان کے خیالات کیمبرج کی طرف منعطف ہوگئے۔ انہوں نے سوچا ممکن ہے کہ کیمبرج میں جہاں کتب خانے ہیں اور جہاں عالمانہ ماحول اور سکون ہے، وہ ایسی کتاب لکھ سکیں جو مقدس برنارڈ کے روحانی خیالات کی تفسیر ہندوستان کے سامنے پیش کر سکے، اور ساتھ ہی وہ اپنی کتاب "ہندوستان اور برطانیہ" (جو اکتوبر میں چھپنے والی تھی) کی اشاعت کے بعد کانفرنسوں اور لکچروں کا پروگرام

---

[۵] "ٹائمز آف ویسٹ افریقہ"، ۲۰ مارچ ۱۹۳۵

[۶] برگنڈی کا رہنے والا تھا۔ اپنے زمانہ کے ممتاز ترین مجاہدوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس نے سائٹو میں ۱۱۱۵ میں ایک خانقاہ قائم کی جس میں اسکے مرید رہا کرتے تھے جو بعد کو "صلیب کے سپاہی" بنے۔ اس نے ۱۶۵ خانقاہیں تعمیر کیں اور یورپ کو دوسری صلیبی لڑائی کے لئے تیار کیا۔ ان عیسائی مجاہدوں کی جماعت کے لئے جو کہ مقاماتِ مقدسہ کی واپسی کے لئے مسلمانوں سے نبرد آزما ہوتے تھے اس نے قواعد و ضوابط بھی بنائے۔ مترجم۔

بنا سکیں۔

تدابیر دو سائل تلاش کر لئے گئے۔ پیمبروک کالج کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ غیر معمولی حالات کے باوجود موسم سرما میں اینڈریوز کو دو برسوں کے لئے آنریری فیلو شپ پیش کرے۔ آر تھر پاریٹ نے "کرسچین ورلڈ" میں اینڈریوز کی وفات کے بعد لکھا: "مجھے یاد ہے کہ ان کی آنریری فیلو شپ ہی وہ چیز تھی جس پر چارلی اینڈریوز کو ہمیشہ فخر رہا؛ اس بات سے ان کے دل پر گہرا اثر ہوا کہ ان کے کالج نے ان کی "خیالی" خدمات کو تسلیم کر لیا۔ پیمبروک کے لئے ان کی موجودگی باعثِ برکت خیال کی گئی، جہاں کالج کے سینیر ممبر ایسی مشکلات سے دوچار ہو رہے تھے جنھیں صحت بخش طریقہ سے حل کرنے کے لئے عمیق قسم کے روحانی تدبر کی ضرورت تھی۔

ان کے لئے کالج میں چند کمروں اور صبح و شام کے کھانے کا انتظام کر دیا گیا تھا مگر ناشتہ وغیرہ کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے وہ ایسے مسائل سے دوچار ہوئے جن سے وہ برسوں سے ناآشنا تھے۔ "ذرا تصور کرو کہ مجھے چائے اور ڈبل روٹی وغیرہ کے لئے فرمائش کرنے کی فکر کرنی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ میری تربیت اس طرح سے ہوئی کہ میں ان گھریلو امور کے انصرام میں بالکل کچا رہ گیا اس لئے کہ چائے بنانے اور گیس روشن کرنے کے لئے میرے پاس دیا سلائی تک نہ تھی۔ میں بھی کتنا غبی ہوں!" دوست ہنستے ہوئے آئے تاکہ اس مشکل میں ان کی مدد کریں۔ "اور تم سے کہہ دو کہ جو دیا سلائیاں اس نے دی ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔ میں اب تک وہ چھوٹی چھوٹی (سوآن کی) دیا سلائیاں استعمال کرتا رہا ہوں اور مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ کیوں میری انگلیاں جل جاتی تھیں۔" کپڑے دھونے کا انتظام بہت گراں تھا، اس لئے انہوں نے ایک قسم کی سستی استری خرید لی جسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے حالانکہ اس کی وجہ سے ان کے واحد اونی گلوبند میں جسے وہ استری کرنے وقت تہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، جلنے کی وجہ سے بڑا سا سوراخ ہو گیا تھا۔

ان سے کہا گیا کہ وہ کیمبرج میں "مسیح حالتِ دعا میں" کے موضوع پر لکچر دیں۔ علم الٰہیات کے پروفیسر کو اجازت تھی کہ وہ کسی "ممتاز" ہستی کو مخصوص لکچروں کے لئے مقرر کرے

اور اینڈریوز خوش تھے کہ قرعۂ فال اُن کے نام پر نکلا اور یہ کہ ان کی اپنی یونیورسٹی نے ان کی عزت افزائی کی۔ تین لیکچر ستمبر میں اور پانچ لیکچر ایسٹر کے موقع پر دیئے گئے اور ہر موقع پر ہال کچھا کچھ بھرا رہتا تھا۔ اُن کے لیکچر کی "ضَو فشانی نیکی"، لے مقناطیس کی طرح انڈر گریجوایٹوں کو اپنی طرف کھینچتی رہتی تھی۔

"دوستوں نے کشادہ دلی سے میرا خیر مقدم کیا ہے اور میں انڈر گریجوایٹ کو ٹیکروں اور کیمبرج کے ہندوستانیوں کا ایک قسم کا دوست بن گیا ہوں۔ اس کے علاوہ کالج کے بھی فرائض ہیں۔ صبح سویرے ۷½ بجے اور شام کو ۷ بجے گرجا بھی جانا پڑتا ہے اور ہال کے اجتماع کے بعد کبھی کامن رُوم میں بعد کو گفتگو کے لئے وقت بھی نکالنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ اور جلدی سو جانا ممکن نہیں ہوتا۔ پھر آپ میری اس عادت سے واقف ہی ہیں کہ میں لازماً بہت سویرے اٹھ بیٹھتا ہوں۔

بڑی بڑی مسرتیں بھی ہیں۔ مثلاً کنگز کالج کے گرجا میں اتوار کی سہ پہر کی نماز کالج کے باغ کی خاموش فضا میں چہل قدمی۔ چاروں طرف جوانی سے معمور زندگی۔ یونیورسٹی کی نئی لائبریری۔ ذہنی ماحول۔ لیکن، آہ، بعض اوقات میں ہندوستان کی فرصت کی زندگی کے لئے بیتاب ہو جاتا ہوں جہاں سیکڑوں معروفیات کے لئے پاکٹ ڈائری بھی نہیں رکھنی پڑتی!"

۱۹۳۶ کی لینٹ ٹرم میں یہ امر لازمی ہو گیا کہ اینڈریوز "یونیورسٹی کے مشن" کے سلسلہ میں سفر کی تیاریاں کریں۔ کیمبرج اور دوسری یونیورسٹیوں کے طلبا کے ساتھ گہرے روابط رکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ورلڈ اسٹوڈنٹ کرسچین فیڈریشن نے ان کے پاس اس مضمون کا دعوت نامہ بھیجا کہ وہ "یونیورسٹیوں کے مشن" کو نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا

لے یہ جملہ بی۔ بی۔ سی کے ہیو ریڈیل فیلڈنگ نے استعمال کیا تھا جو اس موسم گرما میں اینڈریوز سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔

پہنچائیں۔ انہوں نے اس دعوت نامہ کو قبول کر لیا جس کے معنی یہ تھے کہ وہ فی الفور انگلستان سے روانہ ہو جائیں۔ جب وہ ساؤتھمپٹن سے بحر اوقیانوس ۱۰ مارچ ۱۹۳۶ کو روانہ ہوئے اس وقت تک مقدس بنارڈ کا مجوزہ مطالعہ بھی شروع نہیں ہوا تھا لیکن "چیلنج آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر" کا نامکمل مسودہ وہ اپنے ساتھ لیتے گئے۔

(۲)

نیوزی لینڈ کے سفر نے ان کے لئے ممکن بنا دیا کہ وہ فجی کے جدید حالات زندگی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں جو پابند معاہدہ مزدوری کی منسوخی کے بعد وہاں پیدا ہوئے ہوں۔ اس لئے انہوں نے اس سے پہلے کہ یونیورسٹیوں کے مشن کی کارروائی شروع ہو، موقع سے فائدہ اٹھا کر جزائر کا دورہ کیا۔

"سارے فجی میں مسرت کی لہر دوڑ گئی جب وہاں یہ معلوم ہوا کہ اینڈریوز اس ملک میں ایک مہینہ قیام کریں گے۔ وہ کیوں آ رہے ہیں؟ کیا وہ امن کے پیامی بن کر آ رہے ہیں یا گڑبڑ پھیلانا چاہتے ہیں؟

جب جہاز ماری پوسا موسمیٰ کو سووا میں لنگر انداز ہوا۔ اس وقت محتاط کسٹم آفیسر نے اس خطرناک آدمی کے سامان کا معائنہ بہت سختی سے کیا۔ جب ایسی گڑبڑ پیدا کرنے والی قوت دوبارہ ظہور میں آ جائے اس وقت کسی خطرہ کو نظر انداز کرنے کی ضرورت نہیں لہذا انہوں نے مسکراتے ہوئے خاموشی وقار سے ہر چیز کا معائنہ ہونے دیا۔ آنے کے چند ہی گھنٹے بعد انہوں نے ہز ایکسیلنسی گورنر سے ملاقات کی اور بعد میں چیف جسٹس کے مہمان رہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد بشپ اور مشن کے دوسرے عہدیداروں کی معیت میں انہوں نے ایک کانفرنس منعقد کی۔"

فجی کے ہندوستانی باشندے بہت متفکر تھے۔ اور اپنے حقوق شہریت کے سلسلہ میں جو خطرہ انہیں درپیش تھا، اس کے بارے میں ان کی رائے معلوم کرنے کے

ستے خواہشمند تھے۔ فجی کی مجلسِ قانون ساز کے لئے نمایندوں کے چناؤ میں ہندوستانیوں کا مطالبہ تھا کہ انتخاب کے اصول کو قائم و برقرار رکھا جائے۔ اس کے برعکس یورپین باشندے جنہیں کسی قدر اہلِ فجی کی بھی امداد و اعانت حاصل تھی، نامزدگی کے اصول کے حامی تھے۔ اینڈریوز نے فجی اور ہندوستان کی حکومتوں کے کے سامنے ایک یادداشت پیش کی جس میں ایک عملی سمجھوتہ پیش کیا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں طریقوں کے بہترین پہلوؤں کو قائم و برقرار رکھا جائے۔

"انتخابی اصول اس ترمیم کے ساتھ رائج رہے کہ ہر نسل فرقہ وارانہ اصول پر لیجسلیٹو کونسل کے لئے تین ممبروں کا انتخاب کرے، اور ہر نسل کا ایک ممبر گورنر کی جانب سے نامزد ہو تاکہ اقلیت کے مفاد کی نمایندگی ہو جائے جو بصورت دیگر نظرانداز ہو جائینگے۔"

انہوں نے بتایا کہ گورنر کو چاہیئے کہ وہ مسلمانوں اور اچھوتوں جیسے کمزور فرقوں کی نمایندگی کرانے کے لئے نامزدگی کا استعمال کرے اس لئے کہ ان فرقوں کو انتخاب کے لئے نشستیں حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر یورپین یا اہلِ فجی چاہیں تو وہ دوسرے نمایندوں کو بذریعۂ نامزدگی بھیج دیں بشرطیکہ "انتخاب کا اصول چھین نہ لیا جائے۔"

مگر اُن کی نظر میں زمین اور تعلیم کے مسائل اس سیاسی مسئلہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس سیاحت کی وجہ سے انہیں اپنی کتاب "ہندوستان اور بحرالکاہل" کے لئے مواد مل گیا جو شملہ میں ایک سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچائی گئی۔ اُن کی آرا اور تجاویز سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ "ویسٹ انڈیز" سے وہ کس وسیع حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔ فجی میں برطانوی گیانا کی طرح بندوبست اراضی کے دلکش مواقع ایسے ہونے چاہئیں کہ غیر صحت بخش طریقہ سے شہروں کی طرف آبادی کا جو بہاؤ ہو رہا ہے، اس کی بجائے ملی جلی کاشت کا انتظام کیا جائے تاکہ فجی والے تازہ اور صحت بخش چاول کی بہم رسانی کا انتظام خود کر سکیں۔ حکومتِ نوآبادیات کو چاہئے

کہ وہ ہندوستانی مزارعین کو قبضۂ اراضی کے متعلق زیادہ اچھی شرائط دلوائے اور اس طرح اُن مواعید کو عملی جامہ پہنائے جو اُن سے کئے جا چکے ہیں۔ فجی میں طرزِ نوی گاگنتا کی طرح تعلیم، صحیح معنوں میں مذہبی تعلیم کی بنیادی ضرورت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں بھی ضرورت ہے کہ لڑکیوں کے لئے شادی کی عمر کم سے کم چودہ سال قرار دی جائے اور ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہاں پر بھی انہوں نے علیحدگی کے خطرہ کو محسوس کیا اور مناسب رسل و رسائل اور قابلِ اعتماد نیوز سروس کی اہمیت پر زور دیا تاکہ وہ دنیا کے واقعات کے پس منظر کے مقابلہ میں اپنے چھوٹے کم اہمیت رکھنے والے واقعات کو صحیح رنگ میں دیکھنے کے قابل ہو سکیں۔

"ہندوستان اور بحرالکاہل" ایک الہامی کتاب ہے۔ بیس سال پہلے اینڈریوز نے جے۔ ڈبلیو۔ برٹن کی کتاب "آج کا فجی" میں بحرالکاہل کے مسائل پر ایسی وسیع النظری پائی تھی جس کی وجہ سے خود ان کے تخیل میں چمک پیدا ہو گئی تھی ۱۹۳۶ میں جبکہ ہوائی رسل و رسائل کا سلسلہ ایک دور دراز خواب نہیں رہا تھا، انہوں نے امتیازی تدبر کے ساتھ اُس اہمیت پر زور دیا جو حالتِ امن اور حالتِ جنگ دونوں صورتوں میں دنیا کی حکمتِ عملی میں فجی کو حاصل رہیگی۔ انہوں نے اپنی مقدور بھر کوشش کی کہ فجی کے لئے ایسا جوش و خروش پیدا کر دیا جائے جو سارے بحرالکاہل کی جملہ اقوام کے لئے اُسے دوستی اور اتحاد کا مرکز بنا دے۔

لیکن آخری اثر جو اینڈریوز نے پیدا کیا وہ سیاسی نہ تھا بلکہ مذہبی تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ وہاں پہنچے تھے، ہزارہا ہندوستانی عورتیں اور لڑکیاں سُووا کی بندرگاہ پر موجود تھیں تاکہ دینبندھو کی پذیرائی کریں جن کی مسیحی شباہت کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ تھا۔ ہندوستانیوں کے ایک عظیم الشان جلسہ میں چیئرمین نے جو خود عیسائی نہ تھا، حضرت عیسٰی کی تعلیم اور سیرت کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا۔ سی۔ او۔ لے ٹین ایک تماشائی کی حیثیت سے لکھتے ہیں، "اس سے پہلے فجی کے ہندوستانیوں میں ہر عیسائی چیز کے خلاف تلخی اور دشمنی موجود تھی۔ اب اس طرزِ عمل میں یقیناً بہتری

نظر آرہی تھی اور جس آدمی نے کسی دوسرے شخص کے مقابلہ میں اس تبدیلی کے پیدا کرنے میں حصہ لیا، وہ وہاں پلیٹ فارم پر موجود تھا۔"

ان کا سارا دن ملاقاتوں میں گذرا، ملاقاتیوں میں حکومت کے افسر، تاجر، قانون دان اشخاص، کمپنیوں کے منیجر اور مختلف ہندوستانی مسلکوں کے اساتذہ شامل تھے لیکن ان کے پاس ہر ایسے غریب آدمی کے لئے بھی وقت تھا جس کی روح دکھی ہو، وہ ہر روز تین گھنٹے تک ہولی ٹری نٹی کے گرجا میں رہتے تاکہ وہاں وہ ہر اس شخص سے مل سکیں جو اُن سے ملنے کے لئے آئے۔ ایک انگریز تاجر نے لکھا ہے: "میں اس گرجا میں نماز پڑھنے کے لئے گیا جہاں اینڈریوز وعظ کہتے تھے۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ کسی ایسے آدمی کو بتاؤ جو قدیم زمانہ کے مقدس افراد کی طرح عمل کرتا ہو، بولتا ہو اور دیکھتا ہو تو میں فوراً کہہ دونگا: سی۔ ایف۔ اینڈریوز۔ وہاں سب یورپینوں کا بھی یہی خیال تھا اگرچہ وہ مختلف امور میں ان سے اختلافِ رائے رکھتے تھے" ایک اور شخص نے لکھا ہے:۔ "ہر صبح کو ۱/۲ ۶ بجے سینٹ جانز چرچ میں اینڈریوز بیٹھتے اور مقدس یوحنا کی انجیل کی تشریح کرتے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں خود مسیح کو بولتا ہوا سُن رہا ہوں۔"

مگر حد سے زیادہ کام کا نتیجہ بہت تکلیف دہ نکلا جس کا انہوں نے ایک پرائیویٹ خط میں اقرار کیا ہے: "اس جیسی آب و ہوا میں صبح سے رات گئے تک پبلک میں رہنا! میں آپ سے بیان نہیں کر سکتا کہ میں کس قدر تھکا ہوا ہوں!" ایک ہمدرد دوست ریورینڈ اے۔ ڈبلیو۔ میک میلن انہیں ایک خاموش مقام پر جو بھیڑ بھاڑ سے دور تھا چند دن تک آرام کرنے کی غرض سے لے گئے۔ اینڈریوز صبح سویرے سبزہ زار میں جا کر بیٹھ جاتے یا تو مراقبہ میں رہتے یا ایک شاعر کے ذوق و شوق کے ساتھ سورج نکلتے وقت اُس کے پُرشکوہ منظر میں فضا کے حیرت انگیز کرشموں کو دیکھتے۔ شروا کے زمانہ قدیم کے آخری دنوں میں مسلسل چار راتوں کو ٹاؤن ہال میں لوگ جمع ہو جاتے تھے تاکہ حیاتِ مسیح کی داستان ان کی زبانی سنیں۔ "ان مواقع پر عیسائیوں کے جملہ فرقوں کے افراد کے

علاوہ ہندوستانی، فجی کے اصلی باشندے اور یورپین، ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی سب ہی ہوتے تھے۔ ان جلسوں میں گانا اتا نہیں ہوتا تھا اور کوئی صدر چنا جاتا تھا۔ بس اینڈریوز آتے اور ہمارے سامنے آکر بیٹھ جاتے اور زور زور سے بولتے۔ حاضرین جس احترام سے ان کا وعظ سنتے وہ بجائے خود حیرت انگیز ہوتا تھا اور سب پر اس کا اثر پڑتا تھا۔"

نیوزیلینڈ اور آسٹریلیا میں یونیورسٹیوں کے مشن نے بھی اچھا اور دیرپا اثر پیدا کیا اور جن اشخاص نے ان کی موت کی خبر نہیں سنی تھی، وہ اس واقعہ کے سات سال بعد تک انہیں خطوط بھیجتے رہے۔ فجی میں ان کے کام کی رفتار اور بڑھ گئی تھی اور بعض اوقات ایک دن میں سات سات لکچر دئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ہزاروں آدمی ملنے کے لئے آتے اور ان کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ اسی کام پر صرف کریں۔ انہیں ان نوجوانوں سے دلی ہمدردی تھی جو ان کے پاس آکر اقرار گناہ کیا کرتے تھے جس زبردست دباؤ کے ماتحت وہ لوگ بڑے یورپین طرز کے شہروں میں زندگی بسر کرتے تھے، اس میں ان کے لئے مشکل ہوتا تھا کہ وہ "ایمان کی مسرت اور آسودگی" کے اس درجہ تک پہنچ سکیں جس کی ان کے خیال میں انہیں سب سے زیادہ ضرورت تھی اور وہ بے دریغ ان کی خدمت میں مصروف ہوگئے بالآخر جب وہ فری مینٹل پہنچے تو ان کی حیرت انگیز قوتِ برداشت نے جواب دیدیا اور وہ کولمبو روانہ ہونے سے پہلے مجبوراً دو تین ہفتے تک آرام کرنے کے لئے وہاں ٹھہرے رہے اور انہوں نے دو ہفتے تک کینڈی میں قیام کیا اس سے پہلے کہ وہ سمندر کے راستے سے بمبئی جائیں۔

آرام اور سفر کے ان تین ہفتوں میں انہوں نے دعا اور نماز کے بارے میں اپنے لکچروں کو کتابی شکل دیدی جو وڈ بروک، کیمبرج، مغربی افریقہ اور آسٹریلیا میں دئے گئے تھے۔ ایک پیراگراف میں انہوں نے اپنے مذہبی تجربہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

"حضرت عیسیٰ میرے نزدیک زندہ مسیح کی حیثیت رکھتے ہیں جو میرے دل کی انتہائی گہرائیوں میں مجھ سے ہم کلام رہتے ہیں۔ وہ میری روزانہ زندگی میں ہر روز میرے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ اُن الفاظ کو جو اُن کے ابتدائی حواریوں نے صدیوں پیشتر اپنی اپنی انجیلوں میں تحریر کئے ہیں، دہراتے ہیں اور انہیں اپنا لیتے ہیں۔ جب وہ میرے دل سے محوِ گفتگو ہوتے ہیں وہ آپ اپنا ترجمان بن جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے: 'میرے پاس آؤ، تم سب جو محنت کرتے ہو اور زبردست بوجھ اٹھاتے ہو، اور میں تمہیں آرام پہنچاؤں گا' وہ مجھ سے ہر روز کہتے ہیں: 'میں زندگی کی روٹی ہوں'۔ وہ میرا اچھا گڈریا ہے۔ جو آج میرا نام لیکر مجھے پکارتا ہے۔" [1]

کولمبو کا کسٹم آفیسر شوروا کے کسٹم آفیسر سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی نظر میں اینڈریوز "امنِ عامہ میں گڑبڑ پیدا کرنے والے" نہ تھے، بلکہ نیوزی لینڈ کے ٹینس کے کھلاڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے ۶۵ سالہ تھکے ہارے ڈاڑھی والے آدمی سے پوچھ ہی لیا: کیا آپ ڈیوس کپ کے کھلاڑی ہیں؟ چارلی نے سنجیدگی سے جواب دیا، "میں ٹینس کھیل چکا ہوں لیکن ڈیوس کپ کے لئے جتنی مشق کی ضرورت ہے اس حد تک میں نہیں پہنچ سکا۔" (اگر وہ پوچھتا، "کیا آپ ڈبلیو۔ جی۔ گریس ہیں" تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی"۔ بہرحال ہندوستانی اخبارات کے رپورٹر اس سوال پر ہنس دیئے)

ہندوستان واپس آنے پر اینڈریوز آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی طلباء کے لئے پوسٹ گریجوایٹ مطالعہ کو ترقی دینے کی غرض سے مکمل تعلیم کو ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے سب سے پہلے ۱۹۱۸ میں اس سوال کو اٹھایا تھا لیکن اُس وقت کسی نے بھی اس کی تائید نہیں کی اور اس لئے اسے چھوڑ دینا پڑا۔

---

[1] مسیح اور دعا، صفحہ ۸-۱۲۷

اب کی مرتبہ آسٹریلیا کی اسٹوڈنٹ کرسچین موومنٹ نے ان کی سیاحت کے نتیجہ کے طور پر پرتھ میں ایک ہندوستانی طالب علم کی امداد کرنے کے خیال سے فنڈز جمع کیے تھے۔ اسی طرح سڈنی کی یونیورسٹی نے اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستانیوں کو تین کھلے وظیفے دینے منظور کئے۔ اینڈریوز نے زور دیا کہ ان دوستانہ تحریکوں کا گرم جوشی سے استقبال کرنا چاہیئے اور آسٹریلیا کے طلبا کے لئے بھی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں اسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کرنا چاہیئے۔ انہوں نے جنوبی بحرالکاہل کے لئے ایک ہندوستانی ہائی کمشنر کے تقرر کی تجویز بھی پیش کی تاکہ فجی، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ اس کے حلقۂ اثر میں رہیں اور فجی ان دو ملکوں اور ہندوستان کے ساتھ قریبی دوستانہ تعلقات رکھے۔ ان تجاویز کے بارے میں ہندوستان میں اختلاف رائے ہوا لیکن ان کی تہ میں جو عناصر کام کر رہے تھے وہ وسیع النظری اور شرافت پر مبنی تھے۔

(۳)

نومبر ۱۹۳۶ کا ذکر ہے کہ ایک دن اینڈریوز بغیر کسی اطلاع کے دہلی کے کیمبرج برادرہڈ ہاؤس میں وارد ہو گئے تاکہ جب تک نامہ و پیام کا سلسلہ رہے وہ اپنے پرانے گھر کی مہمان نوازی سے مستفید ہوں۔ انہیں معلوم ہوا کہ کشمیری دروازہ کے قریب سینٹ جیمز چرچ اپنی صد سالہ سالگرہ منا رہا ہے۔ چونکہ اس گرجا کے ساتھ سینٹ اسٹیفنز کالج کے تعلقات بہت قدیم تھے اس لئے وہ انہیں بہت عزیز تھا۔ اسی شام کو برادرہڈ کے افسر اعلیٰ کے ساتھ گفتگو کے دوران میں ریورینڈ کرائسٹوفر ایکنسن نے پوچھا کہ پادریت کے بارے میں اب ان کے خیالات کیا ہیں۔ اینڈریوز نے "۳۹ عقائد" اور "اتھانیسین عقیدہ" کی تمہید کے متعلق اپنی قدیم مشکلات کا اعادہ کیا۔ اس پر کرائسٹوفر ایکنسن ہنس دیئے۔ انہوں نے کہا: "آپ کو زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیئے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ جب ہندوستان، برما اور سیلون کے گرجا کو ۱۹۳۰

میں ایک آزاد کلیسا بنا دیا گیا تھا اس وقت سے یہ چیزیں جن سے آپ متفق نہیں ہیں، پادریوں کے لئے لازمی نہیں رہیں۔ اینڈریوز کو اس کا علم نہ تھا اگرچہ انڈین چرچ ایکٹ، ۱۹۲۷ء کے متعلق جس کے ماتحت کلیسائے انگلستان سے قانونی تعلق ختم کر دیا گیا تھا، بعض امور پر حکومت ہند نے ان سے مشورہ بھی کیا تھا۔ ان کے پرانے دوست میٹرو پولیٹن بھی اس صدسالہ تقریب میں حصہ لینے کے لئے کلکتہ سے دہلی آئے ہوئے تھے، اور اسی جگہ قیام پذیر تھے۔ اینڈریوز نے وہاں انہیں ڈھونڈ نکالا اور میٹرو پولیٹن نے رابنسن کے قول کی تصدیق کی۔ اب ان کے دوبارہ پادریت کو اختیار کرنے کی راہ میں کوئی دشواری نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۹۳۶ کو اسی تقریب کے دوران میں انہوں نے اپنے پیارے کلیسا میں "ہولی کمیونین" (عشائے ربانی) کی رسم کو دوبارہ ادا کیا۔ "چرچ ریکارڈ بک" میں ایک پرچہ اب بھی ان کے ہاتھ کا موجود ہے جس پر یہ عبارت درج ہے: "چارلس فریئر اینڈریوز خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا ہے کہ کئی برس کے بعد اسے اپنی پادریت کی تجدید کرنے کی اجازت دی گئی۔" دوسرے دو عقیدے جنہوں نے ۱۹۱۴ میں انہیں بہت پریشان کیا تھا — "کنواری مریم کے بطن سے مسیح کا پیدا ہونا" اور "مسیح کا دوبارہ جی اٹھنا"۔ اب ان کے لئے رکاوٹ کا باعث نہیں رہے تھے۔[۱] "مسیح اور دعا" میں انہوں نے مسیح کا جو حال لکھا ہے کہ "وہ اخلاقی لحاظ سے انقلابی تھے لیکن بت شکن نہ تھے"، اس کا اطلاق خود ان کی ذات پر بھی ہو سکتا ہے۔

دہلی سے روانہ ہونے کے بعد وہ آنارسی کے قریب "فرینڈز دیہی آشرم" پہنچے

---

[۱] "حیاتِ مسیح" کا جو نامکمل مسودہ موجود ہے اس میں اینڈریوز نے مسیح کی پیدائش کے متعلق ایک نوٹ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ انسانی پیدائش کی طرح تھی۔ لیکن کتاب کے متن میں انہوں نے اتنی احتیاط برتی ہے کہ اپنے عقیدہ کا اظہار اس طرح سے کیا ہے کہ اس سے مختلف عقائد رکھنے والوں کو کوئی دکھ نہ پہنچے۔

"باردبا سان کے بعد ایک ایسی صبح کو جبکہ مطلع صاف تھا، اینڈریوز ٹرین سے سفید کھدر میں ملبوس نیچے اترے۔ وہ اپنی لمبی ڈاڑھی میں بائیبل کے قدیم پیغمبروں کی طرح نظر آرہے تھے اور جنگل کی بھیگی ہوئی زمین اور ندی نالیوں پر سے گذرتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ راستہ میں ان کا بٹوہ ہمیشہ کے لئے گم ہوگیا مگر ان کی ٹوپی جو نالی میں گر گئی تھی، نکال لی گئی۔ وہ اپنے ہاتھ میں اس وقت وائٹ ہیڈ کی کتاب "ایڈونچرز آف آئیڈیاز" مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اس خیال سے کہ کہیں وہ بھی غائب نہ ہو جائے۔ وہیں وزرانڈے میں ہم نے اس قسم کا کھانا کھایا جیسا حضرت عیسیٰ اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھکر کھاتے ہونگے اور وہیں ہمیں تلقین کی گئی کہ عیسائیت کو ماننے کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کا احترام بھی مدِنظر رکھا جائے۔ اس کے بعد ہم رسولیا پہنچے جہاں انہوں نے اُن طلبا کے سامنے جو دیہات میں اپنے اخلاقی اور روحانی سدھار کے کام کو تقریباً ختم کرچکے تھے، ایک لکچر دیا جو عجیب و غریب اور بے انتہا موثر تھا۔ یہاں سے فاتحانہ جلوس کی شکل میں اسٹیشن پہنچے۔ تمام طلبا ساتھ تھے اور ان کے ہاتھوں میں اینڈریوز کے سامان کی مختلف چیزیں تھیں، کسی کے ہاتھ میں جوتا، کسی کے ہاتھ میں تکیہ اور بقیہ کے ہاتھوں میں دوسری مختلف چیزیں تھیں۔ گاتے ہوئے جلوس کی شکل میں پیچھے پیچھے آرہے تھے۔" یہ تھا چارلس اینڈریوز کا سرسری دَورہ!"

چند دن کے بعد شانتی نکیتن سے بمبئی اور وہاں سے انگلستان جاتے ہوئے وہ سیواگرام میں گاندھی سے ملنے کے لئے گئے۔ اب کی مرتبہ ان کے ہاتھ میں وائٹ ہیڈ کی کتاب نہ تھی بلکہ "ٹیگور کی نظموں اور ڈراموں کا مجموعہ" تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ گاندھی ان کی موجودگی میں کم سے کم "سائیکل آف اسپرنگ" (موسم بہار کا چکّر) پڑھ لیں جس کا ناقابلِ فتح نوجوانی کا نغمۂ شکرانہ گزشتہ بیس سال سے ان کے لئے باطنی فیض کا سرچشمہ ثابت ہورہا ہے۔ اب تک گاندھی نے مجموعہ کے یہ گیت نہیں پڑھے تھے۔

اینڈریوز انگلستان گئے تاکہ اُس وعدہ کو پورا کریں جو پچھلے موسم بہار میں

کیا گیا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر ریون کے دعوت نامہ کو قبول کر لیا تھا کہ ۱۹۴۰ کی لینٹ ٹرم میں وہ "دیہاتیوں کے علم دین" پر کیمبرج میں چند لیکچر[1] دینگے۔ جنوری کی ابتدا میں انہوں نے برمنگھم میں اسٹوڈنٹ کرسچین موومنٹ کانفرنس میں شرکت کی اور انہوں نے یہاں بھی نہایت موثر طریقہ سے "مسیح اور دعا" پر اپنی تقریر کی۔ لیکن وہ گزشتہ دو سال کے مسلسل سفر سے بہت خستہ ہو گئے تھے اور برمنگھم کی کانفرنس کے بعد کئی دن تک صاحب فراش رہے۔ کیمبرج میں ہر لیکچر کا اثر ان کی صحت پر پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بے خوابی کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ مارچ اور اپریل کے مہینے انہوں نے شہروں کے شور وشغب سے دور کمبرلینڈ میں مسز میک گریگر راس اور اسکاٹلینڈ میں اے۔ جی فریزر کے ساتھ بسر کئے۔ ان ایام میں جو خطوط انہوں نے لکھے ان میں بیشمار دوستوں کے کاموں کا ذکر ہے بالخصوص ہندوستانی طلبا مقیم انگلستان کے کاموں کا جو اُن کے پاس صلاح ومشورہ کے لئے آیا کرتے تھے، لیکن ان میں افراد کے متعلق "فکرمندی" کا عنصر نہیں پایا جاتا جو اُن کے خیال میں زیادہ کام کرنے کی سزا تھی۔ وہ دوستی کی دھوپ میں خاموشی کے ساتھ روشنی کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ آگے قدم بڑھا سکیں۔

[1] یہ لیکچر اُن کی وفات کے بعد "بیک رونڈ" کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں

باب ۲۲

جناب، ہم مسیح کو دیکھنا چاہتے ہیں!

(۱۹۳۷ سے ۱۹۴۰ تک)

(۱)

سوارتھ مؤر ہال میں اینڈریوز کی میز پر ان کے سامنے ایک خط پڑا ہوا تھا۔ یہ ان کے ایک غیر عیسائی دوست نے ہندوستان سے ایسے زمانہ میں بھیجا تھا جبکہ وہ اپنے میثاقی کام میں شدت سے مصروف تھے۔ وہ انہیں ۱۹۳۳ میں مل گیا تھا اور اس وقت اسے الگ رکھدیا گیا تھا، لیکن ان کے خیالات بار بار اس کی جانب منعطف ہوتے رہتے تھے۔ خط میں لکھا تھا:

"آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنی بیس سالہ گہری دوستی کے زمانہ میں آپ سے مسیح کے متعلق کبھی کوئی بات نہیں پوچھی اس لئے کہ آپ کی اپنی شخصیت میرے لئے کافی سے زیادہ اہم رہی ہے۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ سے پوچھوں کہ مسیح لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیوں میں کس طرح زندگی بسر کرتے تھے اور ابھی تک وہ کس طرح سے زندگی بسر کر رہے ہیں میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ سیدھی سادھی انگریزی زبان میں مسیح کی زندگی کی کہانی لکھیں ــــ یہ سب سے اہم کام ہے جسے آپ ہی کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اعلیٰ

قابلیت رکھنے والوں میں بھی اور عوام میں بھی بہت سے آدمی ایسے ہیں جو مسیح کا تصور آپ کی زندگی سے کرتے ہیں۔ صرف آپ ہی ایسے شخص ہیں جو یہ کتاب لکھ سکتے ہیں اس لئے کہ آپ نے ہندوستان میں ان تیس سالوں میں مسیح کی سی زندگی بسر کی ہے۔"

انہوں نے اس خط پر گرم جوشی سے لبیک کہا۔ ان کا خیال تھا کہ پبلک زندگی سے علیحدگی کے بعد وہ اسی ٹھوس کام کو انجام دیں گے اور یہی کام ان کی زندگی کا بہترین کارنامہ ہوگا۔

ان کا اولین خیال یہ تھا کہ انہیں اب فلسطین جانا چاہئے۔ اس سے قبل کے پانچ سالوں میں جبکہ مسئلۂ یہود نے زبردست شدت اختیار کرلی تھی، انہوں نے متعدد مرتبہ اس کی سیاحت کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی شدید ضرورت ان کے اس ارادہ میں حائل ہوجاتی تھی، مگر اب انہوں نے ارادہ کرلیا کہ وہ اپنے کسی مالدار ہندوستانی دوست سے کہیں کہ وہ اس سفر کے مصارف برداشت کرے اور انہوں نے گاندھی سے مشورہ کیا کہ آیا انہیں اس کتاب کے لکھنے کے لئے فلسطین میں قیام رکھنا چاہئے یا نہیں۔ ایک مرتبہ حالات پھر ان کے اس ارادہ میں حائل ہوئے اس ملک کی پرآشوب حالت میں ان کے لئے ناممکن ہوگا کہ وہ اپنی پوری توجہ کتاب پر مرکوز کرسکیں اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بھی گاندھی نے محسوس کیا اور اینڈریوز ان کی رائے سے متفق تھے کہ اگرچہ کتاب کی تیاری یا نظر ثانی کے دوران میں فلسطین جانا مناسب ہوگا، تاہم وہ کتاب ہندوستان کے دل کو اسی صورت میں اپیل کرسکے گی اگر وہ ہندوستانی ماحول میں لکھی جائے گی۔

اس اثنا میں امداد کی ایک ایسی اپیل کی گئی جس پر لبیک کہنے سے اینڈریوز کبھی انکار نہیں کرسکتے تھے۔ ایک ہندوستانی طالب علم ناقابل علاج مرض سرطان میں مبتلا ہوکر گھر جارہا تھا تاکہ وہ اپنے وطن میں جاکر جان دے اور اس کی بیمار اور نوجوان بیوی اس کی تیمارداری کررہی تھی۔ انہیں دوران سفر میں ایک رفیق کی ضرورت تھی اس لئے کہ بدترین برسات کی وجہ سے بحری سفر سخت دشوار ہوگیا تھا۔ اینڈریوز ان کے ساتھ بمبئی تک گئے۔ ان کی رفاقت سے جو فائدہ انہیں پہنچا اس کا بہترین اعتراف جے۔ ایس ہوائٹ لیگنڈ نے ۱۹۴۰ء میں یوں تحریر کیا ہے:

"وہ بیمار کے کمرہ میں جاتے ـــــ جو غالباً سرطان کا مریض تھا اور خیال تھا کہ ابھی کئی مہینے

اور وہ اس تکلیف وہ مرض کی سختیاں بھگتیگا وہ جب بیمار کے کمرہ سے باہر آتے تو مریض کو یہ محسوس کرکے ڈھارس ہوتی کہ اس کی یہ خوفناک حالت...... یہی وہ شاندار طریقہ ہے جس کے ذریعہ کوئی روح مسیح کی خدمت کرسکتی ہے"

جب اینڈریوز اگست ۱۹۲۰ء میں شملہ پہنچے تو وہ بہت تھکے ہوئے تھے اور مسلسل محنت کی وجہ سے وہ ایک سخت عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے جو وبائی قسم کا تھا۔ لیکن فوری طبی امداد اور سر مہاراج سنگھ کے پرسکون مکان واقع سمر ہل میں محتاط اور محبت بھری تیمارداری نے ان کی جان بچائی، مگر صحت کی مکمل بحالی میں پورے دو مہینے لگے۔

اپنے رو بصحت ہونے کے ایام میں انہیں اس ما فوق الفطرت روشنی کا مزید تجربہ ہوا جس میں تقریباً ۵ سال قبل وہ اپنی پہلی تبدیلی کے بعد تمام کائنات کو ڈوبا ہوا دیکھ چکے تھے اور اس کے بعد بھی شاندار لمحات کے شاذ مواقع پر وہ اس روشنی سے مستفید ہوتے رہے۔ صاف آسمان، دھوپ کا درختوں کے پتوں میں سے چھن چھن کر آنا، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ اور سرسبز زمین نے ان میں شاعری کا وہی جذبہ دوبارہ پیدا کردیا جو ابتدائی ایام میں ان کا امتیازی پہلو تھا۔ انہوں نے رابرٹ بریج کی کتاب "صحیفہ حسن" کو مزے لے لیکر پڑھا اور ٹیگور کے نام طویل خطوط میں مصنف کے خیالات سے ہم نوائی کی۔ ٹیگور اس زمانہ میں ایک سخت بیماری سے جو اینڈریوز کی بیماری کی طرح سخت تھی، رو بہ صحت ہو رہے تھے۔ ایک اور خط میں جس میں ایک نو آموز (بھارتی سارا بھائی) کو لکھنے کے فن کے بارے میں دوستانہ نصیحت کی گئی تھی، انہوں نے آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے اعتقاد کا اقرار ذیل کے الفاظ میں کیا:۔

"افلاطون کا یہ قول ہمیشہ کے لئے صحیح ہے کہ اس ناپائیدار حسن کے پیچھے ابدی حسن ہے اور سچائی کی شعاع کے پیچھے ابدی سچائی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آرٹ کی خاطر آرٹ کی تائید میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے، اور میں جانتا ہوں کہ آرٹسٹ کو اپنے تخلیقی رنگ میں بے خوف ہو کر سچائی سے کام لینا چاہیئے، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ نیکی، سچائی اور حسن ابدی ہیں اور بدی، جھوٹ اور باقی ہر چیز فانی ہے، لہٰذا جو موضوع تم اپنے لئے انتخاب کرو اسے ابدی معیار سے پرکھنا چاہیئے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایسی کسی چیز کی منظر کشی نہ کی جائے جس میں کوئی اخلاقی پہلو مضمر نہ

ہو، نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ تم اپنا مقصد بلند رکھو۔"

اور پھر ایک اور خط میں جو دو سال بعد لکھا گیا تھا وہ اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

ہم سب میں جو لکھنے کے عادی ہیں، راستہ میں رُکنے اور پھول توڑنے کا رجحان پایا جاتا ہے ضروری نہیں کہ ایک شخص لفظ کے محدود مفہوم میں تارک الدنیا بن جائے۔ خطرہ اس میں ہے کہ انسان پھر پور زندگی کے پیالہ کو دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کرے جبکہ وہ ہونٹوں تک بے مانگے آتے (خدا کی دین ہے) بلکہ جب خدائی بلاوا آئے، تو اس کی مسرت کے ساتھ ہم آغوش ہو جائے اگر تم اس چیز کے وفادار رہو جو تم میں بہترین ہے۔ تو مسرت کا پھول پھل لائے گا اور اسی عمل میں اندرونی انقلاب مضمر ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان اس حقیقت کو سمجھ لیتا ہے کہ ٹریجیڈی میں بھی ایک قسم کی سچائی اور ایک قسم کا حُسن موجود ہے۔ [1]

ان مذکورہ بالا الفاظ میں افلاطون کے شاگرد کی نہیں بلکہ ٹیگور کے شاگردوں کی روح بھی جلوہ گر ہے۔

اس تخلیق تحریک کی تجدید کے ساتھ ساتھ تقدیس کا سنجیدہ جذبہ بھی کارفرما ہو گیا۔ اینڈریوز کو ایسا معلوم ہوا کہ انہیں دوبارہ زندگی اس لئے دی گئی ہے کہ وہ مسیح کے متعلق ایک کتاب لکھیں۔ مگر دوسرے لوگ شبہات میں مبتلا تھے۔ کتاب کے ہونے والے ناشر ہیرا سیفلے آنوِن نے لکھا۔ "اگر چہ مہاتما گاندھی سی۔ ایف۔ اے کو یہ مشورہ دیتے کہ وہ تبت کی کسی خانقاہ میں چلے جائیں تو ممکن ہے کہ ہمیں معلوم ہوتا رہتا کہ حیاتِ مسیح کہاں تک لکھی جا چکی ہے۔ میں تو اس بارے میں مایوس ہوں کہ اس کتاب کو ہندوستان میں رہ کر لکھا جا سکتا ہے۔"

یہ شبہات مضبوط بنیادوں پر مبنی تھے۔ اینڈریوز ۱۹۳۰ء میں ہندوستان میں رہ کر امن سمجھوتہ کی بہترین کوشش میں حصہ لینے سے کیسے انکار کر سکتے تھے جبکہ صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومتیں قائم ہو رہی تھیں اور وزراء معاشرتی اصلاح کے شریفانہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کر چکے تھے۔ جو لوگ حکومت کے نئے بوجھ کو اب اپنے کندھوں پر اٹھا رہے تھے۔ وہ ایسے رفقائے کار تھے، جو بیس سال سے قومی آزادی کی کشمکش میں برابر کے حصہ دار تھے۔ یہ لازمی امر تھا کہ

---

[1] مکتوب بنام بھارتی۔ سارا بھائی ۱۲ نومبر ۱۹۳۹ء

شراب نوشی کے خلاف اور قید خانوں کی اصلاح کی تائید میں اپنا قلمی جہاد جاری رکھیں اور یہ کہ زنجبار میں لونگ کی تجارت کے بائیکاٹ میں، اور کینیا ں نئے نسلی قانون کے خلاف جنگ میں حصہ لیں بلکہ برما میں "کنگنی" (موسمی بیگار) کے طریقوں اور سیلون میں شامل ہونے والے قلیوں کی شکایات کی تحقیقات کریں۔ یہ بھی ضروری تھا کہ تمام موسم خزاں میں وہ اپنے پرانے دوست لارڈ لوتھئین سے مشورہ کریں کہ کس طرح سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے "مرکزی" احکام کو (جن کے بارے میں تاخیر کا مشورہ اینڈریوز دے چکے تھے) عملی جامہ پہنایا جائے۔ وہ آنے والے خطرات کا بھی ہوش مندی سے مطالعہ کر رہے تھے: خطرات جن کے متعلق وہ انڈیا آفس کو پہلے سے باخبر کر چکے تھے ___ یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی روز افزوں کشیدگی اور انتہا پسندی کا یہ رجحان کہ انہیں طفیلی زمینداروں کے خلاف دباؤ اور تشدد کی پالیسی کی حمایت کرنی چاہیئے جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ دوستانہ نصیحت بھرے ذاتی خطوط لکھ کر مداخلت کر سکتے ہیں تو انہوں نے اس سے دریغ نہیں کیا۔

ایک موضوع جس سے انہیں خاص طور پر لگاؤ تھا، وہ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے تنازعہ کے بارے میں قوم پرست ہندوستان کا طرز عمل تھا۔ مرکزی یورپ میں یہودیوں کی المناک صورت حال ہر وقت ان کے تخیل پر مستولی رہتی تھی۔ ہندوستان میں انہوں نے دیکھا کہ ان کے خلاف "خوفناک تلخی" موجود ہے۔ چنانچہ اخباری مضامین میں انہوں نے زور دے کر بتایا کہ انسانی ترقی میں وہ نمایاں حصہ لے چکے ہیں اور ان مظالم کی تشریح بھی کی جو ان پر کئے جاتے رہتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کے نام جو خط انہوں نے بھیجا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کانگریسی لیڈروں سے انہوں نے کس طرح سے گفتگو کی ہوگی:

"میرا ارادہ تھا کہ فلسطین کے بارے میں عربوں کے اتحاد کے لئے جو کھلی کوششیں جاری کر رہے ہیں۔ ان کے متعلق کچھ لکھوں میرے خیال میں جو لفظ بھی کانگریس کی طرف سے عربوں کی تائید میں نکالا جاتے وہ اس تنبیہ پر مشتمل ہونا چاہیئے کہ انہیں کسی استعماریت پسند طاقت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کرنا چاہیئے۔ اگر عرب اٹلی سے اور یہودی برطانیہ سے دوستانہ مراسم قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ فعل ایسی چیز کا نمائندہ ہوگا جس سے ہمیں حتی الامکان کوئی تعلق نہ

دیکھنا چاہتے۔ ہمیں یہ کہدینا چاہیئے جیساکہ کانگریس نے کہدیا ہے کہ "تم ملکہ آزادر کسی صورت یا کسی شکل میں استعماریت کے ساتھ تعلق نہ رکھو"۔

جیساکہ آپ جانتے ہیں میں کانگریسی معاملات میں کسی قسم کا مشورہ دینے سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا ہوں اس لئے کہ سوراج کا نچوڑ ـــ سوراج ہے۔ لیکن جو بات میرے دل میں تھی، وہ خوف ہے کہ کہیں اطالوی ـ مازش ہم میں سے کسی پر اپنا قابو نہ جمالے۔[ملے]

واپس لوٹنے والے "تارکان وطن کے مسائل سے بھی اینڈریوز غافل نہ رہ سکتے تھے۔ ایک خط میں وہ فجی کے ایک متمول ہندوستانی خاندان کی داستانِ غم بیان کرتے ہیں جسے ہندوستان میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے کی ترغیب دی گئی تھی لیکن اس کے پہنچنے پر اس کا تمام روپیہ چوری ہوگیا اور وہ مٹیا برج میں مصیبت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں، "یہ تو صرف ایک واقعہ ہے۔ میں خود کتنی اشخاص کی ایسی غمناک مثالیں پیش کر سکتا ہوں جو انسان کو آبدیدہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ میں ان حالات میں فلسطین کیسے جا سکتا ہوں اور "حیاتِ مسیح" کیسے لکھ سکتا ہوں جبکہ مسیح ان غریب اور بیکس لوگوں میں خود یہاں جلوہ گر ہیں!"۔ انہوں نے حکومت کے سامنے یہ بوزیشن کی کہ پالیسی اور اصول کے اہم امور حکومتِ ہند کے ہاتھ میں رہیں لیکن تین بڑے صوبوں کے حکام کو اختیارات دے دئے جائیں تاکہ وہ تارکانِ وطن کے بہت سے مقامی معاملات کو جنکا تعلق افراد کی بہبودی سے اس قدر گہرا ہے، جلد اور موثر طریقہ سے حل کر سکیں۔ انہوں نے مسٹر جی۔ ایس۔ باجپئی جیسے افسروں کو جن سے ان کے تعلقات کافی دوستانہ ہو گئے تھے کو جو یاد داشتیں بھیجیں ان میں مایوس کن طریقہ سے اس معاملہ کی شدت کا اظہار کیا گیا ہے:

"ان مقامی امور کی وجہ سے مجھے لامتناہی خط و کتابت کرنی پڑتی ہے۔ غریب افراد یہ سمجھکر مجھے دردناک خط بھیجتے ہیں کہ میں ان کے قابلِ رحم حالات کی تفصیلات میں حصہ لینا پسند کروں گا۔ میری عمر اب ۷۰ کے قریب ہو چکی ہے اور میرے لئے ڈاک کے اخراجات

ملے اس خط پر ۹ رنومبر ۱۹۳۷ء کی تاریخ پڑی ہوئی ہے۔

ناقابلِ برداشت ہو چکا ہے۔ لیکن جو غیر معمولی فائدہ انہیں میری مالی امداد سے پہنچا ہے وہ مجھے اس وقت تک اس کام کو چھوڑ دینے پر آمادہ نہیں کر سکتا جب تک کہ میں یہ نہ دیکھ لوں کہ اسے زیادہ موثر طریقہ سے انجام دینے کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔" [۱]

جس طرح اس سے قبل اینڈریوز کی اس تجویز کے متعلق کہ بحرالکاہل کے جنوبی علاقوں میں ٹی کمشنر مقرر کئے جائیں، ہندوستانی آراء میں اختلاف تھا، اسی طرح ان کی باقی مخصوص تجاویز کی معقولیت پسندی کے بارے میں بھی اہل الرائے اصحاب میں اختلاف ہوا۔ لیکن ان تجاویز کا بنیادی اصول یہ تھا کہ غریب شہریوں اور صاحب اختیار لوگوں میں جو ذاتی رابطہ قائم ہو وہ قدرتی اور حقیقی جمہوریت پر مبنی ہونا چاہئے تاکہ آسانی کے ساتھ عوام کی شکایتوں اور بے انصافیوں کی تلافی کی جا سکے۔

۱۹۳۷-۳۸ کے موسم سرما میں اور مابعد کے سالوں میں انہی مہینوں میں اینڈریوز شانتی نکیتن میں تھے "جہاں وہ اپنے گھر کی طرح سے رہتے ہیں اور یہ بات تمام ہندوستان میں انہیں کسی اور جگہ میسر نہ تھی۔" آشرم کے لئے اپنے پچیس سالہ کام کے دوران میں انہوں نے پہلی مرتبہ اس امر پر رضامندی کا اظہار کیا کہ انہیں کوئی عہدہ دیدیا جائے۔ ۱۹۳۸ کے آخر میں ٹیگور نے انہیں وشوا بھارتی کا وائس پریزیڈنٹ نامزد کیا اور انہوں نے اس عزت افزائی کو اس بنا پر قبول کر لیا کہ اس طرح انہیں بوڑھے شاعر کے بار کو ہلکا کرنے کا موقع ملے گا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ خود ان کی اپنی خط و کتابت کے زبردست حجم میں اور اضافہ ہو جاتا۔ لیکن جب کبھی دوست کچھ نکتہ چینی کرتے تو اینڈریوز جواب میں کہتے "جو کام خدا نے میرے سپرد کیا ہے اسے انجام تک پہنچانے کی طاقت بھی وہی دے گا۔" [۲] اور خاموشی سے اپنے کام میں لگے رہتے۔

وشوا بھارتی کا ایک محکمہ ایسا تھا جس کے لئے خصوصیت کے ساتھ انہوں نے نہایت جانفشانی سے کام کیا۔ یہ ہندی بھون تھا جس کا افتتاح باقاعدہ طور پر ۱۹۳۹ء میں کیا گیا تھا۔

---

[۱] مکتوب بنام اے ایچ۔ جنوری ۱۹۳۸

[۲] مکتوب بنام۔ ای۔ فارسیتھ بیٹن مورخہ ۱۸؍ نومبر ۱۹۳۹

اینڈریوز ہمیشہ اس امر کے لئے کوشاں رہتے تھے کہ شانتی نکیتن حقیقی معنوں میں کل ہندوستان کا تعلیمی مرکز بنے اور یہ کہ ہر صوبہ کی ممتاز ادبی اور ثقافتی روایات بنگال کی طرح وہاں جلوہ گر ہوں۔ ہندی بھون جس کے لئے انہوں نے روپیہ جمع کرنے کی سب سے آخری اور نہایت کامیاب کوششیں کیں، ان کے خواب کی تکمیل کی طرف ایک بہت بڑا قدم تھا اور اس لئے یہی مناسب تھا کہ اینڈریوز ہی اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھیں۔

(۲)

شملہ کی بیماری کے بعد سے اینڈریوز کو مکمل صحت کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ باوجود اس کے انہیں مسلسل محنت کرنی پڑی اور مارچ ۱۹۳۸ میں وہ جنوبی ہندوستان کے مقام تروپتور کے مسیحی آشرم میں گئے پونا میں ۱۹۲۰ میں عیسائی طلبا کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں دو نوجوان ڈاکٹروں ایس۔ جیسوداسن اور ای۔ فارسیسٹر پیٹن سے ملاقات ہوئی تھی جو اس وقت مسیحی آشرم کی بنیاد ڈالنے کے منصوبے باندھ رہے تھے، اور انہوں نے اس کی کامیابی کے لئے برکت بھی دی تھی۔ اب انہوں نے موسم گرما کا زمانہ ان کے ساتھ گزارا، کچھ تو تروپتور میں اور کچھ نیلگری کی پہاڑیوں میں۔ یہاں انہیں خاموشی سے اور بغیر کسی رکاوٹ کے تحریری کام کرنے کا موقع ملا اور وہ مس میو کی کتاب کا جواب "حقیقی ہندوستان" لکھتے رہے۔ جب وہ اس سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے حیدر آباد کے ڈاکٹر ای۔ ای۔ اسپیٹ کے اشتراکِ عمل سے جن سے وہ عرصہ ہوا جاپان میں ملے تھے، نوجوانوں کی سی تن دہی اور جوش کے ساتھ انگریزی "ریڈرون" کا سلسلہ مرتب کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مہادیو دیسائی کو لکھا:-

"منتخب اقتباسات اس نوعیت کے ہوں گے کہ خود ان کے ملک کے اور اس بڑی دنیا کے بلند ترین مطمعِ نظر لڑکوں کے سامنے آجائیں۔ میں اس میں مذہبی شہ بھی داخل کرنا چاہتا ہوں بغیر اس کے کہ مذہبی غیر جانبداری کے اصول کی خلاف ورزی ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ سوانح حیات کے واقعات کے ذریعہ مذہبی اور اخلاقی مطمحِ نظر کو پیش کیا جائے۔ یہ معاملہ عدم تشدد اور سچائی کے نقطۂ نظر سے اس قدر اہم ہے کہ میں آگے بڑھنے سے

پیشتر باپو سے گفتگو کرنے کا متمنی ہوں۔"

ہندوستانی قومی زبانوں کے متعلق انہوں نے غور و فکر کے بعد ایک سلسلہ مضامین لکھا جو مدراس کے اخبار "ہندو" میں شایع ہوا۔ ان مضامین کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنوبی ہند کے باشندوں کے نقطہ نظر سے کس قدر جلد واقف ہو گئے تھے۔ ان مضامین میں انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنے شمالی ہند کے دوستوں کو یاد دلایا کہ "کوئی وجہ نہیں کہ زبان کلچر، آرٹ اور موسیقی کا امتزاج صرف شمال میں مسلمانوں اور ہندوؤں تک محدود رہے۔" انہوں نے غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنی زبان سے خارج رکھنے کے حامیوں کو بتایا کہ "جدید ایجادات کے مناسب الفاظ کے داخلہ کو جو ہر تیرا عظم میں پہنچ چکے ہیں، ہندوستان کی سرحد پر نہیں روک دینا چاہتے۔"

ایک مرتبہ پھر دوستی کے تقاضے اُن کے سکون میں خلل انداز ہوئے یعنی ایک صبح کو اتوار کے دن ایکسپریس ڈلیوری لیٹر آیا۔ اسے بمبئی سے مسز ا ین نے بھیجا تھا۔ اس نے انتہائی مصیبت کی حالت میں خط لکھا تھا کہ ان کے خاوند کو ایک سخت مگر جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ چارلی نے ہم سے کہا کہ آؤ سب مل کر اس کے لئے دعا کریں۔ دعا کے اختتام پر چارلی نے ارادہ کر لیا کہ وہ وہاں جائیں اور مصیبت و ابتلا میں ان کا ساتھ دیں۔ اس کے معنی یہ تھے کہ بدترین گرمی کے موسم میں وہ دو دن کے سفر کی زحمت برداشت کریں اور فوجداری مقدمہ کی جملہ دشواریوں میں سے گزریں مگر ان باتوں کے باوجود چارلی نے پس و پیش نہیں کیا۔ دو تین ہفتے کے بعد اینڈریوز واپس آ گئے اور اگرچہ وہ تھکے ہوئے تھے لیکن ان کا دل اندرونی مسرت سے لبریز تھا۔ سچائی ظاہر ہو چکی تھی اور ان کے دوست ذلت اور ابتلا سے بچ گئے تھے۔[1]

جس انتہائی قدر و قیمت سے اینڈریوز جملہ انسانی محبت کو، نیز مہربانی اور محبت کے ان چھوٹے کاموں کو دیکھتے تھے جو بھلا دئے جاتے ہیں اور بے نام و نشان رہتے ہیں،

---

[1] ڈاکٹر ای۔ ٹالیسٹر بیٹی کا مکتوب مصنفین کے نام۔

اس کا اظہار ان تفصیلات سے ہو سکتا ہے۔ ان آخری سالوں سے بچ کر ہم تک پہنچی ہیں
وہائٹ ہیڈ کی کتاب "ایڈونچرز آف آئیڈیاز" کی عبارتِ تہدیہ کا ایک جملہ جس کی درستی
الہام کا درجہ رکھتی ہے"۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں ان کی تقریر کا موضوع بنا۔ انہوں نے کلکتہ
یونیورسٹی کی تقریبِ تقسیمِ اسناد کے موقع پر بتایا کہ تعلیم میں احترام آمیز محبت کے ان رشتوں
کا کیا مقام ہے جو کم عمر اور زیادہ تجربہ کار اشخاص میں ہوتی ہیں اور جو کیمبرج میں ان کے لئے
اسقدر اہمیت رکھتی تھیں۔ چھ مہینے بعد دوسرے جلسہ تقسیمِ اسناد کے موقع پر جو میسور
یونیورسٹی کے طلبا کے روبرو دیا گیا تھا، انہوں نے یونیورسٹی سیٹلمنٹس کے قیام کی
پرجوش طریقہ سے حمایت کی تاکہ طالب علم اور دیہاتی، مالدار اور غریب کے مابین جو خلیج
حائل ہے اسے پاٹا جا سکے۔ لیکن یہ کام اسی اسپرٹ میں ہونا چاہیے۔ جس اسپرٹ سے انہوں
نے والورتھ میں کام کیا تھا۔ مگر ایسے طریقے عمل میں آنے چاہئیں جو ہندوستان کی فطرت ہی
جوہر کے عین مطابق ہوں۔ میسور یونیورسٹی سیٹلمنٹ کا قیام اسی تقریر کا نتیجہ ہے
ہندوستان کے تمام حصوں کے طلبا کا روز افزوں حلقہ انہیں اپنا گرو سمجھتا تھا بعینہ جس
طرح سے وہ برائتر، ولیسٹ کوٹ اور گور کو اپنا گرو سمجھتے تھے۔ جو خط ان کے پاس سے آتا
اس کا وہ بڑی محبت اور احتیاط سے جواب دیتے اور ہر ایک خط پر اپنی انفرادی توجہ
مبذول کرتے۔

جب کبھی وہ دوروں پر کلکتہ جاتے ان کی موجودگی سے ہسپتال کے بڑے
بڑے وارڈوں میں نئی جرأت اور تسکین کا سامان پیدا ہو جاتا تھا۔ اگر ایک مریض کو دیکھنے
جاتے تو وہ بیشمار دوسرے مریضوں کو بھی ضرور دیکھتے اور ان کی ڈھارس بندھاتے اور ان
کے لئے دعائیں مانگتے۔ عیسائی اور غیر عیسائی دوست قدرتی طور پر ان سے رجوع ہوتے
اور "زندگی کی بڑی بڑی باتوں" کے بارے میں ان سے گفتگو کرتے اور نیز اپنے دکھ
اور موت کی حالت میں ان کی دعاؤں کے طالب ہوتے۔ اس وقت شک وشبہ کی قدیم
دیواریں کلی طور پر منہدم ہو جاتی تھیں۔ ایک ہندو دوست نے جن کی بیماری کے زمانہ
میں اینڈریوز نے دعا مانگی تھی، لکھا ہے کہ "میں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ وہ دوسرے

مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے میرے لئے دعا مانگی تھی اور اس سے مجھے بہت تقویت ہوئی۔" چارلی یہ دیکھ کر بہت مسرور تھے کہ اسی ہندو دوست (جے۔ اے نٹیسن) نے بعد کو ان کے وہ تمام مذہبی خطبات شایع کئے[1] جو سینٹ اسٹیفن کالج میں وہ شام کی نماز کے وقت دیا کرتے تھے۔

مصیبت اور عسرت کے وقت ان سے جو اپیل کی جاتی اس موقع پر ان کے لئے رکنا محال ہو جاتا۔ چنانچہ جب ۱۹۳۸ء میں ٹراونکور نیشنل اینڈ کوئیلن بنک ٹوٹا ہے تو وہ بنگلور میں تھے۔ ایسے بیسیوں اشخاص جنہوں نے اپنی بچت کی چھوٹی چھوٹی رقمیں اس میں جمع کرائی تھیں، تشویش کی حالت میں ان کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ اینڈریوز جانتے تھے کہ یہ اشخاص دوسرے ہزاروں اشخاص کے نمایندہ ہیں اور یہ ان کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ ہر اس امداد کے دینے سے جو وہ دے سکتے ہوں، انکار کر سکیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ ٹراونکور کے بڑے بڑے عمال حکومت بنک کو توڑنے کے ذمہ دار ہیں۔ جس کی وجہ سے ریاست میں سول نافرمانی شروع کردی گئی اور سخت بے چینی رونما ہوئی۔ اینڈریوز نے اپنا کام ترک کر دیا، دو مرتبہ مدراس گئے اور دو مرتبہ دہلی کا تھکا دینے والا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا:[2] "تمام دہشت پیدا کرنا نفرت انگیز ظلم ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ اس کی تہ میں بنیادی بد دیانتی ہے اور میں تو صورت حالات کی اصلاح کرانے کی کوششوں میں مصروف ہوں۔"

انگلستان سے پیہم تقاضے آتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ ان الجھنوں میں اور "حیات مسیح" کے لکھنے میں کوئی تطابق نہیں ہے۔ ان کے جواب میں انہوں نے شرمسار ہو کر یوں اقرار جرم کیا:

"میرا خیال ہے کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی اس قسم کی زندگی میں اب کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا یعنی جس طرح سے ایک چیتا اپنے داغ نہیں بدل سکتا! یہ چیز میرے خون میں شامل ہو گئی ہے جیسا کہ ٹراونکور والے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ بیچارہ فلپ اُن ون!

---

[1] مطبوعہ ۱۹۰۸ء

[2] مکاتیب بنام اے۔ ایچ۔ نومبر ۱۹۳۸ء

میں ساڑھے چھ مہینہ کتاب کی ایک سطر بھی نہیں لکھ سکا۔"[1]

دوسرے چھ مہینہ میں بھی اینڈریوز دوسرے مصائب میں گہرے طور پر گرفتار رہے۔ اڑیسہ کی پہاڑیوں کی بعض دُور دراز دیسی ریاستوں میں ظلم وستم کے خوفناک واقعات رُونما ہو رہے تھے اور تباہ حال پناہ گزین ملحقہ صوبہ میں آنے شروع ہو گئے تھے۔ اڑیسہ کی کانگریسی وزارت کے افراد اینڈریوز کے ذاتی دوست تھے۔ جن کی معیت میں رہ کر انہوں نے قبل کے سالوں میں سیلاب زدہ علاقوں میں امدادی کام کیا تھا۔ اب وہ اینڈریوز سے امداد کے طالب ہوتے اور انہوں نے حکومتِ ہند اور ایسٹرن اسٹیٹس ایجنسی کے افسروں کی خدمت میں پناہ گزینوں کا مسئلہ پیش کرنے کے سلسلہ میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

پچھلی نسل کا کوئی آدمی نوعمر سیاسی لیڈروں کے جذبات کو ان سے زیادہ نہ سمجھ سکتا تھا۔ سوباش بوس کے لئے جو محبت اور احترام ان کے دل میں تھا، اس کی وجہ سے ان کی خواہش تھی کہ وہ ۱۹۳۹ کی پارٹی بازی کے اختلاف کو امن وآشتی کے ذریعہ دور کر دیں اگرچہ وہ اس سے واقف تھے کہ عدم تشدد کے مسائل پر کسقدر گہرے اختلاف رونما ہو رہے ہیں۔ ایک خط میں وہ رقمطراز ہیں: "گڑبڑ اسقدر زیادہ ہے کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ دوستی کے ان تمام رشتوں میں ساتھ دوں اور انہیں استوار کروں جو میری نظر میں بیحد قدر وقیمت رکھتے ہیں۔ میں روز بروز زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ دیکھ رہا ہوں کہ ذاتی دوستیاں ہی وہ مستقل چیزیں ہیں جو الجھاؤ پیدا ہو جانے کے بعد اسے سلجھا سکتی ہیں۔"[2]

(۳)

دسمبر ۱۹۳۸ کے دوسرے پندرھواڑے میں مدراس کے قریب تمبرم کے مقام پر بین الاقوامی مشنری کونسل کی زیر سرپرستی دنیا بھر کے عیسائیوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی

---

[1] مکتوب بنام اے۔ ایچ۔ مورخہ نومبر ۱۹۳۸

[2] مکتوب بنام اے۔ ایچ۔ مورخہ جنوری ۱۹۴۰

مشرق و مغرب کے عیسائی لیڈروں کا یہ ایک نمایندہ اجتماع تھا اور اس سے زیادہ شاندار اجتماع آج تک منعقد نہیں ہوا تھا۔ اینڈریوز کو بڑی حیرت ہوئی جب انہیں بھی اس میں شرکت کرنے کے لئے دعوت نامہ بھیجا گیا اس لئے کہ وہ خود کو ضرورت سے زیادہ شوریدہ سر خیال کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کی تیاریاں کرنی شروع کر دیں اور انعقادِ کانفرنس سے پیشتر کے ہفتوں میں انہوں نے اس کے لئے بڑی محنت کی کہ برطانوی اور امریکی نمایندے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی لیڈروں سے تعلقات پیدا کر سکیں خواہ وہ عیسائی ہوں یا غیر عیسائی اور یہ کہ وہ گاندھی سے بھی ملیں اور ان سے تبادلۂ خیال کریں۔

ٹمبرم کی کانفرنس میں وہ چیز نمایاں طریقہ پر سامنے آ گئی جس پر اینڈریوز گزشتہ تین سال سے مسلسل غور کر رہے تھے۔ بڑا سوال یہ تھا کہ جہاں تک غیر عیسائی مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، انجیل کی تبلیغ کے بارے میں عیسائی فرض کیا ہے۔ تبدیلیِ مذہب کا سوال اس وقت اور نمایاں ہو گیا جب ڈاکٹر امبیڈکر کی خیرہ کرنے والی تجویز سامنے آئی جس کی تہ میں سیاست کارفرما تھی اور جس میں ۶ کروڑ اچھوتوں کو ہندو دھرم سے نکالکر ایسی جماعت میں داخل کر دینے کا سوال اٹھایا گیا تھا جو انہیں قابلِ اطمینان "شرائط" پیش کرے۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان میں یہ بات بھی چھڑ گئی کہ ایک شخص اپنے مذہب کو بدلنے میں کہاں تک حق بجانب ہے اور کن حالات میں وہ ایسا کر سکتا ہے۔ ایک ہندو دوست[1] نے اینڈریوز سے درخواست کی کہ وہ ان کے اخبار کے لئے ایک مضمون تحریر کریں اور بتائیں کہ دوسرے مذہب کے لوگوں کو عیسائی بنانے کے سلسلہ میں صحیح عیسائی نقطۂ نظر کیا ہے۔

یہ ایسا سوال تھا جس پر اینڈریوز اور گاندھی میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ اینڈریوز کو جملہ تبادلۂ مذہبی مباحث سے نفرت تھی اور وہ یقینی طور پر محسوس کرتے تھے کہ سچی عیسائی تبلیغ یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کے دوسرے زندہ مذاہب کی اُن چیزوں کو جو رہ گئی ہیں اور مرنے کیلئے تیار ہیں، طاقت ور بنانے کی کوشش

---

[1] جی۔رام چندرن، ایڈیٹر ماترا بھومی، کالی کٹ۔

کی جائے۔ وہ اس امر میں خاص احتیاط برتتے تھے کہ کوئی نوجوان شخص ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر سچے مذہبی یقین کی بجائے کسی اور جذبہ کے ماتحت عیسائی بنے۔ اس کے برخلاف جب وہ دیکھتے کہ حقیقی یقین موجود ہے تو وہ اسے ایسا کرنے سے نہیں روکتے تھے اور بعض اشخاص نے جنہوں نے وقتاً فوقتاً مسیح کی باتیں ان سے سیکھی تھیں، ان کے علم اور اعانت سے عیسائی گرجا میں جاکر بپتسمہ بھی لے لیا۔ ۱۹۳۷ میں انہوں نے گاندھی سے طویل بحث کی اور نتائج ایک خط میں جو ایک دوست کے نام بھیجا گیا تھا، درج کر دئے ہیں اور یہی وہ نقطۂ نظر ہے جسے انہوں نے تمبرم کی کانفرنس میں پیش کیا تھا۔

"مذہب پر جو تقریر کل آپ نے کی اس سے مجھے بہت پریشانی ہوئی اس لئے کہ جو کلیہ آپ نے بیان کیا ہے کہ تمام مذاہب مساوی ہیں" تاریخ کے مطابق نہیں ہے اور نہ میری زندگی کا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے آپ کا یہ اعلان کہ ایک شخص کو اسی مذہب میں رہنا چاہئے جس میں وہ پیدا ہوا ہے، مذہب جیسے زبردست مسئلہ پر عائد نہیں ہوتا۔

اگر تبدیلِ مذہب سے یہ مراد ہے کہ ہم اپنے مذہب کی کسی زندہ سچائی سے انکار کر دیں تو پھر ہمیں اس سے قطعی سروکار نہ رکھنا چاہئے کیونکہ تبدیلِ مذہب نئی اور شاندار سچائی کی دریافت کا نام ہے جس کے لئے ایک شخص کو اپنی زندگی قربان کر دینی چاہئے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ انسان ایک رفاقت سے دوسری رفاقت میں جا رہا ہے اور یہ کام تھڑ دلی سے نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اگر نئی رفاقت شاندار نئی سچائی پر اس طریقہ سے حاوی ہو کہ وہ قدیم دقیانوسی سچائی کی بہ نسبت اسے زیادہ زندہ اور دل نشین بنادے تو پھر میں اس شخص سے کہوں گا کہ "آگے بڑھے چلو"

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پہلے مذہب کی کسی سچائی سے انکار کیا جائے۔ سوشیل کمار رُدرا کھلم کھلا کہا کرتے تھے کہ انہیں ہندو مذہب کی ہر اچھی چیز سے محبت ہے، اور اس کے باوجود وہ پکے عیسائی تھے۔ یہ بات حضرت عیسیٰ کے خیالات کے عین مطابق ہے وہ جہاں کہیں ایمان کا عکس دیکھتے اس کا لازمی طور پر خیر مقدم کرتے۔

..... مسیح میرے نزدیک اس راستہ کا نام ہے جس کے ذریعہ میں خدا تک پہنچا ہوں

اور میں نے خدا کو پالیا ہے۔ اور میں اس کے بارے میں جب کبھی بغیر کسی جبر یا نامناسب دباؤ کے ایسا کر سکوں دوسروں کو کہنے سے باز نہیں رہ سکتا میں پولوس کی عزت کرتا ہوں جب وہ یہ کہتے ہیں: "مجھ پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ مجھ پر لعنت ہو اگر میں انجیل کی تبلیغ نہ کروں"۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جس پیغام کو پھیلانے کے لئے مسیح دنیا میں آئے تھے وہ نہایت جامع ہے اور نہایت الہامی وہی وجہ ہے کہ میں عیسائی ہوں۔ ساتھ ہی میں اپنے دوست عبد الغفار خاں سے متوقع ہوں کہ وہ پیغمبرؐ صاحب کے پیغام کی تبلیغ کرتے رہیں گے جو اُن کے نزدیک ایک سچائی ہے اور جسے وہ صرف اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتے۔

اس سے میرے خیال میں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہم ہمیشہ اس امر کے متعلق جنگ کرتے رہیں کہ کس کی "مذہبی کتاب" اعلیٰ ہے۔ عیسائیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نمایاں اور واضح امتیازات ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نیکی کا قیمتی عنصر ایسا ہے جو ہم سب میں مشترک ہے۔ مقدس پولوس کا قول ہے، "جو چیزیں سچی، دیانتدارانہ منصفانہ، خالص، پیاری اور خوبصورت ہیں۔۔۔۔۔ ان چیزوں کا تصور کرو اور امن و سکون کا خدا تمہارے ساتھ ہوگا"۔ میرے خیال میں مذہبی امن و آشتی کے اظہار کا یہی بہترین طریقہ ہے بغیر اس کے کہ کوئی سمجھوتہ کیا جائے، ناقابل اتحاد مسائل میں ہم آہنگی کی جائے یا اہم امتیازات کو ہلکا کیا جائے۔

۱۹۳۸ء میں اینڈریوز نے تمبرم کانفرنس کے لئے ایک مقالہ تحریر کیا جس میں انہوں نے بلا واسطہ طریقہ سے اس بنیادی اصول سے بحث کی ہے جسے تبلیغی سرگرمیوں کی تہ میں کارفرما رہنا چاہئے۔ اسی لئے وہ مقدس پطرس کے الفاظ دہراتے ہیں، "آسمان کے نیچے کوئی دوسرا نام نہیں ہے جس کے ذریعہ ہماری نجات ہو سکتی ہے، بلکہ صرف اپنے آقا مسیح کے نام سے ہم بچ سکتے ہیں"، اور وہ پوچھتے ہیں کہ ان لوگوں میں جو عیسائی نہیں ہیں، روح القدس کی موجودگی کے یقینی تجربہ کی روشنی میں اس آیت کا کیا مفہوم ہوگا؟

یہی شکوک مجھے خود مسیح کی طرف لے گئے اور نتیجہ انقلاب انگیز نکلا۔ میری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے اور میں نے مسرت کی ترنگ کے ساتھ دیکھا کہ کس طرح

سے تمام ظاہری نام اور القاب ـــ جملہ انسانوں کے ڈھالے ہوئے تمام امتیازات
ایک بلند معیار، خدائی محبت اور انسانی محبت کی روشنی میں غائب ہو گئے ۔ یہ خوش خبری
تھی ـــ خدا کی طرف سے بشارت جو اس قابل ہے کہ آسمان سے نیچے لائی جائے ۔ یہ اس
ذات کا رویا ہے۔ جس نے اپنے متبعین کو حکم دیا ہے کہ وہ سمندر پار دور دراز ملکوں میں جائیں
ہم محض ان لوگوں میں جان ڈالنے کے لئے نہیں جاتے جو گناہوں کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہیں
بلکہ ان لوگوں میں جنہوں نے دُور سے اس کی شان و شوکت کا جلوہ دیکھا ہے، اس کی
ضَو فشاں موجودگی کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔"

یہ تھا وہ نقطۂ نظر جسے اینڈریوز نے ”کلیسا اور تبلیغ“ کے عنوان سے کانفرنس میں
پیش کیا جس کے ابتدائی اجلاس میں انہوں نے شرکت کی تھی۔ وہاں انہوں نے بنیادی سوالات
اٹھائے ـــ خوش خبری کے اعلان کے فرض کے متعلق خود مسیح کا کیا خیال تھا؟ اسے خود
انہوں نے کس طرح عملی جامہ پہنایا؟ لیکن وہ تمبرم کے اجلاس کو چھوڑ کر آجانے پر مجبور ہوئے
اس لئے کانفرنس کی رپورٹ سے ان کے خیالات کے واضح اثر کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ انہوں
نے بہری کانفرنس کے سامنے ”مسیح اور نسل“ کے عنوان سے ایک پُر جوش خطبہ دیا تھا جو
ایک آیت پر مبنی تھا جسے وہ اسی غرض سے متعدد بار استعمال کر چکے تھے ـــ وہ آیت پونٹی
اَس پائیلیٹ کا حقارت آمیز سوال تھا جو اس نے مسیح کے مقدمہ کے وقت پوچھا تھا، ”کیا
میں یہودی ہوں؟“

اینڈریوز تمبرم کانفرنس ختم ہونے سے پہلے اس لئے چلے آئے تھے کہ انہیں ۲۶ دسمبر
کو الہ آباد میں انڈین فلاسوفیکل کانگریس کے اجلاس کا صدارتی خطبہ پڑھنا تھا جس کا موضوع تھا
”اہمسا“۔ انہوں نے وہائٹ ہیڈ کی کتاب ”ایڈونچرز آف آئیڈیاز“ سے شروع کیا اور افلاطون
کے خیال کو کہ ”ترغیب ایزدی نظام عالم کی بنیاد ہے“، مہاتما بدھ کے قانون عفو و رحم
اور ”تاؤ تے کنگ“ اور زرتشت کی اعلیٰ اخلاقی قوت جیسے نظریات کو، عیسایہ کی مُناجاتِ خادم
اور سالارِ ستیاگرہیان حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو ٹیگور اور گاندھی کی تعلیمات سے وابستہ
کر دیا۔ بیٹھنے سے پہلے اینڈریوز مسئلہ اہمسا پر اپنے عقائد کا فصیح و بلیغ طریقہ سے اعلان

کر چکے تھے۔ انہوں نے فلسفے کے اس اساسی سوال تک کو نہیں چھیڑا کہ آیا ایک عقیدہ نفسِ حقیقت اور حقائقِ حیات کے مطابق ہوتا ہے یا نہیں، اس لئے کہ خود ان کا اپنا ادراک ایک فلسفی کی نوع کا نہ تھا بلکہ ایک صوفی کے محسوسات پر مشتمل تھا۔ ایک سال قبل انہوں نے ایک مضمون میں تسلیم کیا تھا کہ "جب کبھی میں بحث و دلیل کو سنتا ہوں اس وقت میرے دل میں ہیٹ واکلر کا یہ مصرعہ خود بخود دماغ میں آجاتا ہے۔

یہ ہم موسیقی داں ہی جانتے ہیں، باقی لوگ تو بحث کرتے ہیں اور پھر خوش آمدید کہتے ہیں"۔

(۴)

۲۷ مارچ ۱۹۳۹ کو اینڈریوز نے سینٹ اسٹیفنز کالج کی نئی عمارات کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ دہلی کے کالجوں میں پہلا کالج تھا جو شہر کے شمالی حصہ میں جدید یونیورسٹی کی جگہ پر اُٹھ کر گیا تھا۔ یہ خود ان کے اپنے خواب کی تعبیر تھی۔ انہوں نے اس موقع پر معزز مہمانوں کے سامنے جو تقریر کی۔۔۔ اس میں بشپ ویسٹ کوٹ اور سوشیل رُودرا کے حضور میں خراجِ تحسین پیش کیا، لیکن وہ صرف الفاظ نہ تھے بلکہ وہ خود مقرر کی ہستی تھی جسے حاضرین نے ناقابلِ فراموش پایا۔ جب وہ خاموشی سے سنگِ بنیاد کو اس کی صحیح جگہ پر رکھنے کا انتظار کر رہے تھے، اس وقت وہ اطمینان، سکون اور آشتی کا مجسم پیکر بنے ہوئے تھے۔

جب یہ تمام تقریبات ختم ہوگئیں تو اینڈریوز کو ہسپتال جانا پڑا اس لئے کہ وہ خون کے دباؤ کے مرض میں مبتلا تھے۔ تمام سال وہ بیماری سے کش مکش کرتے رہے۔ جولائی میں ٹیگور کے ساتھ چند ہفتے بسر کرنے کے بعد وہ ایک مرتبہ نیلگری پہاڑ پر چلے گئے، لیکن اس کی بلندی ان کے لئے ضرورت سے زیادہ بلند ثابت ہوئی اور ماہِ جون کی گرمی کے باوجود انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ میدانوں میں چلے جائیں۔ انہوں نے کچھ زمانہ بشپ اور مسز ہیکیم واٹش کے ساتھ ان کے اقامت واقع کوئمبٹور میں گزارا اور پھر ترونیتور چلے گئے۔

اُن کے خیالات بار بار "حیاتِ مسیح" کی طرف لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے فروری میں لکھا "میں اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی دوسرا کام اس پر حقِ اوّلیت حاصل کرے یہ کتاب میرے

دل و دماغ پر اس طرح چھا رہی ہے جس کی مثال اب تک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ جولائی میں انہوں نے ہر چیز میں کاٹ چھانٹ کر دی تھی تاکہ "اس کتاب پر زیادہ توجہ دے سکوں جس کے لکھنے میں میں مصروف ہوں"۔ اور کچھ دنوں بعد انہوں نے لکھا: "کتاب واقعتہً لکھی جا رہی ہے لیکن اس کے بہت سے حصوں کو دوبارہ لکھنا ہوگا۔ جولائی کے آخر میں انہوں نے ارلیس الیگزنڈر سے تشکک و شبہ کا اظہار کیا۔ جن سے ان کی گہری پریشانی اور اضمحلال کا اظہار ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"میں اپنی طرف سے انتہائی کوشش کر رہا ہوں کہ حیاتِ مسیح اسی سال مکمل کرلوں جس میں اتنے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں۔ کچھ تو صحت کی بنا پر اور کچھ اس سبب سے کہ یہ مضمون میرے بس کا نہیں ہے، میں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ جاتا ہوں اور جب کئی ابواب لکھ چکتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معیار پر پورے نہیں اترے۔ برخلاف اس کے میں یقیناً ہر ایسا کام کر سکتا ہوں جس میں اس قدر مکمل یکسوئی اور محنت کی ضرورت نہ ہو۔ میرے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ آیا دنیا کی موجودہ حالت میں مجھ سے بار بار یہ تو نہیں کہا جائے گا کہ میں مہاتما گاندھی کے عدم تشدد سے جو عیسائی امن پسندی سے اس قدر قریب ہے، پڑھنے والی پبلک کا از سرِ نو تعارف کراؤں ۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں زیادہ بڑے فرض سے بھاگ رہا ہوں اگر میں "حیاتِ مسیح" لکھنے کے زبردست کام میں مصروف رہنے کی بجائے ان باتوں پر وقت صرف کروں گا؟ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا سخت دشوار ہو رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ جس آدمی کے خیالات دو طرف بٹے ہوئے ہوں وہ اپنے تمام کاموں میں غیر مستقل رہے گا"۔[1]

عیسائی امن پسندی کے جس موضوع کو انہوں نے چھیڑا ہے وہ کئی سال سے ان کے دماغ میں گھوم رہا تھا، لیکن ان کی پہلی کتاب جس میں انہوں نے سب سے پہلے

---

[1] مکتوب مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۳۹

اس بحث پر لکھا وہ "چیلنج آف دی نارتھ ویسٹ فرنٹیئر" تھی جو ۱۹۳۷ء میں شایع ہوئی۔ اس پر ریویو لکھتے ہوئے "چرچ ٹائمز" (لندن) معترض ہے:

"یہ ان انتہائی خوفناک کتابوں میں سے ایک ہے جو اب تک امن پسندی کے موضوع پر شایع ہو چکی ہیں، اس لئے کہ اس میں ایک مخصوص عملی مسئلہ سے بحث کی گئی ہے...... الزام یہ ہے شمال مغربی سرحد پر پولیس کے مقاصد کے لئے ہوائی جہازوں سے بم برسانا اتنا ہی غیر ضروری اور خلافِ مصلحت ہے جتنا اخلاقی اعتبار سے ناپسندیدہ۔"

اینڈریوز نے اس مخصوص عملی مسئلہ پر جو کچھ لکھا، وہ یقین کے ساتھ لکھا لیکن کتاب میں اس کے علاوہ خود ان کے دل کے اندرونی شبہات اور سوالات کا ترشح موجود ہے کیا تاریخی واقعات کی روشنی میں مقتضائے انصاف اور مقتضائے معافی کے ابین کوئی توازن قائم کیا جا سکتا ہے؟ یا انسانی ترقی دونوں خطرناک اضداد کے درمیان رہ کر حاصل کی جا سکتی ہے؟ "ہیمانت" کے یہ الفاظ بار بار ان کے دماغ میں گونجتے تھے اور انہوں نے ان کا متعدد بار اعادہ بھی کیا۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں "میونک کی بحرانی کیفیت" کے زمانہ میں ان کا دل شبہات سے چھلنی ہو رہا تھا اور ان کی ہمدردیاں ان اشخاص کے ساتھ تھیں جنہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ نازی حکومت کی شیطانی کارروائیوں کا فوری مقابلہ کرنا چاہیئے، خواہ اس کا نتیجہ جنگ ہی کیوں نہ ہو۔[1]

اس بحرانی کیفیت کے وقت اینڈریوز جنگلور کے یونائیٹیڈ تھیولوجیکل کالج میں مسیح کی زندگی پر لیکچروں کا مکمل کورس شروع کر چکے تھے اور انہوں نے مسیح کی تعلیم کی روشنی میں زمانۂ جنگ میں عیسائی شہری کے فرائض کی بحث میں کافی وقت صرف کیا تھا۔ انہوں نے بجائے خود مادی طاقت کے جملہ استعمال کو قابلِ ملامت نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ بہت عرصہ پیشتر مسیح کے ہیکل کو پاک وصاف کرنے کے طریقہ پر تبصرہ کرتے

---

[1] مکتوب بنام رابندرناتھ ٹیگور، مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء

ہوئے میگور کو لکھا تھا، ''میں اقرار کرتا ہوں کہ چھوٹی چھوٹی رسیوں کا کوڑا ایسے معاملہ میں میرے لئے قدرے اطمینان رکھتا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ کسی شخص سے توبہ کرانے کی غرض سے پندرہ دن تک برت رکھنے کی تپسیا کی جائے۔''[1] وہ ابھی تک اسی رائے پر قائم تھے اور انہوں نے مانک ویڈ ماؤتھ میں جیک جا بلنگ کی تبدیلی کی کہانی بطور مثال کے بیان کی کہ محبت کی خدمت میں طاقت کو کس طرح استعمال کرنا چاہئے۔[2]

اینڈریوز نے اس استدلال کو جسے پختہ کار عیسائی پیش کرتے تھے کہ سوسائٹی کی منصفانہ بنیادوں کے قیام کے لئے بعض اوقات جنگ خوفناک طریقے سے ناگزیر ہو جاتی ہے، کافی اہمیت دی۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ مردوں اور عورتوں کی زبردست اکثریت معاشرتی ڈھانچہ کے اندر صحیح طور پر معاشرتی بندھنوں اور ذمہ داریوں میں داخل ہوتی ہے، یہ کہ شادی کا تعلق ایک خدائی نظام کی بنیاد ہے، اور یہ کہ خدا کی سلطنت میں ان لوگوں کے لئے بھی گنجائش ہے جو اس نظام کو طاقت کے ذریعہ اور بشرط ضرورت جنگ کے ذریعہ قائم رکھنے کے فرض کو ادا کرنے کے پابند ہیں۔ لیکن ان روحوں کے لئے جو نہایت گہرے طریقہ سے دکھی ہیں، خود ان کا تفکر عملی طور پر کوئی حل پیش نہ کر سکا۔ جہاں تک ان کی اپنی رائے کا تعلق ہے وہ بالکل بدیہی طور پر واضح تھی۔ ان میں اس وقت پیغمبرانہ جوش پیدا ہو جاتا تھا جب وہ ان چند پسندیدہ آدمیوں کا ذکر کرتے تھے جو خدائی سلطنت کی خاطر اپنے آپ کو خواجہ سرا بنا لیتے ہیں، یکساں معیار قائم رکھتے ہیں اور کلیتہً ناقابل مصالحت محبت اور قربانی کے ذریعہ زیادہ بہتر طریقہ کے لئے تصدیق کرتے ہیں ''تاکہ نمک اپنا مزا ضائع نہ کرے اور روشنی تاریک نہ ہو جائے۔''[3]

لیکن ان خیالات سے اینڈریوز پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ سوسائٹی میں زندگی

---

[1] مکتوب مورخہ مارچ ۱۹۲۱۔ [3] دیکھئے باب ۳

[2] ان لیکچروں کے نوٹ شانتی نکیتن میں لئے گئے تھے انہیں، اینڈریوز حیات مسیح کے نئے کام میں لانا چاہتے تھے۔ مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا۔

کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے سے کتراتے تھے، غلط ہوگا۔ ان کی مابعد کی بعض مذہبی
تحریروں سے بلاشبہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے اور غالباً یہ صحیح بھی ہے کہ جو لوگ "دی اِنلائف"
کی متوکلانہ تعلیمات کے سرچشمہ سے حد درجہ سیراب ہو چکے تھے، ان میں سے بہت سے
ایسے تھے جنہیں اس امر سے کوئی علاقہ نہ تھا کہ صنعتی اور نسلی سوالات کو صحیح معنی میں
عیسائیانہ طریقہ سے کس طرح حل کرنا چاہیئے۔ لیکن خود اینڈریوز نے توازن قائم رکھا۔
جیسا کہ ان کی کتابوں کے ایک نقاد نے لکھا ہے: "آپ نے زندگی کی عبادت اور سیاست
کو سمو کر انہیں صحیح طریقہ سے متحد کر دیا ہے"۔ ؎۱ اینڈریوز کی آخری یادداشت اس خیال کے
خلاف صدائے احتجاج تھی جو ان کی رائے میں ہیرڈ یولیٹن کی نشری تقریروں سے پیدا
ہوتا تھا کہ عیسائیانہ نقطۂ نظر سے ناانصافی اور ظلم کا مقابلہ خواہ وہ غیر متشددانہ ہی کیوں
نہ ہو، غلط چیز ہے۔ انہوں نے لکھا "ہمارے آقا (مسیح) بڑے بڑے پیغمبروں کے براہِ
راست سلسلے سے متعلق تھے۔ انہوں نے ہیرودؔ جیسے ظالم کے متبعین کے مقابلہ میں
اپنی مخالفت کو کبھی نہیں چھپایا۔ انہوں نے یروشلم کے عمال سلطنت کو ملزم گردانتے ہوئے
بتایا کہ اُن کی مذہبی حکومت ناکارہ اور فاسد ہے۔ وہ شروع سے آخر تک سرکاری معاملات
پر نہایت بے خوفی سے تبصرہ کرتے رہے"۔ ؎۲

حقیقت یہ ہے کہ اینڈریوز اسی طرح عملی تصوف کی شاندار عیسائیانہ روایت
کے حامل تھے جس طرح سے کرسچین سوشل یونین میں ان کے بعض استاد اس راستہ
پر گامزن تھے۔ ایک ایسے موضوع پر جسے وہ خود مقدس سمجھتے تھے، کچھ کہتے ہوئے انہیں
حجاب ہوتا تھا لیکن آثار یہ بتاتے ہیں کہ آخری دورِ زندگی میں وجدانی کیفیت کا تجربہ
انہیں بار بار ہوتا تھا۔ کرستو کولا آشرم کے دو نوجوان والنٹیر جو اُن کے ٹائپسٹ تھے،
بیان کرتے ہیں کہ ہر دس دس پندرہ پندرہ منٹ تک "حیاتِ مسیح" پر کام کرنے کے

؎۱ آر۔ جی۔ ملبورن کا مکتوب بنام سی۔ ایف۔ اے ۲۷ جنوری ۱۹۴۰

؎۲ مکتوب بنام لارڈ بشپ آف کلکتہ ۲۱ جنوری ۱۹۴۰

بعد وہ چارپائی پر جا کر لیٹ جایا کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکمل سکون اور روحانی مسرت کی دنیا میں کھو سے گئے ہیں۔ چند منٹ گزر جانے کے بعد خود ان کی خواہش پر ٹائپسٹ آہستہ سے انہیں چھوتا اور وہ اٹھنے کے بعد پھر تھوڑی دیر تک لکھتے رہتے اور کچھ دیر بعد پھر لیٹ جاتے۔ یہ کیفیت دو دو تین تین گھنٹے تک رہتی۔ کام اور سکون کے یہ مناظر ان کی ساری زندگی کے نمایندہ رہے۔ ان کے تجربہ میں وہ مسیح جنہوں نے انہیں خدمت پر مامور کیا تھا اور وہ مسیح جنہوں نے انہیں تھکا ہوا اور بار زدہ پا کر کہا تھا کہ وہ ان کے سکون سے بہرہ ور ہوں، ناقابلِ تحلیل طریقے سے ایک ہی تھے۔

(۵)

۳ ستمبر ۱۹۳۹ کو اتوار کے دن جب جنگ کی خبر ساری دنیا میں پھیل گئی تو اینڈریوز اس وقت بھی بنگلور میں تھے۔ اس شام کو انہوں نے یونائیٹیڈ تھیولوجیکل کالج کے گرجا میں نماز پڑھائی۔ ایک شخص نے جو اس موقع پر موجود تھا، لکھا ہے:

"وہ ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھا کہ شروع سے آخر تک ہر انسان والہانہ عبادت میں محو نظر آتا تھا۔ انہوں نے وعظ نہیں کہا بلکہ وہ محبت پر مراقبہ تھا، اور مجھے ایسا نظر آتا تھا کہ مسیح کا محبوب حواری اپنی زبانِ فیض ترجمان سے بول رہا ہے...... جب وہ منبر چھوڑ کر دوسروں کی بانہوں پر جھکے ہوئے باہر آئے، دبلے پتلے کمزور سے اس وقت اُن کا چہرہ محبت اور سکون کے جذبات سے جگمگا رہا تھا"[۱]

وہ مدناپلی گئے، اور پھر ناگپور تاکہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی پوزیشن کے متعلق نیشنل کرسچین کونسل جو غور و خوض کرنے والی تھی اس میں اس کی امداد کریں۔ واردھا میں انہوں نے گاندھی کو "کچھ انقلابی غور و فکر میں" محو پایا اور یہ دونوں دوست اپنی عادت کے مطابق ہنس ہنس کر اور مذاق کرتے ہوئے اہم قسم کے مذہبی مباحث پر تبادلۂ خیال کرتے رہے

---

[۱] "کرسچین ورلڈ"۔ اپریل ۱۹۴۰

اس کے بعد سارا بھائی کے خوبصورت بنگلہ واقع احمد آباد میں کچھ عرصہ تک آرام کیا اور علاج بھی، اس کے بعد ورسووا (بمبئی) کی سمندری ہواؤں میں خلافِ عادت بیکاری میں کچھ دن گزارے۔ یہاں اینڈریوز کم سے کم ایک موقع پر صبح کے ۹ بجے تک بستر پر پڑے رہے۔

دسمبر میں دہلی میں، انہیں ایک خط ملا جس میں ان سے ایک ممتاز مصنف کی حیثیت سے خطاب کیا گیا تھا اور اطلاع دی گئی تھی کہ وزارتِ اطلاعات "سلطنت کے سمندر پار علاقوں میں جنگی پبلسٹی کے متعلق" اُن کے خیالات کا خصوصیت سے خیر مقدم کرے گی اینڈریوز جنگ کے سلسلہ میں کسی سرکاری پروپیگنڈے کا فریق بننا نہیں چاہتے تھے، لیکن دہلی کے محکمۂ پبلسٹی کے ڈائرکٹر اُن کے پرانے واقف تھے اور اس لئے انہوں نے پلان بنانا شروع کیا کہ ہندوستانی معاملات کے متعلق صحیح اطلاعات نشر کرنے میں وہ کہاں تک اس کی امداد کر سکیں گے۔

لیکن وہ تھکا ہوا جسم برداشت کی انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا۔ شانتی نکیتن میں کرسمس کی خوشیاں منانے کے بعد ان کی طاقت کئی ہفتے تک بحال ہو گئی اور وہ اپنی قدیم عادت کے مطابق صبح کی ہوا خوری کے لئے ریڈ روڈ سے سرول جاتے اور واپسی میں اپنے کسی دوست کے یہاں ٹھہرتے تاکہ وہاں چائے کی ایک پیالی پئیں اور روزمرہ کا کام شروع کرنے سے پہلے کچھ ہنسی کی باتیں کرلیں۔ مگر وہ پھر بیمار پڑ گئے اور ان کی بیماری خوفناک طریقہ سے بڑھ گئی۔ جب کلکتہ کے پریسیڈنسی جنرل ہاسپٹل میں ان کا معائنہ کیا گیا تو اس وقت یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ بڑا آپریشن کرنا ضروری ہوگا اور ایک چھوٹا درمیانی آپریشن فی الفور کرنا ضروری ہے۔ ان کی صحت بڑی سست رفتاری سے بحال ہو رہی تھی جس کی وجہ سے تقریر و تحریر کا کام کئی ہفتے تک رکا رہا، اور بڑے آپریشن کے فیصلہ کو ملتوی کر دیا گیا۔ جب وہ ہسپتال میں بسترِ علالت پر پڑے ہوئے تھے، دوست انہیں گھیرے رہتے تھے۔ کچھ دن بعد وہ آہستہ آہستہ مگر صاف الفاظ میں اور مبسوط طریقہ سے عزیزوں کے نام خطوط اور محبت کے پیغامات لکھواتے رہے اور ان سے دعائی درخواستیں کرتے

رہے ۔

مہاتما گاندھی کلکتہ آئے اور بہت دیر تک ہسپتال میں رہے۔ بیماری نے گہری محبت سے اپنے دوست کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "موہن، سوراج آ رہا ہے۔ انگریز اور ہندوستانی اگر چاہیں تو وہ اسے لا سکتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے؟ میں اپنی بیماری سے کلی طور پر ہم آہنگ ہو گیا ہوں۔ میرے خیال میں یہ در پردہ خدا کی برکت تھی" پھر انہوں نے آہستہ آہستہ اور رک رک کر فرانسس ٹامسن کے ذیل کے اشعار پڑھے:

کیا مچھلی سمندر کی تلاش میں ہواؤں پر پرواز کرتی ہے،

کیا عقاب ہوا کے انکشاف کے لئے غوطہ لگاتا ہے،

کیا ہم متحرک ستاروں سے دریافت کریں،

کیا انہیں تیری بھی کچھ خبر ہے؟

نہ اس جگہ جہاں بیچ در پیچ نظام تاریکی آلود ہوں،

اور نہ اس جگہ جہاں ہمارا ٹھٹھرا ہوا تخیل پرواز کر رہا ہو۔

فرشتوں کے پر ہمارے خاکی وجود کے دروازوں پر کھٹ کھٹ کر رہے ہیں،

کاش ہم سنتے!

"اوہ، یہ کس قدر حیرت انگیز ہے — فرشتوں کے پروں کے جھونکوں کا بیان!" اس کے بعد ان کے چہرے سے گہرا سکون نمایاں ہو رہا تھا۔

گرو فرائیڈے اور ایسٹر سنڈے آئے اور گزر بھی گئے۔ شدھیر رُدرا جو ان کے لئے بیٹے کی طرح تھے، تعطیلات میں الٰہ آباد سے ان سے ملنے کے لئے آئے۔ وہ لکھتے ہیں "رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مجھے دعائیں شامل کیا۔ ان کی قوت گویائی بیماری سے متاثر تھی، مگر اس کے باوجود اس دعا میں کیا لطف آرہا تھا!"

بعد میں جب اندیشناک آپریشن کا فیصلہ کر لیا گیا اس وقت گاندھی نے انہیں محبت اور دعا کا مختصر سا تار بھیجا۔ اینڈریوز نے اسے پڑھا اور تھوڑی دیر تک خاموشی

کے عالم میں بیٹھے رہے۔ آخر کار انہوں نے کہا: "مجھے اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ جب باپو برت میں تھے تو میں نے ان سے بہت کہا تھا کہ کسی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیجئے اس وقت انہوں نے جواب دیا تھا، چارلی، کیا خدا پر تمہارا اعتقاد نہیں ہے؟" آج میں اس سب سے بڑے ڈاکٹر کا خیال کر رہا ہوں۔ جو کچھ وہ کرے گا وہ میرے لئے ٹھیک ہوگا اور ہندوستان اور دنیا کے لئے بھی اچھا ہوگا۔"

اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتے تھے اور خدمت سے بالکل نہیں تھکے تھے۔

دوسرے آپریشن کے بعد وہ بہت کم ہوش میں رہے، لیکن جب کبھی وہ اپنی آنکھیں کھولتے اور کسی ایسے شخص کو اپنے پلنگ کے پاس دیکھتے جس سے انہیں محبت ہوتی تو اس وقت ان کا چہرہ حسین مسکراہٹ سے تمتما اٹھتا۔ جب بشپ ویسٹ کوٹ نے انہیں برکت دی تو انہوں نے آہستہ سے کہا: "مجھے اسی چیز کی ضرورت ہے۔" چوتھے دن سے ان کی حالت بگڑنی شروع ہوگئی، اور ۵ر اپریل کو جمعہ کے دن علی الصبح ان کا انتقال ہوگیا۔

ان کے وصیت نامہ کا تتمہ جو آپریشن سے تھوڑی دیر پیشتر لکھوایا گیا تھا۔ یہ تھا:-

"میری خواہش ہے کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو مجھے عیسائی مذہب میں ایک عیسائی کی حیثیت سے سینٹ پال کے گرجا میں جو کلکتہ کے قریب واقع ہے، دفن کیا جائے، بشرط امکان میٹروپولیٹن کی دعا کے ساتھ، جن کی اپنے بشپ کی حیثیت سے، عیسائی کلیسا کے پادری کی حیثیت سے اور میرے عزیز عیسائی مذہب کے مبلغ کی حیثیت سے خدمت کرنے کی آرزو عرصۂ دراز سے میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔"

ان کی آرزوئیں پوری کر دی گئیں۔ نمازِ جنازہ خود میٹروپولیٹن نے پڑھائی اور گرجا سے جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ان کی تقریر نشر کی گئی تاکہ باہر غمزدہ ہجوم کو تسکین ہو۔ تیئسویں گیت کے خوبصورت الفاظ صاف اور متیقن طریقہ سے ہوا میں گونجے:

"اگرچہ میں موت کے سایہ کی وادی میں چل رہا ہوں،
مگر مجھے کسی برائی کا خوف نہیں ہے

کیونکہ تو میرے ساتھ ہے۔

تیرا عصا اور تیرا سہارا یہ دونوں مجھے تسکین دیتے ہیں۔"

ایک ہندو دوست نے جب پُرنم آنکھوں کے ساتھ یہ الفاظ سنے، تو اس کے دماغ میں ان الفاظ کے نئے معنی پیدا ہوئے۔ انہوں نے کہا: "بلاشبہ، چارلس فریئر اینڈریوز کی روح کو کسی برائی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

کلکتہ کے گرجا کا احاطہ قبرستان کا جزو نہیں ہے مگر اس سے قریب ترین جو قبرستان ہے وہ لوئر سرکلر روڈ پر ہے۔ یہ بات بالکل مناسب تھی کہ گاڑیاں نہ ہوں تاکہ غریب اور امیر یکساں طور پر تابوت اٹھانے والی گاڑی کے پیچھے پیچھے پیدل چل سکیں اور عیسائی اور غیر عیسائی، مشرق اور مغرب، رفقا کے اس چھوٹے سے اجتماع کی نمایندگی کریں جو تابوت کو قبر تک لے جا رہے تھے۔

"حیاتِ مسیح" کبھی لکھی نہیں گئی لیکن وہ نہایت وفاداری کے ساتھ اینڈریوز کی زندگی میں ضرور بسر ہوئی ہے۔

کے عالم میں بیٹھے رہے۔ آخر کار انہوں

مرتبہ جب باپو برت میں تھے تو میں نے ا

اس وقت انہوں نے جواب دیا تھا "چارلا

اینڈریوز کی معیت میں

میں اس سب سے بڑے ڈاکٹر کا خیال کر

(بریسن کے قلم سے)

ہوگا اور ہندوستان اور دنیا کے لئے بھی لمس ہے جس کا ہندوستان اور دنیا کے دوسرے

اس کے باوجود وہ زندہ رہنا چاہتا ... قات مئی ۱۹۳۱ میں ہوئی۔ مسز الیگزینڈر وہائیٹ

دوسرے آپریشن کے بعد وہ بہہ ہی تھی، ایک صبح مجھ سے ملیں اور کہا "سی۔ ایف۔ آنکھیں کھولتے اور کسی ایسے شخص سے ہیں، جو کام تم میرے لئے کر رہی ہو، اُسے اتو ی ہوتی تو اس وقت امداد کرو اس لئے کہ وہ بہت اہم کام انجام دے رہے ہیں" اور اس کے انہیں سی۔ ایف۔ اینڈریوز اندر آ گئے۔ وہ مجھ سے اس طرح سے ملے گویا وہ مدتوں سے بچھڑے ہوئے کسی دوست سے مل رہے ہوں۔ رسمی تکلفات وہاں نام کو موجود نہ تھے ہم فوراً ان کے کاغذوں کے ڈھیر کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ گئے، ہمارے کام میں بار بار کے ٹیلیفون سے رخنہ پڑتا تھا اس لئے کہ ان کی آمد کی خبر تیزی سے پھیل چکی تھی۔

دوسری گول میز کانفرنس سر پر کھڑی تھی جس میں شریک ہونے کے لئے مہاتما گاندھی بھی آ رہے تھے۔ سی۔ ایف۔ اے نے اُن کی آمد کے سلسلہ میں زبردست تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ ان کے تعلقات کی وسعت کو دیکھ کر میں اچنبھے میں رہ گئی۔ انہوں نے وہائٹ ہال، فلیٹ اسٹریٹ اور عیسائی لیڈروں کو متحرک کر دیا، آکسفورڈ، کیمبرج، مانچسٹر، برمنگھم وغیرہ مقامات میں مسٹر گاندھی کے دوروں کے عارضی منصوبے بنائے اور اہم اشخاص سے ملاقات کے اوقات مقرر کئے۔ جب تک کانفرنس ہوتی رہی سی۔ ایف۔ اینڈریوز اپنے پرانے رفیق اور دوسرے ہندوستانی لیڈروں کے دوش بدوش کام کرتے رہے اور نازک مواقع پر وہ ایک ترجمان کی حیثیت سے بھی کام کرتے تھے۔ مہاتما ۸۸۔ نائٹس برج میں مقیم تھے اور یہ جگہ ہیجان انگیز سرگرمیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ تمام دنیا کے وزیٹروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ایسے پرشور مجمع میں جو اکثر اشخاص کو پریشان کر دیتا، سی۔ ایف۔ اے اپنے

کاغذات کے لئے چھوٹی سی جگہ صاف کر لیتے اور کہتے: "آؤ، اب کام شروع کریں۔"
ہمیں خلل اندازی کے بغیر مشکل سے ۱۰ منٹ ملتے ہونگے اور اسی ماحول میں "واٹ آئی اوٹو کرائسٹ" کا بیشتر حصہ لکھا گیا۔

جونہی کانفرنس ختم ہوئی وہ چپکے سے افریقہ چلدئے۔ چلتے چلتے جو ہدایات انہوں نے مجھے دیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہمارا اشتراک عمل کس قدر مضبوط ہے۔ ان کے سارے خطوط میرے پاس آتے تھے، خطوں کے جو اقتباسات وہ بھیجتے، انہیں یہاں مخصوص اشخاص کے پاس بھیجدیا جاتا تھا۔ انہیں ہمیشہ اُن بہت سے لنگڑے کتوں کا خیال رہتا تھا جن کی وہ دستگیری کرتے تھے ۔ ان سب کی خبرگیری کرنی چاہئے۔ لاکھوں تاگے ایسے رہ گئے تھے جنہیں ان کی غیر حاضری میں سہارے کی ضرورت تھی اور ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ژولیدہ ہو گئے تھے!

۱۹۳۲ میں وہ ہندوستان ہوتے ہوئے لوٹے جو اُس زمانہ میں عملی طور پر مارشل لا کی زد میں آچکا تھا۔ اس وقت تک لندن میں ایک مصالحتی گروپ بن چکا تھا جس کے دانشمند صدر کارل ہیتھ تھے اور میں اس کی سیکریٹری تھی ۔ یہ ظاہر تھا کہ جب تک یہ عظیم الشان مصالحت کنندہ ہم میں موجود ہے، انہیں ہر قسم کی امداد دینی چاہئے۔ ایک مرتبہ پھر وہائٹ ہال، فلیٹ اسٹریٹ اور عیسائی لیڈروں کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی عادت تھی کہ وہ اہم گفتگوؤں کے بعد احتیاط سے خطوط لکھوا کر بھجواتے جن میں ان گفتگوؤں کا خلاصہ درج ہوتا۔ یہ خطوط تاریخی اور الہامی ہیں۔ جب کبھی وہ لندن سے باہر قیام پذیر ہوتے ہم ٹیلیفون اور خطوط کے ذریعہ تعلق قائم رکھتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے لکھا: "اگر تم مجھے اس ہفتہ میری کتاب کے لئے آزاد چھوڑ دو تو یہ بہت بڑی نعمت ہوگی۔" مگر انہیں مشکل سے اتنا وقت ملتا جس کے حصول کے وہ اسقدر متمنی تھے اس لئے کہ ملاقاتوں کے ضروری بلاوے آتے، یا وہ خود اخبارات میں ہندوستانی خبروں کو پڑھکر یہ ضرورت محسوس کرتے کہ وہ انڈیا آفس اور دوسرے مقامات پر جائیں؛ اور اس کے بعد وہ پھر لندن آجاتے۔ مسٹر گاندھی کے پونا والے برت کے دوران میں اور بالخصوص

برت توڑنے سے قبل کے ہفتہ میں سی۔ایف۔اے نے جو جدوجہد کی اس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ وزیرِ اعظم اور کابینہ کے دوسرے ممبر کہاں کہاں ہفتہ کے آخری دن گزار رہے ہیں۔سی۔ایف۔اے گاڑی مانگ لیتے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے۔

اس کے مابعد کے سالوں میں وہ ہندوستان، افریقہ، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ اور فجی میں بار بار آئے اور گئے اور ساتھ برِاعظم یورپ کے مختلف ممالک میں بھی متعدد بار گئے۔ اسی آمد و رفت میں بہت سے وقفے ایسے ملے جن میں اِس ملک نے بالآخر اندازہ کر لیا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ ان کے ہاتھ میں زیرِ ترتیب رہتی لیکن انہیں اس پر کام کرنے کے لئے مسلسل وقت کبھی نہیں ملا۔ وہ انسانی پَرِ وارگینڈ (شٹل) کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے رہتے تھے۔ میرے پاس اس قسم کے تار اکثر آیا کرتے تھے— "سی۔ایف۔اے کہاں ہیں؟— "کیا آپ سی۔ایف۔اے کے بارے میں یہ بتا سکتی ہیں کہ وہ جولائی میں کہاں ہوں گے؟ "ہم کانفرنس کی صدارت کے لئے اُن کی خدمات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔" وہ جواب میں صرف اتنا کہتے "میں نے آیندہ ہفتہ اپنا پیسج بُک کر لیا ہے۔" جس ٹریول بیورو کے ذریعہ وہ اپنے سفروں کا انتظام کرتے تھے، وہ اُن کے منصوبوں کی بار بار تبدیلیوں کے خوگر ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ سفر کے وقت میں چھ مرتبہ تبدیلیاں کی گئیں۔ اس وقت میں نے مینیجر مسٹر ایچ۔ سے جا کر معذرت کی تو اس نے جواب دیا:

"آپ اس بات سے پریشان نہ ہوں کہ مسٹر اینڈریوز اپنا وقت بدلتے رہتے ہیں۔ جو حیرت انگیز کام وہ کر رہے ہیں اس میں یہی میرا حصہ ہے ان سے کہہ دیجئے کہ میں کوشش کروں گا کہ انہیں اچھا کیبن مل جائے۔" قبل از جنگ کے زمانہ میں جہازوں میں آنا جانا زیادہ سہل تھا اور سی۔ایف۔اے کو تقریباً ہمیشہ علیحدہ کیبن مل جاتا تھا، اور یہی سب سے اچھی بات تھی اس لئے کہ ان کے کاغذ موسم خزاں کے پتوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے پڑے رہتے تھے اور بعض اوقات وہ اُڑ کر دوسرے کیبن میں پہنچ جاتے تھے

بشرطیکہ وہ خالی ہوا۔ سمندری سفر میں وہ ابتدائی چند گھنٹوں تک آرام کرتے اور کہتے: "اب میں ذرا اپنے اعضا کو ڈھیلا ڈھالا چھوڑ دینا چاہتا ہوں اور ان چیزوں کا جنہیں میں نے ادھورا چھوڑ رکھا ہے۔ خیال تک نہیں کرنا چاہتا۔" یہ وہ الفاظ ہیں جو انہوں نے اپنے دوست الیگزنڈر ڈینسن کو لکھے تھے۔ پھر ہر بندرگاہ سے جہاں جہاز رکتا طویل طویل خطوط آتے — "میں چاہتا ہوں کہ یہ خط گھومتا رہے تاکہ لوگوں کو اُن اہم کاموں کی اطلاع ملتی رہے جن کے بارے میں ہمیں آیندہ سال کارروائی کرنے کی ضرورت ہوگی:" "کیا آپ مسٹر۔ . . . سے کہدینگے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟ . . ." "میں کابینہ کے وزرا کے نام خط پر خط بھیج رہا ہوں۔" (وہ اِن خطوں کی نقلیں بھی بھیجدیتے تاکہ ہمیں ان کے خیالات سے واقفیت رہے) پھر خطوں کے آخر میں وہ ذیل کی مزید عبارت لکھتے: "میں چاہتا ہوں کہ آپ خاص طور پر مسٹر اور مسز . . . . اور ان کے بچوں کا خیال رکھیں جب تک وہ لندن میں رہیں۔" جب وہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتے تو جو کچھ بھی وہ کرتے اس کا مستقل ریکارڈ آجاتا۔ ساتھ ہی یہ مشورے بھی ہوتے کہ ہمیں آیندہ یہاں کیا کیا کرنا ہوگا۔ . . . . "میرے دماغ میں بہت سی باتیں ہیں۔ اب صبح کے چار بجے ہیں جو مہاتما گاندھی کی پرارتھنا کا وقت ہے اور میں اُن کے ساتھ جاگ رہا ہوں۔ پاس ہی گورودیو (ٹیگور) گہری نیند سو رہے ہیں اور میں جس لالٹین کی روشنی میں یہ خط لکھ رہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بجھنے ہی والی ہے . . . ."

"میں رات کو دیر تک لکھتا رہا ہوں تاکہ یہ اہم خط پورا ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے ہر جگہ نشر کرا دیں، لیکن بلاشبہ یہ بالکل نجی ہے — یہ صرف میرے ہی خیالات ہیں جنہیں میں نے یہاں کے لوگوں کی روزانہ گفتگوؤں سے اخذ کر کے قلمبند کیا ہے۔ . . . ."

جس طرح اچانک طور پر وہ لندن چھوڑتے اسی طرح ان کی واپسی بھی عمل میں آتی اور آنے سے پہلے تار آ جاتے۔ ایک تار کے یہ الفاظ تھے: "پیس کو پہنچ رہا ہوں۔ اُسٹنٹش سے ملاقات کا انتظام کر دو۔ آن وِن کو اطلاع دیدو کہ کتاب مکمل

ہوگئی ہے۔" ضروری خطوط میں ان لوگوں کی فہرست ہوتی جن سے وہ پہنچنے کے دوسرے دن ملنا چاہتے تھے۔ ان کے بیشمار دوست لکھتے: "جب سی۔ایف۔اے آجائیں تو اُن سے کہدیجئے کہ ان کا کمرہ تیار رہے ہے!" مجھے شبہ ہے کہ آیا کوئی اور شخص بھی ایسا ہوسکتا ہے جس کے پاس ان سے زیادہ گھر ہوں۔ ڈیون شایر میں ان کی بہنوں نے ان کے لئے ایک مخصوص حجرہ اس امید میں محفوظ رکھا تھا کہ وہ اس میں ایک رات سے زیادہ بسر کرینگے۔ ان کے میزبان جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے، اس سیلانی عیسائی کے بارے میں طرح طرح کی دلچسپ کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ ان کی اپنی چیزیں بہت کم ہوا کرتی تھیں اور جو تھیں انہیں وہ بھدّے قسم کے دو سوٹ کیسوں میں لیا کرتے تھے جن میں وہ کم سے کم کپڑے، بہت سی کتابیں، اپنی لکھی ہوئی کتابوں کے ابواب، خطوط، مجوروں کا ایک بکس اور اینوز فروٹ سالٹ کی بوتل جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، ٹھونس لیا کرتے تھے۔ اگر روانگی کے وقت بوتل کا ڈھکنا بند نہ ہوتا تو وہ اپنے میزبان سے یہ کہتے کہ "اسے میرے لئے رکھے رہو۔" ان کی کتنی ہی عجیب وغریب چیزیں اس طریقہ سے دنیا بھر میں پھیلی ملینگی! اگر وہ سب جمع ہوجائیں تو اچھا خاصا میوزیم بنجائے!

دو موقعوں پر مجھے ہندوستان میں سی۔ایف۔اے کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بار ۱۹۳۶ میں (جبکہ وہ بحرالکاہل سے اپنے سفر سے واپس آرہے تھے) اور دوسری بار ۳۹-۱۹۳۸ میں۔ یہ دونوں تجربات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۳۱ میں وہ کنیڈی کے ٹرنٹی کالج میں مقیم تھے اور اس خوبصورت ماحول میں ہم نے بہت طول طویل گفتگوئیں کی تھیں۔ کالج کے گرجا میں جو وعظ انہوں نے کہا وہ بیحد متاثر کرنے والا تھا۔ وہ اس وقت "ہندوستان اور بحرالکاہل" نامی کتاب لکھ رہے تھے۔ ۱۹۳۶ کے بعد سے جو واقعات رُونما ہوئے ہیں ان کی روشنی میں کتاب کو پڑھیئے اور ان کی گہری نظر اور پیش گوئی کی الہامی قوت کی داد دیجئے۔

۱۹۳۸ کے موسم خزاں میں جب میں ہندوستان پہنچی، سی۔ایف۔اے وہیں تھے۔

اس وقت خیال تھا کہ وہ "حیاتِ مسیح" لکھ رہے ہونگے جس کے بارے میں ان کے دوست سر اسٹیفنے اور فلپ اُن وِن اُن پر زور ڈال رہے تھے۔ ان دنوں سیاسی صورتِ حال شدید صورت اختیار کر رہی تھی، بعض ہندوستانی ریاستوں میں گڑبڑ شروع ہو رہی تھی، ان کے پاس روزانہ دعوتیں آتیں کہ "آیئے اور مدد کیجئے" اور ساتھ ہی ٹمبرم کانفرنس کا خیال بھی ان کے دماغ پر مستولی تھا۔ کبھی کبھی میں ان سے کہتی کہ اپنی محنت نہ کیا کریں اور کچھ آرام بھی کر لیا کریں۔ اس کا وہ جواب دیتے: "حیاتِ مسیح لکھنے سے کیا فائدہ۔ جبکہ ایک شخص ایسے کام کرتا ہو جو مسیح کی تعلیم کے خلاف ہیں؟" جب میں دہلی میں ایک ہسپتال میں ان سے ملنے کے لئے جا رہی تھی (کیونکہ انہیں مکمل آرام کا حکم دیا گیا تھا) اس وقت میں نے ان کے دروازہ پر "نو وزیٹرز" کا نوٹس لکھا ہوا دیکھا مگر کمرہ بدستور ملنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب ان کے دوست چلے گئے تو سی۔ ایف۔ اے نے خطوط کا ایک ڈھیر میری طرف کر دیا اور کہا: "میری طرف سے آپ ان کا جواب دیدیں۔" جب میں یہ خط جمع کر رہی تھی جن کے جواب دینے کے لئے کم سے کم دس دن درکار ہوتے تو انہوں نے پُرمسرت تبسم سے فرمایا: "بہت ہی اچھا ہوا، اب میں سمجھتا ہوں کہ میں بالکل آزاد ہوں۔"

ان کی درخواست پر میں چند ہندوستانی ریاستوں میں گئی تاکہ جو کام وہ کر رہے تھے، اسے جاری رکھا جائے۔ میں نے دیکھا کہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز کا رفیقِ کار ہونے کی حیثیت سے تمام ہندوستانی دلوں میں میرے لئے خود بخود جگہ ہو جاتی تھی۔

ان مہینوں میں جبکہ ہندوستان میں رہ کر ہم ایک ساتھ کام کر رہے تھے، مجھے یکایک آگاہی سی ہو گئی کہ اب ہم انگلستان میں انہیں پھر نہ دیکھیں گے۔ لیکن وہ افریقہ جانے اور "حیاتِ مسیح" مکمل کر لینے کے بعد اس ملک میں واپس آنے کا پروگرام تیار کر رہے تھے۔ ۱۹۳۹ کے آخر تک ان کے خطوط باقاعدگی سے آتے رہے، جن میں جنگ کے متعلق ان کے دلی کرب کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹۴۰ کی ابتدا میں وہ طویل وقفوں سے خط لکھتے اور جب وہ ہسپتال چلے گئے اس وقت ان کے دوستوں کے

لکھے ہوئے خط آتے۔

جو خطوط لڑائی سے کچھ دن قبل اور کچھ دن بعد لکھے گئے تھے، ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔ ان سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی:

"ہم زندگی اور موت، جنگ اور امن، کے بیچ میں زندگی گزار رہے ہیں اور سونا بہت مشکل ہوگیا ہے۔ ....."

"میں محسوس کرتا ہوں کہ اس خوفناک نازک موقع کے دوران میں روزانہ لکھتا رہوں، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کل ہم یہ نہ سنیں کہ نامہ و پیام کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے اور انجام قریب آگیا ہے۔ ...."

جب خطوط پر سنسرشپ قائم ہوگئی اس وقت انہوں نے لکھا:

"..... مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے نجی خطوط کے معائنہ سے خط و کتابت کی روح خشک ہو جاتی ہے حالانکہ اسے مفید مطلب بنانے کے لئے ہوا کی طرح آزاد ہونا چاہیئے .... تم جانتی ہو کہ مجھے اس کی فکر نہیں کہ میرے خط کون دیکھتا ہے یا یہ کہ میری چیزوں کی کون نگرانی کرتا ہے ــــ اس لئے کہ میں نے اپنی کوئی چیز کبھی مقفل نہیں رکھی۔ لیکن بہرحال اس سے فرق تو پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ ....."

ذیل کا اقتباس اس خوبصورت خط سے لیا گیا ہے جسے مسٹر گاندھی نے سی۔ایف۔اینڈریوز کی وفات پر مجھے لکھا تھا:-

"..... ہمیں بھول جانا چاہیئے کہ وہ مر گئے ہیں، ہمیں ان کے چھوڑے ہوئے ورثہ پر انہی کی طرح کام کر کے انہیں زندہ رکھنا چاہیئے۔ ......
میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ سی۔ایف۔اے دنیا سے چلے گئے ہیں۔
وہ بجائے خود ایک انسٹی ٹیوشن (ادارہ) تھے۔ وہ محبت کا مجسمہ تھے۔ ...."

لندن ۱۹۴۸